گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
مئی 2021
معراج رسول
WWW.PKLIBRARY.COM

Eid mubarak

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	8
گوشۂ ظرافت	ادارہ	254
بہنوں کی محفل	مدیرہ	256
پاکیزہ ڈائری	آمنہ حماد	270
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	275
منتخب غزلیں	ادارہ	277
خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین	278
بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	280
روحانی مشورے	ادارہ	282
حسن نکھار کے لیے	مہ جبیں	284
ہومیو کلینک		286

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

تمام ایجنٹ حضرات اور قارئین متوجہ ہوں

سسپنس کی کامیاب

گولڈن جوبلی نمبر

کی پزیرائی کے بعد

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

کا خاص شمارہ

گولڈن جوبلی نمبر

بہت جلد

پوری آب وتاب سے آرہا ہے

صفحات 362

قیمت 150 روپے

جگمگاتے قلم کاروں کی دلکش کہکشاں

احمد اقبال، طاہر جاوید مغل، نجمہ مودی، ایچ اقبال، امجد رئیس،

پروین زبیر، روبینہ رشید، عبدالرب بھٹی، حسام بٹ و دیگر مصنفین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

محترم قارئین.....السلام علیکم!

ماہنامہ پاکیزہ کے سالگرہ نمبر کی جس طرح آپ نے پزیرائی کی وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔ آئندہ بھی آپ کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے یہ قلم و قرطاس کا سفر مزید بہتری کے ساتھ جاری رہے گا، ان شاء اللہ!

ماہ رمضان المبارک رحمتوں، برکتوں، سعادتوں سے ہمیں سیراب کرتے ہوئے نجات کی نوید سناتا گزر رہا ہے..... وہ ماہ کہ جس میں ایک نیکی کا اجر دس گنا سے بھی بڑھ کر ہے سبحان اللہ! اگر اس ماہ بھی کوئی مسلمان اپنے گناہ معاف نہ کروا پائے تو اس کی یقیناً بدبختی ہوگی۔

حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں کی خبر گیری، دست گیری اور دادرسی..... محض دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ ان ضرورت مندوں، حاجت مندوں کی عزتِ نفس کو ملحوظ خاطر رکھ کر کرنا ہی ایک سچے مومن کی پہچان ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

گزشتہ برس سے جو وبائی صورت حال کے نتیجے میں ہر شعبہ زندگی متاثر ہوا وہی صورت حال کم و بیش اب بھی جاری ہے، بلکہ کورونا وائرس کی اس تیسری لہر نے تو واقعی جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے ایسے میں ماہ شعبان، ماہ رمضان کے فیوض و برکات ہم سب کے لیے نعمت ہیں جس سے حتی المقدور فیض یاب ہونا ہے..... یہ استغفار کی قبولیت کا ماہ ہے، نعمتوں کے نزول کا ماہ ہے اور دنیاوی مشکلات کے ساتھ، ساتھ آخرت کے عذاب سے نجات کا ماہ ہے۔ اللہ پاک اس ماہ کی طاق راتوں کی فضیلتوں کے صدقے تمام عالم انسانیت اور خصوصاً عالم اسلام کو اس وبا سے نجات دلا دے۔ الٰہی آمین!

آخر میں عید الفطر کی پیشگی مبارک باد بھی دیتے چلیں جو رمضان کے روزوں کا خوب صورت اور ایمان افروز انعام ہے..... اور جو صبر و شکر، رواداری، اخوت و مساوات کا پیغام ہے۔ جب بلاتفریق تمام مسلمانانِ عالم اپنے رب کے حضور شکرانہ ادا کرتے ہیں.....

اللہ پاک ہم سب کو حقیقی معنوں میں خوشیوں، مسرتوں اور رونقوں بھری عیدیں کرنا نصیب ہو۔ الٰہی آمین!

مدیرہ

نزہت اصغر

اور نہ تم ان میں سے ہونا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۹۵) یقیناً وہ لوگ جن پر تمہارے پروردگار کی بات (کہ وہ کافر ہی رہیں گے) سچی ثابت ہو چکی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (۹۶) جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس ہر نشانی آجائے۔ (۹۷) پس کوئی بستی ایسی نہیں ہوئی کہ وہ (عذاب کو دیکھ کر) ایمان لائی ہو تو اس کو اس کے ایمان نے کوئی فائدہ دیا ہو سوائے یونس کی قوم کے، کہ جس وقت وہ ایمان لائے ہم نے دنیا کی زندگانی میں ان سے رسوا کرنے والا عذاب ہٹا دیا۔ اور ایک مدت تک ہم نے انہیں فائدہ پہنچایا۔ (۹۸) اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے زمین میں ہیں ضرور سب کے سب ایمان لے آتے۔ پس کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے یہاں تک کہ وہ مومن ہو جائیں۔ (۹۹) حالانکہ کسی نفس کے لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر اذن خدا ایمان لے آئے۔ اور وہ (کفر کی) پلیدی کو انہی لوگوں پر قرار دیتا ہے، جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (۱۰۰) کہہ دو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے (غور سے) دیکھو۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں ان کو نشانیاں اور ڈرانے والے کچھ کفایت نہیں کرتے۔ (۱۰۱) پھر کیا وہ ایسے دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسا کہ ان لوگوں کے دن تھے جو اُن سے پہلے گزر گئے ہیں۔ کہہ دو پس تم انتظار کرو۔ یقیناً میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (۱۰۲) پھر ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے نجات دیں گے۔ (۱۰۳) اسی طرح سے ہم پر حق ہے کہ ہم مومنوں کو نجات دیں۔ (اے رسول) کہہ دو اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں شک میں ہو، پس میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ لیکن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہوں، جو تمہیں (دنیا سے) پورا، پورا لے لیتا ہے۔ اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں مومنوں میں سے ہی رہوں۔ (۱۰۴) اور یہ کہ تو حنیف (یعنی باطل سے ہٹنے والا) ہو کر دین کی طرف اپنے منہ کو قائم رکھ۔ اور تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہونا (۱۰۵) اور تو نہ پکار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایسی چیز کو جو تمہیں نہ نفع پہنچائے اور نہ نقصان دے۔ پس اگر تم نے ایسا کیا تو تم یقیناً ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (۱۰۶) اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو سوائے اس کے اس کا دور کرنے والا کوئی نہیں۔ اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو دور کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے فیض پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (۱۰۷) کہہ دو کہ اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے حق آچکا ہے۔ پس جو ہدایت اختیار کر لیتا ہے تو وہ صرف اپنے ہی نفس کے لیے ہدایت اختیار کرتا ہے۔ اور جو گمراہ ہو جاتا ہے وہ صرف اپنے ہی فیض کے وبال کے لیے گمراہ ہوتا ہے اور میں تم پر نگراں نہیں ہوں۔ (۱۰۸) اور جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے تو اسی کی پیروی کرتا رہ اور صبر کرتا آنکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۱۰۹)

(سورۂ یونس ۱۰ پارہ ۱۱ آیات ۹۵ تا ۱۰۹)

bklibrary.com

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

سَیِّدُنَا نَجِیّ اللہ ﷺ

سید کونین، ختم المرسلین، افضل الانبیا رحمت اللعالمین حضرت محمدؐ کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا نجی اللہ ﷺ بھی ہے جس کے معنی و مفہوم: اللہ کے رازدار کے ہیں۔

1۔ القرآن: ترجمہ: ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی (۱۷)
انہوں نے اپنے پروردگار کی کتنی ہی بڑی نشانیاں دیکھیں (۱۸)
(سورۂ نجم آیت ۱۸۔۱۷)

2۔ الحدیث: ۱۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ ''بے شک میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ کچھ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان... چرچراتے ہیں کیونکہ ان پر چار انگشت جگہ بھی ایسی نہیں ہے کہ جہاں کسی فرشتے نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی پیشانی سجدے میں نہ رکھی ہو۔ خدا کی قسم! میں جو کچھ جانتا ہوں اگر تم بھی جانتے تو یقیناً بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے اور فرشِ زمین پر لذتوں سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دیتے اور باری تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرتے ہوئے ضرور جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ اس کے بعد فرماتے۔ ''کاش میں درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔'' (ترمذی)

۲۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''قسم اللہ عزوجل کی کہ میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور سب سے زیادہ اس کا خوف رکھنے والا ہوں۔''
(بخاری و مسلم)

3۔ الوانے: آپؐ کی روح اس حقیقتِ کبریٰ سے معمور تھی۔ یہ بالکل فطری عمل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ظلمت اور ہلاکت سے بچا کر اس حقیقت عظمیٰ کا انکشاف کرنے پر مامور کر کے عزت سے سرفراز فرمایا تھا۔ آپؐ اپنی روح اور حقائق کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تھے۔ رازِ ہستی آپؐ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ آپ کا وجود وہم و گمان سے ماورئ اور صفاتِ ایزدی کا پرتو تھا۔ اس پُرخلوص انسان کی نداہاتف غیب کی آواز تھی۔ جسے لوگ انتہائی توجہ اور انہماک سے سنتے تھے اور انہیں سننا بھی چاہیے تھا کیونکہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز ہیچ تھی اور آج بھی ہیچ ہے۔
(تھامس کارلائل)

4۔ الفضائل: ۱۔ جو شخص ۱۲۸ مرتبہ صبح شام اس اسم پاک ''سیدنا نجی اللہ'' کا ورد کرے گا اس پر اسرارِ الٰہی منکشف ہوں گے۔

۲۔ جو کوئی یہ چاہے کہ اس کی سمجھ و فہم و عقل میں اضافہ ہو تو وہ ہر نماز کے بعد 50 مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ لیا کرے۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوارِ اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو

افشاں آفریدی

یہ دنیا دار العمل ہے، جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔ جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا نہ بھلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر...

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

Ayesha

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ اسٹڈی میں دُرِ مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آجاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آجاتا ہے زاویار کو دیکھ کر دُرِ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ عینی، دُرِ مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ دُرِ مکنون کے خوف اور دحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں۔ دادی، عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو دُرِ مکنون کی میڈیکل فائل زوہا کے ذریعے دے دی ہے۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے تو درِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ ردا کی شادی میں سائرہ بیگم، درِ مکنون کو ایک فیملی سے ملواتی ہیں رخصتی کے بعد آصف اپنی پھپو کو ائرپورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوہا کے ساتھ گھر آجاتا ہے، سیڑھیوں پر درِ مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی کے کمرے کا دروازہ بجا ڈالتا ہے۔ ماسٹر کی سے جب وہ لوگ دادی کا کمرا کھولتے ہیں تو دہشت زدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ دُرِ مکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب اوندھے منہ پڑی تھی۔ عکرمہ جب اسپتال سے گھر آتا ہے تو واچ مین اسے اظہار صاحب کا گولڈ پلیٹڈ پسٹل کی شکل کا لائٹر لاکر دیتا ہے کہ کل گیٹ کے پاس گرا ہوا تھا۔ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ دُرِ مکنون کو کومہ میں گئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ مظفر شیرازی بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں تو دادی کہتی ہیں کہ ڈاکٹر تو پُرامید ہیں جب وہ صحت یاب ہو کر آئے گی تو جشن صحت منائیں گے اور اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ مظفر صاحب کے پوچھنے پر دادی سیف کا نام لیتی ہیں تو مظفر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دُرِ مکنون ان کی اور سائرہ شیرازی کی سگی بیٹی ہے۔ عکرمہ بھی یہ بات سن لیتا ہے۔ دادی کہتی ہیں کہ انہیں درِ مکنون کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ ان کی ہے۔ نہیں جانتی تھیں کہ یہی سچ ہے۔ جب سے اسے درِ مکنون سے اپنے اور اس کے رشتے کا پتا چلا تھا وہ اور بھی زیادہ ذمے دار ہو گیا تھا کہ وہ اس کی سگی چچازاد تھی۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب کو بتا دیتا ہے کہ درِ مکنون اس کا انتخاب ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کے درِ مکنون سے شادی کے فیصلے پر بہت سیخ پا ہوتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ردا کو آصف سے طلاق دلوا کر عکرمہ سے شادی کر دیں۔ دادی نے زوہا کو بلا کر درِ مکنون تک عکرمہ کا پروپوزل پہنچوایا تو دُرِ مکنون انکار کر دیتی ہے۔ عکرمہ، درِ مکنون سے بات کر کے اسے اس رشتے پر کنونس کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ سوچتی ہے کہ اس کا انکار بہتر ہے۔ طاہرہ بھی درِ مکنون کو سمجھاتی ہیں تو وہ عکرمہ سے رشتے کے لیے ہاں کر دیتی ہے۔ عکرمہ کا بھائی عبید آرہا تھا تو عکرمہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ دُرِ مکنون سے معافی مانگتا ہے تو درِ مکنون، عکرمہ کو اپنے اور زاویار اور اپنے ماضی کے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ زاویار، درِ مکنون کی دوست عینی کا بھائی تھا عینی اور دُرِ مکنون اس سے پہلے ایک پروجیکٹ میں مدد لیتی ہیں اور پھر وہ ان کے کلس میں ایڈمشن کے لیے ان کی تیاری کرواتا ہے، زاویار، درِ مکنون کو پسند کرنے لگتا ہے۔ صوفیہ (درِ مکنون کی ماں) مکرم صاحب کی چھٹی بیٹی تھی جو ان کی دوسری بیوی سے تھی ان کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔ جن میں دو پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ ان کو اولادِ نرینہ کی خواہش نے دوسری شادی پر مجبور کیا لیکن دوسری بیوی سے بھی بیٹی ہوئی تو مجبوراً دل کو سمجھا لیا۔ چار بیٹیوں کی شادی کے بعد ان کی (پہلی بیوی کی) سائرہ اور صوفیہ ہی رہ گئی تھیں۔ شادی کے لیے جب زاہد علی نے اپنی والدہ کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا جو اس کالونی میں نئے، نئے شفٹ ہوئے تھے۔ زاہد علی کی والدہ نے جب مکرم صاحب کی بیٹیوں کو دیکھا تو سوچا کہ زاہد علی نے سائرہ کو ہی پسند کیا ہوگا اور ان کے لیے رشتہ ڈال دیا جو قبول ہو گیا۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ سب سے چھپ کر اپنے دوست مظفر کے ساتھ ان کے گھر گئے تو دلہن کو دیکھ کر حیران ہو گئے انہوں نے صوفیہ کو پسند کیا تھا۔ انہوں نے شادی سے انکار کیا تو مظفر کی والدہ نے ان کے لیے سائرہ کا رشتہ دیا جو قبول کر لیا گیا لیکن سائرہ کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔ سائرہ کی لگاتار چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے ایک پیدائش کے فوراً بعد انتقال کر گئی اب اتنے

pklibrary.com

سال بعد صوفیہ اور سائرہ دونوں امید سے ہوگئیں۔ صوفیہ کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اس بار وہ خوش تھیں کہ خدا نے ان کی گود ہری کی لیکن جب ان کے مردہ بچے نے جنم لیا تو مظفر نے اپنی بیٹی (دُرِّمکنون) صوفیہ اور زاہد علی کی گود میں ڈال دی۔ اس بات سے صرف زاہد علی اور مظفر ہی باخبر تھے۔ دُرِّمکنون اپنی دوست صباحت کی منگنی کی شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو ٹیکسی خراب ہوجاتی ہے تو ٹیکسی والا اسے راستے میں ہی اتار دیتا ہے۔ وہاں زاویار آجاتا ہے وہ اس کے ساتھ جاتی ہے وہ راستے میں اسے پروپوز کرتا ہے...... ایک جگہ زاویار کولڈ ڈرنک لینے کے لیے رکتا ہے ان کے پیچھے کچھ بدمعاش لگ جاتے ہیں جو اسلحے کے زور پر درمکنون کو اغوا کرلیتے ہیں اور زاویار موت کے خوف سے اسے ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ عبید اور سدرہ بچوں سمیت کراچی آگئے تھے۔ درمکنون، طاہرہ کے ساتھ ایک کاؤنسلنگ نشست میں جارہی تھی۔ درمکنون، سدرہ، عبید اور عکرمہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو واپسی پر زاویار کو شیرازی ولا کے باہر دیکھ کر ڈسٹرب ہوتی ہے لان میں آصف اور ردا کی آوازیں اسے گھٹن کا احساس دلاتی ہیں لاؤنج میں جانے لگتی ہے تو سائرہ بیگم کی ناگوار باتیں اس کے کان میں پڑتی ہیں۔ طاہرہ، درمکنون کو کہتی ہیں کہ قرآن کی ہر آیت ہمیں وعظ و نصیحت کرتی ہے اگر ہم سننا چاہیں تو...... آصف گھر چھوڑ کر کسی کو بھی بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا اور اس سب کی ذمے دار سائرہ بیگم، دُرِّمکنون کو ٹھہراتی ہیں۔ عکرمہ، ردا کو تسلی دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ آصف کے سامان میں سے ایک ٹریولنگ ایجنسی کا بل نکلتا ہے جس سے ان لوگوں کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ وہ لندن گیا ہے۔ دادی کی باتوں سے اسے سائرہ شیرازی کی نفرت اور عناد کی صحیح وجہ معلوم ہوئی۔ سائرہ بیگم چاہتی ہیں کہ عکرمہ اور دُرِّمکنون کی شادی ابھی نہ ہو لیکن کوئی بھی شادی ملتوی کرنے کے حق میں نہیں ہوتا۔ آصف کا میسج آتا ہے، ردا کے پاس کہ عکرمہ اور درمکنون کی شادی انجوائے کرنا۔ عکرمہ، ردا کو یقین دلاتا ہے کہ وہ جلد آصف کو ڈھونڈ کر لائے گا۔ سائرہ بیگم، افروزہ سے بات کرتے ہوئے درمکنون کو سنانے کے لیے کہتی ہیں کہ اگر صوفیہ آج ہوتی تو میں اس سے عکرمہ کو مانگ لیتی...... لیکن اب کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات سن کر دُرِّمکنون، عکرمہ سے بات کرنے جاتی ہے مگر کر نہیں پاتی۔ سائرہ بیگم، دادی کو بتاتی ہیں کہ آصف نے ردا کو ایک طلاق بھیج دی ہے اور درمکنون سے کہتی ہیں کہ جب تم یہاں آئی تھیں تو ہر فرد نے تمہیں خوش کرنے کے لیے، بہت کچھ کیا، آج تمہیں اس مشکل وقت میں ردا کا خیال کرنا ہے۔ ان کی باتوں کے زیرِ اثر درمکنون خواب میں بھی دیکھتی ہے میمی خالہ کے مطالبے پر ماما انہیں مایوس نہیں کرتیں، وہ چونک کر اٹھ جاتی ہے۔ طاہرہ آنٹی کی ہدایت پر وہ اور عکرمہ درس لے رہے تھے۔ نکاح کے بعد سب باہر چلے جاتے ہیں تو سائرہ بیگم، دُرِّمکنون سے کہتی ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں...... عینی کا فون آتا ہے تو عکرمہ، درمکنون کی اس سے بات کرواتا ہے، عینی اسے بتاتی ہے زاویار کا نکاح ہورہا ہے، شیری سے۔ وہ رخصت ہو کر شیرازی ولا آتی ہے تو اس کے محسوسات مختلف تھے۔ عکرمہ، مظفر صاحب کو یقین دلاتا ہے کہ دُرِّمکنون کو خوش رکھے گا۔ عکرمہ، درمکنون کو للی فلاورز کا بوکے دیتا ہے اور گفٹ دیتا ہے تو درمکنون گفٹ کے بجائے ایک وعدہ لیتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے گا اور وہ بھی بہت جلد۔ عکرمہ کہتا ہے کہ میں آپ کو رشتہ نبھانے کے لیے فورس نہیں کروں گا لیکن بدلے میں آپ مجھ سے دوبارہ یہ مطالبہ نہیں کریں گی۔ سائرہ بیگم کی طبیعت اسی رات خراب ہوجاتی ہے آصف نے دوسری طلاق بھیجی تھی وہ سب سائرہ بیگم کے لیے پریشان ہوتے ہیں اور ان کو اسپتال لے جاتے ہیں تو عکرمہ اور دُرِّمکنون بھی جاتے ہیں۔ ایمرجنسی میں ان کا کچھ ٹریٹمنٹ ہوتا ہے اور پھر افروزہ کی بہن مہناز کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتی اور سائرہ بیگم سے کہتی ہیں کہ تم نے بہت اچھے وقت کا انتخاب کیا ہے۔ ڈاکٹر، عکرمہ سے کہتی ہیں کہ سائرہ کل تک انڈر آبزرویشن رہیں گی۔ دُرِّمکنون شام میں جب اسپتال جاتی ہے تو تنہائی ملتے ہی سائرہ بیگم کہتی ہیں کہ اگر عکرمہ کی شادی اس کی مرضی سے ہوتی تو وہ پوری رات اسپتال میں نہ ہوتا۔ عکرمہ، درمکنون کے چہرے سے جان جاتا ہے کہ سائرہ بیگم نے اسے کچھ کہا ہے وہ کہتا ہے کہ آپ ان کی باتوں کو سیریس نہ لیں۔ جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کرلیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہوجائے۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کرلو...... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کرسکتا۔ عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔ آغا جان، شہرین کے ساتھ زوی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کرلے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔ زاویار باپ سے کہتا ہے کہ شیری کو اس کے نام پر نہ بٹھائیں اسے اس سے شادی نہیں کرنی ہے۔ جس پر

اس کو شہرین کی طرف سے تھینکس کا میسج ملتا ہے تو اسے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ زاویار اور اس کے دوستوں نے آج ایک اغوا شدہ لڑکی کو بازیاب کرایا تھا اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر اس کے گھر والے اسے قبول نہیں کر رہے تھے۔ زاویار، کلثوم کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑتا ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو بتاتی ہیں کہ دُرِ مکنون کی شادی عکرمہ سے ہو رہی ہے تو زاویار بہت اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔ وہ ساحل سمندر پر آتا ہے تو کلثوم اسے فون کرتی ہے وہ فون سن کر ہاسٹل پہنچتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اور وارڈن سرفراز کے منع کرنے کی وجہ سے جانے نہیں دے رہی تو زاویار اسے اسپتال لے جاتا ہے، کلثوم کی ماں اس کی شادی ایک چار بچوں کے باپ سے کرنا چاہتی ہے اور زاویار کو کہتی ہیں کہ وہ اسے یہ شادی کرنے پر راضی کرے۔ سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ بابر زمان کا پتا چل گیا ہے۔ تین سال پہلے اس کے باپ نے ایک لڑکی (درمکنون) کے اس کی نجی جیل سے بازیاب ہونے پر اس پر کیس ہونے کی وجہ سے شوکت زمان نے باہر بھیج دیا تھا اور اب وہ چند ہفتوں میں لاہور آنے والا ہے۔ زاویار لاہور جانے کا ارادہ باندھتا ہے تو سرفراز نے اسے تنبیہ کی۔ زاویار فون کر کے آغا جان سے دو شرطیں رکھتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے کچھ کانٹیکٹس اور کیش دیں گے اور فیملی کو اس بارے میں نہیں بتائیں گے تو وہ لاہور آنے کے لیے تیار ہے اس پر آغا جان شیری سے شادی کا کہتے ہیں۔ زاویار، عاصمہ، مہران اور مومنہ کو بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ابرڈ جانا چاہتا ہے اور اس سے پہلے وہ لاہور جائے گا کیونکہ پاپا اور آغا جان بہت بلا رہے ہیں۔ عاصمہ اسے جانے کی اجازت تو دیتی ہیں لیکن سوچتی ہیں کہ نہ جانے کیا سوچا ہے زاویار نے اپنے دل میں..... سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ وہ کلثوم سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے نتاشا اسے چھوڑ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔ سرفراز، زاویار کو تنبیہ کرتا ہے کہ بابر زمان اور شوکت زمان بارسوخ اور خطرناک لوگ ہیں وہ کسی بھی طرح قانون شکنی نہ کرے۔ زاویار، سرفراز سے کہتا ہے کہ اس کی خالہ میرج بیورو چلاتی ہیں وہ کلثوم کے لیے کسی رشتے کی بات کرے گا۔ زاویار کالاہور میں استقبال اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا تھا۔ رات میں زاویار باہر نکل جاتا ہے تو شیری پریشان ہو کر اسے فون کر کے واپس بلاتی ہے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گناہ کا سرزد ہو جانا بشریت ہے اور تائب ہو جانا انسان کو ولیوں کے درجے تک لے جاتا ہے۔ آغا جان کی اچانک طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کی طبیعت تھوڑی... بہتر ہوتی ہے تو عینی، زاویار سے کہتی ہے کہ اسے دُرِ مکنون کی شادی میں لے جائے تو وہ کہتا ہے کہ آغا جان کو اس حالت میں چھوڑ کر میں نہیں جا سکتا۔ زاویار، آغا جان سے ملنے جاتا ہے تو وہ اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ زاویار کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں تو میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ سب زاویار کے ہاں کہنے سے خوش ہوتے ہیں تو شیری کہتی ہے کہ میری رضامندی کی کوئی اہمیت نہیں۔ زاویار کہتا ہے کہ میں آغا جان کے لیے اس فیصلے پر راضی ہوں اگر تم راضی نہیں ہو تو تم انکار کر دو۔ ابا (کامران صاحب) شیری کو بلا کر کہتے ہیں کہ ہم اس رشتے پر راضی ہیں اس لیے تم سے نہیں پوچھا لیکن تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قبول ہے تو شیری کچھ کہہ نہیں پاتی اس کے سر جھکانے پر کامران صاحب اسے دعائیں دیتے۔ کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ زاویار کے شیری سے نکاح کے بعد وہ سب لوگ آغا جان سے ملنے اسپتال جاتے ہیں اور وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں وہاں سے وہ سب باہر کھانا کھانے چلے جاتے ہیں جہاں عینی، دُرِ مکنون کی شادی کی تصویریں دکھاتی ہیں سب کو جوزار ابھائی نے بھیجی تھیں۔ وہ لوگ گھر واپس آتے ہیں تو زاویار کا کمرا کچھ چیزیں تبدیل کر کے سجا دیا گیا تھا۔ زاویار نے دُرِ مکنون کو جو رنگ دی تھی اور اس نے واپس کر دی تھی وہی رنگ وہ شیری کو دیتا ہے، وہ اسے بہت پسند آتی ہے۔ خواب میں درمکنون کو روتا دیکھ کر زاویار اٹھ جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ آج وہ شیری کے سامنے عیاں ہو گیا ہے۔ خولہ، فون پر زاویار کو مبارک باد دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ولیمہ آرام سے کرنا تاکہ سب آسکیں۔ سرفراز، زاویار کو مبارک باد دیتے آتا ہے اور بتاتا ہے بابر زمان اگلے ہفتے نہیں اگلے مہینے آرہا ہے۔ وہ کلثوم کا خط زاویار کو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی خالہ نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ کلثوم کا خط پڑھ کر زاویار کو ایک دفعہ پھر دُرِ مکنون کا خیال آتا ہے۔ ایک دم شہرین کمرے میں داخل ہوتی ہے تو وہ اسے جائیز چلنے کا کہتا ہے۔

اب آگے پڑھیے.....

قسط نمبر 26

خالی گلاس اس کے ہاتھ سے نہ جانے کیسے چھوٹ کر گرا اور چکنا چور ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر کانچ سمیٹنا چاہے تو بے احتیاطی کے باعث ہتھیلی میں کرچیاں گھس کر اسے زخمی کر گئیں۔ یک دم خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے زخم کو دبا کر خون روکنے کی کوشش کی مگر کٹ گہرا لگا تھا۔ خون رک نہیں رہا تھا۔ ابھی وہ بینڈیج کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سے دستک کے بعد ذرا توقف سے عکرمہ اندر داخل ہوا۔

''ارے یہ کیا..... ہاتھ کیسے کٹ گیا آپ کا؟'' وہ لپک کر نزدیک آیا تھا۔

''وہ..... ان فیکٹ گلاس ٹوٹ گیا تھا اور میں.....''

''دکھائیں مجھے۔'' عکرمہ نے اس کا ہاتھ دیکھنا چاہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں اٹس اوکے۔ ابھی رک جائے گا خون۔'' اس نے بائیں ہاتھ کو کچھ اور بھی مضبوطی سے جکڑ لیا۔

''بیوقوفی کی باتیں مت کریں۔ ہٹائیں ہاتھ۔'' اب کے عکرمہ نے زبردستی اس کا حنائی ہاتھ پکڑ کر زخم جانچا اور خون روکنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تو وہ باتھ روم سے آفٹر شیو لوشن اٹھا لایا۔

''نہیں پلیز۔ اس سے بہت جلن ہوگی۔'' دُرِ مکنون آفٹر شیو لوشن دیکھتے ہی روہانسی ہوگئی تھی۔

''ہاں مگر خون رک جائے گا اور زخم میں سپٹک بھی نہیں ہوگا۔'' اس کے چہرے پر بچوں کی طرح خوف اور آنکھوں میں نمی دیکھ کر عکرمہ نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''کم آن دُرِ مکنون۔ بی بریو۔ یہ کیا آپ بچوں کی طرح واویلا کر رہی ہیں۔ ہاتھ ادھر کریں۔'' اس بار ذرا سختی سے کہا تو وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

اور پھر عکرمہ نے لوشن زخم پر ڈالا تو وہ بچوں کی طرح ہی رونے لگی۔ عکرمہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

اور اگلے لمحے اسے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ آنسو اس زخم کی وجہ سے نہیں بہے بلکہ ان الفاظ کے باعث بہے ہیں جو ابھی وہ سائرہ بیگم کی زبانی سن کر آئی ہے۔ کیونکہ جب سے وہ ولی کی کال سن کر واپس کمرے میں آیا تھا اس وقت سے لے کر اب تک دُرِ مکنون کے چہرے پر گہرے اضمحلال کے سائے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھر آتے ہی اوپر جا کر کمرے میں بند ہوگئی تھی۔

خون رکتے ہی اس نے فرسٹ ایڈ باکس لا کر اس کے ہاتھ پر بینڈیج کرنی شروع کی۔ ساتھ، ساتھ سرزنش بھی جاری تھی۔

''حد کرتی ہیں آپ بھی۔ آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ معلوم ہے ناں کہ ہاتھوں سے کرچیاں سمیٹنے سے ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں۔''

''تو پھر ''آپ'' کیوں کر رہے ہیں ایسا؟'' دُرِ مکنون کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا جس پر عکرمہ کا ہاتھ لمحے بھر کے لیے تھما تھا۔

''میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔ یہ محض وہم ہے آپ کا۔'' جواب میں وہ کچھ ایسی ہمت پست کر دینے والے لہجے میں بولا کہ دُرِ مکنون خاموش ہوگئی۔ ذرا دیر بعد عکرمہ نے دوستانہ مسکراہٹ سمیت اس کی طرف نظر اٹھائی تو اسے اپنی جانب بغور دیکھتا پایا۔

''کیا ہوا..... کیا سوچ رہی ہیں؟'' نظریں ملنے پر بھی دُرِ مکنون ایسے ہی پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتی رہی تو اس نے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ سے گھن نہیں آتی۔ نفرت محسوس نہیں ہوتی؟'' بہت غیر متوقع اور تلخ سوال کر ڈالا تھا اس نے۔

عکرمہ کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم سنجیدگی میں تبدیل ہوگئی۔

''کیوں، ایسی کیا برائی ہے آپ میں کہ آپ سے نفرت کی جائے۔'' کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے پہلے بینڈیج مکمل کی اور پھر فرسٹ ایڈ باکس بند کر کے رسانیت سے سوال کیا۔

''کوئی اچھائی بھی تو نہیں ہے۔ مجھ جیسی لڑکی.....''

''سب سے پہلے تو آپ اپنے آپ کو اس خود ترسی..... سے باہر نکالیں دُرِ مکنون اور اتنی تنگ نظری سے خود کو دیکھنا بند کریں۔'' پتا نہیں وہ کیا کہنے جا رہی تھی کہ عکرمہ نے یک دم اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

''اگر ہمارے لباس پر کوئی داغ دھبا لگ جائے تو کیا ہم اسے کاٹ کر لباس سے الگ کر دیتے ہیں؟'' وہ سوال کر رہا تھا۔

''نہیں..... بلکہ ہم اسے صاف کر کے دوبارہ استعمال کے لائق بنا لیتے ہیں۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں دُرِ مکنون۔ اگر مجھ میں کوئی کمی ہوگی تو کیا آپ مجھ سے نفرت کریں گی؟ مجھ سے گھن کھائیں گی؟''

''آپ کی بات الگ ہے۔ آپ مرد ہیں۔''

''تو کیا مرد کو سو خون معاف ہوتے ہیں؟'' اس نے ایک بار پھر قطع کلامی کی تو دُرِ مکنون نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر

اسے دیکھنے لگی۔
''ہاں اسے معاف ہوتے ہیں جبکہ عورت تو مظلوم و مقتول ہو کر بھی بہتان سے محفوظ نہیں رہتی۔'' اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔
عکرمہ نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔
''مگر میں ان ناانصاف انسانوں میں سے نہیں ہوں۔ جو قصور آپ کا نہیں ہے۔ اس کے لیے کیوں خود کو الزام دیتی ہیں آخر اس خودترسی کے طوق کو گلے سے اتار کر آپ خود کو آزاد کیوں نہیں کر لیتیں دُرِمکنون۔''
''مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔ میں اپنے آپ کو معاف کر سکتی ہوں نہ خود کو آپ کے لائق سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے آپ سے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ غلط کر دیا میں نے۔ سب غلط ہو گیا مجھ سے۔''
عکرمہ کے سوال کے جواب میں وہ بولی تو بیچارگی اور پچھتاوے سے بھرپور جملے نکلے تھے اس کے لبوں سے اور پھر یک دم وہ اس سے ہاتھ چھڑا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔
عکرمہ کے لیے بہت غیر متوقع حرکت تھی یہ۔ وہ کتنی ہی دیر اپنے ہاتھوں پر دُرِمکنون کے خون کی سرخ رنگت دیکھتے ہوئے اس کے اس ردِعمل کے بارے میں سوچتا رہ گیا تھا۔

......☆......☆......

چائنیز ریسٹورنٹ سے واپسی پر زاویار اسے آغا جان سے ملانے اسپتال لے گیا تھا۔ حسبِ توقع ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر آغا جان کی آنکھوں میں جیسے دیے جل اٹھے تھے۔ اور یہ وہ روشنی تھی جس سے زاویار کو اپنے دل میں پھیلے اندھیرے کم پڑتے محسوس ہوتے تھے۔
شہرین نے بھی آغا جان کی خوشی کو محسوس کیا تو لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ وہ دونوں کافی دیر خوش گپیاں کرتے رہے اور شہرین خاموش بیٹھی دونوں کو دیکھتی رہی۔ خاص طور پر زاویار کو جس کی آنکھوں میں کبھی تشویش ہلکورے لے رہی ہوتی تو کبھی آسودگی۔
سرفراز سے ملاقات کے بعد سے لے کر اب تک زاویار ایک ناگفتہ بہ سی کیفیت میں گرفتار تھا۔ جسے شہرین اس کے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی محسوس کر سکتی تھی۔
گو کہ واپسی پر بھی وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں چھپی دبیز سوچ واضح تھی۔
''کیا بات ہے زوی۔ جب سے تمہارا دوست تم سے مل کر گیا ہے تم فکر مند لگ رہے ہو، کبھی خوش دکھائی دیتے ہو تو کبھی پریشان۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے سرفراز نے؟'' وہ میک اپ صاف کر کے بیڈ کی طرف آئی تو ایک بار پھر زاویار کو خود میں گم محسوس کیا۔
''ہوں۔'' وہ اس کے بولنے پر اپنے خیالات سے باہر آیا تھا۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ محض وہم ہے تمہارا۔''
''ہم پہلے بھی اچھے دوست رہے ہیں زوی۔ جب صرف کزنز تھے تب بھی اپنی خوشیاں، غم شیئر کرتے تھے۔ اور اب تو ہمارے درمیان ایک اور رشتہ بھی قائم ہو گیا ہے۔ پھر بھی کیا تم مجھے اپنے دل کی بات بتانے لائق نہیں سمجھتے۔'' شہرین سنجیدگی سے کہتی اس کے سامنے رکھے صوفے پر آ ٹکی تھی۔
زاویار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر فکر مندی کے ساتھ، ساتھ شکوہ بھی درج تھا۔
''میں ایسا بالکل نہیں سوچتا شہرین۔ تم دل میں تو ہمات کو جگہ مت دو۔''
''تو پھر ایسا کیوں ہے کہ جب سے سرفراز تم سے مل کر گیا ہے، تم پریشان ہو مگر مجھ سے شیئر نہیں کر رہے۔'' شہرین کو اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہ پا کر اس نے گہری سانس لی۔
''میں پریشان نہیں۔ خوش ہوں ان فیکٹ۔'' اسے احساس تھا کہ وہ زیادہ دیر شہرین کو ٹال نہیں سکتا اس لیے کچھ سوچ کر بولا۔
شہرین کے سوال پر جواباً اس نے کلثوم کا قصہ مختصر کر کے اسے سنایا۔
''ماشاء اللہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے زوی۔'' وہ واقعی دل سے خوش ہو کر بولی اور فخر سے اسے دیکھا جو اب اس کی زندگی کا ساتھی تھا۔ جس کے لیے دل میں اچانک پھوٹ پڑنے والی محبت سے وہ ہار گئی تھی۔

''ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ اسے زندگی کی تمام خوشیاں عطا کرے اور اس کے ہر درد کو مٹا دے''۔ وہ مسکرا کر بولا تھا۔ عجیب تھکن زدہ سی مسکراہٹ تھی اس کی۔ شہرین کو لگا جیسے وہ چشم تصور سے کسی کو دیکھ رہا ہے۔ جیسے یہ دعا اس کے لبوں سے کلثوم کے بجائے کسی اور کے لیے نکلی ہو۔

''آمین، ہم بھی کراچی چلیں گے اس کی شادی میں۔ تم نے معلوم کیا کب ہے شادی''۔

شہرین کے سوال نے ایک بار پھر اسے حقیقت میں دنیا میں لا پٹخا۔

''معلوم نہیں۔'' ہلکے سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے بے خیالی میں جھک کر سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور ٹیبلٹ نکالی تو سامنے بیٹھی شہرین دراز میں رکھی گئی ساری ٹیبلٹس دیکھ کر چونک گئی۔

''یہ کون سی میڈیسن کھا رہے ہو زوی۔ اور یہ تمہاری دراز میں اتنی دوائیاں کون سی ہیں؟'' وہ تحیر سے کہتی ہوئی اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

زاویار نے چونک کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کھٹ سے دراز بند کر دی۔

''کوئی دوا نہیں۔ ٹرنکولائزر ہے۔ میں سکون سے سونا چاہتا ہوں اس لیے۔''

''کیا تم روز ٹرنکولائزر لیتے ہو؟'' اب شہرین نے آگے بڑھ کر سائڈ ٹیبل کی دراز کھول لی تھی۔ زاویار اسے ناگواری سے دیکھ کر رہ گیا۔

''نہیں...... کبھی، کبھی لے لیتا ہوں۔''

''تم نیند کی گولیاں لیتے ہو... تم......؟'' حیرت کے باعث شہرین مزید کچھ بول ہی نہ سکی۔

... میں یہ زاویار ہی تھا جسے جگانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ وہ نیند کا بہت کچا تھا۔ جلدی سونا اس کے بچپن کی عادت ... گھ ... میں خواہ کسی بھی طرح کی کوئی تقریب ہوتی یا خود اس کے امتحان چل رہے ہوتے وہ گیارہ بجے سو جانے کا پکا عادی تھا۔ تب بھی اسے جگانا کوئی آسان کام نہ ہوتا۔

وہ زاویار جس کی نیند کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ آج ٹرنکولائزر کی مرہونِ منت چند گھنٹوں کی نیند سو پاتا تھا۔ اس انکشاف نے اسے حیران کر ڈالا تھا۔

''ہوں...... مگر اس میں اس قدر پریشان یا حیران ہونے والی کیا بات ہے شہرین۔ آخر کو یہ دوائیں انسانوں کے لیے ہی ایجاد ہوئی ہیں۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولا تو وہ خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں مگر لوگ ایسی دوائیں جبھی استعمال کرتے ہیں جب انہیں کوئی پرابلم ہو۔ تمہیں کیا دکھ ہے زوی؟'' شہرین کے لہجے میں تفکر سے زیادہ دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔

زاویار کو لگا وہ زیادہ دیر اس کے آگے ٹک نہ سکے گا۔ اس لیے یک دم اٹھا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے بولا۔

''مجھے کوئی دکھ نہیں شیری۔ آغا جان کی زندگی بچ گئی ہے۔ میری تمہاری شادی ہوئی ہے اور بھی بہت سی خوشیاں مجھے حاصل ہیں۔ تم اس طرح کی باتیں سوچ کر خود کو ڈسٹرب مت کرو۔ خوش رہا کرو۔ جیسے ہمیشہ رہا کرتی تھیں۔'' اس کا گال تھپک کر کہتے ہوئے وہ اس کے پاس سے نکلتا واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ شہرین اسے جاتا دیکھتی رہی اور کل رات اس کے اچانک چیخ پڑنے اور جاگ جانے کا واقعہ اس کی یادداشت میں ایک بار پھر تازہ ہو گیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی بیڈ پر ٹک گئی تھی۔ ذہن تیزی سے کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔

......☆......☆......

... عکرمہ کو بہت کچھ کہہ کر کمرے سے آ گئی تھی مگر اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا اپنی جگہ درست سہی، ... صحیح نہیں تھا۔

... دادی کے کمرے میں ان کے پاس جمع تھے۔ ایک اداس خاموشی نے سب کو اپنے حصار میں لے

رکھا تھا مگر اس کا اظہار کوئی نہیں کر رہا تھا۔ دادی کی خاطر سب خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہے تھے۔

بالآخر عبید اور سدرہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر عکرمہ نے بھی تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے کی راہ لی تو وہ دادی کے پاس اکیلی رہ گئی۔

''چلو جاؤ بیٹا۔ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ سائرہ کل صبح گھر آجائیں گی ان شاء اللہ۔ باقی معاملات بھی مالک کے کرم سے بہتر ہو جائیں گے۔ تم دل پر زیادہ بوجھ مت لینا۔''

''کیسے نہ دل پہ بوجھ لوں دادی؟ میری تو ہر سانس پچھتاوے کے خارزار سے چھل کر نکل رہی ہے۔'' اس نے اداس نظروں سے دادی کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ سائرہ بیگم کی زبان سے نکلے الفاظ اس کے اندر بچھوؤں کی طرح گڑے ہوئے تھے۔

''میں جانتی ہوں بیٹا کہ یہ تمہاری زندگی کا سب سے خوب صورت وقت تھا جو اس دکھ کی وجہ سے دھندلا گیا ہے مگر تم فکر مت کرنا۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دکھائے گا۔'' دادی نے اس کا ماتھا چوم کر محبت اور یقین سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں دادی جان۔ میں بس میمی اور رداباجی کے لیے دکھی ہوں۔ کاش میں ان کی زندگی سے دکھوں کے کانٹے چن سکتی۔'' اس کے لہجے میں حسرت اور شدید دکھ تھا۔

''اللہ سب کا وارث ہے بیٹا۔ ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا جیسے آسانی کا وقت گزر گیا ہے۔'' دادی جان کے لہجے میں یقین اور ایمان کے رنگ پختہ تھے۔

دُرِ مکنون نے رشک سے انہیں دیکھا۔

''کیسے سوچ لیتی ہیں آپ اتنا پوزیٹو۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوتی دادی؟''

''مایوسی تو کفر ہے بیٹا۔ باقی رہ گیا سوچ کا معاملہ، تو اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ہی تو، توکل ہے۔ جب انسان مثبت امید رکھتا ہے تو اللہ کی ذات اسے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ تم بھی اپنی تمام فکریں اس باری تعالیٰ پر چھوڑ دو اور پُرسکون رہو۔'' انہوں نے بردباری سے کہتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔ عکرمہ کے ساتھ وہ جس لہجے میں بات کر کے آئی تھی اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

دادی کے کمرے میں بھی جب تک وہ رہا دُرِ مکنون نے اس کی جانب دیکھنے سے مکمل طور پر احتراز کیا تھا۔ نہ جانے وہ کس موڈ میں ہوگا، یہ خیال اسے سہما رہا تھا۔ اس لیے بجائے کمرے میں جانے کے وہ بیرس پر نکل آئی۔ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بیرس کی ریلنگ تک چلی آئی تھی۔ نیچے لان خاموش تھا۔ اس کی نظر نیچے کی طرف گئی تو ردا کو لان کی سیڑھیوں پر تنہا بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''ردا آپی ابھی تک جاگ رہی ہیں۔'' اسے حیرت ہوئی کیونکہ کل رات سے اب تک وہ سوئی نہیں تھی۔ اس کا دل جیسے ردا کے غم سے بھر گیا۔

''ٹھیک ہی تو پریشان ہیں میمی۔ ردا آپی کا غم انہیں کس طرح چین لینے دے سکتا ہے۔'' اس نے لب بھینچ کر سوچا۔ اور پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے، بنا آہٹ پیدا کیے نیچے کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ نیچے خاموشی تھی، وہ دروازہ آہستگی سے بند کرتی لان کی طرف آگئی۔ ردا خود میں ایسی گم تھی کہ اسے دُرِ مکنون کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ مگر جب وہ اس کے پہلو میں آکر بیٹھی تو وہ اپنے خیالات سے باہر نکلی۔

''ارے۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو دُرِ مکنون؟'' ردا کے انداز میں حیرت اور تفکر دونوں تھے۔

''نیند نہیں آرہی تھی۔ بیرس سے آپ کو دیکھا تو یہاں چلی آئی۔'' اس نے کچھ بے بسی سے کہا تھا۔

''عکرمہ بھائی سو گئے ہیں کیا؟'' ردا نے اب کے اسے گہری نظر سے دیکھا تھا۔

''پتا نہیں۔ شاید۔'' اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔

''تمہیں اس وقت یہاں نہیں، اپنے کمرے میں ہونا چاہیے دُرِ مکنون۔'' اس کے انداز میں ہلکی سی فہمائش تھی۔ دُرِ مکنون نے بے ساختہ ردا کی طرف دیکھا تھا مگر کچھ بول نہیں سکی۔

رکھا تھا مگر اس کا اظہار کوئی نہیں کر رہا تھا۔ دادی کی خاطر سب خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہے تھے۔

بالآخر عبید اور سدرہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر عکرمہ نے بھی تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے کی راہ لی تو وہ دادی کے پاس اکیلی رہ گئی۔

''چلو جاؤ بیٹا۔ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ سائرہ کل صبح گھر آجائیں گی ان شاء اللہ۔ باقی معاملات بھی مالک کے کرم سے بہتر ہو جائیں گے۔ تم دل پر زیادہ بوجھ مت لینا۔''

''کیسے نہ دل پہ بوجھ لوں دادی؟ میری تو ہر سانس پچھتاوے کے خارزار سے چھل کر نکل رہی ہے۔'' اس نے اداس نظروں سے دادی کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ سائرہ بیگم کی زبان سے نکلے الفاظ اس کے اندر بچھوؤں کی طرح گڑے ہوئے تھے۔

''میں جانتی ہوں بیٹا کہ یہ تمہاری زندگی کا سب سے خوب صورت وقت تھا جو اس دکھ کی وجہ سے دھندلا گیا ہے مگر تم فکر مت کرنا۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دکھائے گا۔'' دادی نے اس کا ماتھا چوم کر محبت اور یقین سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں دادی جان۔ میں بس میمی اور رداباجی کے لیے دکھی ہوں۔ کاش میں ان کی زندگی سے دکھوں کے کانٹے چن سکتی۔'' اس کے لہجے میں حسرت اور شدید دکھ تھا۔

''اللہ سب کا وارث ہے بیٹا۔ ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا جیسے آسانی کا وقت گزر گیا ہے۔'' دادی جان کے لہجے میں یقین اور ایمان کے رنگ پختہ تھے۔

دُرِ مکنون نے رشک سے انہیں دیکھا۔

''کیسے سوچ لیتی ہیں آپ اتنا پوزیٹو۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوتی دادی؟''

''مایوسی تو کفر ہے بیٹا۔ باقی رہ گیا سوچ کا معاملہ، تو اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ہی تو، توکل ہے۔ جب انسان مثبت امید رکھتا ہے تو اللہ کی ذات اسے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ تم بھی اپنی تمام فکریں اس باری تعالیٰ پر چھوڑ دو اور پُرسکون رہو۔'' انہوں نے بردباری سے کہتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ سر ہلا کر کمرے سے نکل آئی۔ عکرمہ کے ساتھ وہ جس لہجے میں بات کر کے آئی تھی اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

دادی کے کمرے میں بھی جب تک وہ رہا دُرِ مکنون نے اس کی جانب دیکھنے سے مکمل طور پر احتراز کیا تھا۔ نہ جانے وہ کس موڈ میں ہوگا، یہ خیال اسے سہار رہا تھا۔ اس لیے بجائے کمرے میں جانے کے وہ ٹیرس پر نکل آئی۔ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ تک چلی آئی تھی۔ نیچے لان خاموش تھا۔ اس کی نظر نیچے کی طرف گئی تو ردا کو لان کی سیڑھیوں پر تنہا بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''ردا آپی ابھی تک جاگ رہی ہیں۔'' اسے حیرت ہوئی کیونکہ کل رات سے اب تک وہ سوئی نہیں تھی۔ اس کا دل جیسے ردا کے غم سے بھر گیا۔

''ٹھیک ہی تو پریشان ہیں میمی۔ ردا آپی کا غم انہیں کس طرح چین لینے دے سکتا ہے۔'' اس نے لب بھینچ کر سوچا۔ اور پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے، بنا آہٹ پیدا کیے نیچے کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ نیچے خاموشی تھی، وہ دروازہ آہستگی سے بند کرتی لان کی طرف آگئی۔ ردا خود میں ایسی گم تھی کہ اسے دُرِ مکنون کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ مگر جب وہ اس کے پہلو میں آکر بیٹھی تو وہ اپنے خیالات سے باہر نکلی۔

''ارے۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو دُرِ دی؟'' ردا کے انداز میں حیرت اور تفکر دونوں تھے۔

''نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹیرس سے آپ کو دیکھا تو یہاں چلی آئی۔'' اس نے کچھ بے بسی سے کہا تھا۔

''عکرمہ بھائی سو گئے ہیں کیا؟'' ردا نے اب کے اسے گہری نظر سے دیکھا تھا۔

''پتا نہیں۔ شاید۔'' اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔

''تمہیں اس وقت یہاں نہیں، اپنے کمرے میں ہونا چاہیے دُرِ دی۔'' اس کے انداز میں ہلکی سی فہمائش تھی۔ دُرِ مکنون نے بے ساختہ ردا کی طرف دیکھا تھا مگر کچھ بول نہیں سکی۔

''شیرازی ولا کی خوشیوں کو شاید کسی کی نظر ہی لگ گئی ہے۔ میرے بعد تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مگر تم خود کو کمپوز رکھو دُرّی۔ میں جانتی ہوں کہ تم میمی کے لیے فکر مند ہو۔ لیکن تمہیں عکرمہ بھائی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' ردا کو اپنی بھول کر اس کی فکر پڑ گئی تھی۔ وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

''جی آپی۔ میں بس جانے ہی لگی ہوں۔ مگر اس وقت آپ کے پاس دو منٹ بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔ ردا نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا اور خاموش رہی۔

''آپ پریشان ہیں؟'' کچھ دیر ان دونوں کے مابین خاموشی گونجتی رہی جسے دُرِّمکنون کے سوال نے توڑا تھا۔

''میمی میری وجہ سے ہاسپٹلائزڈ ہیں دری۔ بہت مشکل ہوتا ہے اپنوں کو اپنی خاطر تکلیف میں دیکھنا۔'' ردا کی آواز میں درد گھلا ہوا تھا۔ دُرِّمکنون اس درد کو جھیل چکی تھی۔ اس تکلیف سے آشنا تھی وہ۔

''میمی ٹھیک ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔ ڈاکٹرز نے بہت امید دلائی ہے۔'' اس کے حافظے میں سائرہ کے الفاظ اور ان کا انداز ایک بار اور تازہ ہوا تو لہجے میں اداسی سی گھل گئی۔ ''آپ تھوڑی دیر سو لیں آپی۔ کل رات سے بے آرام ہیں آپ۔''

''اب آرام کہاں دری۔ آصف نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' یک دم ردا کی آواز رندھ گئی۔ ''وہ شخص جس کو سب سے لڑ کر اپنایا تھا وہ آج مجھے اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا۔ کیوں کیا اس نے ایسا...؟'' ردا بیچارگی سے استفسار کر بیٹھی تھی۔

''دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے آپی۔ شاید ان کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔''

''مجبوری..... ہاہ۔'' ردا طنز سے ہنس پڑی تھی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہنسی دُرِّمکنون کا دل اس کی حالت پر بھر آیا تھا۔

''وہ مجبور نہیں سوچنے سے معذور ہو گیا تھا دُرّی۔ وہ میری چاہت کو ہمدردی سمجھتا تھا۔ میں اس سے محبت کرتی تو وہ اسے ترس گردانتا۔ جب ہم کسی سے محبت کریں اور وہ اسے سمجھ نہ سکے تو بہت تکلیف ہوتی ہے دُرّی۔'' ردا کے لہجے میں نوحے گھلے تھے جیسے۔

''مجھے، اپنے آپ کو اور اس رشتے کو ایک موقع دے کر تو دیکھیں۔ مجھے یقین ہے آپ کے سارے خدشے غلط ثابت ہوں گے۔'' عکرمہ کی آواز اس کے دل کے ایوانوں میں گونجی تو اسے خود سے نظر چرانا پڑی۔

''محبت کے جواب میں اگر محبت نہ دی جا سکے تو کم از کم اعتماد تو لوٹانا چاہیے مگر آصف سے یہ بھی نہ ہو سکا اور اس نے میرے پیروں تلے سے زمین تک چھین لی۔'' ردا کی بات پر اس کے اندر جیسے کسی تلخ یاد کا راگ سا چھڑ گیا۔

''کیا ایسے مجرم کو معاف کیا جا سکتا ہے آپی؟'' اس کے تصور میں زاویار اور آصف گڈمڈ ہو رہے تھے، دونوں نے ہی محبت کے نام پر دغا دی تھی۔ اس نے کھوئے، کھوئے لہجے میں سوال کیا۔

''محبت کے مجرم کو معاف کرنے کے لیے بہت بڑا دل چاہیے دُرّی۔ اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کی غلطی کی اصل وجہ خود کو قرار دے لیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں قصور ہمارا تھا۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ خود کو تو بہت آسانی سے معاف کر دیتا ہے مگر دوسرے کو نہیں۔''

ردا کا انداز بہت گہرا تھا۔ دُرِّمکنون نے شدید تاسف سے ساتھ بیٹھی ردا کو دیکھا جو کبھی کیسے چہکا کرتی تھی اور آج جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔

''یوں بھی دُرّی جب ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے ناں تو اس میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ غلطی ہماری ضرور ہوتی ہے۔ کبھی بے احتیاطی اور کبھی غیر ضروری اعتماد کی وجہ سے ہم ناقابلِ تلافی خسارے کا شکار ہو جاتے ہیں۔'' ردا نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا تھا۔

''تو کیا جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس میں میری غلطی تھی؟ کیا تھی میری غلطی؟ ماما نے کتنا روکا تھا اس روز گھر سے نکلنے پر، شام کے اذکار پڑھنا بھی یاد دلائے مگر شیطان نے مجھے وہ بھی بھلا دیے، ماما کا کہنا نہ ماننا، یقیناً یہی میری غلطی تھی، میں نے زندگی کے طوفان سے بچنے کے لیے زاویار انصاری کا ہاتھ تھاما اور وہ مجھے ان ہی طوفانوں کے حوالے کر گیا۔ شاید اس پر کیا جانے والا اعتماد ہی میری بے احتیاطی تھی۔'' اس کے اندر جیسے سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

''اگر قصور ہمارا ہی ہو تو پھر کیا کرنا چاہیے آپی؟'' وہ بمشکل ماضی سے حال میں لوٹ سکی۔ ردا کے فقرے نے اس کے

دماغ میں جیسے احتساب کی کھڑکی کھول دی تھی۔

''اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغفار کرنا چاہیے، توبہ کرنی چاہیے۔ میں بھی وہ ہی کر رہی ہوں۔'' ردا بہت دلگرفتہ تھی، اس نے بے اختیار ردا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''ایسا مت سوچیں آپی۔ ضروری تو نہیں کہ انسان پر آئی ہر مصیبت اس کے اپنے گناہوں کی سزا ہی ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے اس کی آزمائش بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ردا کے رنجیدگی سے کہنے پر وہ بے ساختہ بولی تھی۔ ردا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ ہی دُرِ مکنون تھی جو دنوں خاموش رہا کرتی تھی اور آج اس کا انداز اعتماد اور دلیل سے بھرپور تھا۔ ردا نے رشک بھری نظر اس پر ڈالی۔

''اور یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ تکلیف، یہ مصیبت اللہ کی طرف سے آزمائش ہے سزا نہیں؟'' اس کی دلیل کے جواب میں ردا نے استفسار کر ڈالا تھا۔

''طاہرہ آنٹی کہتی ہیں۔ جو پریشانی انسان کو اپنے رب سے جوڑ دے وہ آزمائش اور جو دور کر دے وہ سزا ہے۔'' جواباً اس نے برجستہ کہا تھا۔ ردا اس کی بات پر دھیمے سے مسکرا دی۔

''تم بہت اچھی ہو دُرِ مکنون اسی لیے دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتی ہو۔ شکریہ میرا دل بڑھانے کے لیے۔'' ردا نے پھیکے پن سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

''آپ خود بہت اچھی ہیں آپی۔ میں آپ کے ہر دکھ ہر سکھ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔'' ردا کی بات پر اس نے جیسے فیصلہ کُن انداز میں کہا تھا۔

''تمہیں اب اپنے کمرے میں جانا ہے دُرِ مکنون۔ سب پریشانیاں ذہن سے جھٹک دو۔ کل میمی گھر آ جائیں گی اور شام میں تمہارا ولیمہ ہے۔ چلو شاباش جاؤ۔ جا کر آرام کرو۔''

''اور آپ؟ آپ کیا ساری رات یہیں گزار دیں گی؟''

''کیسے گزار سکتی ہوں میں ساری رات یہاں۔ تم جیسے لوگ گزارنے دیں گے تب ناں۔'' دُرِ مکنون کے تردد کے جواب میں ردا جیسے بے بس سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندازہ تھا کہ وہ اسے ساتھ لیے بغیر ٹلے گی نہیں۔

.....☆.....☆.....

دُرِ مکنون کے آنسو زاویار کے پپوٹوں پر گرے تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس دوران مزید دو آنسو دُرِ مکنون کے رخساروں سے پھسلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آ ٹپکے۔

وہ آنسو تھے یا کھولتے پانی کے چھینٹے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''معاف کر دو دُرِ مکنون۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' زاویار کی رندھی ہوئی تیز آواز نے بستر پر پاس لیٹی شہرین کو جاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آج پھر زاویار وسط رات میں اٹھ بیٹھا تھا۔

''مانتا ہوں کہ تمہارا مجرم ہوں تمہیں برباد کیا ہے میں نے۔ مگر تھک گیا ہوں میں اس طرح اذیت اٹھا، اٹھا کر۔ پلیز سونے دو مجھے۔ میں سالوں سے نہیں سویا ہوں۔'' شہرین نے دیکھا وہ لمبا چوڑا مرد یک دم بلک اٹھا تھا۔

آج وہ پھر یہ بھول گیا تھا کہ اس کے پہلو میں لیٹا وجود حیرت اور دکھ سے ساکت اسے تکے جا رہا ہے۔

دو گھنٹے پہلے وہ بمشکل سو سکا تھا۔ ٹرنکولائزر کا اثر بھی اب نسبتاً کم ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ہائی پوٹینسی کی دو گولیاں لینی پڑتی تھیں تب بھی دو گھنٹے سے پہلے اسے نیند نہیں آتی تھی۔

شہرین نے دیکھا وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھا تھا۔ کتنی ہی دیر ایسے گزری۔ وہ یونہی ساکت تھا۔

''زوی۔ لو پانی پی لو۔'' بہت آہستگی سے اٹھ کر شہرین نے سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی سے بھرا گلاس اس کی طرف بڑھایا تو وہ بری طرح چونک کر مڑا۔

''شیری تم..... آئی مین..... وہ..... میں.....''

''بی ریلیکس زوی۔ تم شاید خواب میں ڈر گئے ہو۔ لو پانی پی لو۔'' زاویار کے چہرے پر تفکر اور پشیمانی کے رنگ پھیل گئے تھے۔

شہرین نے اسے بغور دیکھتے ہوئے بہت نرمی سے کہہ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔

اسے شہرین کی آنکھوں میں ان گنت سوال اور الجھنیں نظر آرہی تھیں مگر وہ بے بس اور لاجواب تھا۔

''اور پانی دوں؟'' گلاس خالی کر کے اس کی طرف بڑھانے پر اس نے زاویار سے پوچھا تھا۔ لہجے میں اب بھی نرمی تھی اور چہرے پر فکرمندی چھلک رہی تھی۔

''نہیں۔'' زاویار نے انگلیاں بالوں میں پھنساتے ہوئے شہرین سے نظر چرالی تھی۔

''اگر تمہیں زیادہ گھبراہٹ ہو رہی ہے تو کھڑکی کھول دوں زوی۔ فریش ہوا تمہارے اعصاب پر اچھا اثر ڈالے گی۔''

اس کے محبت سے لبریز انداز میں کچھ تھا۔ زاویار کو اپنا دل جیسے پگھلتا محسوس ہوا۔

''شہرین! وہ ان فیکٹ.....''

''اس وقت کچھ مت کہو زوی۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ اور ریلیکس کرو۔ ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے۔''

اسے زاویار کی آنکھوں میں تیرتی وحشت میں چھپی ان کہی داستانیں دکھائی دیں تو اسے ٹوک کر بولنے سے روکا اور ہلکے سے اس کے شانوں پر بوجھ ڈال کر اسے لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں زوی۔ تم اسٹریس مت لو۔ بس آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔''

اس کے بالوں میں نرمی سے گردش کرتی شہرین کی انگلیوں نے زاویار انصاری کی زبان کو جیسے تالا لگا دیا۔ کچھ دیر جیسے وہ دل و دماغ میں اٹھتے طوفان کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں موندے رہا مگر جب برداشت نہیں ہوا تو بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔

''اگر میری موجودگی سے ڈسٹرب ہو رہے ہو تو میں کمرے سے باہر چلی جاتی ہوں۔ تم اطمینان سے سو جانا۔''

نہ جانے اس کی آنکھوں اور چہرے پر کیا لکھا تھا کہ شہرین کے لبوں سے بلا ارادہ یہ جملے نکلے، جواب میں زاویار نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے لب خاموش تھے مگر نگاہوں میں گویا التجا تھی۔ شہرین کو لگا جیسے زاویار کی آنکھیں میں دھنسا اترنے لگی ہو۔

''زوی!'' شہرین کے لہجے میں اسے پکارتے ہوئے گویا درد گھلا تھا۔

زاویار انصاری کو لگا اگر وہ چند لمحے اور اس کے سامنے موجود رہا تو اس کا ہر دکھ، ہر اذیت، ہر رنج پگھل کر آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے گا۔

اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے وہ برق کی سی تیزی سے اٹھا تھا اور اس سے پہلے کہ شہرین کچھ کہتی، وہ کمرا چھوڑ گیا تھا۔

.....☆.....☆.....

وہ دھڑکتے دل سے اپنے کمرے کی جانب آئی تھی۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے رہ کر ہمت مجتمع کرتی رہی۔ اس کی سہمی ہوئی دستک کے جواب میں عکرمہ نے ''آجائیں'' کہا تو وہ گہری سانس بھر کر جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

عکرمہ سامنے صوفے پر اطمینان سے بیٹھا لیپ ٹاپ پر تیزی سے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر وہ دوبارہ لکھنے میں مشغول ہو چکا تھا۔ دُرِ مکنون خود میں عجیب سا محسوس کرتے ہوئے دروازہ بند کر کے صوفوں کے قریب چلی آئی۔

''دادی سو گئی ہیں؟'' ذرا دیر بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو ساتھ ہی سوال بھی کر ڈالا۔

''جی شاید۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔'' وہ کچھ گڑبڑا کر بولی تھی۔

''کیوں؟ کیا آپ اتنی دیر سے دادی کے پاس نہیں تھیں؟'' اسے نرم نگاہوں کے حصار میں لیتے ہوئے عکرمہ نے پھر سے سوال داغ دیا تھا۔ دُرِ مکنون کو اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ اس نے تو باقاعدہ باز پرس شروع کردی تھی۔

''نہیں، میں دراصل ردا آپی کے پاس لان میں تھی۔'' سر جھکا کر مجرمانہ انداز میں کہا تو عکرمہ نے گہری سانس بھر کر لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ دیا اور پھر اسے مخاطب کیا۔

''بیٹھیے۔'' اس کے کہنے کی دیر تھی دُرِ مکنون تابعداری سے اس کے مقابل صوفے پر آبیٹھی اور منتظر نظروں سے اسے دیکھ کر نگاہ جھکالی۔ یقین تھا کہ وہ اب کچھ کہے گا۔

''ردا کیسی ہے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''بہت پریشان ہیں۔''

''اور آپ کو اتنی رات گئے اپنے کمرے سے باہر دیکھ کر تو وہ اور بھی پریشان ہوئی ہوگی، ہے ناں؟'' اس کا اگلا سوال برجستہ تھا دُرِ مکنون لاجواب سی اسے دیکھنے لگی تھی پھر پشیمانی سے نظر جھکالی۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا مسز کہ آپ کے اور میرے درمیان تعلقات کی نوعیت خواہ جو بھی ہے وہ صرف آپ کے اور میرے درمیان رہے اور اس کا علم گھر کے بقیہ افراد کو نہ ہو۔'' وہ رسان سے پوچھ رہا تھا۔ دُرِ مکنون نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''خاص طور پر دادی اور چچا جان کو۔ آپ جانتی ہیں ناں کہ آصف کی وجہ سے اس وقت وہ دونوں کس تکلیف اور پریشانی سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں اگر انہیں یہ پتا چلے کہ آپ نے ہماری شادی اور ہمارے رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا تو آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ انہیں کس قدر دکھ پہنچے گا۔ صرف میرے ہی نہیں آپ کے حوالے سے بھی بہت سے ارمان ہیں ان کے، خواہشات ہیں ان کی۔''

''پلیز ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے یک دم نفی میں سر ہلایا تھا۔

''تو پھر کیسی بات ہے۔ آج ہماری شادی کو دوسرا دن ہے اور کل سے اب تک آپ کا جو بی ہیویئر ہے، وہ آپ کی ناپسندیدگی کا کھلا ثبوت ہے۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں، یقین کیجیے یہ پسند یا ناپسند کا معاملہ نہیں ہے۔'' جواباً وہ وفاعی انداز اختیار کر گئی تھی۔

''تو پھر؟'' عکرمہ سوالیہ تھا، دُرِ مکنون لب بھینچ کر بیچارگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ نہیں سمجھیں گے۔''

''آپ سمجھانے کی کوشش تو کریں۔'' عکرمہ برجستہ بولا تھا۔

''کل کوشش کی تو تھی کیا نتیجہ نکلا۔'' اس کے چہرے پر لکھا تھا مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ لب ایک دوسرے میں ایسے پیوست تھے جیسے اب کھلیں گے نہیں۔ اس کی خاموشی پر بالآخر عکرمہ کو خود ہی بولنا پڑا۔

''بہرحال میرا خیال ہے مسز کہ ہمیں اپنے مسئلے اس کمرے میں ہی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جن گھر والوں کو خوش کرنے کے لیے آپ نے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کیا ہے، آپ کے رویّے سے وہ ہی ہرٹ ہوجائیں۔'' عکرمہ کے سنجیدہ لہجے میں سرزنش تو نہیں البتہ نصیحت ضرور تھی، سوال تھا۔

''میں نے نہ چاہتے ہوئے قبول نہیں کیا آپ کو۔'' وہ بری طرح خفت کا شکار ہوئی تھی۔ بے ساختہ بولی بنا سوچے سمجھے۔

''تو گویا دل سے کیا ہے؟'' عکرمہ نے بنا توقف سوال کر ڈالا تھا۔

''پلیز مجھے پزل مت کیجیے۔'' دُرِ مکنون نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھ کر کہا تو وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''او کے نہیں کرتا پزل۔ مگر پلیز آپ گھر والوں کے سامنے میرا اور اپنا بھرم رکھنے میں میرا ساتھ دیں۔'' وہ سمجھا رہا تھا اسے۔ دُرِ مکنون جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔

''آئی ایم سوری۔'' بمشکل زبان سے نکلا۔ اس کے انداز میں کچھ تھا، عکرمہ کے چہرے پر نرم مسکراہٹ اتر آئی۔

''اچھی بات ہے۔ البتہ اپنی اس سوری کی expiry date چیک کر لیجیے۔ کہیں کل شام تک expire نہ ہو جائے۔'' وہ قدرے شوخی سے بولا تو دُرِ مکنون نے پہلے تو نہ سمجھنے والے انداز میں سر اٹھا کر سوالیہ نظریں اس پر ٹکائیں اور جب بات سمجھ میں آئی تو زچ ہو کر تیکھے تیوروں سے اسے دیکھا۔

''اس وقت ٹپیکل بیویوں والے تیوروں سے گھور رہی ہیں مجھے۔ پھر کہتی ہیں کہ کسی دوسری خاتون کے بارے میں سوچوں۔'' عکرمہ کا شوخ انداز اس کے اس طرح دیکھنے پر عود آیا تھا۔

''بیوی والے تیوروں کا بہت تجربہ ہے آپ کو۔'' اس بار دُرِ مکنون کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جھنجلاہٹ تھی جس پر عکرمہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

''تجربہ نہ سہی۔ مشاہدہ تو ہے۔'' بمشکل ہنسی روک کر وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ دُرِ مکنون نے لاجواب ہو کر نظر چرالی۔ کچھ دیر دونوں کے مابین خاموشی گونجتی رہی جس نے دُرِ مکنون کو بے چین سا کر دیا۔

''دوا لے لی تھی آپ نے؟''

''جی۔''

''نیند آ رہی ہے اب؟'' عکرمہ نے پوچھا تھا جس پر یک دم اس کی آنکھوں میں سراسیمگی اتری تھی۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے عکرمہ کی طرف دیکھا جو کچھ سوچتے ہوئے اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی خوفزدہ نگاہوں نے عکرمہ کے احساس کی کمی نہ کو چھوا تھا اس لمحے۔

''یہ آپ کا اپنا گھر ہے دُرِ مکنون۔ کوئی عارضی پناہ گاہ نہیں۔ جہاں آپ خوف اور خدشوں کا شکار رہیں۔ میری بیوی ہیں آپ۔ میں شوہر ہوں آپ کا۔ ڈرائیروں سے جاتا ہے محافظ سے نہیں۔'' اس کی آنکھوں سے جھلکتے خوف نے عکرمہ کو بے ساختہ یہ سب کہنے پر مجبور کیا۔ اس کے چہرے پر لمحے بھر کو سخت تاسف ابھرا تھا۔

''جج..... جی؟'' وہ پشیمانی کے باعث اٹک گئی تھی۔

''آپ تمام اندیشوں کو پسِ پشت ڈال کر اطمینان سے سو جائیں دُرِ مکنون۔ میڈیسن لینے کے بعد زیادہ دیر جاگنا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ مجھے نیٹ سے یہ ڈاؤن لوڈنگ مکمل کرنی ہے۔ جس میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ آرام کریں۔'' عکرمہ کے حلاوت سے پُرسنجیدہ انداز اور لہجے میں بہت کچھ تھا۔

وہ شرمندگی کے باعث کچھ کہنا چاہتی تھی مگر الفاظ نہ سوجھے تو خاموشی سے اٹھ کر بستر کی طرف آ گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی بے اعتباری عکرمہ کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکی ہے۔ اسے گہری ندامت نے چھوا۔

''زخم ٹھیک ہے اب ہاتھ کا؟'' ابھی وہ بیڈ پر دونوں پاؤں لٹکا کر بیٹھی سوچ میں گم تھی کہ اچانک عکرمہ نے سوال کر ڈالا تھا، لہجہ حسبِ معمول نرم تھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''جی بہتر ہے۔''

''اچھی بات ہے، کل صبح ڈریسنگ چینج کر لیجیے گا۔ چلیے اب اچھے بچوں کی طرح فٹافٹ سو جائیں۔ شب بخیر!'' لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے عکرمہ نے گویا بات ختم کی تو وہ گم صم سی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور رضائی ٹھوڑی تک کھینچ لی۔ پھر کتنے ہی لمحے وہ بند پلکوں کی اوٹ سے عکرمہ کو گاہے بگاہے دیکھتی رہی۔ مگر وہ واقعی مصروف تھا۔ اور اسی آنکھ مچولی میں اسے پتا نہیں چلا کہ دوا کے اثر کے باعث کب وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

جس وقت آنکھ کھلی فجر کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کمرے میں نظریں دوڑائیں، عکرمہ وہاں موجود نہیں تھا۔

''یا اللہ۔'' وہ کچھ متفکر سی اٹھ بیٹھی تھی۔ اسی دم باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ عکرمہ واش روم سے نکل رہا تھا۔

تازہ وضو کے باعث اس کے سر کے بال اور چہرہ گیلا تھا۔ دُرِ مکنون نے سکون کی سانس لی اور خود بھی وضو کرنے کے

خیال سے بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''السلام علیکم! صبح بخیر مسز۔'' عکرمہ اسے بیڈ سے اٹھتا دیکھ کر متوجہ ہوا تھا اس کا لہجہ معمول کے مطابق تھا، دُرِ مکنون کے خدشے کے برعکس اس کے انداز میں کسی طرح کی خفگی نہیں تھی۔ اس نے سکون محسوس کیا اور دھیمے سُروں میں وعلیکم السلام کہہ کر واش روم کی جانب بڑھ گئی۔
عکرمہ کا طرزِ تخاطب اور یہ صبح دونوں ہی کس قدر اجلے، اجلے تھے۔ اسے اپنا دل پروں سے بھی ہلکا محسوس ہوا تھا۔ بڑا شگفتہ احساس تھا۔ جس سے نظر چرانا اسے دشوار لگا۔
وہ وضو کر کے باہر نکلی تو عکرمہ مصلیٰ بچھائے سنت رکعت پڑھ رہا تھا، اس کے لیے بھی مصلیٰ بچھا دیا تھا اس نے۔ وہ دوپٹا لپیٹ کر سنتیں پڑھنے لگی۔ سلام پھیرا تو اسے اپنا منتظر پایا۔
''میرے ساتھ جماعت کریں گی؟''
وہ پوچھ رہا تھا۔ دُرِ مکنون نے ایک لمحے کو سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بے اختیار سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس نے عکرمہ کے مصلے کے ساتھ بچھے اپنے مصلے کو دو قدم پیچھے کی طرف سرکا لیا تھا۔
اگلے لمحے وہ عکرمہ کی امامت میں نماز پڑھ رہی تھی اور دل میں اترتے ایک ناگفتہ بہ احساس نے اسے پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ سجدے میں جھکتے ہوئے اس کا روم، روم سجدہ ریز اور احساسِ تشکر سے بھیگا ہوا تھا۔

......☆......☆......

''یا اللہ زوی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔'' اس نے تڑپ کر دعا مانگی تھی۔
زاویار کے کمرے سے اچانک چلے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تو وہ بھونچکا سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی، ذرا دیر بعد حواس بحال ہوئے تو وہ کچھ دیر اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر جب کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ واپس نہ لوٹا تو وہ متفکر سی کمرے سے نکل آئی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ گھر پر نہیں تھا، اقرار چچا کی بائیک بھی پورٹیکو سے غائب تھی۔
بائیک اسے کبھی راس نہیں آئی تھی، کراچی میں ہونے والا ایکسیڈنٹ ابھی شہرین کے حافظے میں تازہ تھا۔ وہ پریشان ہو کر کمرے میں واپس آئی تا کہ اسے فون کر سکے مگر اس کا سیل فون سائڈ ٹیبل پر پڑا منہ چڑا رہا تھا۔
''یا اللہ! اب کیا کروں۔'' اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔'' کتنی ہی بھاری ساعتیں اس نے ٹہل ٹہل کر گزاریں حتیٰ کہ فجر کی اذانیں سنائی دینے لگی۔
''پلیز زوی واپس آجاؤ۔'' اس کا دل پکارا تھا، بے بس ہو کر وہ رو پڑی تھی۔
''یا اللہ، زوی کو بخیریت گھر واپس بھیج دے۔''
پھر یہ شاید اس کی سچی پکار کا نتیجہ تھا یا زاویار کو ہی گھر کا راستہ یاد آ گیا تھا۔ کلک کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا تو اس نے برق کی سی تیزی سے گھٹنوں پر رکھا سر اٹھایا۔
''زوی!'' وہ لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔ ''تم ٹھیک ہو، کہاں تھے تم؟'' بے قراری سے اسے کندھوں سے تھام کر پے در پے سوال کیے تو زاویار لمحہ بھر کے لیے اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔
''جواب کیوں نہیں دیتے، کہاں تھے تم، کچھ اندازہ ہے تمہیں...... کتنا پریشان رہی میں، کیسے برے، برے خیال آ رہے تھے مجھے، اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو مر جاتی میں۔''
اس کی خاموشی پر وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر یک دم رو پڑی تھی۔ اس کے انداز میں کس قدر استحقاق تھا، محبت تھی۔ زاویار انصاری کے دل کو کسی احساس نے چھوا۔
''ٹیک اٹ ایزی شیری۔ اب آ گیا ہوں میں۔'' نرمی سے اس کا سر تھپکتے ہوئے وہ بے طرح شرمندہ تھا۔ اپنی جذباتیت پر پشیمان اس نے بھاری آواز میں کہا تو شہرین بمشکل اپنی سسکیاں روک سکی۔
''کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی کرو گے زوی؟'' شہرین نے درد سے چور انداز میں سوال کیا تھا جو اسے مزید

نادم کر گیا۔

''پلیز شیری! آئی ایم سوری۔''

''ٹرسٹ می زوی، میں عاصمہ مامی یا آغا جان نہیں ہوں، میں ٹوٹ جاؤں گی اس طرح، بکھر جاؤں گی میں۔'' شہرین اس وقت حساسیت کی انتہا پر تھی۔ ایک بار پھر بری طرح رو پڑی تھی۔

''شیری! شیری پلیز یار معاف کر دو اس بار، دوبارہ ایسا نہیں ہوگا، بلیومی۔'' اسے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اسے یاد آیا کراچی اسپتال میں بھی اس نے شہرین کو ایسے ہی حواس کھوتے دیکھا تھا۔

اسے فکرمندی سے تھام کر صوفے پر لا بٹھایا اور پانی کا گلاس لا کر اسے تھمایا تو وہ کھوئی، کھوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ زاویار نے دیکھا چند گھنٹوں میں ہی اس کا جیسے خون نچڑ گیا تھا، وہ آنکھیں جن میں ہمیشہ ستارے چمکتے تھے اس وقت مستقل رونے کے باعث سرخ اور بجھی، بجھی تھیں۔

''پانی پی لو شیری۔'' اسے اپنی طرف اس طرح دیکھتا پا کر اس نے بلا ارادہ کہا تھا۔ دل کا چور اسے نظر چرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر گلاس شہرین کے لبوں سے لگایا تو وہ گھونٹ، گھونٹ پانی پینے لگی مگر نظریں ہنوز اس پر مرکوز تھیں۔ زاویار انصاری کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی کے ساتھ کئی سوال بھی پینے کی کوشش کر رہی ہے۔ جو اس وقت اس کی آنکھوں کے آنسوؤں میں چمک رہے تھے۔ اور جن کے جواب دینا زاویار انصاری کے بس سے باہر تھا۔

.....☆.....☆.....

نماز فجر کے بعد صبح کے اذکار اور قرآن کریم سے دو رکوع پڑھ کر اس نے اشراق کے نفل ادا کیے اور جب مصلے سے اٹھی تو دیکھا عکرمہ بیڈ پر لیٹ کر کب کا سو چکا تھا۔

''یا اللہ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے، انہوں نے مجھ جیسی بے توقیر لڑکی کو میری اپنی نظروں میں، اس گھر میں اور معاشرے میں ایک مقام دلایا۔ مجھے ایسی حکمت عطا کر کہ میں انہیں ردا آپی سے شادی کے لیے قائل کر سکوں۔'' اس دعا کے ساتھ ہی کئی آنسو یک دم اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ اسے اپنے بائیں پہلو میں شدید کسک کا احساس ہوا جسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ اسے علم تھا کہ اس وقت دادی کے سو اسب گھر والے سو رہے ہوں گے، اس لیے آہستگی سے دروازہ کھول کر دادی کے پاس چلی آئی۔

''السلام علیکم، صبح بخیر دادی!'' دادی تلاوت میں مصروف تھیں، اس کی آمد پر سورہ مکمل کر کے قرآن کریم بند کیا تو اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ صبح بخیر دادی کی جان۔'' دادی نے کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا تھا اور پھر گلے سے لگا کر شفقت سے بولیں۔ ''زخم کیسا ہے تمہارا؟''

بہت گہرا ہے، نہ جانے کبھی بھرے گا بھی یا نہیں۔'' اس نے سوچا۔

''بہتر ہے دادی۔'' اس نے ان سے الگ ہوتے ہوئے بے خیالی میں اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا۔

''عکرمہ جاگ رہا ہے؟''

''فجر پڑھ کر سو گئے ہیں۔''

''تم نہیں سوئیں؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، دل چاہا آپ کے پاس آ جاؤں۔''

دادی کے سوال میں عجیب سی کریدتھی، اسے گویا وضاحت دینی پڑی۔

''عکرمہ سے گھبرایا نہیں کرو میری گڑیا۔ وہ بہت نرم دل اور احساس کرنے والا انسان ہے، تمہارا بہت خیال رکھے گا، تم اعتبار کرو اس پر۔'' اس کے جواب پر دادی گہرے لہجے میں بولیں تو اس نے ششدر ہو کر انہیں دیکھا۔

''جج..... جی.....''

''رات تم بہت دیر ردا کے ساتھ رہیں، اچھا کیا۔ میں جانتی ہوں اس وقت ردا کو ہم سب کی محبت، توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے مگر اب تم خیر سے شوہر والی ہو، خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگتی ہے بیٹا، گھر میں سدرہ اور عبید بھی ہیں، مظفر اور دیگر لوگ بھی۔ اگر کوئی رات گئے ایک دن کی دلہن کو یوں لان میں بیٹھا دیکھ لیتا تو کیا سوچتا بھلا۔''

''اُف تو دادی کو بھی پتا چل گیا۔'' اس کا خفت کے باعث نظر اٹھانے کو دل نہ چاہا، کل رات ہی تو یہ سب سمجھایا تھا عکرمہ نے۔

''مظفر میاں تمہارے لیے بہت فکر مند رہتے ہیں دُرِّی بیٹا، تمہیں خوش دیکھنے کے لیے دن رات دعائیں مانگتے ہیں وہ۔ تم سمجھ رہی ہو ناں بیٹا؟'' دادی کے بظاہر سادہ جملوں میں گہرے معنی چھپے ہوئے تھے۔

''میں بہت خوش ہوں دادی یقین کریں۔ بس ردا آپی کو اکیلا بیٹھا دیکھا تو ان کے پاس چلی گئی تھی، ٹرسٹ می دادی۔'' اس نے بے ساختہ ان کے ہاتھ کو اپنی مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے کہا تھا۔ لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہیں سدا خوش و آباد رکھے میری جان۔ میرے عکرمہ کے گھر کی رونق ہو تم، دودھو نہاؤ پوتو پھلو۔'' دادی نے اس کے یقین دلانے پر اس کا ماتھا چوما تو وہ ان کی دعاؤں پر جھینپ گئی۔

''آج سائرہ اسپتال سے واپس آرہی ہیں، عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا، تمہیں تو معلوم ہے کہ ان کا حلقۂ احباب کس قدر وسیع ہے۔ تم جا کر اچھی طرح تیار ہو جاؤ، عکرمہ جاگے تو اسے بنک سک سے تیار بیوی نظر آنی چاہیے، مرد چاہے زبان سے تعریف کرے نہ کرے مگر بیوی کا اس کے لیے سجنا اسے بہت اچھا لگتا ہے، عکرمہ کی تو ویسے بھی کوئی کام کہہ کر کروانے کی عادت نہیں مگر تم ہمیشہ خیال رکھنا بیٹا۔'' اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا تو اس نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔

پھر کافی دیر دادی اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں اور ان کی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا کہ عکرمہ کے ساتھ، ساتھ اسے دادی کے لیے بھی بجنا سنورنا ہے۔ وہ اسے کسی سے کم نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

''عکرمہ نو ابھی سو رہا ہے تمہارے لیے ناشتا بنواؤں؟''

''نہیں دادی ابھی بھوک نہیں۔ جب سب اٹھیں گے تب میں کرلوں گی، البتہ آپ کے لیے ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں، نئی نویلی دلہن ہو تم، اس پر ہاتھ بھی زخمی ہے، کام کرنے کے لیے تو زندگی پڑی ہے۔ ابھی تو بس آرام کرو تم اور خوش رہا کرو۔'' دادی نے اس کے بے دھیانی سے کہنے پر نرمی سے ٹوکا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھتے، اٹھتے رہ گئی۔ اور ان کی محبت پر بے ساختہ ان کے کندھے سے لگ گئی۔

''میں بہت خوش ہوں دادی۔ یقین کیجیے۔''

''اللہ تمہیں خوشیوں کے ساتھ بسائے میری بچی۔'' دادی کی زبان سے ہی نہیں دل سے بھی دعا نکلی تھی۔

''کون جانے یہ خوشیاں بھی کتنے دن کی مہمان ہیں دادی۔ میمی خالہ مجھے بسنے نہیں دیں گی، اتنا یقین ہے مجھے۔'' اس نے گہری سانس بھر کر سوچا تھا اور آنکھوں میں اترتی دھند کو جذب کرنے کی خاطر پلکیں جھپکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چلیں؟''

''میں جا کر کپڑے نکال لیتی ہوں اپنے۔''

''ہاں ضرور۔ ساتھ میں میچنگ جیولری اور نفیس سا میک اَپ بھی کر لینا، دوپہر تک سیلون بھی جانا ہے تمہیں۔''

''جی دادی!''

''سدا سہاگن رہو۔ پیا من بھاؤ۔'' دادی محبت سے بولیں تو وہ ایک بار پھر جھینپ کر کمرے سے نکل آئی۔ دل تو چاہا کہ ٹیرس پر جا کر صبح کی تازہ ہوا لے مگر کل رات عکرمہ اور ابھی دادی سے ملنے والی نصیحتوں نے اسے کسی اور طرف کا رخ کرنے نہ دیا۔

کمرے میں آکر اس نے الماری سے پنک کلر کا سوٹ نکالا جس پر سفید موتیوں کا انتہائی نفیس اور نازک کام بنا ہوا

تھا۔ اس نے اپنے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ عکرمہ کا بھی ایک شلوار قمیص استری کر کے رکھ دیا۔ پھر کپڑے بدل کر بال بنائے، دادی کی خواہش کے مطابق ہلکا سا میک اپ کیا۔

اور ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک نے متوجہ کیا۔ دادی کے ساتھ اصغری ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

''ماشاءاللہ۔'' اسے حسب ہدایت سجا سنورا دیکھ کر دادی نے بے اختیار اس کا ماتھا چوما تھا۔ اصغری کی آنکھوں میں بھی ستائش تھی۔

''بس اسی طرح رہا کرو ہر وقت۔'' دادی اس کی فرمانبرداری پر بہت خوش ہو گئی تھیں، وہ مسکرا کر سر جھکا گئی۔ ''عکرمہ نہ جانے کب اٹھے، تم ہلکا سا ناشتا کر لو، فجر کی جاگی ہوئی ہو۔'' انہوں نے اصغری کو ٹرے اندر لے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

''آپ بھی میرے ساتھ ناشتا کریں دادی۔''

''نہیں، میں دودھ کا گلاس لے چکی ہوں۔ اب سب کے ساتھ ہی ناشتا کروں گی، تم تھوڑا سا کھا لو اور ہاں میچنگ کی کچھ جیولری بھی پہن لینا۔'' وہ ناشتے سے انکار کرتے ہوئے ہدایت دیتی اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے چلی گئیں تو وہ ان کے کہنے پر عمل کرتی جیولری پہن کر صوفے پر آ بیٹھی اور ابھی ناشتا شروع کیا ہی تھا کہ عکرمہ جاگ گیا۔

''اوہ، نو بجنے کو ہیں۔'' وال کلاک پر نظر پڑتے ہی وہ بستر سے اٹھ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ درکمنون کچھ کہتی وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ذرا دیر بعد وہ اس کا استری کیا ہوا گرے شلوار سوٹ پہن کر باہر نکلا تو دُرِ مکنون سینڈوچ اور چائے کو گلے سے اتارنے کی سعی کر رہی تھی۔

''دیر ہو گئی کافی، آپ نے مجھے جگایا نہیں۔ اسپتال پہنچنا تھا مجھے۔''

''سوری، مجھے خیال نہیں رہا۔'' اس کے معذرت خواہ انداز پر عکرمہ نے بالوں میں برش چلاتے ہوئے رخ موڑ کر اس پر نگاہ ڈالی تو لمحہ بھر کے لیے ہٹا نہیں سکا۔ وہ بجی سنوری بہت فریش لگ رہی تھی۔ عکرمہ کے لب آپ ہی آپ مسکرا دیے۔ گویا اس کی نصیحت کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ تاہم اپنا خیال اسی طرح رکھا کریں۔'' اس کے مسکراتے لہجے میں توصیف تھی، دُرِ مکنون کو نظر اٹھانا مشکل لگا۔

''آپ ناشتا کریں گے؟'' اس کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لیے اس نے بے ساختہ کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ عکرمہ اس کے انداز پر مسکرا دیا۔

''ناشتے کے لئے تو ٹائم نہیں ہے۔'' اس نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ ''ہاں البتہ یہ سینڈوچ میں چلتے چلتے کھا سکتا ہوں۔''

دُرِ مکنون کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں رکھا اس کا ادھ کھایا سینڈوچ اس نے یک دم اٹھا لیا تھا۔

دُرِ مکنون اس پیش قدمی اور جسارت کے لیے تیار نہیں تھی۔ حیرت اور بے یقینی سے سامنے کھڑے عکرمہ کو دیکھا جو اس کا جھوٹا کس مزے سے کھا رہا تھا۔

ساتھ ہی اس کی محظوظ ہوتی نگاہیں دُرِ مکنون کا حصار کیے ہوئے تھیں۔ ابھی وہ اس جھٹکے سے سنبھلی بھی نہیں تھی کہ پلیٹ میں رکھا چائے کا مگ جسے وہ آدھے سے زیادہ خالی کر چکی تھی۔ عکرمہ اسے اٹھا کر چند گھونٹوں میں پی گیا۔

''آپ چینی کتنی لیتی ہیں۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''آدھا چمچ۔'' وہ بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ بمشکل بولی۔

''اور میں دو چمچ۔ پھر بھی بڑی عجیب بات ہے مسز آپ کی چائے بہت میٹھی لگی مجھے۔''

''اُف میرے اللہ۔ حد ہے۔'' فرطِ حجاب سے وہ سرخ پڑ گئی تھی۔ بے اختیار رخ موڑ گئی۔

عکرمہ کو احساس تھا وہ اسے بری طرح پزل کر چکا ہے۔ اس لیے مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ دُرِ مکنون نے انتہائی شرم کا غلبہ اپنے دل و دماغ پر چھاتا محسوس کیا۔ اسے جاتے دیکھ کر گہری سانس لی تھی کہ یک دم وہ پلٹا تھا۔

''یہ رنگ بہت جچتا ہے آپ پر۔ اکثر پہنا کریں۔'' بھاری آواز، گہری نظریں اور دل کی دھڑکنوں کو رفتار بھلانے والا لہجہ۔ دُرِ مکنون کو دل کانوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ چہرے پر جیسے پنیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی جھکی نظر اٹھ نہ سکی۔

اور وہ اس کا سوہنا مکھڑا نگاہوں میں جذب کرتا مڑ کر نیچے جانے والے راستے پر ہولیا۔

''یہ عکرمہ ہی ہیں ناں۔'' وہ جیسے عالم خواب میں چلتی دروازے تک آئی تھی۔ دروازہ بند کر کے اس سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ بند آنکھوں سے ذرا دیر پہلے کا منظر وہ دوبارہ دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اسے اپنا دل ایک خوشگوار احساس میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سامنے الماری کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خود ہی متحیر رہ گئی۔

peach کلر کے خوب صورت لباس اور ہلکی پھلکی جیولری میں وہ یک دم بہت بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ نہ صرف یہ کہ گلابی ہو رہا تھا۔ بلکہ عجب طرح کی سرشاری اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

''کیا واقعی دکھ، رنج اور تاسف کے علاوہ میں کچھ اور بھی محسوس کر سکتی ہوں۔'' وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔ ''مبارک ہو دُرِ مکنون۔ بالآخر خوشی و انبساط جیسے جذبات محسوس کرنے کی حس اب تمہارے اندر دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔'' اس کے دل نے سرگوشی کی تھی۔

ابھی تک تو وہ شیرازی ولا میں ملنے والی ہر خوشی کو بھیک اور خیرات ہی سمجھ کر وصول کرتی رہی تھی۔ احسان اور مروت جان کر بجھے دل سے قبول کرتی رہی تھی۔ مگر آج یہ پہلی مرتبہ تھا کہ عکرمہ کی آنکھوں میں اور اس کے چہرے پر جو جذبے اس نے دیکھے، وہ ان کی صداقت سے انکار نہیں کر سکی۔

''گویا عکرمہ شیرازی نے تمہارے دل کو دوبارہ دھڑکنا سکھا دیا ہے۔'' کوئی اس کے اندر بولا تھا اور اس لمحے اسے اپنے لبوں پر بکھرتی بے اختیار شرمگیں مسکراہٹ نے حیران کر ڈالا تھا۔

.....☆.....☆.....

''ملنے آسکتے ہو زاویار صاحب؟'' مولا بخش کا میسج اسے دوپہر کو ملا تو وہ خوشی سے بے چین ہو گیا۔

''مولا کراچی سے آیا ہے۔ ملنے چلو گی؟'' اس نے ساتھ بیٹھی شہرین سے استفسار کیا تو اس نے بنا سوچے ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ زاویار جانتا تھا کہ وہ ابھی تک رات والی اداس کیفیت سے خود کو آزاد نہیں کرا سکی ہے مگر خود کو بظاہر سنبھالے ہوئے تھی۔

آج آغا جان کے اسپتال سے فارغ ہونے کی قوی امید تھی، شام تک سب ہی انہیں لینے جا رہے تھے، ان دونوں کو بھی ساتھ جانا تھا مگر شام میں ابھی کافی وقت پڑا تھا۔

وہ مولا بخش کے بتائے ہوئے ہوٹل پہنچے تو وہاں موجود عاصمہ اور مہران کو دیکھ کر خوشگوار حیرت نے انہیں گھیر لیا۔

''ماما آپ دونوں۔'' وہ بے اختیار ماں کی طرف بڑھا تھا۔

''congrats bro۔ ایک سرپرائز آپ نے دیا شادی کر کے تو ایک سرپرائز ہمارا دینا بھی بنتا تھا ناں۔'' مہران شوخی سے بولا تھا۔ جواباً زاویار نے گرمجوشی سے اسے خود سے لگا لیا۔ ''کہاں تو شادی کے نام سے بھاگتے تھے آپ اور کہاں ایسی instant شادی۔''

''بس یار It was just sudden۔ کچھ سوچنے کا وقت نہیں مل سکا۔'' وہ مہران کی محبت پر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''سوچنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایسی بھابی کے لیے سوچ بچار کرنا محض وقت کا زیاں ہوتا۔'' مہران نے شریر

نظروں سے جدید تراش خراش والے حسین سوٹ میں ملبوس عاصمہ کے گلے لگی کھڑی شہرین کو دیکھا تو وہ جھینپ سی گئی۔ زاویار کی نگاہ اس کے محجوب انداز پر لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے پر رکی تھی۔

''کیوں ٹھیک کہا ناں بھائی۔'' مہران کے استفسار پر وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اطمینان ہلکورے لے رہا تھا عاصمہ نے بغور بیٹے اور بہو کو دیکھا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ آغا جان کی ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے میرے بچے کراچی نہیں آسکیں گے، اس لیے خود ہی چلی آئی۔'' عاصمہ نے محبت پاش لہجے میں کہا تو زاویار کے دل پر جیسے شبنم سی گرنے لگی۔

''آپ نے بہت اچھا کیا مامی، زوی بہت مس کر رہا تھا آپ کو اور میں بھی۔'' شہرین کا ناز بھرا انداز اپنائیت سے بھرپور تھا۔ زاویار نے محسوس کیا کہ شہرین واقعی خوش تھی۔

''اُدھر ماما کا بھی یہی حال تھا۔ مومنہ کی ساس بیمار ہیں اس لیے وہ نہیں آسکی مگر ماما اس کا ویٹ بھی نہیں کر سکیں۔''

''سو سوئٹ۔'' شہرین، عاصمہ کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے متاثر ہونے والے انداز میں بولی تو وہ مسکرا دیں۔

''اچھا چلو روم میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' عاصمہ ان سب سے کہتے ہوئے لفٹ کی طرف چل دیں تو ان سب نے بھی تقلید کی۔

عاصمہ ان دونوں کے لیے بہت سے تحفے لائی تھیں، آؤٹ فٹس اور طلائی زیوروں کے بعد جب پانچ ہزار کے کئی کرارے نوٹ شہرین کے ہاتھ پر رکھے تو وہ سٹپٹا گئی۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں مامی، بہت زیادہ ہے یہ سب۔'' اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے کبھی کچھ کر ہی نہیں سکی میں۔'' محبت بھرے اصرار سے اس کا ہاتھ تھام کر نوٹ اس کی حنائی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے وہ یک دم آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ زاویار کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بہت اداس لگیں۔

''جبھی تو آج اپنے بیٹے کی شادی تک میں شریک نہیں ہو سکی۔''

''ایسا نہیں ہے ماما۔ آپ یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ تھیں اور ہیں۔'' زاویار نے بے ساختہ کہا تھا۔

شہرین اور عاصمہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ نظر چرا کر مہران کی طرف دیکھنے لگا مگر اس کے چہرے پر بھی استعجاب تھا۔ اس نے گہری سانس بھر کر نظر جھکائی تو عاصمہ نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''اور آئندہ بھی ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''ان شاء اللہ مامی!'' شہرین نے متبسم لہجے میں کہا تو عاصمہ نے اسے خود سے لگا لیا۔ پھر پورا دن وہ سب ساتھ رہے، لنچ کے بعد عاصمہ اور مہران بھی ان دونوں کے ساتھ آغا جان سے ملنے اسپتال گئے تو وہ انہیں دیکھ کر حیران اور مسرور رہ گئے۔

''معاف کرنا عاصمہ بیٹا۔ تمہارے علم میں لائے بغیر تمہارے بیٹے کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا میں نے۔'' حال احوال کہنے سننے کے بعد آغا جان نے اچانک ہی کہہ دیا تھا۔

''بہت اچھا فیصلہ کیا آپ نے آغا جان۔ میں بہت خوش ہوں، اتنی پیاری بہو بیٹھے بٹھائے مل گئی مجھے۔'' عاصمہ نے محبت پاش نظروں سے ساتھ بیٹھے زاویار اور شہرین کو دیکھا تو آغا جان نے دل میں سکون اترتا محسوس کیا۔ لمحہ بھر کے لیے زاویار کی نگاہ شہرین سے ٹکرائی تو اس کے لبوں پر بے اختیارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ شہرین اس کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

کچھ دیر خوشگوار ماحول میں گفتگو رہی اور پھر عاصمہ جانے کی اجازت لے کر رخصت ہوئیں۔ اُدھر انصاری ہاؤس سے شہریار اور اقرار صاحب آگئے تو اسپتال سے ڈسچارج ہونے والے امور سرانجام دینے کے بعد بالآخر انہیں اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

.....☆.....☆.....

اس کے سیلون جانے سے کچھ دیر پہلے عکرمہ، مظفر صاحب، عبید اور سائرہ بیگم کی اسپتال سے واپسی ہوئی تو وہ نیچے سائرہ بیگم ... کے کمرے میں چلی آئی جہاں دادی ان کے ساتھ محوِ گفتگو تھیں۔ تاہم سائرہ بیگم نے اسے جن کینہ توز اور معاندانہ نظروں سے دیکھا تھا، صبح عکرمہ کے رویے کی تمام خوشگواری پھیکی پڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا، دُرِ مکنون کی نگاہیں اسے ڈھونڈ کر رہ گئیں۔

''اللہ پر بھروسا رکھو سائرہ بیٹا۔ وہ ردا کے حق میں بہتری کی راہ ضرور نکالے گا۔'' دادی انہیں تسلی بھری نصیحت کر رہی تھیں۔

''اللہ کے بھروسے ہی تو زندہ ہوں اماں۔ ورنہ اب بندوں سے تو کوئی امید نہیں رہی۔ مگر اللہ بھی اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنے لیے کوشش کرے اور مجھے اب اپنی بیٹی کے لیے کیا کرنا ہے یہ میں نے طے کر لیا ہے۔'' سامنے بیٹھی دُرِ مکنون کو آتشی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ بولیں تو برف سی سنسناہٹ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی، اس نے ہراساں نظروں سے انہیں دیکھا۔

''اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے بیٹا۔'' دادی نے خلوص سے دعائیہ کہا۔

''آمین! آپ دیکھیے گا اماں کہ میں اپنی بیٹی کی خوشیاں کیسے واپس لاتی ہوں۔'' انہوں نے سہمی ہوئی دُرِ مکنون کو استہزائیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کچھ ایسے کہا کہ وہ بھاری دل سے ان کے سامنے سے ہٹ آئی۔

سیلون میں بھی اس کی یہی کیفیت برقرار رہی حتیٰ کہ اس کی نوک پلک سنوار کر آئینے کے آگے لا بٹھایا گیا۔ لائٹ بلو اور سلور کنٹراسٹ کے نفیس برائڈل گاؤن میں وہ برات والے دن سے زیادہ حسین اور قاتل لگ رہی تھی۔

''ماشاء اللہ، بہت پیاری لگ رہی ہو دُرّی۔ اللہ تمہیں ہر بری نظر سے بچائے۔'' آج طاہرہ اس کے ساتھ تھیں۔ سیلون سے واپسی پر اسے شیرازی ولا پہنچا کر وہ اپنے گھر چلی گئیں تو اسے ڈھیروں تعریفوں سے نوازنے کے بعد اپنے کمرے میں لا بٹھایا گیا۔ بیگم کی تنفر بھری نظروں نے اسے ایک بار پھر بہت پیچھے دھکیل دیا تھا، جن میں اسے بسنے نہ دینے کا تہیہ صاف لکھا دکھائی دے رہا تھا۔

عکرمہ کمرے میں داخل ہوا تو نگاہوں کی برق رفتاری میں رخنہ پڑا۔ وہ چند لمحوں کے لیے نظر ہٹا نہیں سکا تھا۔ دُرِ مکنون صوفے پر کسی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی تھی۔

''ویسے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، انسان کو تھوڑی بہت شاعری ضرور آنی چاہیے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے، کیا خیال ہے آپ کا؟'' گرے ڈنر سوٹ میں ملبوس عکرمہ بہت باوقار اور وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کی خوشگوار آواز پر دُرِ مکنون نے بے اختیار نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو مرعوب ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

''اے میرے اللہ! کتنا رحیم ہے تو، مجھ کم نصیب کی تقدیر میں کیسا نفیس اور شاندار انسان لکھا تو نے، آج میری ماما اور بابا زندہ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ مگر کیا یہ ساتھ دائمی ہوگا؟ یقیناً نہیں یہی ایسا ہونے نہیں دیں گی۔''

''ہیلو! کیا پھر سے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟'' اس کے یک ٹک دیکھتے رہنے پر عکرمہ نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا کر شوخی سے کہا تو وہ جھینپ کر نظر جھکا گئی۔

''ویسے اگر مجھے شاعری آتی ہوتی تو آپ کا بہت فائدہ ہو جاتا تھا۔ منہ دکھائی کا گفٹ تو پسند نہیں آیا آپ کو، کیا پتا آپ کی شان میں کہا گیا قصیدہ ہی دل کو بھا جاتا۔'' عکرمہ کی آنکھوں میں ستائش اور لہجے میں شوخی تھی۔

''قصیدہ نہیں صرف ایک وعدہ چاہیے آپ سے۔'' اسے نہیں معلوم کس طاقت نے بولنے پر مجبور کیا تھا۔ جملہ ایسا تھا کہ عکرمہ کے لبوں کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ مدھم پڑ گئی۔

''اور جو میں یہ وعدہ نہ کر سکوں تو؟''

''تو بھی کیا کر سکتی ہوں میں۔ میرا اختیار ہی کیا ہے کسی پر۔'' اداسی اس کے لہجے میں گھل گئی تھی۔

''کسی اور کا تو نہیں پتا۔ البتہ میرے معاملے میں تو بہت decisive ہیں آپ۔ میں اپنی لائف سے خوش ہوں

یا نہیں اس بات کو اہمیت دیے بغیر میرے لیے فیصلہ سنا دیا ہے آپ نے۔''

''میں نے فیصلہ نہیں صرف درخواست کی ہے آپ سے۔'' وہ ندامت سے چور بولی تھی۔

''کیوں؟''

''آپ کی خوشی کی خاطر۔''

''اور آپ کو یہ گمان کیوں ہوا کہ میں خوش نہیں ہوں۔''

''کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرا ساتھ آپ کو بہت جلد تھکا دے گا۔''

''اس قدر ہمدردی کے اسباب پر کچھ روشنی ڈالیں گی آپ؟''

''اس میں ہمدردی کی کیا بات ہے؟ آپ مجھ پر ترس کھا کر شادی کر سکتے ہیں تو کیا میں اچھا نہیں سوچ سکتی آپ کے لیے۔''

''بالکل سوچ سکتی ہیں مگر کس رشتے سے؟'' عکرمہ کا لہجہ بے لچک تھا۔ ''میں نے تو دل سے اپنایا ہے آپ کو۔ اپنے نکاح میں لیا ہے پوری سچائی اور ایمانداری سے، ترس کھا کر نہیں مگر آپ، آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟ آپ نے تو مجھے دل سے لائف پارٹنر قبول کیا ہی نہیں۔ پھر میری اتنی فکر کیوں، کس کے لیے کر رہی ہیں آپ یہ سب؟''

''آپ کے لیے، اس گھر کے لیے اس گھر کے سکون کے لیے۔''

''میں، میرا گھر اور اس کا سکون اب آپ سے وابستہ ہے دُرِ مکنون! پلیز ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ۔''

''گھر کا وہی سکھ تو دینا چاہتی ہوں میں آپ کو، آخر آپ کیوں نہیں سمجھ جاتے میرا پوائنٹ آف ویو؟'' اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ اتر آئی تھی۔ عکرمہ نے ایک لمحے کو رک کر اسے بغور دیکھا۔

''میرا اور آپ کا رشتہ ہمدردی نہیں، محبت کا متقاضی ہے دُرِ مکنون۔ مگر اسے زبردستی قبول کرانے کے لیے میرا کوئی جبر نہیں آپ پر مگر آپ بھی مجھے مجبور مت کریں بلکہ.....'' ابھی عکرمہ کی بات مکمل ہوئی بھی نہ تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے ان دونوں کو متوجہ کیا۔

''عکرمہ تم تیار ہو گئے ہو تو دُرِ مکنون کو لے کر نیچے آجاؤ۔ اظہار بھائی نے اچانک آکر ہم سب کو سرپرائز کر دیا ہے، وہ تمہارے ولیمے کے لیے اسپیشلی آئے ہیں شارجہ سے۔'' دروازے پر زوہا خوشگوار موڈ لیے حاضر تھی۔

''اوہ۔'' عکرمہ نے بمشکل اپنے چہرے کے تاثرات کو کنٹرول کیا۔ ''گریٹ، اوکے ہم آتے ہیں۔'' جبراً مسکرا کر کہتے ہوئے وہ گہری سوچ کے ساتھ دروازہ بند کر کے پلٹا تو دیوار سے لگ کر کھڑی دُرِ مکنون نگاہوں کا مرکز بنی جس کا تنفس بہت آہستہ چل رہا تھا۔ زوہا سے ملنے والی اطلاع نے جیسے لمحے بھر میں اس کا خون خشک کر دیا تھا۔ وہ حد درجہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

''بی ایزی۔ پریشان مت ہوں، میں ہوں آپ کے ساتھ۔'' وہ گہری سانس بھر کر اس کے پاس آیا تھا۔ دُرِ مکنون کا سر آہستہ، آہستہ نفی میں ہل رہا تھا اور نمی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلنے کو بے تاب تھی۔

''مجھ سے نہیں ہو سکے گا، پلیز نہیں۔''

''کوشش کرنی ہوگی دُرِ مکنون۔''

''آپ کو نہیں پتا میں کس تکلیف سے گزری ہوں۔'' دُرِ مکنون کے تڑپ کر کہنے پر اذیت کی تلوار جیسے اس کے سینے میں اتری تھی۔ اس نے لب بھینچ کر جیسے اس اذیت کو بدقت برداشت کیا۔

''ہاں مگر اب میں آپ کی ہر تکلیف میں ساتھ ہوں آپ کے۔ جس دکھ سے آپ کا سابقہ پڑے گا، اس کے سامنے کھڑا ہوں گا میں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میرے لیے ایک ایسے شخص کو اپنے ہی گھر میں برداشت کرنا آسان ہے جس نے میری بیوی کی چادر کو میلی نظر سے دیکھا۔'' عکرمہ کا لہجہ اس کے ضبط کا گواہ تھا۔ دُرِ مکنون کا دل اس کی بات پر دکھ سے بھر گیا۔

''آپ گناہ گار ہیں نہ خطا کار کہ اس طرح ڈریں۔ منہ تو اسے چھپانا چاہیے جو مجرم ہے۔ حق اگر اس طرح کمزور پڑے گا تو ظلم تو پھر بڑھے گا ہی۔ آپ کو اسے فیس کرنا ہی ہوگا۔''

''بہت تکلیف ہوگی مجھے۔'' آنسو نہ چاہنے پر بھی یک دم اس کی آنکھوں سے ابل پڑے تھے۔

''جانتا ہوں۔ جو چاہیں سزا دے لیجیے گا مگر فی الحال میرے ساتھ چلیں۔''

''آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ شخص کتنا ظالم ہے۔ میں نے کس طرح بچایا اس دن خود کو۔ نہیں پتا کسی کو۔'' وہ اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔ ''اللہ کے بعد کتنا پکارا تھا آپ کو اس دن، ایک آپ کو ہی تو پکارا تھا مگر آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔''

دُرِمکنون جیسے خود سے بیگانہ ہوگئی تھی اس لمحے، ایک بار پھر ظاہر ہوگئی تھی وہ۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔ کیا اعتراف کر گئی ہے۔ عکرمہ کو اس کے جملے درحقیقت ششدر کر گئے۔ تو گویا وہ اس سے توقعات رکھتی تھی۔ کیسے حق سے جواب طلبی کر رہی تھی اس سے۔ عکرمہ کے دل میں ایک ناگفتہ بہ سا احساس جاگا تھا اس لمحے۔

''اور آج آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ پر بھروسا کر کے اس ظالم انسان کا سامنا کروں۔ نہیں ہوگا مجھ سے، کیسے کروں میں، میرا غم ابھی تک تازہ ہے۔''

''جانتا ہوں۔ مگر کیا آپ کو یاد ہے؟ یہاں آنے سے پہلے ایکسیڈنٹ کے بعد سرجری سے گزری ہیں آپ۔ جس طرح زخموں کی سرجری ہوتی ہے اسی طرح غموں کی سرجری بھی کی جاتی ہے، اس میں نشتر چبھے گا، تکلیف بھی ہوگی اور برداشت بھی کرنی ہوگی ورنہ دکھوں کے زخموں سے خوشیوں کا سارا خون بہہ جائے گا۔''

''کہنا آسان ہے۔ خود پر بیتتی ہے جب ہی انسان سمجھ پاتا ہے۔''

''یقین کیجیے اپنے اوپر بیتتی ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' عکرمہ کے گہرے لہجے میں کچھ تھا، دُرِمکنون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جو ہمیشہ ضبط کی طنابیں تھامے رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس کے اندر کا انتشار اور غیظ اس کے ماتھے پر پڑی شکنوں سے صاف ظاہر تھا۔

دُرِمکنون کے دل کو جیسے کسی گہرے احساس نے چھوا تھا۔ اور یک دم وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

''جتنے آنسو بہانے ہیں بہا لیں۔ مگر اس کمرے سے نکلنے سے پہلے خود کو اتنا مضبوط بنا لیں کہ کوئی آپ کو کمزور سمجھ کر مزید ہرٹ نہ کر سکے۔'' بھاری آواز میں کہتے ہوئے عکرمہ کا ہاتھ اس کے سر پر آرکا تو دُرِمکنون کے آنسو خود بخود تھمنے لگے، یوں لگا جیسے اچانک وہ کسی چھاؤں میں آگئی ہو۔

''لیجیے پانی پی لیں۔'' ذرا دیر بعد وہ حسب سابق پانی لیے حاضر تھا۔ ''شکر ہے کہ آپ کا میک اپ واٹر پروف ہے، ورنہ مجھے دادی سے ٹھیک ٹھاک سننے کو ملتیں، اب انہیں کون یقین دلاتا کہ آپ کے ان آنسوؤں کی وجہ میں نہیں۔'' گلاس کے ساتھ ٹشو بھی پکڑاتے ہوئے عکرمہ نے لطیف پیرائے میں کچھ سمجھایا تھا اسے۔ دُرِمکنون کو یک دم ندامت نے آگھیرا۔ اس پہلو پر تو سوچا ہی نہیں تھا اس نے۔ بے اختیار چہرے پر سے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ عکرمہ کو دیکھنے لگی تھی۔ جس کی آنکھوں میں گہرے تاسف کی پرچھائیاں تھیں۔

''thats like my Mrs۔ خود کو مضبوط بنائیں بالکل ویسے ہی جیسی آپ یہاں آنے سے پہلے تھیں۔ کچھ آئی سمجھ۔'' بات مکمل کر کے وہ حوصلہ افزا انداز میں مسکرایا تھا۔ دُرِمکنون سر اثبات میں جھکا گئی۔ الماری سے کچھ برآمد کرنے کے بعد عکرمہ نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ بلا چوں و چرا کیے اٹھ گئی۔ تاہم وہ جسم پر غلبہ پاتی لرزش پر قابو نہیں کر پا رہی تھی۔

''do trust me۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' عکرمہ نے اپنی مضبوط ہتھیلی اس کے سامنے بڑھائی تو وہ بلا ارادہ اس کا ہاتھ تھام گئی۔ اس لمحے اس کے ذہن سائرہ بیگم تھیں اور نہ روداد۔ محض خوف تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ عکرمہ کو احساس ہوا اس کا ہاتھ برف کے مانند ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''میں ہوں ناں ساتھ۔ حوصلہ کریں۔'' ساتھ چلتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تو اس نے خود کو قدم اٹھانے پر بمشکل راضی کیا۔

.....☆.....☆.....

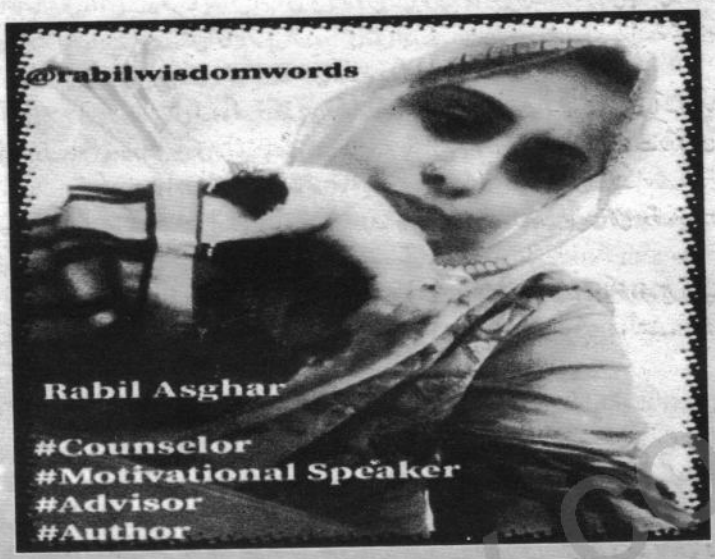

کونسلر:

کونسلر آپ کے مزاج کو سمجھ کر آپ کو Transform کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے آپ کو جسمانی بیماری ہے تو آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں گے اور اگر کپڑے سلوانے ہوں تو درزی کا انتخاب کریں گے۔ ایسے ہی ضرورت پڑتی ہے کہ آپ کے مزاج کو سمجھ کر رہنمائی کی جائے۔

"انسان ہر دفعہ خود بھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔
کبھی غصہ زیادہ آ گیا، کبھی بیزاری کی وجہ
سے الزام لگا دیا۔ اس طرح کے مسلے مسائل
ہر انسان کے ساتھ پیش آتے ہیں ان کو بہتر
بنانا اپنے لیئے ضروری ہے Transform کریں۔
جیسے انسان کم کھاتا ہے سمارٹ رہتا ہے
ایسے ہی اپن Transformation کی ضرورت پڑتی ہے
یہ رکتی نہیں اس کو بھی سیکھنا پڑتا ہے۔"

رابطہ کے لئے انسٹاگرام پیج پر میسج کریں: https://instagram.com/rabilwisdomwords

آغا جان کی واپسی سے گھر میں رونق اتر آئی تھی۔ لاؤنج میں خوب گہما گہمی تھی۔ گو کہ شہریار صاحب سمیت سب نے بہت اصرار کیا وہ اپنے کمرے میں آرام کریں مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔

''کتنے دن بعد اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے خوش ہو لینے دو۔ کراؤں گا آرام بھی۔''

قریبی عزیزوں کو اطلاع ملی کہ وہ گھر آ گئے ہیں تو کچھ لوگ ملنے چلے آئے۔ عیادت کے ساتھ، ساتھ پوتے کی شادی کی مبارک باد بھی بہانہ بن گئی تھی۔ ایک بار پھر سے شہرین کو سجا سنوار کر لاؤنج میں لا بٹھایا گیا تھا۔ زاویار کو بھی کون چھوڑتا، یعنی اسے بھی گھسیٹ لائی اور شہرین کے ساتھ بٹھا دیا۔ خوش گپیوں اور تصویروں کا دور ایک بار پھر چل پڑا تھا۔ زاویار کے سیل پر کوئی میسج آیا تھا جسے پڑھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شہرین نے دیکھا کہ سب لوگوں کو مصروف پا کر وہ اپنے کمرے کی جانب چل دیا ہے۔

وہ کچھ فکرمندی اس کی تقلید میں اپنے کمرے کی طرف آئی تو اسے تیزی سے اپنا والٹ، لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتا دیکھ کر دروازے پر رک گئی۔

''سب ٹھیک ہے زوی۔ تم کہیں جا رہے ہو؟''

''ہاں! ایک فرینڈ کا میسج آیا ہے، اس سے ملنے جا رہا ہوں۔'' شہرین کے عقب سے آ کر استفسار کرنے پر وہ کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے مڑ کر بولا تھا۔

''ایسا کون سا فرینڈ ہے جس سے ملنے کی اتنی جلدی ہے تمہیں۔'' عجلت اس کے ہر انداز سے عیاں تھی، شہرین نے کچھ حیرت سے دیکھا تھا اسے۔

'' LUMS میں ساتھ پڑھتے تھے ہم۔ وہ صرف آج رات ہے لاہور میں۔ کل صبح یو کے واپس چلا جائے گا وہ۔ میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔'' ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے قصداً شہرین کی فکرمندی کو نظر انداز کیا تھا۔

'' are you sure Zavi کہ سب ٹھیک ہے؟'' اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے شہرین اس کے نزدیک چلی آئی تھی۔

''یہ تم شکی بیویوں کی طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہو شیری؟ ٹرسٹ می، کسی لڑکی سے ملنے نہیں جا رہا میں بلکہ اب تو میں کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔'' وہ قصداً ہنس کر بولا تھا۔

''تو کیا پہلے دیکھا کرتے تھے۔''

''نہ دیکھتا تو کیا کرتا، سب کا اصرار جو تھا کہ شادی کے لیے کسی کو پسند کر لوں، ویسے میں ایسا زاہد بھی نہیں تھا۔'' زاویار کا موڈ خاصا خوشگوار تھا، کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرایا تو شہرین لمحے بھر کے لیے خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

''تو پھر کوئی پسند آئی؟'' کلائی میں کنگن کو گردش دیتی شہرین کے سوال میں کرید تھی۔ زاویار نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اس ٹاپک پر ہم پھر کبھی بات کریں گے ڈیئر شہرین، ابھی میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ٹیک کیئر۔'' اس کے سوال کو کمال مہارت سے ٹالتا وہ بعجلت دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ''میں گھنٹا ڈیڑھ میں لوٹ آؤں گا۔ کوئی پوچھے تو اسے مطمئن کر دینا۔'' اسے تاکید کرتا وہ چلتا بنا اور شہرین بے بس سی اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

جسے ندیم سے ملنے والی ایک خبر نے بے چین کر دیا تھا۔ ندیم چھ ماہ قبل کراچی سے لاہور چلا آیا تھا۔ اور اب یہاں کام کر رہا تھا۔ سرفراز کی ماتحتی میں جو کچھ اس نے سیکھا تھا وہ یہاں کام آ رہا تھا۔

.....☆.....☆.....

''وعلیکم السلام، بھئی بہت مبارک ہو۔ سالے صاحب!'' عکرمہ کے سلام کے جواب میں اظہار صاحب نے اٹھ کر گلے ملتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا اور اس کے عقب میں کھڑی دُرِ مکنون کو گہری نظروں سے دیکھا تو وہ بے بسی اور غصے

سے نظریں جھکا گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اظہار انصاری کی نظروں میں اس کی بے بسی پر تمسخر کے ساتھ، ساتھ ستائش بھی تھی۔

''شکریہ اظہار بھائی۔'' عکرمہ کے سنجیدہ لہجے میں بے زاری کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ دُرِ مکنون کو لے کر نیچے آیا تو زارا اور اظہار صاحب انہیں لاؤنج میں منتظر ملے تھے۔

''شکریے کی بھلا کیا بات ہے۔ یہ تو آپ لوگوں کی محبت ہے جو ہمیں دور سے کھینچ لائی، سوچا سر پرائز دے کر آپ کی خوشی میں اضافہ کیا جائے۔'' عکرمہ کے الگ ہونے پر وہ ہنس کر بولے۔

''ہوں یہ تو ہے۔ آپ کے لیے بھی ایک سر پرائز ہے، جس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال ان سے ملیے میری شریک حیات، دُرِ مکنون شیرازی، گو کہ ملاقات تو پہلے بھی رہی ہے ان سے مگر اب حوالہ بدل گیا ہے۔'' عکرمہ کا انداز بہت بدلا ہوا تھا۔

اظہار انصاری سمیت دُرِ مکنون نے بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''حوالے سے کیا فرق پڑتا ہے عکرمہ۔ دری پہلے بھی ہماری کزن تھی اور اب بھی ہے۔'' زارا نے ہنس کر کہتے ہوئے دُرِ مکنون کے کندھے پر بازو پھیلایا جو اس وقت حواس باختہ کھڑی تھی۔ درحقیقت اسے اس وقت عکرمہ کے تیوروں سے ڈر لگ رہا تھا۔

''فرق پڑتا ہے زارا۔ پہلے یہ صرف تمہاری کزن تھیں اب میری مسز ہیں۔ پہلے مہمان تھیں اب مکین ہیں۔ پہلے اکیلی تھیں جبکہ آج میں ساتھ ہوں ان کے۔'' عکرمہ کے چہرے پر تبخ مسکراہٹ تھی اور لہجہ بہت کچھ جتاتا ہوا۔

''ہوں یہ تو ہے۔ بہرحال تمہارے پاس کون سا سر پرائز ہے پہلے وہ بتاؤ۔'' زارا نے اس کی تائید میں سر ہلایا اور پھر سوال داغ دیا۔

''وہ سر پرائز تمہارے لیے نہیں، اظہار بھائی کے لیے ہے زارا۔'' وہ رسان سے بولا تھا۔ نظریں اظہار انصاری پر ہی جمی تھیں جو کچھ فکرمندی سے عکرمہ کے تیور ملاحظہ کر رہے تھے۔ بیوی کا پوچھا گیا سوال ان کے چہرے پر بھی تحریر تھا۔

''ایک ہی بات ہے۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔'' زارا کو تجسس ہو رہا تھا۔

''بالکل۔ میں بھی یہی سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے ساتھی، ایک دوسرے کا لباس، ایک دوسرے کی ڈھال ہوتے ہیں۔'' اس بار عکرمہ طنزیہ انداز سے ہنس کر بولا تو زارا مصنوعی خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اچھا اب ختم بھی کرو یہ فلسفہ اور بتاؤ کہ کیا سر پرائز ہے۔'' اسے تجسس ہو رہا تھا۔ جواباً اظہار انصاری کو نظروں کی گرفت میں لیے، لیے عکرمہ نے جیب سے کچھ برآمد کر کے اظہار صاحب کے سامنے پیش کیا تو دونوں میاں بیوی حیران رہ گئے۔

''ارے یہ کہاں سے ملا تمہیں؟'' زارا نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر گولڈ پلیٹڈ لائٹر عکرمہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

''وہیں جہاں اظہار بھائی اسے گرا گئے تھے۔'' اس کے لبوں پر ایک بار پھر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شارجہ جانے سے پہلے میں نے خود یہ لائٹر اظہار کو پکڑایا تھا بلکہ اسپتال جاتے ہوئے تو انہوں نے اسموکنگ بھی کی تھی کار میں پھر یہ تمہارے پاس کیسے آ سکتا ہے؟'' زارا الجھن کا شکار تھی۔

''اب اس کا جواب تو اظہار بھائی کے پاس ہی ہوگا، کیا پتا اظہار بھائی کسی کام سے شیرازی ولا واپس آئے ہوں۔ کیوں اظہار بھائی؟ ارے اسی دن تو دُرِ مکنون کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا شاید آپ کو کچھ پتا ہو کہ کیا ہوا تھا اس دن۔'' عکرمہ نے یک دم اظہار صاحب کو مخاطب کیا تو دُرِ مکنون نے گھبرا کر بلا ارادہ اس کا بازو تھام لیا۔ جبکہ اظہار بری طرح سٹپٹا گئے تھے۔ عکرمہ بہت گہری نظروں سے انہیں جانچ رہا تھا جس کے باعث ان کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔

''کیا مطلب؟ کیا یہ تمہیں گھر پر ملا تھا؟'' زارا کی حیرت اس کی بات پر بڑھ گئی تھی۔

''ہوں۔ جس دن تم لوگ واپس گئے، اسی شام یہ لائٹر واچ مین کو شیرازی ولا کے گیٹ کے پاس پڑا ملا تھا۔'' عکرمہ اس وقت بمشکل اپنے غصے کو قابو کیے ہوئے تھا۔

''کیا واقعی؟'' زارا نے اس بار شوہر کی طرف قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔ ''اظہار! کیا آپ شیرازی ولا واپس آئے تھے اس روز؟''

''ارے نہیں بھئی۔ یہ لائٹر شاید عکرمہ کی گاڑی میں گر گیا ہوگا۔ بہر حال اب مل گیا ہے ناں۔'' اظہار انصاری نے کھسیا کر بات بنائی۔

''نہیں..... عکرمہ کی گاڑی میں کیسے گر سکتا ہے۔ عکرمہ ہمیں وہاں ڈراپ کر کے ٹکٹس کنفرم کرانے چلا گیا تھا جبکہ اسپتال پہنچ کر آپ نے اسموکنگ کی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اسپتال میں آصف سے ملنے کے بعد ہم سیدھے ہی ائرپورٹ گئے تھے۔'' زارا کو سب یاد تھا لہٰذا وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ لائٹر گاڑی میں گرا ہوگا۔

''افوہ زارا، آج تمہارے بھائی کا ولیمہ ہے۔ یہ کیا تم بیکار کی بحث میں پڑ گئی ہو۔ معمولی سی چیز ہے، گم گئی تھی مل گئی، اب ختم بھی کرو بات کو۔'' اظہار انصاری نے اس بار قدرے بیزار کن لہجے میں کہا تو زارا کو خاموش ہونا پڑا۔ عکرمہ نے دیکھا دُرِ مکنون کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، اس گفتگو اور اظہار صاحب کے سامنے نے اس کے اعصاب پر ناخوشگوار اثر ڈالا تھا۔

''ہوں، ہو سکتا ہے اظہار بھائی صحیح کہہ رہے ہوں لیکن زارا تم اظہار بھائی اور ان سے متعلق چیزوں کا خیال رکھا کرو۔ نہیں تو قیمتی چیزیں کھو بھی جاتی ہیں۔ اظہار بھائی کچھ معاملوں میں بہت بے پروا ہیں۔'' آخری فقرہ اس نے اظہار انصاری کی طرف دیکھتے ہوئے بہت کچھ جتانے کے انداز میں کہا تھا۔

''زارا! تمہیں میمی بلا رہی ہیں۔'' زارا الجھے ہوئے انداز میں کبھی عکرمہ کو تو کبھی اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی کہ زوہا کی آواز نے ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا تو وہ کسی سوچ میں مستغرق ردا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دُرِ مکنون نے زارا کے جانے کے بعد عکرمہ کو تشویش سے دیکھا تھا، جس کے تیور اسے اندر ہی اندر سہائے دے رہے تھے جواباً وہ خفیف سا مسکرا دیا تھا۔

''اور سنائیں اظہار بھائی! جاب کیسی چل رہی ہے آپ کی۔'' گہری سانس بھر کر وہ ایک بار پھر ان کی طرف متوجہ ہوا جو اپنی جگہ جز بز ہو رہے تھے۔ انہیں عکرمہ سے یہ توقع نہیں تھی۔

''سب اچھا چل رہا ہے۔'' وہ کھنکھار کر بولے۔

''تو پھر سب اچھا ہی چلنے دیجیے اظہار بھائی۔ آپ کی زندگی میں ہر چیز کا ردھم قائم ہے، اس ردھم کو نہ توڑیں۔ بعض مرتبہ حالات اور معاملات بگڑ جائیں تو پھر سنوارے نہیں سنورتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے۔'' ذرا سا توقف کرتے ہوئے اس نے انہیں سخت نظروں کی گرفت میں لیا۔

''ہمارا گھر اور ہمارے فیملی میمبرز ہمارے دل کا ایک خاص حصہ ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے، یہ ہم میں سے کسی کو بھی برداشت نہیں ہوتا اور یقیناً آپ کو بھی نہیں کہ اگر کوئی آپ کی بیٹی یا بہن کی طرف میلی نگاہ ڈالے۔'' عکرمہ کا لہجہ یک دم سرد ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ اظہار انصاری لب بستہ اسے سنے گئے۔

''عزت اور اعتبار آپ کے اس لائٹر کی طرح نہیں ہوتے کہ ایک بار کھو جائیں تو دوبارہ مل جائیں گے۔ زارا آپ کے ساتھ مخلص ہے، کوشش کیجیے کہ آپ پر اسے جو اعتبار ہے اس کا بھرم قائم رہے۔ جن کے گھر شیشے کے ہوں انہیں اپنے ہاتھوں میں دوسروں کے لیے پتھر نہیں اٹھانے چاہئیں۔ تکلیف اتنی ہی دیں جتنی خود برداشت کر سکیں۔ اس گھر کے دروازے ہر اس شخص کے لیے کھلے ہیں جو اس میں نیک نیتی کے ساتھ داخل ہو ورنہ اپنے گھر اور گھر والوں کی حفاظت کرنا میں خوب جانتا ہوں۔'' دھیمی آواز مگر سخت لہجے میں بولتا عکرمہ اس عکرمہ سے بہت مختلف تھا جسے وہ اب تک جانتے تھے۔

''لیکن عکرمہ! مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی.....''

''غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہے میرے بارے میں۔ اسے جتنی جلدی آپ دور کر لیں بہتر ہوگا ہم سب کے لیے۔ آپ کا اور میرا رشتہ لحاظ کا متقاضی ہے، اسے میری کمزوری نہ سمجھیے گا۔'' اظہار صاحب کی بات قطع کرتے ہوئے وہ سخت آتشیں

لہجے میں بولا تھا۔ لاؤنج میں کوئی تھا نہیں۔ اپنی بات کہہ کر اس نے حواس باختہ سا تھ کھڑی دُرِ مکنون کا ہاتھ تھاما اور جلالی انداز میں آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اظہار انصاری کے چہرے پر شرمندگی اور تفکر کے بادل چھا گئے تھے۔ تذلیل، ندامت اور شکست نے انہیں کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ دُرِ مکنون کی موجودگی نے احساسِ ذلت میں کچھ اور بھی اضافہ کیا۔

زارا کی آنکھوں میں لکھی تشکیک انہوں نے پڑھ لی تھی اور اب یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اگر زارا نے کچھ پوچھا تو اسے کیسے مطمئن کریں گے۔ عکرمہ کی معنی خیز گفتگو کو اس کے ذہن سے جھاڑنا آسان نہیں ہوگا اس کا اندازہ تھا انہیں۔

.....☆.....☆.....

''سب ٹھیک رہا زاویار۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' ندیم واپسی پر کار خود چلا رہا تھا۔

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سب ٹھیک رہا۔'' وہ کسی خیال سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ''بلکہ اتنے دن بعد تم سے مل کر اچھا لگا۔''

''ہوں..... مجھے بھی۔''

''تمہاری ٹیم کافی competent ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ کام کر کے اور بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔'' وہ واقعی متاثر ہوا تھا۔

''شکریہ..... سرفراز کی صحبت سے ہی سیکھا ہے جو سیکھا ہے۔ مگر تم فی الحال اس جھنجٹ میں نہ پڑو۔'' ندیم کا انداز سادہ تھا۔

''تمہیں سرفراز نے بتایا تھا کہ میں لاہور میں ہوں؟''

''ہوں، تمہارے آغا جان کی علالت کا بھی پتا چلا تھا مجھے۔ مگر میں وقت نکال کر ملنے نہیں آسکا۔''

''آئی انڈر اسٹینڈ۔''

''تم کب تک ہو لاہور میں۔ آئی مین کراچی کب واپس جاؤ گے؟''

''فی الحال کچھ طے نہیں کیا۔ آغا جان کی صحت ابھی ٹھیک نہیں۔ ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر سوچوں گا۔''

''بھابی سے بھی پوچھ لینا کہ وہ کیا چاہتی ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کراچی میں اپنے میکے کے نزدیک رہنا چاہیں۔'' ندیم اس کی طرف دیکھ کر شوخی سے بولا تو وہ بھی مسکرا دیا۔

شہرین کے ذکر پر اس کا دھیان ذرا دیر پہلے والی اس گفتگو کی طرف مڑ گیا جو گھر سے نکلنے سے پہلے ان دونوں کے مابین ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کا ایک بجنے کو تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس وقت سخت پریشان ہوگی، اس لیے گہری سانس بھر کر اپنا موبائل آن کیا۔

حسبِ توقع شہرین کی ان گنت مسڈ کالز اس کے سیل کے ڈسپلے پر جگمگا رہی تھیں۔

''ہیلو زوی تم کہاں ہو؟ تم ٹھیک ہو ناں؟'' اس کے کال کرتے ہی شہرین کی بے تاب آواز سننے کو ملی۔

''آف کورس شیری۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس راستے میں ہوں تھوڑی دیر میں گھر پہنچتا ہوں۔ تم نے کسی کو بتایا تو نہیں ہے کہ میں کہاں ہوں؟'' وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں یہ مگر پلیز اب گھر آجاؤ زوی۔'' اسے شہرین کے لہجے میں تھکن محسوس ہوئی تو ہوں کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

.....☆.....☆.....

اس کا ایک پاؤں کہیں تو دوسرا کہیں پڑ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک غیرت مند مرد کے ہاتھ میں تھا جو اس کا شوہر تھا۔ اس کا واحد محرم رشتہ جو اس کے پاس تھا۔ جو اس کے لیے واقعی دنیا سے لڑنے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شیرازی ولا کے مکینوں سمیت اس گھر کے داماد بھی عکرمہ شیرازی کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر آج اس نے جس طرح اس کے سامنے اظہار انصاری کا محاسبہ کیا تھا، اس نے عکرمہ کی زندگی میں اس کے مقام کا تعین کر دیا تھا۔

جو محبت رشتے کے طفیل دل میں آئے وہ ہی پاکیزہ، پائدار اور قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔ ایسی اپنائیت غیرت اور فکر،

زادیار انصاری کی نام نہاد محبت میں تو شامل نہیں تھی جس کا وہ دم بھرتا تھا۔
اس نے نظر اٹھا کر ساتھ چلتے عکرمہ کو دیکھا تو بے اختیار کبھی کا پڑھا ہوا ایک فقرہ، یادداشت میں تازہ ہو گیا۔ ''اللہ جب بہترین سے نوازتا ہے تو پہلے بدترین سے گزارتا ہے کیونکہ سونے کو کندن بننے کے لیے جلنا پڑتا ہے۔''
اس کے دل کو بے اختیار شکر گزاری نے چھوا تو آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ قدموں کی رفتار ہلکی ہوئی تو اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے عکرمہ کو بھی رکنا پڑا۔
''کیا ہوا؟'' مڑ کر حلاوت سے سوال کرتے عکرمہ کے فکر مند لہجے نے آنسو رخساروں پر بہا دیے۔
''اونہوں۔ اب مزید آنسو نہیں۔'' عکرمہ نے یک دم اس کے رخساروں پر سے آنسو اپنی پوروں پر اتار لیے۔ وہ اس پیش قدمی کے لیے تیار نہیں تھی۔ بری طرح ٹپٹا گئی۔
''میں اپنی مسز کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اینڈ بائی دا وے آج ہمارا ولیمہ ہے، سوچ لیں روتی بسورتی تصویریں آئیں گی۔ پھر مجھ سے شکوہ نہ کیجیے گا۔'' شوخی سے بولتا عکرمہ اس عکرمہ سے کس قدر مختلف تھا جسے اس نے ذرا دیر پہلے اظہار صاحب سے مخاطب دیکھا تھا۔
جواباً ایک بے اختیار اور دل سے ابھرتی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا حصار کیا تو عکرمہ اسے لمحے بھر کے لیے دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ حسین نہیں حسین تر لگ رہی تھی۔
یک دم کلک کی آواز قریب ہی ابھری تو دونوں چونکے۔
''تھینکس گاڈ۔ بالآخر ایک رومینٹک پوز بھی capture کرنے کو ملا۔'' سدرہ کیمرا ہاتھ میں لیے شوخی سے دونوں کو دیکھ کر بولی تو وہ دونوں ہی جھینپ گئے۔ ''بائی دا وے ڈیئر کپل، یہ کاریڈور اس قسم کی سرگرمیوں کے لیے کچھ خاص safe نہیں، so be careful ذرا نزدیک ہو کر شرارت بھری راز داری سے بولتی سدرہ، دُرِ مکنون کے دلکش چہرے کو مزید گلابی کر گئی۔ ''بائی دا وے آپ دونوں جا کہاں رہے ہیں؟''
''ہم ذرا دادی کے پاس جا رہے ہیں۔ تاہم آپ کے خبردار کرنے کے لیے شکریہ۔'' عکرمہ نے شوخی سے بھابی کو جواب دیا تو وہ بھی ہنس دی۔
''بڑے چھپے رستم ہو تم عکرمہ۔ کہاں تو شادی کے لیے مان نہیں رہے تھے اور کہاں خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔''
''سب صحبت کا کمال ہے بھابی۔'' دُرِ مکنون پر ایک متبسم نظر ڈالتے ہوئے وہ بولا۔
''ماشاءاللہ۔ یہ تو ہے۔'' سدرہ ہنس کر ستائشی انداز میں بولی تو عکرمہ کی جاندار ہنسی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اور ایسے میں دُرِ مکنون کے دل میں ایک عجیب خواہش ابھری۔ وقت کے یہ لمحے تھم جانے کی خواہش۔
''اے کاش! یہ خوب صورت وقت یہیں رک جائے۔ تھم جائے۔ میں اسے دل کھول کر جی لوں۔'' وہ ایک عالمِ بے اختیاری میں عکرمہ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ سدرہ نے اس کی بے خودی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اور تصویر کھینچ ڈالی تو وہ کلک کی آواز پر چونکی۔ وہ دونوں یک دم ہنس پڑے تو ایک پُرسکون محجوب مسکراہٹ نے دُرِ مکنون کے خوب صورت چہرے کو مزید نکھار بخش دیا۔
ولیمے کی تقریب بہت خوشگوار رہی۔ دادی، مظفر شیرازی اور طاہرہ بیگم نے واضح طور پر اسے خوش محسوس کیا۔ ہر ایک نے دونوں کی جوڑی کو بہت سراہا۔ اس نے دیکھا عکرمہ کا رویہ زارا اور بچوں کے ساتھ معمول سے زیادہ شگفتہ تھا تاہم اظہار صاحب سے وہ دوبارہ ہمکلام نہیں ہوا تھا۔ وہ خود بھی اسٹیج کی طرف نہیں آئے تاہم جب ڈنر کے بعد فیملی گروپ فوٹوز بننے لگے تب زوہا انہیں زبردستی بلا کر لے آئی تھی۔ دُرِ مکنون نے محسوس کیا کہ زارا کا موڈ کوئی خاص خوشگوار نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی آپس میں کھنچے، کھنچے سے تھے اور یہ بات ایسی تھی جس نے چند گھنٹوں پہلے حاصل ہونے والے اس کے سکون میں دراڑ ڈال دی۔
گھر واپسی پر وہ گم صم بیٹھی یہی سب سوچ رہی تھی کہ عکرمہ کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا۔ کس سوچ میں گم ہیں؟''

''بس ایسے ہی۔ کچھ خاص نہیں۔'' اس نے سوچوں کے تانے بانے سمیٹتے ہوئے توجہ عکرمہ کی طرف مبذول کی۔

''کچھ تو ہے، خاص نہ سہی عام سہی۔''

''زارا آپی کے ساتھ یہ اچھا نہیں ہوا۔ شاید ان کے سامنے آپ کو وہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔'' عکرمہ کے سوال پر وہ متاسف سی بولی تھی۔

''اظہار بھائی کو صحیح راستے پر لانے کے لیے یہ ضروری تھا۔ زارا کا اس میں کوئی قصور نہیں مگر اظہار بھائی کا تو ہے۔ انہیں کسی نہ کسی طور تنبیہہ تو کرنی ہی تھی۔'' اس موضوع پر بات کرتے ہوئے عکرمہ کے اعصاب کھنچنے لگتے تھے۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ پتا نہیں کیوں میں ہر بار اس گھر کے لوگوں کے لیے تکلیف اور دکھ کی وجہ بن جاتی ہوں۔'' وہ اداس لہجے میں بولی تو عکرمہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''آپ نے شاید چچا جان اور دادی کے چہروں کی طرف غور سے نہیں دیکھا، اسی لیے ایسا کہہ رہی ہیں۔ وہ دونوں کس قدر خوش ہیں آپ کے اس فیصلے سے اور سب سے بڑھ کر میں، میرے لیے تو انتہائی باعثِ مسرت ہیں آپ۔'' سنجیدگی سے کہتے، کہتے وہ بے ساختہ شوخی سے بولا تو دُرِ مکنون کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔

''اور اسی خوشی میں میرے پاس آپ کے لیے کچھ ہے۔'' دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے عکرمہ نے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''کھول کر دیکھیے۔''

اس کی ہدایت پر دُرِ مکنون نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ہوائی ٹکٹ مع پاسپورٹ برآمد ہوا۔ جس پر عمرے کا ویزا لگا ہوا تھا۔ ساتھ میں عکرمہ کا پاسپورٹ بھی تھا۔

''یہ..... یہ میرے لیے ہے؟'' وہ سب دیکھتے ہوئے بھی بے یقین سی سوال کر گئی تھی۔ خوشی اور استعجاب نے اس کے چہرے کو کچھ اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ عکرمہ کے مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے پر وہ ایک بار پھر ٹکٹ کو بے یقینی سے دیکھنے لگی تھی۔

''کیا واقعی ہم عمرے پر جائیں گے؟'' حیرت اور مسرت نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ عکرمہ کو اس کا ہم کہنا بہت دلفریب لگا۔ مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

''آپ کو پتا ہے۔ میں اور ماما کب سے عمرے کے لیے جانا چاہتے تھے مگر بابا ہر بار ٹال دیتے، کہتے جب شیرازی انکل کے پاس وقت ہوگا تو ہم چاروں اکٹھے چلیں گے۔'' وہ جیسے ماضی میں سفر کرنے لگی تھی۔

''کیوں؟ چچا جان کے ساتھ کیوں؟ آپ نے کبھی پوچھا نہیں ان سے کہ چچا جان کا جانا کیوں ضروری تھا آپ کے ساتھ۔ وہ آپ کے فیملی ممبر تو نہیں تھے۔'' عکرمہ نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا مگر کچھ تھا اس کے انداز میں جو دُرِ مکنون کو نہ صرف ماضی سے باہر کھینچ لایا بلکہ اسے کھٹک بھی گیا تھا۔

''کیا مطلب..... یہ کیوں کہا آپ نے؟''

''بس ویسے ہی۔ کیا کبھی آپ نے محسوس نہیں کیا کہ آپ کے فادر کی لائف میں چچا جان کی بہت خاص جگہ تھی۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آپ کا بھی ہے۔ چچا جان کی آپ کے ساتھ شفقت غیر معمولی ہے۔'' عکرمہ اسے نگاہوں کے حصار میں لیے پوچھ رہا تھا جس پر دُرِ مکنون کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''تو کیا آپ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ حالانکہ وہ آپ کو بھی تو بے حد چاہتے ہیں۔ میرے ہونے سے آپ کی اہمیت کم تو نہیں ہوگئی۔'' وہ بات کو کسی اور پیرائے میں لے گئی تھی۔ فکرمندی سے بولی۔

''نہیں، ایسا بالکل نہیں۔ آپ کے لیے میرے گھر والوں کے دل میں عزت اور اہمیت کا ہونا میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔ رہ گئی میری جگہ یا میری اہمیت تو اس معاملے میں مجھے کوئی اِن سیکیورٹی نہیں، یوں بھی آپ بیوی ہیں میری، آپ مجھ سے اور میں آپ سے الگ نہیں۔'' گہری نظروں سے اسے دیکھتا وہ اسے پزل کرنے میں صد فیصد کامیاب تھا۔

''میں تو بس ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ چچا جان آپ کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔''

''ہوں۔ اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں ان ہی کی اولاد کے لیے دکھ کا سبب ہوں۔'' لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے وہ آہستہ سے کہہ گئی۔

''کچھ دکھ نصیب میں لکھے ہوتے ہیں ان کا الزام خود کو نہ دیا کیجیے۔''

''جو کچھ آج زارا آپی کو سننا پڑا کیا وہ میری وجہ سے نہیں تھا؟ پتا نہیں اس سب سے ان کے گھر پر کتنا برا اثر پڑے گا؟'' وہ ایک بار پھر زارا کے لیے اداس ہوگئی تھی۔

''ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زارا بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہے، وہ ٹیکل کرلے گی۔''

''کیا آپ کو یقین ہے؟'' اس کا لہجہ اس کی فکر کا مظہر تھا۔

''آف کورس، زارا کی اسی سمجھداری کی وجہ سے دادی کی خواہش تھی کہ اس کی شادی عبید بھائی کے ساتھ ہو جائے اور کچھ یہ بھی تھا کہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کے بیٹوں کی اولادیں نئے رشتوں میں بندھ کر ایک دوسرے کے اور نزدیک رہیں۔''

''چاہتی تو وہ آپ کے لیے بھی کچھ ایسا ہی تھیں۔ مگر آپ نے بھی ان کی یہ خواہش پوری نہ کی۔'' عکرمہ نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا تو وہ بے ساختہ کہہ گئی تھی۔ جواباً اس نے کچھ چونک کر اسے دیکھا مگر جب بولا تو اس کا انداز متبسم تھا۔

''ہاں مگر آپ کی صورت میں ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی ہے ناں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ دادی کے لیے آپ ردا جیسی ہی ہیں۔''

''ردا آپی جیسی ہونے میں اور ردا آپی ہونے میں بڑا فرق ہے۔'' اس کا لہجہ گہرا تھا۔ ''دادی، ردا آپی کو آپ کے لیے پسند کرتی تھیں اور میسی بھی۔''

''یہ پرانی بات ہے۔ آپ سے کس نے کہی؟'' اس کی معلومات نے عکرمہ کے ماتھے پر بل ڈال دیے تھے۔

''گھر میں اکثر یہ بات کی جاتی ہے۔'' وہ نظر جھکا کر بولی۔

''کی جاتی ہے نہیں، کی جاتی تھی۔ اب اس کا کوئی امکان موجود نہیں۔'' اس نے قطعیت سے کہا تو نہ جانے کیسے رکتے رکتے بھی وہ کہہ گئی۔

''کیوں نہیں ہے، امکان تو اب بھی ہے۔ آپ چاہیں تو دادی اور میسی کی یہ خواہش اب بھی پوری ہوسکتی ہے۔ ردا آپی کا گھر ٹوٹ رہا ہے اور.....''

''اسٹاپ اٹ دُرِ مکنون۔'' اس سے پہلے اس کا جملہ مکمل ہوتا عکرمہ نے انتہائی سخت لہجے میں اسے ٹوکا تو وہ تھرا کر رہ گئی، عکرمہ کے چہرے پر ہلکے، ہلکے غصے کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ اس کا ادھورا فقرہ پورا مفہوم رکھتا تھا اپنے اندر۔ ''کچھ اندازہ ہے کہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ بات پہلی اور آخری بار کہی ہے آپ نے۔ آئندہ میں ایسا کچھ نہیں سنوں۔ ڈو یو گیٹ دیٹ۔'' اتنی شدید ناراضی اور وہ بھی عکرمہ کو۔ وہ ششدر سی چند لمحوں کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''جائیں جا کر چینج کریں اور آکر ہاتھ کی ڈریسنگ کروائیں۔'' اس کی خاموشی پر جب وہ حکمیہ بولا تو انداز ہمت پست کردینے والا تھا۔ دُرِ مکنون کی آنکھوں میں یک دم دھند اتری تھی۔ وہ اگر اس کے سامنے رکتی تو رو ہی پڑتی اس لیے تیزی سے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''اوہ گاڈ! یہ اختراع کس نے ڈالی اس بیوقوف لڑکی کے دماغ میں؟ کیا چچی جان نے؟..... اوہ نو..... تو گویا دوسری شادی کا وعدہ ردا کے لیے لیا جارہا تھا.....'' اس نے سر پکڑ لیا تھا۔

اس کا ذہن تیزی سے کڑیاں جوڑنے لگا تھا۔ نکاح سے لے کر آج تک کی تمام باتیں، دُرِ مکنون کا رویہ اور سائرہ بیگم کی علالت۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا اسی قدر معاملہ واضح اور فکر بڑھتی جارہی تھی۔

(جاری ہے)

مہکتی عید

قرۃ العین سکندر

''عید پر تمہاری شادی طے کردی گئی ہے۔''
صالحہ بیگم نے اسے اطلاع دی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ یہ بھی ایک نہ یقین کرنے والی بات تھی' جہاں وقت نے دو مرتبہ اس کی شادی کو التوا میں ڈالے رکھا تھا۔ اب عید کے موقع پر شادی کی اطلاع بھی اسے ایک مذاق ہی لگ رہی تھی۔ ارسل اس کا کزن بھی تھا اور اب منگیتر بھی۔
یہ منگنی خالصتاً بڑوں کی پسند کے مطابق تھی مگر

بچوں سے ان کی منشا کی سند ضرور حاصل کرلی گئی تھی۔ ارسل نے تو باقاعدہ اس کے نام پر اپنی امی کو عندیہ دیا تھا' یوں چچی جان اس کے لیے رشتہ لے کر آئی تھیں۔

''مگر ابھی تو رضیہ پڑھ رہی ہے' ابھی اتنی جلدی کیا ہے؟'' سلمٰی بیگم معترض ہوئیں اور بات ایک لحاظ سے ٹھیک بھی تھی۔ سارے خاندان کو اطلاع ہو جاتی اور پھر خاندان بھر کی نگاہیں ارسل اور رضیہ کے رشتے پر ٹک جاتیں مگر جب صالحہ بیگم نے دلیل سے قائل کیا تو سب کو منطق سمجھ آگئی تھی۔

ارسل اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرونِ ملک جارہا تھا اور ہر ماں کی طرح صالحہ بیگم بھی یہی روایتی سوچ رکھتی تھیں کہ بیٹے کو باندھ دیں تاکہ پیروں میں من چاہی زنجیر اسے وقت آنے پر واپس کھینچ لائے۔

''اب ہاں بھی کردو ناں بھابی' یوں بھی رضیہ اب اتنی بھی بچی نہیں ہے' ایف اے میں تو ہے۔ دو سال تک آجائے گا ارسل تو ہم دھوم دھام سے شادی کردیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ارسل وہاں جاکر یمیوں کے چکر میں پھنس جائے۔'' سلمٰی بیگم نے طوعاً و کرہاً اس رشتے پر ہاں کردی تھی۔ کہتے ہیں جب ماں کا دل راضی نہ ہو مکمل تو اس بات میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ماں کا دل آنے والے اندیشوں سے نہ صرف دہل سا جاتا ہے بلکہ اسے آنے والے مصائب کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دے جاتی ہے۔

بے حد دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا کی گئی اور خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پھر جب رضیہ کے چہرے پر ارسل کے نام کی لالی چھانے لگی تو سلمٰی بیگم بھی مطمئن سی ہوگئی تھیں۔ ارسل کے اب بار بار چکر لگنے لگے تھے اور سلمٰی بیگم نے کبھی اس کے آنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک مذہبی گھرانا ضرور تھا مگر یہاں اتنی پابندی بھی نہیں تھی کہ سلام تک نہ کیا جاسکے۔ اس لیے جب ارسل آتا رضیہ چائے تیار کرکے مع لوازمات مسکراتے ہوئے ٹرے ٹیبل پر رکھ دیتی۔ ارسل کی دھیمی سی لو دیتی نگاہوں کی زد میں رضیہ شرما سی جاتی۔

اتنا ہی ان دونوں کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک دوسرے کی نگاہوں میں اپنا عکس تلاشتے اور کھوجتے رہتے۔ مستقبل کے سنہرے خواب میٹھی سی اٹھتی دل میں کسک اور ان دیکھی راہوں پر قدم سے قدم ملا کر چلنے کی خوب صورت خواہش جو عنقریب ان دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دینے والی تھی۔ جس دن ارسل نے جانا تھا' رضیہ نے روروکر اپنا برا حال کرلیا تھا۔ متورم چہرہ' سوجی آنکھیں' دل کی عکاس تھیں۔ ارسل نے خاص طور پر جانے سے پہلے رضیہ سے ملنے کی تائی اماں سے فرمائش کی تھی۔ ارسل نے جوں ہی رضیہ کا اداس چہرہ دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کے دل پر گھونسا سا لگا ہو' رضیہ نے ایک نظر ارسل کو دیکھا شکوہ کناں آنکھوں میں درد کا جہاں آباد تھا۔ کرب واذیت کے کتنے دریا وہ عبور کرآئی تھی۔ وہ یک ٹک اس کے مغموم چہرے پر لکھی تحریر پڑھتا رہا' کہنے کو جیسے اب کچھ تھا ہی نہیں..... اپنے پیاروں کی جدائی کا غم سوہانِ روح ہوا کرتا ہے اور ارسل سے اس کا نازک رشتہ متقاضی تھا کہ وہ اس سے کوئی عہد و پیماں کرے، کوئی ایسا لفظ کہے جو اس کے رستے زخموں پر مرہم رکھ دے، ارسل نہ جانے خلاؤں میں دیکھ کر کیا سوچ رہا تھا پھر خرد کی دنیا میں لوٹ آیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''رضیہ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کروں گا' محض اتنا کہوں گا کہ مجھ سے بڑی دو بہنوں کی ذمے داری بھی ابا کے ساتھ مجھے ہی بانٹنی ہے' رخشی آپا اور زویا آپا کے رشتے طے ہیں' میں چاہتا ہوں تعلیم کے بہانے جو مجھے یہ موقع ملا ہے اسے گنواؤں نہیں بلکہ اتنا کما کر واپس لوٹوں کہ ابا کے چہرے پر چمک ہو، اماں کا چہرہ سرخرو ہو اور میں ان سے نظر سے نظر ملا کر بات کرنے کے قابل ہوں اور رہی بات ہمارے اس نئے رشتے کی تو یہ رشتہ ضرور نیا ہے مگر ہم دونوں ایک ہی خون ہیں' یہ رشتہ ہمیں باندھے رکھے گا۔ میں جانتا ہوں میرے حوالے سے دنیا تمہیں طعنہ و تشنیع نہیں دے مگر تائی اماں ضرور دیں گی' تم تب حوصلہ اور ضبط نہ کھونا' جب کبھی

تمہیں لگے کہ ضبط کا بندھن اب ٹوٹنے والا ہے تم مجھے یاد کر لینا اور یہاں کال بھی کر لینا۔'' رضیہ کی تمام حسیات کان بن گئی تھیں۔ اس کا ایک، ایک لفظ اس کے کان ضرور سن رہے تھے مگر دل پر بھی رقم ہو رہا تھا۔

پھر ارسل اسے روتا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ شروع، شروع میں وہ بے انتہا روئی' ارسل سے بچپن کا ناتا تھا اور پھر دونوں نے اکٹھے شعور کی منزل پر قدم رکھا تھا' سب نے ہی ارسل کی کمی کو محسوس کیا تھا۔ شروع میں تو ایک تواتر سے اس کا فون آتا رہا' سلمٰی بیگم مطمئن تھیں' پھر وقت کو پہیا لگ گیا' رضیہ کا گریجویشن بھی مکمل ہو گیا مگر ارسل نہ آیا۔ رخشی آپا اور زویا آپا کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ خاص کر زویا آپا کی شادی پر تو اس کا دل.... بے انتہا تیز دھڑکنے اور ان گنت خواب بننے لگا تھا' اس کی شادی کی تاریخ رخشی آپا اور چچی خود لینے آئی تھیں۔

''اب نہ رویا کر آرہا ہے اپنا ارسل' اس کی اور تمہاری شادی میں اپنی زویا کے ساتھ ہی کر دوں گی۔'' صالحہ بیگم نے اس کا بڑھ کر ماتھا چوما اور وہ بری طرح شرما گئی تھی۔

گھر بھر میں شادی کا ذکر ہونے لگا اور وہ پھر سے جیسے زندہ ہو گئی تھی۔ ارسل کو اتنے سالوں بعد دیکھنا کیسا لگے گا۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ نہ آسکا۔ بقول اس کے کہ اس کا پاسپورٹ نہیں مل سکا اور یوں زویا تو رخصت ہو کر پیا دیس چلی گئی مگر رضیہ ماں کے سینے پر مونگ دلتی ہوئی وہیں ماں کی دہلیز پر بیٹھی رہ گئی۔ پھر ایک شام ارسل کا فون آیا۔ وہ رضیہ سے بات کرنے کا خواہاں تھا۔

''دیکھو رضیہ خفا نہ ہونا' میں جلد آجاؤں گا۔'' ارسل پشیمان سا تھا۔

''جی، یہ تو میں پچھلے چار سال سے سن رہی ہوں۔'' اس نے افسردگی سے کہا مگر ارسل کو اس کا کہنا سراسر طنز ہی لگا تھا۔

''اب اگر نہیں آسکا تو کیا تم مجھے طعنے دو گی۔'' ارسل کو اس کا کہنا سخت ناگوارِ خاطر گزرا تھا شاید۔ جبھی روکھے سے انداز میں بول گیا۔

''کیا اپنی آپا کا سوچنے کے بجائے خود دولھا بن جاتا اور ساری عمر میری آپا کو طعنے ملتے کہ جہیز نہیں لائی' ڈھنگ کا کھانا نہیں تھا' فرنیچر عمدہ نہ تھا اور بہت سی باتیں جو میری آپا کے لیے اذیت کا باعث بن جاتیں' اس لیے بجائے خود غرض بن کر سوچنے کے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ساری رقم بھیج دیتا ہوں' میں تو اگلے سال بھی آہی سکتا ہوں شادی کے لیے۔'' ارسل کاش یہ وضاحت نہ کرتا تو رضیہ کو اتنا درد نہ ملتا۔

اور جو طعنے اس کا مقدر بن گئے تھے اس کا کیا' اٹھتے بیٹھتے ہر کسی کی نگاہوں میں امڈتا ترحم' تمسخرانہ نگاہیں' ذو معنی جملے ارسل نے لحظہ بھر کے لیے اس کی بابت نہ سوچا۔ جو طعنے اس کی بہن کو ابھی ملے بھی نہ تھے اور شاید ملتے بھی نہ۔ کیونکہ صالحہ بیگم نے تنکا، تنکا آشیانہ بنانے کے مترادف ایک عرصہ دراز سے زویا کا جہیز بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات مردوں کو نہیں بتائی جاتی یہ تو عورتوں کے کام ہوتے ہیں کہ خاموشی سے رقم کا جتھا جوڑ کر بیٹیوں کے لیے جہیز کی غرض سے چیزیں بنائی جاتی ہیں اور پھر صالحہ بیگم کوئی غیر نہ تھیں کہ اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ انہوں نے زویا آپا کی شادی کے لیے سب کچھ تیار کر رکھا ہے' ارسل نے دور پردیس میں بیٹھے از خود ساری باتیں تراش لی تھیں۔ اب اس کے فون پر سارے جواز ساری دلیلیں بیکار تھیں۔ گیا ہوا وقت تو اب نہیں لوٹنے والا تھا۔ رضیہ نے خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور آنسوؤں کو دباتی اپنے کمرے میں آکر بستر پر پڑھے گئی۔

مائے نی میں کینوں آکھاں

روتے، روتے وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی' اسے معلوم ہی نہ ہو سکا تھا۔ جب سلمٰی بیگم نے کمرے میں جھانکا تو وہ نم پلکوں کے پرے کسی گہرے خواب کی زد میں تھی۔ انہوں نے تاسف سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے دبے قدموں نکل گئیں۔

صبح اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی تھی۔ وہ جب

تک کچن میں آئی' فریدہ بھابی سب کو ناشتا کروا چکی تھیں۔ تیوریوں پر بل لیے وہ خاصے آف موڈ میں تھیں۔ اس پر ایک خشمگیں نگاہ ڈالی اور برا سا منہ بنایا۔

''کچھ رنگ ڈھنگ ہی بدل لو اپنے۔ بیاہ تو ہوا نہیں تمہارا کہ ہمارے سر سے یہ بوجھ ٹلے اور ارسل تو جیسے وہاں جا کر بھول ہی گیا اور تم ہو کہ گھر کے کاموں میں سرے سے دلچسپی ہی مفقود ہے۔'' اسے بھابی کا انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔

''ارسل کا اس سارے معاملے میں کیا تعلق؟'' رضیہ نے سخت خفگی سے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہے اس سارے معاملے سے ارسل کا تعلق' وہی تو ہے فساد کی جڑ اس کے خوابوں سے فرصت ملے تو بی بنو کچن میں جھانکیں گی ناں۔ دوپہر ہونے کو آگئی اور نواب زادی بن کر سوئی ہوئی ہو۔'' سلمٰی بیگم دروازے میں اِستادہ تھیں اور تعجب سے اپنی بہو کی زبان کی تیزیاں ملاحظہ کر رہی تھیں۔ رضیہ نے ضبط گریہ سے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا اور سلمٰی بیگم تاسف سے ایک گہری نظر بہو پر ڈال کر رہ گئی تھیں۔ جہاں خفت وقتی طور پر ضرور امڈی تھی مگر فوراً ہی خفت کی جگہ ڈھٹائی نے لے لی تھی۔

پھر گاہے بہ گاہے گھر میں جھگڑوں نے اپنی جگہ بنالی تھی۔ موضوع بحث فقط رضیہ اور ارسل ہی ہوا کرتے تھے۔ رضیہ نے اس کے باوجود کے ارسل نے اس کا دل دکھایا تھا اور پھر خاندان بھر میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا' اس سے دلی طور پر ناراضی نہ باندھ سکی۔ یہ بندھن تو دل کا تھا اور اصولی طور پر ناراضی جائز بھی تھی مگر دل تھا کہ ارسل کے ہر فون کال اور اس کے ذکر پر دھڑکنے لگتا تھا مگر بظاہر وہ خفگی کا تاثر لیے رہتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اس دن کے بعد ارسل سے بات چیت ترک کر دی تھی۔ اب جبکہ ماہِ رمضان کی آمد تھی اور سب رمضان کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے' صالحہ آنٹی نے آ کر اس کو ایک نئی کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ اب نئے سرے سے اس کے زخموں کو ادھیڑا جا رہا تھا۔ صالحہ بیگم نہ جانے سلمٰی بیگم سے کیا کچھ کہہ کر گئی تھیں کہ وہ ایک بار پھر پورے جوش اور ولولے کے ساتھ شادی کی تیاریوں میں جت گئی تھیں۔

''اماں میرے سامنے شادی کا ذکر نہ ہی کیا کریں تو بہتر ہے۔'' ایک دن اس نے ماں کے زور دینے پر کہ وہ بازار جا کر اپنی بھابی کے ساتھ شاپنگ کر آئے' اس نے سخت ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ اس کے لہجے میں ٹوٹ کر بکھر جانے والے خوابوں کی کرچیوں کی چبھن تھی۔ ایک جلن تھی' اِک کسک تھی۔ وہ ماں تھیں اور اپنی بیٹی کے احساسات کو بخوبی سمجھ رہی تھیں مگر اس بار انہوں نے دل میں یہ بھی پختہ عزم کر لیا تھا کہ معاملہ آر یا پار ہوگا اس مرتبہ اگر ارسل نہ آیا یا شادی کا معاملہ دوبارہ التوا کا شکار ہوا تو وہ یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے نئے سرے سے رضیہ کے لیے رشتے کی مہم کا آغاز کر دیں گی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رضیہ کے بالوں میں چاندی اتر آئے۔ اصل میں وہ دُہرے رشتوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ اگر معاملہ خاندان کا نہ ہوتا تو وہ زبردستی یہ رشتہ ختم بھی کروا دیتی مگر یہاں ان کے میاں کا زور بھی تھا اور پھر وہ اس بات سے بھی آگاہ تھیں کہ رضیہ اس رشتے کے لیے دلی آمادگی لیے بیٹھی ہے۔ اتنے طعنے اتنے تشنع اس نے یونہی نہیں سن لیے تھے' اس نے ارسل کی محبت پر لبیک کہے ایک عرصہ گزار دیا تھا۔

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی عبادات اور ذکر و اذکار میں بتدریج اضافہ ہو گیا تھا۔ ہر جانب نور کی کرنیں چھا گئی تھیں' رضیہ نے بھی اپنی پوری توجہ عبادت کی جانب مائل کر دی تھی۔ اس کا زیادہ وقت گھر میں ہی گزرتا تھا۔ وہ اکثر افطاری اور سحری دونوں اوقات میں ساری ذمے داری بخوبی نبھا رہی تھی۔ بھابی کا رویہ بھی اگرچہ نرم تو نہ ہو سکا مگر اب نئے سرے سے اس کی شادی کا ذکر اور تاریخ طے ہو جانے کے بعد بدل ضرور گیا تھا باقی از خود رضیہ نے اپنے آپ کو کاموں میں مصروف کر لیا تھا۔ وہ فراغت لفظ سے ہی

چڑنے لگی تھی کیونکہ اس طرح اس کو نئے سرے سے فکروں اور سوچوں پر قابو پانا مشکل ہونے لگتا تھا اور ارسل کی یادوں پر غلبہ پانا اس قدر آسان بھی تو نہ تھا۔ وہ اداس ضرور تھی مگر کسی سے کچھ کہتی نہ تھی۔ ایک دو مرتبہ جب امی نے اسے اصرار کیا کہ وہ شادی نہ سہی عید کے لیے ہی شاپنگ کرلے اس طرح ایک تو ان کی نیت یہ تھی کہ کسی بہانے وہ گھر سے باہر نکلے اور پھر وہ اسے ساتھ لے جائیں اور ایک ہی بار عروسی جوڑا اور دوسری جیولری دلوادیں۔ مگر وہ تو اس سب میں دلچسپی ہی نہ لیتی تھی۔

''اماں میرے پاس پہلے ہی بہت سے جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ عید کے دن یوں بھی سارا دن تو کچن میں کاموں کی نذر ہوجاتا ہے نہ میں کہیں آتی جاتی ہوں' کوئی بھی سوٹ نکال کر پہن لوں گی' آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیں۔'' وہ آزردہ اور مضمحل سی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑے حلقے اس بات کے غماز تھے کہ وہ کئی راتوں سے سو بھی نہیں پائی تھی۔

''ارے میں ماں ہوں کیوں نہ کروں تمہاری فکر۔'' وہ بری طرح سے تلملاسی جاتیں مگر اب انہوں نے اس پر زور دینا چھوڑ دیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب رضیہ کو سارے کاموں سے فراغت ملتی وہ سجدے میں گر کر سارے غم اپنے رب کے حضور پیش کردیتی تھی اس کے لب خاموش رہتے تھے مگر آنسو ایک تواتر سے اس کے گالوں پر پھسل کر اس کے دل کے درد کی ترجمانی کردیتے تھے۔

بھابی بھی اب ہمدردی بنتی جارہی تھیں اسے لگتا تھا کہ یہ دوغلے لوگ' فرضی جملے' جھوٹے جذبات' اور برف احساسات لیے چہرے ہیں جو وقت کی چاپ سن کر اپنے رنگ ڈھنگ بھی بدل جاتے ہیں۔

آخری عشرے کے ساتھ ہی اس کے دل میں جیسے اتھل پتھل ہونے لگی تھی..... سب اہلِ خانہ بھی سرگوشیوں میں باتیں کرتے جب وہ وہاں سے گزرتی تو ایک دم خاموشی چھا جاتی تھی۔ وہ بھی ان سب کو ان

قارئینِ بیرونِ ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ **بیرون ملک ڈاک خرچ** پر تقریباً **200 سے 250 فیصد** اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کررہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کردی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے خاموشی سے پلٹ جاتی۔ کئی بار اس نے صالحہ چچی کو آتے اور افطاری کے بعد جاتے دیکھا تھا۔ اس نے کبھی نہ کریدا کہ ان کی آمد کا مقصد کیا ٹھہرا' اس نے اپنے تمام معاملات ساری فکریں رب العزت کے سپرد کردی تھیں اور خود ہر فکر سے آزاد ہو چکی تھی۔

''ارسل آگیا۔'' یہ اطلاع ایسی نہ تھی کہ وہ اس پر بھی ساکن رہ جاتی..... اس نے اچنبھے سے پلٹ کر ماں کے چہرے کو دیکھا۔ جہاں دبی، دبی مسکان اور جوش تھا۔

''شام کو تم تیار رہنا.....'' اگلا حکم صادر ہوا۔

''وہ کس خوشی میں' امی میں نے کسی کے سامنے نہیں جانا۔'' وہ دل برداشتہ ہوئی۔

اور پھر اس نے شام کو اسی حلیے میں کچن میں کاموں کا انبار خود پر مسلط کرلیا' وہ ہرگز ارسل کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اس سے گریز پا تھی' اس لیے سارے کام نبٹاتی رہی۔

''تم یہاں اس حلیے میں کیوں ہو' جاؤ کام میں کرلوں گی۔ تم تیار ہو جاؤ۔'' بھابی نے اسے سرزنش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''اچھا جاتی ہوں بس یہ کباب تل لوں۔'' بھابی اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں' سو ٹھنڈی سانس بھر کے باہر چل دی تھیں۔ اچانک گھر میں جیسے ہلچل سی مچ گئی تھی۔ قہقہوں اور باتوں کی ملی جلی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں' وہ کان لپیٹے اپنے کام میں منہمک رہی۔

''کیا سلام کرنے کا رواج نہیں ہے یہاں۔'' عقب سے آکر ارسل نے کہا تو وہ بری طرح چونکی تھی۔

ارسل محبت پاش نظروں سے اس کے کانوں کے پیچھے اڑسی ہوئی لٹوں میں چمکتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ رضیہ نے خفت سے اپنے رف حلیے کو دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل کام والی ماسی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اتنے سالوں بعد بھی ارسل کو رضیہ کا حسن ویسا ہی چھا جانے والا اور اعصاب پر سوار ہونے والا ہی لگ رہا تھا۔ وہ نگاہوں میں وارفتگی لیے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ جاکر بیٹھیں' میں افطاری بھیج رہی ہوں۔'' وہ نروس ہو رہی تھی۔

''اچھا..... مگر میں تو یہاں تم سے ملنے آیا ہوں۔'' ارسل نے اطمینان سے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی۔

''شرم نہیں آتی روزے میں اس طرح دیکھتے ہوئے۔'' وہ اتنی حواس باختہ ہوئی کہ جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

''شرم تو آرہی ہے کہ میں نے اتنی اچھی لڑکی کو اتنے دکھ دیے اور تمہاری آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے میرے دل کو کچوکے لگا رہے ہیں..... مگر اب میں آگیا ہوں، ہر دکھ کا مداوا کرنے کے لیے' اپنی ہر غلطی کی تلافی کے لیے اب مان جاؤ ناں۔'' اس کا لہجہ پُرعزم اور آخر میں ملتجی ہو گیا۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔'' ارسل نے ایک پیکٹ اسے تھمایا۔ وہ شرما کر پیکٹ لیے وہاں سے چلی گئی۔ اس نے کمرے میں جاکر پیکٹ کھولا' اس میں ارسل کے نام کی رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔ اس نے ست رنگی چوڑیاں دونوں کلائیوں میں پہن لی تھیں۔ اتنے میں بھابی آکر زبردستی اسے چھت پر لے گئیں۔

تبھی عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہوا تھا۔ اس نے آسمان پر عید کے چاند کی آس میں نظریں دوڑائی تھیں مگر اسے کچھ نظر نہ آنے پر مایوسی سی ہو رہی تھی۔

''محترمہ وہاں کیا تلاش کر رہی ہیں' عید کا چاند تو یہاں ہے۔'' ارسل نے عین اس کے کان کے پاس آکر کہا..... تو اس نے سٹپٹا کر ہاتھوں سے دل تھام لیا۔ بھابی اسے چھوڑ کر نیچے جا چکی تھیں۔

چوڑیوں کی چھنکار چہار سو پھیل گئی تھی۔ ارسل اور رضیہ اس عید پر ایک ہو گئے تھے۔ اللہ نے اس کا انتظار خوشگوار دنوں میں بدل دیا تھا۔

❁❁❁

بیڈ پر نیم دراز، کتاب پڑھنے میں محو حسنات فاروقی کو اچانک ہی کمرے میں پھیلے غیر معمولی سناٹے کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے ایک ترچھی نظر بیڈ کے دوسری طرف بیٹھی اپنی شریکِ حیات پر ڈالی۔ شب خوابی کے سیاہ سلکی لباس میں ملبوس زرنگار خلافِ معمول نہایت خاموشی سے نائٹ کریم کی مدد سے چہرے کا مساج کرنے میں مصروف تھیں۔

''کیا بات ہے بیگم! پریشان ہو کسی بات سے؟'' حسنات فاروقی نے کتاب سے چہرہ ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں..... کوئی بات نہیں..... کوئی پریشانی نہیں۔'' زرنگار نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ چہرے پر اضطراب نمایاں تھا۔ حسنات کو محسوس ہوا کہ کمرے میں پھیلی لیونڈر کی مسحور کن، فرحت بخش خوشبو بھی زرنگار کے ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں آج ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

''لیکن تمہارا چہرہ تو بتا رہا ہے کہ تم کسی الجھن کا شکار ہو..... کوئی پریشانی ہے یا پھر اداسی!'' وہ کتاب سائڈ میز پر رکھ کر پوری طرح زرنگار کی طرف متوجہ ہوئے۔

حسنات کے التفات بھرے لہجے کے جواب میں زرنگار نے ایک ٹھنڈی آہ خارج کی تھی۔

''حسنات! کبھی، کبھی یہ کمی مجھے بہت چبھنے لگتی ہے..... مکمل ہوتے ہوئے بھی ادھورے رہنا..... یہ احساس ایک ناگ کی طرح ڈستا ہے میرے وجود کو.....''

خوشبو

انعم سجیل

زرنگار کی اس بات سے حسنات کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''اٹھارہ سال ہو گئے ہیں حسنات فاروقی..... اٹھارہ سال.....'' ان کا لہجہ بھرا گیا۔

''زرنگار! کیا میری چاہت میں تمہیں کبھی کوئی کمی نظر آئی..... کیا میرا پیار تمہارے لیے کافی نہیں.....؟ وہ عشق جو میں تم سے کرتا ہوں..... میرے ہوتے ہوئے کیوں کوئی کمی تمہیں ایسا کچھ بھی سوچنے پر مجبور کرتی ہے؟'' حسنات نے دونوں ہاتھ زرنگار کے شانوں پر رکھ کر انہیں اپنے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ سر جھکائے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتی رہیں۔

''تم جانتی ہو زرنگار! تم میری پہلی اور آخری محبت ہو..... میں نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے بیچ، ہماری اس چاہت اور محبت کے درمیان کوئی تیسرا آئے.....'' حسنات فاروقی کے لہجے میں قطعی پن جھلک رہا تھا۔

''وہ ''کوئی'' تو نہیں، ہمارا حصہ ہوگا حسنات!'' زرنگار نے تڑپ کر شوہر کو دیکھا۔

''ماں بن کر ہی ایک عورت کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔'' ان کے لہجے میں سلگتی کسک ان کے اندر جلتے دکھوں کا بھید کھول رہی تھی۔

''تم مکمل ہو میری جان! بالکل مکمل..... اور مجھے ایسے ہی قبول ہو.....'' حسنات نے بہت پیار سے انہیں اپنے قریب کیا۔ زرنگار کے جسم سے اٹھتی ایک قیمتی پرفیوم کی دلفریب خوشبو ان کے حواسوں پر چھانے لگی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ ایسی ہی ملو..... یوں ہی خوشبوؤں میں بسی، نکھری..... تروتازہ اور مہکتی ہوئی..... صرف میں اور تم..... بس اور کوئی نہیں..... تمہارا سارا وقت، ساری توجہ اور تمام تر چاہت میرے لیے ہو..... صرف میرے لیے..... تمہیں اتنا چاہا ہے میں نے زرنگار کہ میں اپنے اور تمہارے درمیان کوئی تیسرا وجود برداشت ہی نہیں کر سکتا۔'' زرنگار کو خود سے لگائے، ان کے بال سہلاتے وہ کہتے رہے اور وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔

اتنے سالوں سے وہ یہی سب سنتی آ رہی تھیں مگر اب اکتانے لگی تھیں۔

دنیا کی نظر میں وہ ایک پرفیکٹ کپل تھا۔ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی حسنات کی زرنگار کے لیے محبت میں روزِ اول جیسی ہی شادابی اور شدت تھی جس کا برملا اظہار وہ خلوت و جلوت میں بھی کرتے نظر آتے تھے۔ زرنگار کو حسنات کی محبت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن اولاد کی کمی کا احساس کبھی کبھی ان کی آسودہ حال زندگی کے پُرسکون تالاب میں کسی کنکر کی طرح ہلچل مچا دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

''السلام علیکم! آج بہت دیر لگا دی..... میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔'' اقبال جونہی گھر میں داخل ہوا تو فرزانہ نے سلام کے ساتھ ہی شکوہ بھی جڑ دیا۔

''ہاں، آج کارخانے میں کام زیادہ تھا اسی لیے دیر ہو گئی۔ تسلی رکھا کر..... کام پر ہی جاتا ہوں، کوئی عیاشی کرنے نہیں جاتا۔'' اقبال نے بیزاری سے کہا تو فرزانہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ کتنا دل تھا اس کا کہ وہ جلدی آ جاتا تو کہیں باہر گھومنے جاتے۔

''روٹی ڈال دے جلدی سے..... بھوک لگ رہی ہے مجھے۔'' بیوی کو کمرے میں جاتا دیکھ کر اقبال نے پیچھے سے آواز دی۔

''روٹی تیار ہے..... تُو ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل لے پھر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کپڑوں سے تو شدید بدبو آ رہی ہے۔'' فرزانہ نے اس کے لیے صاف کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔

وہ اس کی بات سن کر ہنس دیا۔

''بڑی آئی صفائی پسند..... ابھی تک عادت نہیں ہو سکی تجھے اس بدبو کی.....'' اس نے نخوت سے سر جھٹکا پھر کچھ سوچتے ہوئے بیوی کے ہاتھ سے کپڑے لیے اور غسل خانے میں گھس گیا۔

اقبال اور فرزانہ کی شادی کو تین مہینے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا تعلق جنوبی پنجاب سے تھا۔ اقبال روزگار کے سلسلے میں لاہور شہر آیا تو پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک لیدر فیکٹری میں چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد فرزانہ جب اقبال کے ساتھ اس شہر میں آئی تو اس کی آنکھوں میں بہت سے خواب

بسے تھے...... وہ سوچا کرتی کہ وہ شوہر سے خوب ڈھیر ساری فرمائشیں کیا کرے گی......، وہ باہر گھومنے جایا کریں گے اور خوب مزے، مزے کے کھانے کھائیں گے۔ اس نے لاہور کے کھانوں کی بہت تعریف سن رکھی تھی۔ لیکن حقیقی زندگی کی مشکلات نے اسے جلد ہی خوابوں کی دنیا سے باہر لا کھڑا کیا۔ مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے اقبال کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ اس کی آئے روز کی فرمائشیں پوری کر سکتا۔ اسے ان بے جا فرمائشوں سے الجھن ہوتی۔ نئی نویلی دلہن کی چھوٹی، چھوٹی خواہشوں کو بھی پورا نہ کر سکنے کی خلش اور سختی اس کے لہجے میں ڈھل جاتی اور اقبال کا کھردرا رویہ فرزانہ کے چہرے کی جوت بجھا دیتا۔

اب بھی اس کے لہجے نے فرزانہ کو آزردہ کر دیا تھا۔ وہ آنسو پیتی سالن گرم کرنے لگی۔

☆......☆......☆

”کچھ دنوں سے میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔“ چوکی کھینچ کر وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا بات......؟“ گرم گرم روٹیوں کی ڈلیا اقبال کے سامنے رکھتے اس کی نگاہوں میں استعجاب اترا تھا۔

”یہی کہ تجھے یہاں کسی کوٹھی میں صفائی وغیرہ کے کام کے لیے ملازمہ رکھوا دیتا ہوں۔“ اقبال نے بیوی کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے تاثرات جانچے پھر بنا کسی لمبی تمہید کے اپنا مدعا بیان کیا۔

”اور یہ خیال تجھے کیسے آ گیا......؟“ فرزانہ نے روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے بظاہر عام سے لہجے میں استفسار کیا۔ وہ اس کے آنے پر ہی کھانا کھاتی تھی چاہے اقبال کو کتنی ہی دیر ہو جائے۔

”دیکھ! میں تو صبح سویرے کام پر چلا جاتا ہوں...... اور شام ڈھلے آتا ہوں۔ تُو سارا دن گھر میں اکیلی بور نہیں ہوتی؟“

”گھر کے کام کاج کرتی ہوں...... گزر ہی جاتا ہے دن...... اکیلا پن محسوس تو ہوتا ہے مگر اب شادی کے بعد بھی دوسروں کے گھروں کے کام......“ دھیمے لہجے میں ادھوری بات کہتے فرزانہ نے سر جھکایا۔

”شادی سے پہلے بھی تو، تُو دوسروں کے گھروں میں ہی کام کرتی تھی، اب بھی کر لینا۔“ اقبال کے لہجے کی چبھن اس کو ناگوار گزری مگر وہ چپ چاپ نوالے نگلتی رہی۔ اس کی جامد چپ پر وہ بھی ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ پھر خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔

”اور یہ بھی تو سوچ کہ اگر تجھے کہیں کام مل جائے گا تو چار پیسے ہی فالتو ہاتھ آ جائیں گے۔ ہماری آمدن میں اضافہ ہو جائے گا۔“

”ہوں......!“ آمدن کی بات پر فرزانہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

”کہہ تو تُو ٹھیک ہی رہا ہے۔ تیری تنخواہ سے تو گھر کا خرچہ پورا کرنا ہی بڑا اوکھا ہو جاتا ہے، باقی باتیں تو ایک طرف رکھ دے۔“ فرزانہ نے پاس رکھے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ اسے وہ تمام فرمائشیں یاد آئی تھیں جو وہ وقتاً فوقتاً اقبال سے کرتی رہتی اور جواباً وہ اسے اپنی خالی جیب دکھا دیا کرتا۔

”میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ابھی تو ہم دو ہیں، کل کو دو سے تین ہوں گے، آنے والے کے لیے بھی ابھی سے کچھ جوڑ کر رکھنا چاہیے ناں“ فرزانہ کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اقبال نے آہستگی سے کہا۔

”اور ویسے بھی گھر میں بیٹھ کر روٹیاں توڑنے سے بہتر ہے کچھ میرا ہی ساہ سوکھا کرا دے۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ فرزانہ کو۔ نوالہ حلق سے نیچے اتارنا مشکل ہو گیا۔

”اور اگر تُو سمجھے تو اس میں تیرا بھی فائدہ ہی ہے۔ تیری بوریت بھی دور ہو جائے گی۔ اور تجھے تو پتا ہی ہے کہ یہ بڑے لوگ اپنے نوکروں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ راشن پانی اور کپڑا لتا بھی مل جاتا ہے تنخواہ کے ساتھ ساتھ......“ وہ جانتا تھا فرزانہ کو اچھا کھانے اور اچھا پہننے اوڑھنے کا بہت شوق ہے۔

”ٹھیک ہے، اگر اسی میں تیری خوشی ہے تو......“ فرزانہ نے ایک جملے میں بحث سمیٹی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی بات منوا کر ہی دم لے گا۔

”یہ کی ناں بات...... میری سوہنی!“ اس کے مان جانے پر اقبال کھل اٹھا۔

”بس فیر تو تیار رہ...... صبح ہی بات کرتا ہوں میں

pklibrary.com

کسی دوست سے..... جلد ہی بندوبست ہو جائے تو اچھا ہے۔'' کھانا کھا کر وہ رومال سے ہاتھ پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ فرزانہ نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

کھانے کے برتن دھو دھلا کر وہ کمرے میں آئی تو اقبال سو چکا تھا۔ وہ پلنگ کے دوسرے کونے پر جا ٹکی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ بھیگی آنکھوں سے سیمنٹ اکھڑی دیوار کو دیکھے گئی۔

شادی سے پہلے اقبال اپنے دوستوں کے ساتھ رہتا تھا اور خرچہ چار لوگوں پر تقسیم ہو جانے کی وجہ سے کسی کی جیب پر کچھ خاص بوجھ نہیں پڑتا تھا..... لیکن اب بیوی کے یہاں آ جانے کے بعد اسے الگ رہائش کا بندوبست کرنا پڑا اور اس ہوشربا مہنگائی نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ صرف اس کی تنخواہ میں گزارہ بہت مشکل تھا، اسی لیے اس نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت پسندی سے سوچا جاتا تو اس کا کہنا بھی کچھ غلط نہیں تھا۔ فرزانہ کو کسی بڑے گھر کا کام مل جاتا تو ان کو کافی سہولت ہو جاتی..... محنت بھی زیادہ نہ ہوتی اور تنخواہ بھی اچھی ملنے کا امکان تھا۔ سوچ کی الجھی ڈوروں کے سرے تلاشتے اسے خود پر نیند کا غلبہ محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

''اور کچھ نہیں تو کم از کم اس سیلن زدہ بدبودار مکان سے ہی کچھ پل کو چھٹکارا مل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ نئے بنگلے کی مالکن بھی اچھی ہو تو کھانے پہننے کو اچھا مل جائے۔''

فرزانہ کے دل کو بہلانے کے لیے بہت سے بہانے اس کے ذہن کے کچے فرش پر رقص کرنے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

چند دنوں میں ہی اقبال کے ایک دوست کے توسط سے اسے قریبی پوش علاقے کے ایک بنگلے میں صفائی کا کام مل گیا۔ جدید طرز پر بنا فاروقی ہاؤس مین روڈ سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تھا اور فرزانہ کے لیے اپنے گھر سے یہاں تک آنا جانا بھی بہت آسان تھا۔

باہر سے شاندار نظر آنے والا یہ گھر اندر سے اور بھی خوب صورت تھا۔ چکنے سفید ٹائلز سے چمکتا فرش، قیمتی لکڑی کا بھاری فرنیچر، کھڑکیوں پر گرے دبیز پردے، جابجا موجود آرائشی اشیا... اور دیواروں پر آویزاں خوب صورت پینٹنگز..... گھر کی ہر اک شے سے نہ صرف مکینوں کی آسودہ حالی عیاں ہوتی تھی بلکہ ان کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ فرزانہ کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا، اس کی عمر کا بیشتر حصہ ایسے ہی گھروں میں کبھی کل وقتی تو کبھی جز وقتی ملازمہ کے طور پر کام کرتے ہی گزرا تھا۔ مگر اس گھر کی منفرد بات جس نے اس کی توجہ کھینچی تھی وہ اس گھر میں پھیلی ''خوشبو'' تھی۔ پورا گھر ہمہ وقت دلفریب خوشبوؤں سے مہکتا رہتا۔ گھر کے ہر پورشن میں الگ، الگ طرح کی خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کیا جاتا۔ اور اس کام کو اس گھر کی مالکن بیگم زرنگار فاروقی خود ہی سرانجام دیتیں۔ اس معاملے میں وہ گھر کے کسی ملازم پر انحصار نہیں کیا کرتی تھیں۔

بیگم زرنگار ایک نرم دل خاتون تھیں۔ ان کی عمر چالیس کے قریب ہو گی لیکن دلکش نقوش، بے حد ملائم گوری جلد، دمکتا چہرہ اور متناسب سراپا جس کے باعث وہ اپنی اصل عمر سے کافی کم دکھائی دیتی تھیں۔ گزرتے وقت نے ان کی خوب صورتی کو مزید نکھار دیا تھا۔ کچھ وہ خود بھی اپنے پہننے اوڑھنے کا بہت خیال رکھتیں۔ فرزانہ نے ہمیشہ ہی ان کو نک سک سے تیار دیکھا تھا۔ گھر کے ساتھ، ساتھ بیگم صاحبہ کا پور، پور بھی بیش قیمت اور مسحور کن خوشبوؤں میں نہایا رہتا۔ دنیا بھر کے قیمتی عطر اور پرفیومز ان کی سنگار میز پر سجے ہوتے۔ گلاب، چنبیلی، مشک کستوری، خس، عود، زعفران اور جانے کون، کون سی خوشبوئیں ان چھوٹی، چھوٹی خوب صورت شیشیوں میں قید تھیں جو پورے گھر میں بکھری رہتیں۔

زرنگار بیگم جیسی حسین عورت جس کو رب نے حسن کے ساتھ، ساتھ دولت سے بھی خوب نوازا۔ اور اس پر یہ کہ جان چھڑکنے والا شوہر..... یہ خصوصیات کسی بھی دوسری عورت کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتی تھیں۔

چند دنوں میں ہی فرزانہ نے اندازہ لگا لیا کہ زرنگار کو مہنگی اور منفرد خوشبوؤں کا جنون تھا اور ان خوشبوؤں کو زرنگار کے قدموں میں ڈھیر کر دینا حسنات

فاروقی کا من پسند مشغلہ.....

زرنگار کی یہ دیوانگی فرزانہ کو حیرت میں تو ڈالتی مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ فاروقی ہاؤس کا یہ عطر بیز ماحول اس کی طبیعت پر چھایا اضمحلال کافی حد تک دور کر دیا کرتا۔ کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر وہ صفائی کے دوران موقع پاتے ہی ان شیشیوں کے ڈھکن ہٹا کر انہیں سونگھنا شروع کر دیتی اور یہ نت نئی خوشبوئیں اس کے جھنجھناتے اعصاب کو پُرسکون کر دیتیں۔ سیلن زدہ دیواروں کی بساند، اقبال کے کپڑوں اور وجود سے اٹھتی چمڑے کی ناگوار بدبو، اور گھر کے باہر ابلتے گٹروں کا تعفن..... سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو جاتا۔ گویا فرزانہ کی بے کیف اور بوجھل زندگی میں فاروقی ہاؤس کسی ان دیکھے روزن سے جھانکتے بادِ صبا کے جھونکوں جیسا ثابت ہوا تھا۔

لیکن جلد ہی اسے اس بات کا ادراک ہوا کہ یہ فرار وقتی تھا۔ اپنے مکان میں واپس آتے ہی اس کا احساسِ کمتری پھر سے لوٹ آتا۔ اس نے بھی تو قسمت سے بس یہی چاہا تھا..... ایک اچھا سا گھر، پیار کرنے والا شوہر اور اتنے پیسے کہ اس کو کسی شے کے لیے ترسنا نہ پڑے..... لیکن ہوا کیا تھا..... اقبال اور فرزانہ سائیکل کے ان دو پہیوں کی طرح ہو گئے تھے جو ایک دوسرے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتے مگر منزل تک پہنچنے کے لیے اپنے، اپنے مدار میں ہی گھومتے رہتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے وہ دونوں بھی دن رات حالات کے ہاتھوں پھسلتے ہی چلے جا رہے تھے۔ پیار، محبت، الفت جیسے جذبات سے خالی، بے کیف و بے رنگ زندگی..... بس ضرورت کا رشتہ.....

ہمیشہ وہ اپنے دل کو سو بہانوں سے بہلا لیتی لیکن اپنی پل، پل بدلتی جذباتی کیفیت کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ خوشبو نگری کبھی تو اس کے اعصاب کو پُرسکون کرتی اور کبھی یہی چیز اس کو اپنی تمام محرومیوں کا ادراک بہت شدت سے کروا جاتی۔ یہ خلش اس کو غم اور خوشی کے ہنڈولے کے بیچ جھلاتی رہتی۔

اور اسی ڈولتی سنورتی زندگی میں ایک تیز لہر آئی تھی۔

وہ امید سے تھی..... اس خبر نے اسے عجیب احساس سے دوچار کیا تھا لیکن وہ احساس کم از کم خوشی کا ہرگز نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں سے اس کی طبیعت گری، گری تھی۔ ابھی شروع کے مہینے تھے تو متلی کی کیفیت بھی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی وہ کسمندی سے پلنگ پر ہی لیٹی تھی جب اقبال ناشتے کا پوچھنے اندر آیا لیکن اسے یوں لیٹا دیکھ کر حیران ہوا۔

''کام پر نہیں جانا تُو نے.....؟'' اقبال کو اس کی صحت سے زیادہ کام کی فکر تھی۔

''طبیعت کچھ بہتر نہیں لگ رہی آج کل..... سوچ رہی ہوں کام چھوڑ ہی دوں۔'' فرزانہ کا لہجہ نقاہت سے بھرا تھا۔

''پاگل ہے تُو..... روز، روز ایسی نوکریاں کہاں ملتی ہیں..... کام چھوڑ دیا تو پھر دوبارہ کیسے ملے گا۔'' اقبال کسی صورت ہاتھ آئی کمائی کو جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسی حالت میں.....'' فرزانہ کہتے، کہتے رکی۔

''کچھ نہیں ہوتا..... ساری عورتیں ہی کام کرتی ہیں اس حالت میں بھی..... تُو کوئی انوکھا بچہ تو نہیں پیدا کرنے جا رہی ناں اور کام کرنے سے ہی بدن میں طاقت آتی ہے۔ اٹھ شاباش..... ناشتا بنا دے مجھے..... ہاتھ پاؤں ہلائے گی تو چنگا محسوس کرے گی۔'' اقبال محکم سے کہتا پھر سے باہر نکل گیا۔

''یہ مصیبت بھی میرے لیے ہی ہے۔'' پیٹ پر ہاتھ رکھے نادیدہ وجود کو کوستے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

بیگم زرنگار نے بھی اس کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے پہلے آرام کا مشورہ دیا لیکن فرزانہ کے یہ کہنے پر کہ اسے کوئی مشکل نہیں ہوگی، وہ خاموش ہو گئیں۔ ویسے بھی آہستہ، آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ زندگی پھر سے اسی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ بس یہ ہوا تھا کہ اس کے دل کی خلش نے اس کے وجود پر پوری طرح اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ پُرآسائش زندگی کا وہ خواب

جو اس کی آنکھوں میں بستا تھا، اب ایک حسرت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

''مبارک ہو! بیٹا ہوا ہے۔'' بشیراں دائی نے ایک کمزور سے وجود کو اس کے پہلو میں لٹایا تب بھی اس کے دل میں ممتا کا کوئی احساس نہ جاگا تھا جبکہ اقبال بیٹے کا باپ بن کر بہت اِترا رہا تھا۔

''تُو خوش نہیں ہے فرزانہ؟'' اقبال نے اس کا نچڑا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''کس بات کی خوشی.....؟ ذمّے داری بڑھ جانے کی؟'' فرزانہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''جھلیے! ایسا کیوں سوچ رہی ہے..... آنے والا اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔ رب کی دی ہوئی نعمت کی ناشکری نہ کر.....'' اقبال نے اسے سمجھانا چاہا تھا لیکن فرزانہ نے بیزاری سے منہ موڑ لیا۔

اس وقت وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ نہ جانے کیسی کسک تھی جو اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑ رہی تھی۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ وہ اس کے جذباتی پن سے واقف تھا، اسے یقین تھا کہ وہ کچھ دیر میں خود ہی سنبھل جائے گی۔ اور واقعی اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ہفتے بھر میں ہی پھر سے اپنے گھر کے ماحول سے اکتا گئی۔ وہی بدبو، وہی تعفن..... اسے سوچ، سوچ کر وحشت ہونے لگتی۔ ایسی صورتِ حال میں خوشبوؤں میں بسا فاروقی ہاؤس اور بھی شدت سے یاد آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

موسم بدل رہا تھا۔ فضا میں خنکی کے بجائے اب ہلکی تپش محسوس ہوتی تھی۔ وہ گھر سے نکلی تو سورج اپنی سنہری کرنیں پورے آسمان پر پھیلا چکا تھا۔ سُبک رفتاری سے چلتی وہ فاروقی ہاؤس پہنچنے تک ہانپنے لگی تھی۔

''بیگم صاحبہ گھر پر ہی ہیں.....؟'' اپنا مقصد بحال کرتے ہوئے اس نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے پوچھا تھا۔

''ہاں..... آجاؤ۔'' چوکیدار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

ننھے بیٹے کو ایک کمبل میں لپیٹے سینے سے لگائے اب اپنے جوتے گھر کے اندرونی حصے کے باہر ہی اتارتے ہوئے وہ جونہی لونگ روم میں داخل ہوئی، چنبیلی کی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اسپرے ابھی تازہ تھا اس لیے خوشبو بھی تیز تھی۔ اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔ وہ جیسے اتنے دنوں سے اسی خوشبو کی کمی محسوس کر رہی تھی..... اس کی ساری کلفت اڑنچھو ہو گئی۔

''السلام علیکم!'' اس نے آگے بڑھ کر موبائل پر مصروف بیگم صاحبہ کو سلام کیا۔

''ارے فرزانہ! تم آ بھی گئیں..... طبیعت کیسی ہے تمہاری..... مبارک ہو۔'' زرنگار اسے سامنے پا کر حیران ہوئی تھیں۔

''شکریہ..... میں ٹھیک ہوں جی۔'' وہ متشکر ہوئی۔

''میں نے تو رانی (کپڑے دھونے والی) سے کہہ رکھا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہو گی، وہ ہی صفائی کا کام بھی دیکھ لیتی ہے۔ مجھے لگا تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہو گی۔''

''بس بیگم صاحبہ ہو گیا آرام..... اس جسم کو کام کرنے کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ اب آرام کرنے کا وقت ملے بھی تو اسے سکون نہیں ملتا۔''

''اچھا چلو جیسے تمہاری مرضی.....! پھر تم ایسا کرو پہلے میرا کمرا صاف کر لو، باقی صفائی بعد میں کر لینا۔'' اس کو ہدایت دے کر وہ پھر سے موبائل میں مگن ہو گئیں۔

فرزانہ نے بے حد احتیاط سے گہری نیند سوئے منے کو نیچے قالین پر لٹایا۔ ماں کی گود سے نکلنے پر اس نے ہلکی سی جنبش کی تو فرزانہ اسے تھپکنے لگی۔

''سو جا میرا بچہ.....!'' فرزانہ کی آواز پر زرنگار نے چونک کر قالین پر لیٹے اس ننھے وجود کو دیکھا تھا۔

''ارے! تم اس کو بھی ساتھ لے آئیں.....؟'' وہ حیران تھیں۔

''آپ تو جانتی ہیں بیگم صاحبہ! گھر پر اور تو کوئی ہے نہیں..... کس کے پاس چھوڑ کر آتی۔'' فرزانہ کے

لہجے میں لجاجت تھی۔

''ہوں.....'' زرنگار نے ہنکارا بھرا۔ ''لیکن کام کیسے کرو گی اس بچے.....؟'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فرزانہ بول اٹھی۔

''آپ کام کی فکر نہ کریں جی..... میں سارا کام کر دوں گی۔ یہ سویا رہے گا..... میں نے اس کو نہلا دھلا کر فیڈر پلا دیا ہے اور نیپی بھی لگا دی ہے۔'' فرزانہ اپنی طرف سے تمام تیاری پوری کر کے آئی تھی۔ وہ خود بھی پرانے سہی مگر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' زرنگار، فرزانہ کی صفائی پسند عادت سے اچھی طرح واقف تھیں، اسی لیے مطمئن ہوگئیں۔

فرزانہ نے ایک نظر خوب بجی سنوری سی خوشبوؤں میں ڈوبی زرنگار بیگم پر ڈالی اور پھر ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے کی گلابوں سے مہکتی معطر فضا اس کی منتظر تھی۔ اس نے ایک گہری سانس بھر کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔

''امیر لوگوں کی زندگی بھی کیسی حسین ہوتی ہے، خوشبوؤں سے بھری..... ایک ہم ہیں جو ان مہنگی اور قیمتی خوشبوؤں کو اپنی سانسوں میں تو اتار سکتے ہیں لیکن بدن پر نہیں مل سکتے کہ خوشبو تو ہر سو بکھر کر سارا بھید کھول دیتی ہے۔''

کئی بار کی سوچی ہوئی بات نے ایک بار پھر سے اس کے دماغ پر دستک دی تو وہ جھنجلا اٹھی۔

نظر بے ساختہ کمرے میں لگی دیوار گیر تصویر پر پڑی جس میں حسنات فاروقی اور زرنگار بیگم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے نظر آرہے تھے۔

''واہ رے مولا.....! تیرے رنگ..... بس کو دیتا ہے تو دیتا ہی چلا جاتا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح ایک بے جان سا شکوہ اس کے لبوں سے پھسلا۔ وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

حسنات فاروقی ان دنوں کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے اور ان کی غیر موجودگی میں زرنگار بیگم کو تنہائی کچھ زیادہ ہی ستاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بوریت مٹانے کی غرض سے موبائل پکڑے بیٹھی تھیں لیکن جلد ہی اس بے سبب مصروفیت سے بھی اکتا گئیں۔ موبائل میز پر رکھتے ہوئے ان کی نگاہ کچھ فاصلے پر لیٹے اس ننھے منے سے وجود پر پڑی جسے کچھ دیر قبل فرزانہ یہاں ڈال کر گئی تھی اور پھر جیسے پلٹنا بھول گئی۔

جب سے فرزانہ کو امید لگی تھی، تب سے ہی زرنگار کے اندر کا احساسِ محرومی پوری طرح جاگ گیا تھا۔ وہ جو شکوہ کناں تھیں..... سراپا احتجاج بن گئیں کہ جس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ تمام عمر ترستی تھیں، وہ ثمر جس کو پانے کی آرزو وہ شدت سے کیا کرتی تھیں، وہ کس قدر آسانی سے کسی اور کی جھولی میں جا گرا تھا۔

لوگ ان پر رشک کرتے کہ آخر کیا نہیں تھا ان کے پاس..... لیکن کوئی ان کے دل سے پوچھتا تو جواب ملتا کہ آخر ہے ہی کیا اُن کے پاس..... اس دانستہ بے اولادی کے دکھ نے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ دنیا والوں کے لیے وہ ایک خوش قسمت ترین عورت تھیں لیکن خود اپنی نظر میں ان سے بدقسمت شاید کوئی اور نہ تھا۔ وہ فرزانہ کو رشک سے دیکھا کرتیں کہ اس پر رب کا کیسا کرم تھا۔

اپنی محرومی کا ماتم کرتے آج بھی وہ یہی سب سوچے جا رہی تھیں۔ آنسو ٹوٹ، ٹوٹ کر ان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے ان کے گال بھگو رہے تھے۔

دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھیں، ایک ٹرانس کی کیفیت میں چلتے ہوئے وہ منے کے قریب آئیں اور آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ جو خود ہر وقت قیمتی پرفیومز سے بجی رہتیں، آج انہیں اس ننھے وجود کے بدن سے پھوٹتی نامحسوس قدرتی مہک دنیا کی نایاب ترین خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

بیگم صاحبہ کے کمرے سے واپس آتی فرزانہ کے قدم اس منظر نے جکڑے تھے۔ ہاتھ بے ساختہ لبوں پر جا پڑا۔

اس کی نظروں کے سامنے زرنگار گھٹنوں کے بل نیچے قالین پر بیٹھیں، منے کو اپنے بازوؤں میں بھینچے، اس کے ننھے جسم کی دلفریب خوشبو سے اپنی محرومیوں کے جام بھرنے میں مگن تھیں۔

❁❁❁

تیری زلف کے سر ہونے تک

عالیہ حرا

''نہیں..... ولید اگر یہ منگنی صرف دادی کی پسند ہے تو میں کیسے کر سکتی ہوں۔ میں اِک پڑھی لکھی، سمجھدار لڑکی ہوں..... ان فیصلوں کو نہیں مانتی۔ زندگی میری ہے تو فیصلہ بھی میرا ہونا چاہیے اور شادی جیسا فیصلہ.....؟'' وہ بولے جا رہی تھی۔ اور ولید سن رہا تھا۔

''تمہاری کوئی اور پسند ہے؟''

''نہیں..... مگر ہو بھی سکتی ہے، تم جانتے ہو میں آئیڈیل پرست ہوں۔ مجھے زندگی میں ہر چیز مکمل اور پرفیکٹ چاہیے۔'' لمحہ بھر کو وہ رکی..... اور ولید کو دیکھا۔

''مجھے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا سفر نہیں کرنا..... ایک دیوار سے دوسری دیوار تک کا راستہ نہیں ناپنا۔ اپنی دنیا بڑھانی ہے اپنے گھر سے تایا کے گھر تک کا سفر نہیں کرنا۔'' صالحہ کا حوصلہ کمال کا تھا۔

ولید خاموشی سے بنا تاثر دیے اسے سن رہا تھا۔

''یہ فیصلہ ہم دونوں کا ہونا چاہیے بھلا زندگی باہمی رضا و اتفاق کے بغیر گزر سکتی ہے۔ پتا نہیں تمہاری کیا مرضی ہے، میں نے تو اپنی مرضی بتادی۔'' صالحہ نے ولید کی خاموشی کو قطعی اہمیت نہ دی۔

''اگر اس رشتے میں تمہاری مرضی نہ ہوتی تو تم بھی مجھے کہہ سکتے تھے۔''

''اگر میں کہوں..... میں دادی کے اس فیصلے میں خوش ہوں تو.....''

صالحہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے اپنا آئیڈیل زمین بوس نظر آیا۔

''مگر میں تو نہیں ہوں ناں دو لوگ کس طرح سے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں جن کے ذہن نہ ملیں.....''

''آئندہ زندگی میں سب چلتا ہے جیسے فریحہ بھابی اور کمال بھائی.....'' ولید مسکرایا۔

''ہاں ذرا اپنی رعنا بھابی اور ظہیر بھائی پر بھی نظر کرلو..... کیسے دنگل رہتا ہے ان کے ہاں.....''

''مگر ہم تو پڑھے لکھے ہیں دنگل آرام سے کھیلا کریں گے۔'' ولید بھی مسکرایا۔

''دنگل آرام سے نہیں کھیلے جاتے..... پھر میرے کچھ خواب ہیں ولید.....'' وہ جتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں بھی تو سنوں.....'' ولید بولا۔

''بھئی اِک خوب صورت پیارا گھر..... پڑھا لکھا، ہینڈسم شوہر، شاندار گاڑی..... وغیرہ، وغیرہ۔ بس میں اور وہ ہوں..... ساری دنیا ہمارے قدموں میں ہو اور اِک خوب صورت زندگی ہو۔'' وہ لہروں میں تیر رہی تھی۔ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

''اور..... اور..... پیسہ..... اس کے پاس بہت

پیسہ ہو ولید..... پیسہ اصل میں خوشحالی کی ضمانت ہے، ہماری شادی اِک خاندانی شادی ہو گی۔ امی، ابو کی طرح عام سی۔ تایا ابو..... اور تائی جان کی طرح نارمل روٹین کی۔ گھر داری، کپڑوں کی سلائی، رشتے ناتے اور بچے پالنا..... زندگی میں اور بہت کچھ بھی ہونا چاہیے ناں.....'' پھر آنکھیں کھول کر ولید کو دیکھا۔

یہ گلابی، غزالی آنکھیں خم دار پلکیں، گندمی رنگت، پتلے ابرو اور دراز قد دلکش سراپا اس کے دل میں پر سایہ فگن تھا۔

''اور کچھ..... اور کیا ہونا چاہیے یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے، زندگی ان کاموں سے ہے بلکہ زندگی اسی طرح ہی آگے بڑھتی ہے، ان چیزوں کو زندگی سے نکال دیا جائے تو زندگی رک جاتی ہے۔'' ولید کا انداز ناصحانہ تھا۔

صالحہ ابراہیم کچھ سمجھنے کی کیفیت میں تھی..... اور نہ اس کا موڈ تھا۔ جذباتی، آئیڈیل اور خوابوں میں گم رہنے والی..... دادی کے اس بچپن کے فیصلے سے خوش نہیں تھی۔ اس سے پہلے دادی ان کی شادی کی طرف آتیں۔ صالحہ ابراہیم کی دل سے خواہش تھی کہ یہ رشتہ ٹوٹ ہی جائے..... اور..... پہل ولید بن نعمان کرے۔

اس لیے گاہے بگاہے وہ اسے اکساتی رہتی تھی۔ مگر دل جس کا اسیر ہو اس سے رہائی کب چاہتا ہے..... کب دستبرداری کا طالب ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی نٹ کھٹ ہی صالحہ اسے اچھی لگتی تھی..... اور اچھے لوگوں کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ ''صالحہ اسی کی تھی، اسی کی ہے، اسی کی ہو گی۔'' وہ پُریقین تھا۔

حقیقت کتنی تلخ، ترش اور سفاک ہوتی ہے سامنا ہوتا تو پھر رب ہی یاد آتا ہے یا پھر اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں پر شرمندگی مقدر بن جاتی ہے۔

''پھر کرو گے ناں انکار.....؟'' وہ خواب دیکھتے، دیکھتے جاگ اٹھی تھی۔

''بالکل نہیں..... دادی بیمار ہیں، میں انہیں ہرٹ نہیں کر سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی ولید احمد بن نعمان احمد.....'' صالحہ ابراہیم پاؤں پٹخ کر کھڑی ہوئی۔ غصے سے لفظ دبا کر چبھتی اور تیزی سے اپنے پورشن کی جانب بڑھ گئی۔

''میں خود کر دوں گی..... انکار..... سمجھے۔'' ولید لب بھینچ کر اسے جاتے دیکھتا رہا۔

''پاگل لڑکی..... آئیڈیل ہمیں بنے بنائے کبھی نہیں ملتے..... انہیں ہمیں تراشنا ہوتا ہے۔ اپنے قابل بنانے کے لیے نوک پلک سنورنا ہوتی ہے، اپنے قالب میں ڈھالنے کے لیے اور..... صالحہ ابراہیم اگرچہ تم میرا آئیڈیل نہیں ہو مگر تم میرا آئیڈیل بن جاؤ گی..... تمہیں میں تراش لوں گا، خراش لوں گا۔ تم سے محبت مجھے مہنگی نہیں پڑے گی ڈیئر۔'' سیل فون سامنے کر کے اس نے اسکرین روشن کی۔

مسکراتی ہوئی صالحہ سامنے تھی۔ اسی کے ہر روپ کو وہ اپنی نظر میں رکھتا تھا۔ اور اگر وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی تو اچھا ہی تھا ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔

☆☆☆

''حد ہو گئی بھئی..... یہ پچیس ہزار کی رقم تمہیں کیا دے سکتی ہے..... اور ضرورت کیا ہے بھلا نوکری کی۔ کون سی خواہش تمہاری پوری نہیں ہوئی۔ یا تمہارا باپ کون سا ضرورت مند ہے جو تمہیں نوکری کی ضرورت ہو.....'' حسن آرا نے تو اس کے لتے لے لیے تھے۔

''امی مہنگائی کتنی ہے اور میری ضروریات، خواہشات۔''

''بس اپنے گھر جا کر کرنا۔'' صفاچٹ انکار کر دیا۔

''اس گھر میں کون سا سرخاب کھڑا ہے میرے استقبال کو..... وہی پرانی طرز کا گھر اِک کمرا میرے حصے کا لگی بندھی روٹین..... بچے، کھانے کی ذمے داریاں، گھریلو جنگیں اور رشتے داریاں..... ہونہہ.....'' وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔

''اِدھر آؤ۔'' حسن آرا زور سے چیخیں۔ بیٹی کے

تیورا چھے نظر نہیں آرہے تھے۔

''جی بولیں.....'' پلٹ کر اندر آئی۔

''یہی زندگی ہے اور ایسی ہی زندگی ہوتی ہے شادی کے بعد..... سمجھ آئی تمہیں۔ اگر تم سمجھ رہی ہو کہ تم انکار کروگی تو ہمیں پروا نہیں ہے، جا کر اپنے باپ اور رشتے داروں کے سامنے کھڑی ہو کر کہہ دو۔ اگر تم خوشی سے قبول کروگی تو یہی محل ہے اور تم محلوں کی رانی..... دل میں خوشی نہ ہو تو محل بھی جھونپڑی لگتا ہے۔''

''امی.....'' وہ زچ ہوگئی۔ ''ولید مجھے کیا دے سکتا ہے؟''

''اپنی اوقات کے مطابق مانگو گی تو سب دے سکتا ہے..... آسمان کے تارے مانگو گی تو منہ کے بل گروگی۔''

''امی میرا آئیڈیل کوئی غریب شخص نہیں ہے۔''

''اک بات سن لو، تم ایک غریب لکڑہارے کی بیٹی ہو جو سفید پوش ہے، جس کا اپنا گھر ہے، جس نے اپنے بچوں کو حلال کمائی سے پالا ہے جو اپنے بچوں پر کوئی آنچ برداشت نہیں کرسکتا۔ اپنے جذبوں کو آئیڈیل کی نام نہاد پوٹلی میں باندھ کر دادی کے آتش دان میں ڈال دو..... اور اِک نئی زندگی کی ابتدا کرو۔ میں آج ہی اماں جان سے بات کرتی ہوں۔'' امی اسے بے نقط سنا کر منہ پھیر کر کھڑی ہوگئیں۔

اب کے لب بھینچ کر صالحہ باہر کل گئی۔ اس کا پکا ارادہ تھا پاپا کو مٹھی میں کرنے کا..... اور اس نے ابراہیم احمد کو مٹھی میں کرلیا۔

ابراہیم احمد نے خوشی سے اسے بینک میں جاب کرنے کی اجازت دے ہی دی۔ بی کام کیا ہوا تھا اس نے اب ایم بی اے کی بھی تیاری کررہی تھی۔ اچانک ہی ارم کے توسط سے اسے اِک بینک سے آفر آگئی۔ جہاں اس نے اس کا سی وی ڈالا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آئیڈیل اور پیسہ ساتھ، ساتھ مل رہا تھا۔ حسن آرا نے سنا تو ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''آرام سے بیگم..... آرام سے۔''

''کیا آرام سے..... آپ کی آزادی، بے جالاڈ پیار نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ کل کو کچھ اور مانگ بیٹھی تو کیا کرلیں گے آپ؟''

''وہ میری بیٹی ہے میرا برا چاہے گی اور نہ میری رسوائی کا باعث بنے گی۔'' ابراہیم احمد کو اپنے تمام بچوں پر اعتماد تھا..... ان کے چاروں بچوں نے ان کا سر کہیں نہیں جھکایا تھا نہ تعلیم کے میدان میں نہ ہی شادیوں کے سلسلے میں۔ گھر میں ان کی مانی جاتی تھی۔ چھوٹی صالحہ ذرا سی ضدی اور من مانی کرنے والی تھی۔ تاہم اسے بھی ہینڈل کرنا ان کو آتا تھا۔ آخر کو باپ تھے اس کے۔

آج کل ماں بیٹی میں شدید سرد جنگ چل رہی تھی۔ صالحہ کو مطلق پروا نہیں تھی وہ تو اپنی دھن میں تھی۔

''یہ آپ نے غریب لکڑہارا کس کو کہا تھا؟'' صبح ناشتا کرتے ہوئے اس نے اماں سے دریافت کیا تھا۔

''تمہارے ابا حضور کو..... جن کی فرنیچر مارکیٹ میں سب سے بڑی دکان ہے۔ جسے تم کسی خاطر میں نہیں لاتیں اور چلیں بیس، پچیس ہزار کی جاب کرنے۔'' ہڈیاں کاٹتے ہوئے آرام سے کہا۔ صالحہ نے سلائس کا بائٹ لے کر چائے کا گھونٹ بھرا..... کچن میں زوہا بھابی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ اور فصیحہ بھابی ماسی سے کمروں کی صفائیاں کروا رہی تھیں۔

''میرے اندر ٹیلنٹ ہے تو جاب کررہی ہو ناں..... مجھے ایک لگی بندھی روٹین لائف نہیں چاہیے۔''

''بکواس بند کرو..... زمانے کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے شکر گزاری سے گھر میں رہنا سیکھو اور اپنی ان بھابیوں سے کچھ سیکھو..... دیکھ لو..... زوہا نے آنرز کیا ہوا ہے اور کچن کس خوبی سے چلاتی ہے۔ ذائقہ دیکھو اس کے ہاتھوں میں..... اور فصیحہ کو دیکھو اس کا ہنر دیکھو ٹیکسٹائل میں کیا، کیا نہیں کیا اس نے گھر کو دیکھو کیسے چندن بنا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ طریقہ سلیقہ ہوتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہل اٹھا کر کھیت جوتنے بیٹھ جاؤ..... تعلیم ایک ضرورت بھی ہے اور روشن خیالی وسعت نظری کا ذریعہ..... ابھی تمہیں ضرورت نہیں ہے کہ تم جاب کرو..... آگے پڑھنے

کو ہم منع نہیں کر رہے صالحہ.....''

''تم بس ولید کے مہکتے دل میں جگہ بناؤ..... اور شادی کی تیاریاں کرو۔'' زوہا نے مسکرا کر اسے دیکھا جو ڈائننگ ٹیبل سمیٹنے آئی تھی۔

''خواہ مخواہ.....'' وہ بدک گئی۔

''ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔''

''شادی کے بعد کر لینا۔''

''شادی کے بعد انسان کر ہی کیا سکتا ہے سوائے.....'' اس نے بھابی کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

''صالحہ.....'' حسن آرا نے گھرکا..... ساتھ گھورا بھی۔ اس کے عقب میں ابراہیم احمد اور ولید اندر آ رہے تھے۔ وہ صالحہ ہی کیا جو سمجھ جائے یا آنکھوں کا اشارہ سمجھ جائے۔ زوہا سسر اور چچا زاد کو دیکھ کر سر پر دوپٹا جمانے لگی۔ حسن آرا نے نشست بدلی۔

''یہ غلامی..... جی حضوری اور خدمت گزاری اپنے بس کی بات نہیں۔'' آہستہ سے جملہ مکمل کیا پھر بھی سنائی دے گیا۔

حسن آرا جز بز ہو گئیں..... ولید نے کچھ سنا نہ ہو ابراہیم احمد بیٹی کے جملے پر خاصے زور سے ہنسے اور وہیں کاؤچ پر بیٹھ کر ولید کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ باپ کی آواز پر وہ بے ساختہ مڑی لیکن ولید کو دیکھ کر منہ کڑوا ہو گیا۔

''کیوں آ جاتا ہے یہ یہاں۔'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

☆☆☆

''بچوں کا ہر شوق پورا کرنا چاہیے، جاب اس کا شوق ہے ضرورت نہیں۔'' ایزی چیئر پر بیٹھے کتاب پڑھتے ہوئے ابراہیم احمد بولے۔

''جانتے ہیں زمانہ کتنا خراب ہے۔''

''زمانہ کتنا بھی خراب ہو میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔''

''کاش..... اس خوش گمانی سے آپ نکل سکتے۔'' انہوں نے بستر کی چادر برابر کرتے ہوئے سر جھٹکا۔

''میرے بچوں کی ذہانت پر شک مت کیا کرو۔''

''شک..... مجھے کسی پر ہو نہ ہو..... صالحہ پر ضرور ہے، اوپر سے آپ کی شہ نے اسے اور چڑھا رکھا ہے۔'' ابراہیم احمد نے مسکرا کر کتاب بند کر دی۔

''یہ عمر ہوتی ہی ایسی ہے حسن آرا..... بچوں کے ساتھ ہمیں چلنا پڑتا ہے۔ ورنہ بچے بغاوت کر دیتے ہیں۔ ان کے اندر تنک مزاجی اور خودسری آ جاتی ہے بچوں کو اپنا ساتھ دے کر ان کی من مانی پر قابو پانا چاہیے۔ تم نہیں سمجھو گی بس تم اپنے دل سے سارے خدشے اور واہمے نکال دو۔ کچھ برا نہیں ہو گا..... ان شاء اللہ۔'' حسن آرا ان کا منہ دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

''مبارک ہو جاب..... ویسے کب ریزائن کر رہی ہو؟'' دادی کی خیریت طلب کرنے وہ آ رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر ولید سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''کالی زبان.....'' اسے گھورا۔

''میرا مطلب ہے کب جوائن کر رہی ہو.....'' وہ مسکرایا۔

''تم سے مطلب.....؟''

''بھئی دوسرے رشتے اپنی جگہ بطور کزنز تو تمہاری پہلی تنخواہ پر میرا بھی حق بنتا ہے ناں۔''

''تمہارا حق.....؟'' وہ چیخنے کو تھی۔

''میرا مطلب ہے ہم سب کزنز کا حق..... بطور ٹریٹ آخر ہمارے خاندان کی پہلی کماؤ کزنز ہو گی تم۔'' وہ شرارت سے باز نہیں آیا۔

''دوسروں کے پیسے پر نظر رکھنے کی عادت پرانی ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''دوسرے کہاں صالحہ..... پاگل ہو گیا، اپنائیت کی نظر ہے، تمہارے ہونے والے شوہر نامدار ہیں یہ۔'' فراز جانے کہاں سے آیا تھا۔ پیچھے، پیچھے زارا بھی نمودار ہوئی۔

''کون ہے باہر اندر آ جاؤ.....'' دادی کی آواز آئی۔

ان پر نظر ڈالتی..... صالحہ اندر چلی گئی۔ ایک دوسرے کو آنکھ مارتے وہ بھی اندر چلے آئے۔ دادی چٹ پٹ پوتی کی بلائیں لے رہی تھیں۔

دادی اسے بھی عزیز تھیں پر ان کا یہ فیصلہ..... ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ''اور دادی..... وہ محبت کی گہری

نظر سے صالحہ اور ولید کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں کی ان کی نظر میں خوب صورت جوڑی تھی۔ ابھی دادی کے کانوں میں صالحہ کی واہی تباہی والے نظریات نہیں پہنچے تھے۔ انہیں اپنے فیصلے پر فخرِ عظیم تھا۔

☆☆☆

''ویسے مجھے تمہاری جاب کی کہانی سمجھ میں نہیں آئی۔'' پارک میں نگی بینچ پر صالحہ کے پہلو میں بیٹھ کر فرحانہ نے بیگ سائڈ پر رکھ کر کولڈ ڈرنک اپنے آگے کی۔

صالحہ سامنے کھیلتے بچوں کو دیکھنے لگی۔ اس کا انٹرویو کامیاب ہوا تھا۔ کم سے جوائن کرنا تھا ڈیشنگ پرسنیلٹی والے خوبرو سے احسن مرزا نے اس کا انٹرویو لیا تھا۔ گریس فل اسمائل کے ساتھ وہ بہت ذہین لگا تھا۔ بغور اس کا جائزہ لیا گیا۔ ہیڈ آفس میں بیٹھا ایک اچھی پوسٹ کا حامل شخص اسے بھا گیا تھا۔

''یوں سمجھو..... آئیڈیل کی تلاش.....'' وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائی۔

''کیا مطلب تمہارا آئیڈیل بینک میں ہے؟''

وہ چونکی۔ ویسے تمہارا آئیڈیل ہے کیا؟''

''ذہین، ڈیشنگ، ویل سیٹلڈ اور.....'' وہ بتاتی چلی گئی۔

''ماں ہو نہ باپ، نہ بہن، بھائی..... وہ اکیلا ہو اور زن مریدی کے فرائض سر انجام دیتا رہے۔'' فرحانہ نے سر جھٹک کر صالحہ کا جملہ مکمل کیا۔

''ہاں..... اِک خوشحال زندگی گزارنے کے لیے ان تلخ، ترش اور جھگڑالو رشتوں سے دور ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔''

''اونہہ..... فضول سوچ..... اور یہ آئیڈیل نہیں ہے۔ خود غرضی ہے..... اور ہوسکتا ہے تمہاری خواہش اس کی خواہش نہ ہو۔''

''یہ میرا حق بھی تو ہے ناں.....؟'' اب چپس کا پیکٹ کھولا۔

''ایسے حق مانگنا فضول ہے جس رشتے کی بنیادیں کمزور ہوں صالحہ وہ کیسے چل سکتا ہے۔ زندگی ویسی ہی گزارنی چاہیے جیسی خدا نے ہمیں بتائی ہے۔ آسمان کی طرف دیکھ کر چلوگی تو گر جاؤ گی، منہ کی کھاؤ گی۔'' فرحانہ نے تفکرانہ انداز میں سمجھایا۔

''تمہارے پاس گھر ہے خوب صورت رشتے ہیں، محبت ہے، ایک منتخب کردہ شخص ہے جو تمہارے گھر والوں نے پسند کیا ہے۔ قناعت پسند بنو، صالحہ ابراہیم ایسا نہ ہو کہ رب ملے نہ رضا ملے۔''

''بددعا دے رہی ہو؟''

''نہیں..... اِک دوست کو درست راستہ دکھا رہی ہوں اگر تمہیں تمہارا آئیڈیل بظاہر نظر نہیں آرہا تو وہ تمہیں کہیں مل بھی نہیں سکتا۔''

''میں تلاش کر تو سکتی ہوں ناں.....''

''تم بینا ہوتے ہوئے بھی نابینا ہو..... یہ تلاش لاحاصل ہے۔''

''خدا کے واسطے ولید کی قصیدہ خوانی شروع مت کردینا۔ میں اسے کہہ چکی ہوں کہ دادی کو انکار کردے، مجھے شادی نہیں کرنی اس سے۔''

''کیا.....؟'' فرحانہ ہکا بکا رہ گئی۔

''وہ مان گیا.....؟''

''ہاں، میری ناپسندیدگی جان گیا ہے۔''

''اوہ مائی گاڈ.....'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''خود غرض، بیوقوف، جاہل۔'' وہ غرائی۔

''من پسند لائف گزارنے کا سب کو حق ہے۔''

اس نے شانے اچکائے۔

''تمہارا کوئی علاج نہیں ہے صالحہ۔''

''میرا علاج میرا آئیڈیل لائف پارٹنر ہی کرسکتا ہے۔'' وہ مسکرائی اور..... فرحانہ لاحول پڑھتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''ایک بات یاد رکھنا مس صالحہ ابراہیم..... جب تم کسی کی توقع نہیں بن سکتیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی تمہاری توقع پر پورا اترے۔ توقعات کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں میں رہتا ہے۔ قانع بنو، قناعت پسند انسان

ہمیشہ خوشحال اور مطمئن رہتا ہے۔'' بیگ اٹھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ خالی بوتل پیچھے رکھے ڈسٹ بن میں ڈالی اور ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''چلو.....''

''تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔'' صالحہ بھی کھڑی ہوگئی۔

''میری ناراضی کی تم کوئی پروا مت کرو.....'' فرحانہ بہت جز بز تھی۔ صالحہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے فرحانہ بیوقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔

اس کی جاب شروع ہوگئی تھی پاپا صبح جاتے ہوئے چھوڑ دیتے حسن آرا جل بھن جاتیں۔ انہیں صالحہ کے تیور اچھے نہیں لگتے تھے۔ اسے بھی ماں کی ناراضی کی پروا نہیں تھی۔ ان سے صلح نامہ کرنا خود کو گھر بٹھانا تھا۔ اور وہ یہ نادر موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''آپ نے اماں جان سے بات کی شادی کی تاریخ رکھیں ولید اور صالحہ کی۔'' آخری حربہ انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے رکھا صالحہ کو گھر بٹھانے کا اور اندر آتی صالحہ اخبار پکڑے کھڑی رہ گئی۔

''اتنی جلدی کیا ہے ہمارے گھر کی آخری شادی ہے۔''

''جو میں دیکھ رہی ہوں ناں آپ نہیں جانتے۔''

''تم..... صالحہ سے خوفزدہ کیوں ہو؟'' وہ ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

''اس نے فیصلہ بدل لیا تو.....؟'' ممکنہ خدشہ بتایا۔

''جاب اس کا شوق ہے..... رشتہ ڈھونڈنے کی جدوجہد نہیں..... پھر ولید میں کیا خراب یا خامی ہے۔ خاندانی، پڑھا لکھا، اچھی جاب..... پھر اوپر اس کے ماں، باپ کا منتخب کردہ شخص کیا ہم اس کا برا چاہیں گے۔'' وہ بیگم کو سمجھا رہے تھے۔

''جب آنکھوں پر پٹی اور دماغ میں بھس ہو تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔'' وہ کیسے میاں کو سمجھاتیں۔

''اچھا چلیں نکاح کر دیتے ہیں۔''

''اماں جان نہیں مانیں گی۔'' صالحہ الٹے پیروں اپنے کمرے میں آکر سر پیٹنے لگی۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے امی کا تو بس.....''

''صالحہ، صالحہ.....'' فصیحہ بھابی آواز دیتی اندر آگئیں۔

''جی.....''

''بازار جاؤ تو بتا کر جانا، مجھے کچھ چیزیں منگوانی ہیں..... یہ پرچی اور پیسے رکھ لو۔''

''بھابی.....'' اس نے کاغذ تھام لیا۔ ''بھابی، پلیز.....'' ان کا ہاتھ تھام کر انہیں قریب بٹھالیا۔ ''آپ امی کو سمجھائیں..... فی الحال یہ شادی وادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ مجھے جاب کرنے دیں۔ اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے۔''

''تمہارا ایم بی اے تو شادی کے بعد بھی پورا ہو جائے گا..... جانتی ہو ولید کتنا پڑھا کو ہے۔ وہ تمہاری اور مدد کرے گا۔ جاب تو تمہارے لیے بالکل غیر ضروری ہے۔'' پیار سے مسکرا کر دیکھا۔

''یہ تو امی کی ہمنوا نکلیں۔'' جز بز ہو کر وہ پیچھے ہوئی۔

''میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''تو ابھی کون کر رہا ہے۔'' وہ شرارت سے ہنسیں۔ ''کچھ ماہ تو لگیں گے ناں آخر کو میری آخری نند کی شادی ہے خوب دھوم دھام سے ہوگی۔''

وہ چپ بیٹھی رہی۔

''ابھی مارکیٹ نہیں جا رہی، جاؤں گی تو لا دوں گی۔'' پرچی بیگ میں ڈال کر وہ اٹھ گئی۔ فصیحہ نے بغور اس کی خاموشی کا جائزہ لیا۔

''تم ولید سے انکار کروانا چاہتی ہو یا شادی پر ہی اعتراض ہے۔'' خاصے دنوں سے وہ ماں، بیٹی کی خفگی دیکھ رہی تھیں۔

''فی الحال..... کچھ عرصے کے لیے۔'' ان کی جانب دیکھا۔

''یہ تو تم ولید سے بھی کہہ سکتی ہو۔''

''ہوں..... کہہ دوں گی اس سے بھی۔'' صالحہ کے دماغ میں کچھ اور چلنے لگا تھا۔

''ویسے بھی اماں جان، فراز اور ارسل کی شادی

بھی ایک ساتھ کرنا چاہتی ہیں اسی لیے کم سے کم تیاریاں ایک سال تک تو چلیں گی۔'' وہ ''ہوں'' کہہ کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

''ہیلو..... ولید.....''

''اوہ ہیلو جانِ من..... خیریت..... بندہ حاضر ہو جاتا۔ شوقِ دیدار بھی پورا ہو جاتا اور من بھی راحت پا جاتا۔''

''مجھے بات کرنی ہے۔''

''گھر آ جاؤں..... فون کس لیے کیا بھلا.....؟ کہاں آؤں؟''

''ولید میں فون پر ہی بات کر لوں گی آنے کی زحمت مت کرو.....'' دانت کچکچا کر اس نے فون سیٹ کو دیکھا۔

''اوہو.....'' گہری سانس لی۔

''تم نے دادی کو منع کر دیا شادی کے لیے.....''

''نہیں، یہ بڑوں کا مسئلہ ہے میں کیوں منع کروں۔''

''تمہیں سمجھایا تھا ناں میں نے۔''

''تم نے دادی کو سمجھانے کے لیے تو نہیں کہا تھا۔''

''ولید.....!'' وہ زچ ہو گئی۔

''جی جانِ ولید.....''

''بکواس نہیں.....''

''ہاں، حقیقت ہے۔ بکواس نہیں، دادی اپنی زندگی میں یہ تین شادیاں نپٹا دینا چاہتی ہیں، تم بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں.....''

''میرا ساتھ نہیں دو گے۔'' صبر کا گھونٹ بھرا۔

''جی جان سے۔'' وہ مسکرایا۔ ''ساری عمر دوں گا..... تم آزما لینا.....'' صالحہ نے ضبط سے ہونٹ کاٹا اور سیل آف کر دیا۔

ولید مسکراتے ہوئے، ہونٹوں پر پیار کی دُھن بجاتے ہوئے اپنے سیل کی روشن اسکرین پر اس کا دھانی روپ دیکھنے لگا۔

☆☆☆

جاب کرتے ہوئے اسے ایک ماہ ہو گیا تھا۔ منیجر احسن مرزا سے وہ متاثر ہو گئی تھی۔ نپا تلا سا انداز..... بھاری لہجہ اور خوب صورت اندازِ گفتگو..... اس کے آئیڈیل کے قریب، قریب اس کی سوچوں پر احسن مرزا حاوی ہونے لگے۔

اس روز فرزانہ اس سے ملنے چلی آئی تو اس نے خوشی، خوشی بتایا۔

''میرا آئیڈیل ہے منیجر احسن مرزا..... تم دیکھو گی تو داد دو گی۔''

''تلاش ختم.....؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں.....''

''آئیڈیل کی تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا..... کمی بیشی ہر جگہ رہتی ہے۔'' فرحانہ نے ایک گہری سانس بھری اور نظر بھر کر دیکھا۔

''ملواؤ.....''

''ہاں تم چائے پیو، وہ ابھی باہر آئیں گے اس کونے والی ٹیبل پر جائیں گے..... تم دیکھنا۔'' صالحہ کی آنکھوں میں گہری چمک اور ہونٹوں پر مسکان تھی۔

''شادی شدہ ہے؟''

''ہاں، دو بچے ہیں بورڈنگ میں کالج لیول کے ان کی بیگم بیمار رہتی ہیں۔'' فرحانہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

''تم اس بیمار عورت پر سوتن بن کر جاؤ گی تاکہ کل کی مرتی وہ آج مر جائے۔'' آگے کو جھک کر لفظ چبا، چبا کر بھرپور نظروں سے گھورا۔ ''ابھی ان کے بچے پڑھ رہے ہیں کل کو ان کی شادیاں بھی کرنی ہے..... بیٹا نظر نہیں آیا تمہیں۔'' صالحہ اک ٹک اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''منیجر احسن مرزا..... انکل ابراہیم سے کچھ ہی چھوٹے ہوں گے۔'' اِک اور انگارہ پھینکا۔ فرحانہ کو صالحہ کی سوچ سے ہی اختلاف تھا کبھی اس معرکے میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

''تو کیا انکل تیار ہو جائیں گے اس ادھیڑ عمر کو اپنا داماد بنا لیں گے۔''

''فرحانہ.....!'' صالحہ کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔

''ملو..... تو.....'' منمنائی۔

''کیا ملوں اس گنجے، ادھیڑ عمر امیر آئیڈیل سے..... تمہیں مبارک ہو وہ نامکمل آئیڈیل مجھے نہیں

ملنا۔'' جھٹکے سے کھڑی ہوکر اس نے بیگ گھسیٹا۔
''مس...... صالحہ پلیز یہ فائل چیک کر کے آفس میں لائیں۔'' عقب سے آواز ابھری۔
صالحہ کھڑی ہوگئی...... فرحانہ بے ساختہ مڑی۔ موصوف فائل بڑھا رہے تھے، نظریں صالحہ کے چہرے پر تھیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ مڑ کر دوبارہ صالحہ کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خوش آمدید مسکراہٹ اور آنکھوں میں دید کی دمک تھی۔
''لاحول ولاقوۃ......'' وہ دوبارہ بیٹھی۔ آنے والا سیاہ بوٹوں کی ایڑیوں پر گھوم گیا بنا اس پری کو لیے۔ پری دم سادھے بیٹھ گئی۔ نگاہ بند دروازے پر تھی۔
''اے......'' گلاس میں بچے پانی کے چند قطرے اس پر غصے سے پھینکے۔
''آں...... ہاں......'' وہ دھم سے بیٹھی۔
''یہ ہے تیرا آئیڈیل شہزادہ...... شہزادہ کم شکاری زیادہ لگ رہا تھا۔ کم بخت کی نظریں تھیں یا تیر...... کیا ہے اس میں جو ولید میں نہیں۔'' وہ دانت کچکچا کر بول رہی تھی۔
''ہے کیا ولید میں......؟'' اس نے سر جھٹکا۔
''کم سے کم جوانی تو ہے...... اخلاقیات ہے، تمیز ہے۔'' وہ فرحانہ کی شکل دیکھنے لگی۔
''اب اس بچپن سے نکل آؤ...... بیٹے کو میں نے دیکھا نہیں ہے۔ مگر اس کا بیٹا زیادہ بہتر رہے گا تمہارے لیے، دولت مند باپ کا بیٹا......'' جل بھن کر دوسری راہ سجھائی اس کی کم عقلی پر غصہ آرہا تھا۔
''بیوقوف...... باپ چاہیے یا شوہر...... اس کے بیٹے سے شادی کرو۔ تو یہ تمہارا سسر ہوگا۔''
صالحہ خاموشی سے فائل دیکھنے لگی۔
تبھی بیل بجی...... صالحہ نے نوک پلک سنواری، فائل اٹھائی اپنے بال ٹھیک کیے...... اور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ فرحانہ سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھی رہ گئی۔
☆☆☆
کئی دن تک اس نے صالحہ سے بات نہ کی اور صالحہ کو مطلق اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کون، کون اس سے بات نہیں کر رہا اور کون، کون اس سے ناراض ہے، وہ آزاد تھی، ہواؤں میں اڑ رہی تھی اپنے آئیڈیل کی تلاش میں...... اور آئیڈیل...... جو اس زمین پر کہیں نہیں ملتا...... لیکن وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی اس کی نظر میں، اک مکمل شخص اس کی زندگی میں آگیا۔ مگر وہ احسن مرزا نہیں تھا۔
وہ مل اونر...... سیٹھ خلیل مراد کا اکلوتا بیٹا ابرار خلیل مراد تھا۔ اپالو کا شہزادہ...... خوب صورت، دراز قد، گھنے سیاہ بالوں والا...... اپنا اکاؤنٹ ہینڈل کرنے آیا تھا۔ خوب صورت سی صالحہ اسے ایک دم بھا گئی تھی۔
وہ روز آنے لگا...... صالحہ سے بات کر کے جاتا، اس کی ٹیبل پر رکتا...... پھر روز رکنے لگا۔ اس کا بینک بیلنس، فیکٹریاں سب جان کر تو گویا صالحہ کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔
لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر اس کی فون کالز ریسیو کر لی۔ اس کی کافی کی آفر کو بھی نہیں ٹھکرایا۔ آئس کریم میں تو اس کی جان تھی...... ایک دن اس کے ساتھ آف کر کے ساحلوں کی سیر کو بھی نکل گئی۔ سمندر کا کنارہ تھا ابرار احمد کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا دنیا جہاں کی باتیں تھیں۔ آئیڈیل میں گم وہ مکمل غافل تھی کہ ابرار اس پر حاوی ہونے لگا...... وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔
''پلیز......''
''کیا ہوا؟''
''ابھی ہمارا کوئی رشتہ طے نہیں ہے۔''
''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، رشتہ ہمارے درمیان تو طے ہے ناں...... ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا ہے پھر دیر کیوں......'' وہ سر تا پا شار تھا۔
صالحہ پسندیدگی کے اس موڑ پر تھی جہاں حرص اور ہوس اور پیار کا فرق سمجھ نہیں آتا۔
اسے تو پیسہ، خوب صورتی اور اک بڑا سا گھر مل گیا تھا۔ اس کا آئیڈیل اس کے سامنے تھا۔ ابرار خلیل مراد کے محلوں ایسے گھر نے اسے حیران کر دیا تھا اور اس عالم شوق اور حیرانی کو ابرار اپنے وجود میں اتار لینا چاہتا تھا۔
''اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجیں ناں......!''

مگر ابھی کچھ حیا باقی تھی۔

''بس اتنی سی خواہش.....'' ابرار احمد نے گہری سانس لی۔

ہاں تو اور کیا.....

''چلو ہم آج ہی نکاح کر لیتے ہیں۔''

صالحہ اسے دیکھے گئی۔

ابرار نے ہاتھ کھینچ کر قریب کر لیا۔

''آپ اپنے پیرنٹس کو بھیجیں ناں..... اپنے گھر والوں کو میں راضی کر لوں گی۔'' اس نے اس کے اتنا قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پاپا، مما تو امریکا میں ہوتے ہیں، پاپا کا یہاں چکر لگتا رہتا ہے مگر وہ مما کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔ میرے دونوں بھائیوں نے بھی ایسے ہی کیا ہے..... اور اگر تم باقاعدہ شادی چاہتی ہو تو انتظار کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم انتظار کر لیتے ہیں۔'' مسکرا کر اسے دیکھا۔

''مگر مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔'' وارفتگی سے کہا۔

''ایک اچھی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ غلط نہیں کریں، جب ہم ایک دوسرے کو قبول کر چکے ہیں تھوڑا انتظار.....''

''ثابت تو کرو قبولیت۔'' شوخ ہوا۔

وہ دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''جناب مجھے دیر ہو رہی ہے ابھی گھر چھوڑ دیں آئندہ اپنے پیرنٹس کو لے کر آیئے گا۔'' بیگ اٹھایا۔

اس پل ابرار کو احساس ہو گیا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلنے والا۔

''یہ رنگ دیکھو تمہارے لیے لایا تھا۔'' خوب صورت یاقوت کی انگوٹھی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

''سچ.....!'' اشتیاق بھرے انداز میں اس نے تھام لی۔

''ارے یوں نہیں، لاؤ پہنا دوں.....'' ابرار نے اس کا ہاتھ تھام کر رنگ پہنا دی..... صالحہ فطری مسرت سے چمک رہی تھی اندرونی خوشی اس کے رخساروں پر چھلک آئی

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو

کانچ محل

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری.....

رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور

عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان

بہت جلد سسپنس کے صفحات کی زینت

تھی۔ مکمل اعتماد میں لینے کے لیے ابرار خلیل مراد جیسے گھاگ شکاری نے ہاتھ چوم کر ابھی اسے چھوڑ دیا تھا۔

چڑیا بہت معصوم، کم عمر اور بھولی تھی اسے اعتماد دینا ضروری تھا۔ آج تک اس کی زندگی میں ایسا کوئی معصوم پرندہ نہیں آیا تھا۔ اسے اس کی معصومیت سے مکمل فائدہ اٹھانا تھا۔ ابرار کی شوخ جسارت نے اسے بلش کر دیا تھا، مڑ کر گاڑی میں جا بیٹھی...... ابرار خلیل ہنستا ہوا پیچھے آ گیا۔

☆☆☆

رات وہ ابرار کے خیالوں میں گم تھی اس کی دی ہوئی رنگ انگلیوں کے درمیان جگمگا رہی تھی۔ منظر بار، بار آنکھوں کے سامنے تھا۔

''کون کہتا ہے آئیڈیل نہیں ملتا...... وہ تو بنا بنایا میرے خوابوں جیسا ہے۔'' آنکھیں موند کر وہ مسکرائی۔

''مجھے ولید سے بات کرنی چاہیے، مجھے ہر حال میں انکار کرنا ہوگا۔ وہ دادی کو منع کر دے۔ اگر ابرار نے گھر والوں کو بھیج دیا تو...... تو پھر میں کیا کروں گی۔'' چونک کر وہ حال میں آئی۔

گھڑی پر نگاہ کی ایک بج رہا تھا۔

''ولید سو چکا ہوگا...... اسے جلدی سونے کی عادت ہے۔ سیل آف کر کے سوتا ہے۔'' نمبر ملاتے، ملاتے رک گئی۔

تبھی ابرار کالنگ پر تھا۔ کال اٹھائی...... اور پھر ساری رات وہ تھی اور اس کی رنگین باتیں...... خواب دیکھتی آنکھیں تھیں...... اِک خمار آمیز نشہ تھا جو کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور خوشیوں کا اڑن کھٹولا تھا...... اور وہ آسمانوں پر اڑی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''تو تمہیں...... تمہارے خوابوں کا شہزادہ مل گیا۔'' فرحانہ کا فون تھا۔ ایک دم اٹھا لیا اس کا علیک سلیک کے بنا طنزیہ جملہ کانوں میں پڑا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ تم ایسی تھیں تو نہیں...... ایک کے بعد دوسرا......'' صالحہ چپ چاپ سنتی رہی۔

''تو نہیں...... اور سہی اور نہیں اور سہی......''

''فرحانہ......'' صالحہ کو برا لگ گیا۔ ''میں نے کیا، کیا ہے؟''

''احسن مرزا تو دل پھینک عاشق تھا...... یہ ابرار خلیل مراد تمہیں کہاں مل گیا، عاشق مزاج رئیس زادہ...... اس کی تو کوئی کل سیدھی ہے نہ زندگی کا کوئی کنارہ ہے...... آوارہ مزاج بگڑا شہزادہ......''

''تمہیں کیسے پتا......؟''

''میری دوست پر نظریں گاڑی ہیں، میں کیسے بے خبر رہ سکتی ہوں۔''

''وہ بہت اچھا ہے، برا ہوتا تو میرا انتخاب نہیں کرتا۔''

''ہا...... ہا...... ہا۔''

''اس امیر عاشق مزاج شہزادے کا انتخاب تم نے کیا ہے ورنہ تو تم منتخب کی جا چکی ہو......'' صالحہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ مگر فرحانہ کو چھیڑنا آبیل مجھے مار کے مترادف تھا۔

''فرحانہ...... تم کیوں یہ باتیں کر رہی ہو......؟''

''تم یہ گھٹیا حرکتیں چھوڑ دو صالحہ، تم ایک شریف خاندان کی شریف زادی ہو، یہ گھومنا پھرنا، سمندروں کی سیر...... یہ کینڈل لائٹ ڈنر، تحائف...... تمہیں زیب نہیں دیتا تمہارے اندر اتنی لالچ کہاں سے بھر گئی۔''

صالحہ چونک گئی...... اتنی معلومات......

''تم میری جاسوسی کرتی ہو......؟''

''ہاں اپنی دوست کے لیے میں کنویں میں بانس ڈلوا سکتی ہوں۔ صالحہ یہ فضول حرکتیں چھوڑ دو...... وہ عاشق آوارہ ہے۔ ڈال، ڈال منڈلانے والا بھونرا...... ایسے لوگ کسی کا آئیڈیل نہیں ہوتے۔ ان بے انت خوابوں سے پیچھا چھڑاؤ...... بہت من مانی کر لی تم نے۔''

''ابرار بہت اچھا ہے، وہ اپنے پیرنٹس کو بھیجے گا۔''

''وہ اپنے پیرنٹس کو کیسے بھیج سکتا ہے۔ پاگل لڑکی اس کی بیوی شکاگو میں اس کے پیرنٹس کے ساتھ رہتی ہے، اس کے دو بچوں کو لے کر۔ آوارہ ابرار ہر سال

ان سے ملنے جاتا ہے، تم اسے کیا دے سکتی ہو بھلا..... سوائے اس کی ہوس پوری کرنے کے۔"

"فرحانہ بکواس مت کرو....."

"میری بات بری لگ گئی جب وہ کر گزرے گا تو وہ برا نہیں لگے گا۔ میں تمہیں سمجھا رہی ہوں، تم باشعور ہو۔ اب بھی سمجھ جاؤ۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو..... بکواس کر رہی ہو..... تم سے کسی نے غلط کہا ہے۔"

"تم مکمل مکھی نگل کر دیکھ لو..... خود ہی پتا چل جائے گا؟" صالحہ نے فون رکھ دیا تھا۔ اسے غصہ چڑھ رہا تھا۔ "فرحانہ مجھ سے جلتی ہے، مجھے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے تو اس سے برداشت نہیں ہو رہا۔ اونہہ..... ابرار شادی شدہ کیسے ہو سکتا ہے..... مجھ سے جھوٹ کیوں بولے گا..... وہ امیر زادہ ہے اسے کیا پڑی ہے کہ ایسا کرے، وہ میرے پیار میں دیوانہ ہے، وہ کیوں شادی شدہ ہونے لگا۔"

مگر اس کا ذہن الجھنے لگا تھا۔ فرحانہ کی بات کس حد تک درست ہے۔ یہ وہ کیسے پتا کر سکتی تھی۔

☆☆☆

"تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے.....؟" صبح ناشتے کی ٹیبل پر پاپا نے اس سے پوچھا۔

"بہت اچھی پاپا..... مجھے بہت مزہ آ رہا ہے۔"

"بی بی کب تک کے شوق ہیں یہ..... گھر بیٹھ کر شادی کی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"آپ خود کر لیں تیاریاں، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی کچھ ہی عرصہ ہوا ہے ابھی جاب کرتے ہوئے۔ کیوں پاپا.....؟" اس نے باپ سے ہمنوائی چاہی۔

"شادی تو لازمی ہے بیٹا جی....." اپنا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ بولے۔

"ہم اماں جان کو زیادہ عرصے تک نہیں روک سکتے۔" وہ باپ کی شکل دیکھنے لگی۔ اور حسن آرا، صالحہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ..... انہیں ایک دم سے خوف محسوس ہوا۔

"بس بہت ہو گئے شوق پورے..... اب گھر بیٹھو۔ بھلا دو سال اس ضد میں گزار دیے۔ ایم بی اے بھی ادھورا رہ گیا۔" صالحہ نے ماں کو دیکھ کر صبر کا گھونٹ بھرا اور ناشتا کرنے لگی۔

"کہہ تو تمہاری ماں بھی ٹھیک رہی ہیں، شوق تھا پورا ہو گیا۔ باہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"اگر میں ولید سے شادی نہ کروں تو....." ایک دم سے اس کے دماغ میں ابھرا جسے اس نے بمشکل ہونٹوں تک آنے سے روکا۔

"ولید....." اس نے دانت کچکچائے۔

"میری زندگی سے نکل جائے..... کسی کی آئی اسے آئے..... آئے کسی گاڑی کے نیچے اونہہ....." سر جھٹکا اور حسن آرا کی چھٹی حس انہیں کوئی سگنل دے رہی تھی..... بیٹی کے تیور بہت کچھ بتا رہے تھے۔

☆☆☆

"کیا بات ہے صالحہ کوئی مسئلہ ہے، بڑی خاموش ہو....." ابرار نے گود میں ہاتھ رکھ کر بیٹھی صالحہ کو بغور دیکھا۔ "لانگ ڈرائیو میں بھی تم خاموش تھیں۔ میں ہی بولتا رہا، تمہارے حسن کے قصیدے پڑھتا رہا۔ اب بھی لنچ کرتے ہوئے تم چپ ہو....." کھیرے کا سلائس زبردستی اس کے منہ میں ڈالا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" وہ چونکی۔

"پھر بھی..... چلو آج تمہیں میں گھر لے کر چلتا ہوں..... کچھ دیر وہاں بیٹھیں گے۔" اس نے بغور دیکھا۔

"اب تو لنچ ٹائم ختم ہونے والا ہے، ویسے بھی آفس میں آج کل کام بہت ہے۔"

جانے کیوں اس نے انکار کر دیا حالانکہ ابرار کے ساتھ تو وہ ہر جگہ جانے کے لیے ہمہ وقت تیار تھی۔ یہ فرحانہ کی بات کا اثر تھا۔ اس کی چھٹی حس تھی یا کسی کی دعا.....

"کوئی مسئلہ ہے؟" ابرار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

صالحہ نے نگاہ اٹھا کر لو دیتی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا۔

"ہمیں اپنے رشتے کو نام دینا چاہیے۔" جانے کیا جاننا چاہا۔

''محبت اور محبوب کا نام..... دنیا کا سب سے خوب صورت نام.....'' وہ ہنسا۔

''آپ کے پیرنٹس.....''

''وہ آئیں گے تو بات آگے بڑھے گی ناں.....'' سلاد کھانے لگا لاابالی سا انداز..... ایک، ایک پیس اس کے منہ میں بھی ڈالتا گیا۔

''اگر آپ مجھے چھوڑ گئے تو.....؟'' ممکنہ خدشہ زبان پر آ گیا۔

ابرار نے اسے دیکھا..... رکا، اٹھا اور اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ اپنا بازو اس کی پشت پر پھیلا کر اس کے قریب ہوا..... بھینی، بھینی لپک نے صالحہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کا سر ابرار کے شانے سے جا لگا۔

''کیسا تحفظ..... کیسا یقین چاہیے..... سند لے لو..... دے دوں.....؟'' بے حد قریب گمبھیر سی سرگوشی ابھری۔ وہ فیملی روم میں تھے۔

''تمہارے جیسی حسین لڑکی کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ یقین دلا رہا تھا۔ اِدھر دل بدگمان ہو رہا تھا۔

''ہم باقاعدہ منگنی کر چکے ہیں کہو تو ابھی نکاح کر لیں۔''

''اتنا آسان ہے نکاح کرنا.....'' اس نے سر اٹھایا۔

''ہاں.....؟'' اس نے ماتھے پر آئے بال سنوارے۔

''تمہارے لیے محبت میں سب جائز ہے؟'' دل میں قرار جھولنے لگا..... کہیں بھی تو جھوٹ کا شائبہ نہ تھا، فرحانہ جھوٹ بولتی ہے، ابرار غلط نہیں ہے۔ وہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔

انگلی میں پڑی یاقوت کی انگوٹھی گھمائی۔ دل بے ایمان ہونے لگا۔

''محبت فریب کیسے ہو سکتی ہے..... دھوکا کیسے ہو سکتی ہے۔'' مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آ گیا یقین.....؟'' کھسک کر پیچھے ہوئی۔

''چلیے..... لنچ کریں.....'' وہ واپس اپنی جگہ جا بیٹھا۔

''اب کس کا دل چاہے گا لنچ کرنے کو..... میرا تو..... میرا تو.....'' شرارت سے پلیٹ آگے سرکا کر اس نے کہا۔ ''میرا تو دل تمہیں کھانے کو چاہ رہا ہے۔'' وہ شوخ ہوا۔ ''میرے پسند کے کپڑوں میں ہو، یہ کلر مجھے بہت پسند ہے۔'' اور گلابی کلر اس پر اٹھ بھی بہت رہا تھا۔ صالحہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''انگور کھٹے ہیں۔''

''ہم انگور میٹھے کرنا جانتے ہیں۔''

''کل ہم لانگ ڈرائیو پر دور چلیں گے گھر بتا کر آنا..... ویک اینڈ ہے ناں کل..... دیر سے گھر جانا۔''

''امی پانچ بجے سے گیٹ پر بیٹھ جاتی ہیں.....''

''پھر سارا دن کا آف لے لو ناں.....'' اس نے ایک اور راہ دکھائی۔

''ناممکن..... جاب ہے میری..... دو آف پہلے ہی کر چکی ہوں.....''

''چلو پھر سنڈے میرے نام کر دو..... گھر آ کر خوب مزہ کریں گے۔ گھومنے جائیں گے، شاپنگ کراؤں گا۔'' پھر لالچ دیا۔

''نہیں ابھی مشکل ہے.....''

''کیا مطلب ہے.....؟'' ابرار کو غصہ آ گیا۔ ''یہ نہیں..... وہ نہیں..... یہ آسان..... یہ مشکل..... کیوں کی تھی پھر محبت۔''

اسے اس کے غصے پر پیار آ گیا۔

''سمجھا کریں ناں.....؟'' بازو پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے نہیں سمجھنا..... بس۔'' اس نے منہ پھلا لیا مصنوعی غصے سے۔

''اچھا میں دیکھوں گی، ابھی تو مجھے آفس چھوڑ دیں۔ پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔''

بیگ لے کر وہ کھڑی ہو گئی..... ابرار اسے دیکھتا رہا۔ صالحہ نے اسے بازو سے کھینچ کر اٹھایا۔ وہ کھنچا چلا آیا۔

گاڑی اسٹارٹ کی پھر سارے راستے منہ بنا رہا۔ کوئی بات نہیں کی۔

''میں فون پر بتاؤں گی کب آؤں گی۔ ناراضی ختم۔''

''پکا.....؟'' وہ خوش ہوا۔

''پکا..... میں آپ کی ناراضی برداشت نہیں

کرسکتی ابرار۔" اتنا کہہ کر وہ اتر گئی تھی۔

ابرار نے گاڑی آگے بڑھالی۔ صالحہ اُدھر ہی کھڑی رہی..... کتنے لمحے گزر گئے۔

"بڑی اونچی اڑان ہے....." بے حد قریب سے آواز ابھری۔ پلٹی تو فرحانہ کھڑی تھی۔

"محتاط نہیں ہوئیں ناں تم پھر بھی گھومنا پھرنا ہے جانتی ہو کتنا بڑا آوارہ مزاج ہے وہ ہر جگہ کہانیاں چھوڑنا اس کا معمول ہے۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ آگے چلنے لگی۔ فرحانہ ہمراہ ہوئی۔ "وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتی ہو اور ہم شادی کریں گے۔"

"وہ ایک ریاکار اور مکار شخص ہے۔ پکا دھوکے باز....." فرحانہ بڑے وثوق سے کہہ رہی تھی۔ صالحہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"مت جلو ہماری محبت سے ایسا نہ ہو کہ ہماری دوستی میں دراڑیں پڑ جائیں۔" کہتے، کہتے وہ آفس میں داخل ہوگئی۔

"پہلے کون سی سلامت ہے دوستی....." اس کے مقابل آکر اس کی ٹیبل کے سامنے ہی سیٹ سنبھال لی..... لوگ لنچ کے بعد واپس آرہے تھے۔

"یہ جو ہم میں تم میں نبھاہ ہے
میرے حوصلے کا کمال ہے

میں ایک بجے تک آفس آگئی تھی پتا چلا تم ضروری کام سے ساڑھے بارہ بجے ہی جا چکی ہو۔" صالحہ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"ان ضروری کاموں کو کم کردو ایسا نہ ہو میں انکل سے تمہاری شکایت کرکے تمہیں گھر ہی بٹھادوں۔"

"فرحانہ..... میرے معاملے میں مت بولو..... میں ابرار کے لیے کسی سے سمجھوتا نہیں کروں گی سمجھیں۔" دوٹوک انداز تھا۔ "میں خود عقل وشعور..... رکھتی ہوں....."

"آں ہاں....." مذاق اڑایا۔

"وہ اوباش، عیاش شخص..... لڑکیوں کا شکاری....."

"مگر تم کیسے جانتی ہو....." اس نے فرحانہ کی بات کاٹی۔

"میں نہیں جانتی عباس (فرحانہ کا منگیتر اور کولیگ) جانتا ہے۔ عیاش باپ کا اوباش بیٹا..... جانتی ہوناں عباس صحافی ہے۔ اس نے تمہیں کلب میں دیکھا تھا اور پھر مجھے بتایا تھا۔ وہ سوئمنگ کررہا تھا اور تم کنارے پر بیٹھی تھیں۔" لمحہ بھر کو صالحہ کی آنکھیں جھکیں۔

"میری جاسوسی کرواتی ہو.....؟"

"ہاں تمہارا مستقبل محفوظ رکھنے کے لیے....." اس نے برملا اعتراف کیا۔

"میرا مستقبل اس کے ساتھ ہی محفوظ ہے۔"

"تم خوش فہمیوں میں مت رہو..... صالحہ....."

"فرحانہ....." صالحہ زچ ہوگئی۔

"بجائے تم میرا ساتھ دینے کے مجھے اس راستے سے بھٹکا رہی ہو....."

"تم غلط راستوں کی مسافر بن رہی ہو صالحہ..... عباس نے تمہاری دلچسپی دیکھ کر ساری معلومات اکٹھی کی ہیں اور مجھے سب بتادیا ہے۔"

"مجھے فی الحال اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔" وہ اتنا کہہ کر رہ گئی۔ فرحانہ کو کیسے جھٹلاتی اتنا یارانہ تھا۔

☆☆☆

کتنے دن ہوگئے تھے اس کا ولید سے سامنا ہی نہیں ہوا۔ شکر تھا نہیں ہوا..... الماری کھول کر وہ کھڑی ہوگئی۔

"فضول بکواس ہی کرنی ہے کیا دے سکتا ہے وہ مجھے..... کیا ہے اس کے پاس۔ ابرار کے مقابل کھڑا ہوسکتا ہے۔ کتنے مہنگے سوٹ دلاتا ہے، حیثیت ہے ولید کی.....؟ میں کیسے ایک لگی بندھی روٹین کے ساتھ رہ سکتی ہوں..... چند ہزار میں سے کتنوں کا حصہ ہوگا۔ میرے حصے میں کیا آئے گا کسمپرسی، غریبی نہیں ہرگز نہیں، میں ابرار کے مقابلے میں کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کروں گی..... زندگی سے پیسہ نکال دو تو کیا بچتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں....." وہ ابرار کے دیے گئے تحائف دیکھتے ہوئے سوچے جارہی تھی۔

☆☆☆

ابرار لمحہ، لمحہ اس پر جال پھینک رہا تھا۔ ابرار کے ساتھ ہوتی تو خود کو ہواؤں کا ہم سفر خیال کرتی یہ احساس ہی قابلِ فخر تھا کہ اسے اس کا آئیڈیل مل گیا تھا۔ اس کی رسائی میں تھا۔ آج پھر وہ اسے لینے آیا تھا۔

''تم آج بھی گھر جانے سے انکار کر دینا۔'' ڈرائیو کرتے ہوئے گلہ آمیزی سے اسے دیکھا۔

''میں ایک ہی دفعہ باقاعدگی سے جانا چاہتی ہوں۔'' صالحہ ہنس دی۔

ابرار احمد نے گاڑی ایک سائڈ پر روک دی قریب کھڑے نارمل والے کو اشارہ کر کے بلایا۔ اسٹرا لگوا کر پورا نارمل لے لیا۔

''تم ابھی تک برانے دور میں جی رہی ہو..... صالحہ ہم مل گئے تو سب مل گئے۔ باقاعدہ بھی چلی آنا..... بے قاعدگیوں کے ساتھ بھی تو چلو.....''

اسٹرا سے گھونٹ لے کر نارمل اس کی جانب بڑھایا۔

''زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ تم ابھی تک وہیں پیچھے ہو.....'' وہ معنی خیزی سے ہنس کر بولا تھا۔

''دیکھو ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں، پہچانتے ہیں ہماری دوستی ہے پھر فاصلے کیوں.....؟''

''دوستی.....؟''

''ہاں، دوستی..... جسے تم لڑکیاں محبت کہتی ہو، محبت امر ہے پھر بھی خوف ہے تمہیں..... کس بات کا خوف؟''

''بات خوف کی نہیں ہے ابرار.....''

''پھر؟''

''بات احتیاط کی ہے، شرم وحیا کی ہے..... حدود کی ہے۔''

''کیا..... میں تمہارا..... برا چاہوں گا؟'' اس نے دانہ ڈالا..... ''اب بہت ہو چکی.....'' صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ حد ہو گئی۔ ذرا سی لڑکی نے اتنے ماہ لے لیے۔ اب انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہی پڑیں گی۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔

''میرے کچھ خواب ہیں۔''

''خوابوں کی تعبیر تو مل گئی ہے ناں میری شکل میں.....'' وہ جذباتی ہوا۔

''تو پھر..... انتظار کیسا.....'' شوخی جسارت سے وہ آگے بڑھا۔

''آپ کے گھر والے..... انتظار آپ کی طرف سے ہے۔''

''تو میں تو تیار ہوں.....'' وہ مزید آگے ہوا۔

''مجھے شادی کرنی ہے آپ سے، عزت ہوں میں آپ کی محبت کے سارے رنگ صرف آپ کے لیے ہیں ابرار.....''

''شادی.....'' لگتا تھا کوئی کڑوا سا گھونٹ بھرا۔

''تم لڑکیاں شادی تک بڑی جلدی پہنچ جاتی ہو، بھئی یہ شادی ہی دوستی کی محبت کی منزل ہوتی ہے۔'' اس کا منہ خراب ہو گیا۔

''ہاں ہر راستے کی ایک ہی منزل ہوتی ہے اور ہماری منزل بھی شادی ہے۔'' وہ سر گھما کر باہر دیکھنے لگی۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔'' اس نے اس کا سر گھما کر اپنی طرف کیا۔

''میرا آپ کے ساتھ ہونا کیا مطلب رکھتا ہے؟''

''ہاں..... میرے ساتھ ہو..... گرتنی دور ہو یہ تم جانتی ہو۔''

''دوری، بہت ضروری ہے ہمارے لیے.....''

''میں نہیں مانتا.....'' اس نے بچوں کی طرح منہ بسورا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھائی..... رفتار بہت تیز تھی۔ صالحہ نے گھبرا کر بازو ہلایا..... اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ پوری طرح ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ اِک تڑپ سی صالحہ کے اندر اتر گئی۔

اور اسی تڑپ نے اسے کئی دن تک بے قرار رکھا۔ ابرار اس سے بات نہیں کر رہا تھا، فون بند تھا۔ اس کا منہ اتر گیا۔ طبیعت میں اداسی اتر گئی۔

کہاں جائے کس سے پتا کرے، اسے تو اس کے آفس کا بھی نہیں پتا تھا کبھی اس نے بتایا ہی نہیں۔ ہاں گھر ضرور معلوم تھا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

pklibrary.com

"دیکھ رہے ہیں آپ، کہا، کہا کر آپ کی بیٹی کا کیا حال ہو گیا ہے۔" رات کھانے کی ٹیبل پر دانستہ چکنی صالحہ کی جانب حسن آرا نے اشارہ کیا جس کا اترا ہوا چہرہ اس کے بیمار ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

"تھک گئی ہو نوکری کر کے......؟" پاپا نے اس کی جانب دیکھا۔

وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔

"صالحہ......"

"جی...... جی پاپا......" سر اٹھایا۔

"کہاں گم ہو بیٹا......؟ کیا ہوا......؟"

"کچھ نہیں پاپا......" اس نے آہستگی سے کہا۔

"بس فلوز کام کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہے۔"

"سوپ بنوالیں۔"

"جی......"

"میں کہتی ہوں ہو گیا شوق پورا...... بیٹھو گھر میں...... دادی پوچھ رہی تھیں تمہارا...... دکھا آؤ ان کو چہرہ...... آپ بھی اب تاریخ دے ہی دیں۔" حسن آرا...... باپ، بیٹی دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

صالحہ کی طبیعت بیزار ہونے لگی۔

"امی مجھے ابھی شادی نہیں کرنی...... سمجھائیں پاپا، امی کو، کیا ملے گا میری شادی کر کے۔"

ابراہیم احمد تو اسے دیکھتے رہ گئے۔

صالحہ اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

"یہ ہے آپ کی آزادی کا نتیجہ...... خود ہی بھگتیے گا، مجھے الزام مت دیجیے گا میں تو اول روز سے ہی جاب کے خلاف تھی۔" حسن آرا صاف بری الذمہ ہو گئیں۔

ابراہیم احمد انہیں دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئے۔

☆☆☆

فون کی بیل پر نمبر دیکھ اس نے کال اٹینڈ کی۔ طبیعت بے حد اداس اور مضمحل تھی۔

"ہیلو......" دھیمی سی آواز میں کہا۔

"آفس میں ہو صالحہ......؟"

"ہاں......"

"لنچ کرنے باہر نہیں گئیں......؟" فرحانہ کی آواز میں حیرت تھی۔

"نہیں، میں روز نہیں جاتی۔"

"جاتی تو روز ہی ہو بس پچھلے سات آٹھ دن سے نہیں جا رہیں کیوں؟" فرحانہ کی آواز میں طنز تھا۔

"تم کیوں میری جاسوسی کرتی ہو؟" وہ دبی دبی آواز میں چلائی۔

"میں تمہیں گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی...... تم میری بچپن کی دوست ہو، صالحہ ابراہیم......"

"اچھا...... کیوں فون کیا......؟ اور نمبر بھی کوئی اور ہے۔"

"تمہاری محبت کی خبر گیری کے لیے...... میرا نمبر تو تم نے شاید بلاک کر دیا ہے۔"

"کہاں ہیں یہ ابرار خلیل مراد۔"

"تم سے مطلب......؟"

"مجھ سے ہی تو مطلب ہیں، بڑے اونچے اڑ رہے ہیں صاحب سوچا پہلے تم سے پوچھ لوں محبت برقرار ہے کہ اڑ گئی۔"

"فرحانہ......"

"ویسے کوئی حیرت کی بات نہیں میرے لیے کیونکہ ان جیسے لوگ لمحہ لمحہ محبت کرتے ہیں مگر کسی سے محبت نہیں کرتے ان کی محبت ہوس ہوتی ہے یہ کسی کے نہیں ہوتے مگر سب کے ہوتے ہیں۔ دولت کی چمک ان کی جانب ہر شے، ہر جذبے کو کھینچ لیتی ہے۔"

"اس بکواس کا مطلب......؟"

"تمہارے دماغ کے دروازے بند ہو گئے ہیں اتنی اہم معلومات تمہیں بکواس لگ رہی ہے۔ تو بائے۔"

"فرحانہ......" بے اختیار روکا۔

مگر فرحانہ نے اسے مزید زچ کرنا تھا اس لیے سیل آف نہیں کیا تھا۔

"ہاں بولو......"

"کیوں بول رہی ہو ایسا......؟"

"میرا یقین کر لوگی......؟"

صالحہ چپ رہی۔

"بتاؤ ابرار کہاں ہے؟"

pklibrary.com

''معلوم نہیں اس کا سیل آف جا رہا ہے۔''

''سارے مزے لوٹ کر اس نے یہی کرنا ہے۔'' لفظ تیر بنے۔

''پلیز فرحانہ.....'' اس کا دل بوجھل ہوا آنسو بہنے لگے..... محبت تو اس نے کی تھی۔

''ڈھونڈوا سے۔''

''کہاں.....؟''

''جہاں، جہاں تم سمجھتی ہو اس کے ملنے کا امکان ہے..... مگر ایک بات یاد رکھنا، وہ کہیں نہیں ملے گا۔ ایسے لوگ کہیں نہیں ملتے..... جن کا معیار دولت ہو، پیمانہ دولت ہو..... جذبے، پیسہ ہوں..... اور عورت عیش ہو..... یہ آوارہ، عیاش لوگ پیسے سے ہر جذبہ خریدتے ہیں۔ تم ان لوگوں کو کہیں بھی دیکھ سکتی ہو۔''

''پلیز فرحانہ.....''

''اب بھی وقت ہے قتل کے ناخن لو، میں گھر آ کر تم سے بات کرتی ہوں..... بائے۔''

آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے۔

اسے ابرار سے کتنی محبت تھی کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ کہاں تھا۔ کس حال میں تھا، یہ فرحانہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو اس سے ناراض تھا، خفا تھا۔

''آجاؤ ابرار ایک بار آجاؤ، میں منالوں گی، ساری ناراضی ختم کردوں گی۔ پلیز اپنی خبر دو ابرار.....''

گھر جا کر بھی دل بھرا رہا تھا۔ کہیں نہیں لگ رہا تھا، باہر سیاہ گھور اندھیرا تھا، تاریکی تھی آسمانوں کا روشن چاند بھی شاید گرہن میں تھا۔ نیچے جھانکا تو ایک دم پیچھے ہوگئی۔ پاپا اور ولید نیچے بیٹھے تھے۔

''میں صبح ابرار احمد کے گھر جاؤں گی، بہت لڑوں گی اس سے مجھے یوں کیوں تنہا، اکیلا چھوڑ دیا تھا۔'' آنسو تھے کہ امڈ کر آ رہے تھے۔ ولید نے ابھی تک انکار نہیں کیا تھا دادی کا حکم نامہ جاری ہونے کو تھا۔ ابرار کا پتا نہیں تھا۔ بے چینی، بے بسی سوا تھی۔ اوپر سے یہ فرحانہ جانے کیا بکواس کر رہی تھی۔ بے قراری نے وجود کو جکڑ رکھا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن لنچ ٹائم میں وہ ابرار احمد کے گھر آ گئی۔ گیٹ پر ہی چوکیدار نے بتایا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

''کب آئیں گے؟'' رشک سے شاندار بنگلے کو دیکھا۔

''ضروری کام سے گئے ہیں۔'' چوکیدار خاص اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آپ کا نام.....؟''

''فاریہ بتا دینا.....'' رکشے میں بیٹھ کر اسے آگے چلنے کا اشارہ دیا۔

''تمہارے دعوے، باتیں تعریفیں سب جھوٹ تھیں۔'' آنکھیں بھیگنے لگیں۔

اگلے دو دن تک ابرار کو فون کرتی رہی پر فون بند رہا تھا۔ فرحانہ آ گئی تھی۔

''تم کیا بکواس کر رہی تھیں اس دن.....؟'' گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

''بکواس نہیں..... حقیقت، ثبوت کے ساتھ کہا تھا مگر تم نے کیا یقین کیا ہوگا..... تم تو اب بھی اپنی آئیڈیل محبت کی یاد میں آنسو بہا رہی ہو.....'' اس کی حالتِ زار کا مذاق اڑایا۔

''تم اس کے بارے میں اتنی بدگمان کیوں ہو..... ابرار ایسا نہیں ہے کوئی اور مسئلہ ہو سکتا ہے کوئی کام پڑ سکتا ہے، کوئی مجبوری.....'' گارڈ کی بات سن کر بھی وہ مان کے نہیں دے رہی تھی۔

''خیر زبانی تو تمہیں یقین آئے گا نہیں اس لیے میں نے اور عباس نے بڑی مشکل سے ثبوت اکٹھے کیے ہیں اب بھی تمہیں عقل نہ آئی تو تمہاری مرضی..... یہ لو..... دیکھو۔'' سیل اس کی جانب بڑھایا۔ ''تمہاری عاشقی کس حال میں ہے۔''

صالحہ نے فون تھام لیا۔

وہ، وہ ابرار خلیل مراد تھا، مختلف اسٹائل میں..... لڑکی کے ساتھ..... ہر تصویر میں لڑکی مختلف تھی۔ پارک، ہوٹل، سمندر کا کنارہ، بند کمرا، مدہوشی میں لہراتے ہوئے ہاتھ میں گلاس..... بغل میں چھپی لڑکی.....

''یہ یہ.....'' صالحہ بدحواس ہوئی۔

''ہاں..... یہ تمہارا آئیڈیل، تمہاری محبت.....''

فرحانہ نے آہستہ آہستہ بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

صالحہ نے بے یقینی سے پھر دیکھا۔ قریب کر کے بار، بار دیکھا۔ اسی کی محبت اسے منہ چڑھا رہی تھی۔

آنسو خشک ہو گئے۔ فرحانہ کے الفاظ اس کی آئیڈیل محبت کے پرخچے اڑا رہے تھے۔

”یہ ہوس کے پجاری محبت نہیں کرتے دعوت عیش دیتے ہیں۔ اور جیتے جاگتے انسانوں سے کھیلتے ہیں۔ چند روپے دکھا کر سب کچھ لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔“

اور اس کا بھی سب کچھ لٹ چکا تھا۔

”ٹھیک ہے...... یہ سب مجھے سینڈ کرو......“ پھر وہ خود ہی جلدی، جلدی اپنے نمبر پر سینڈ کرنے لگی۔

”کیا کرو گی......؟ تم کچھ نہیں کر سکتیں کوئی پوچھ گچھ نہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے ان جیسے اوباش مردوں کی نظر میں سود و زیاں نہیں ہوتا...... بس پیسہ، سب کچھ ہوتا ہے یہ خدا کی ڈھیلی رسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وہ رب جب حساب کتاب پر آتا ہے تو رسی پوری کھینچتا ہے کہ بندہ منہ کے بل گرتا ہے یوں کہ اٹھ بھی نہیں پاتا۔ اور تم اس سے اب پوچھ گچھ کر کے کرو گی بھی کیا۔“ مگر صالحہ سن کب رہی تھی ”کیا تم سمجھ نہیں سکی تھیں کہ وہ تمہیں استعمال کر رہا تھا۔“

اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ محبت کے میدان میں کوئی بھی لٹ سکتا ہے...... شکر تھا کہ عزت بچ گئی تھی۔ اس کا انتخاب غلط تھا...... یا آئیڈیل کی تلاش۔

☆☆☆

اگلے دن وہ پھر اس سفید اور گرے بنگلے کے سامنے تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ وہ سیدھی اندر گئی۔ ڈرائنگ روم میں ابرار نظر آ گیا۔

”تم......!“ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

”آہا آؤ بھئی......“ پھر خوش ہوا۔

صالحہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ جس کے لیے سب کچھ قربان کیا...... وہ کیسے خوش باش کھڑا تھا۔

”آئیے، آئیے، آخر آ گیا آپ کو ہماری ناراضی کا خیال......“

بانہیں پھیلا کر اس کی جانب بڑھا۔

بکھرے بال، ملگجے کپڑے، ستا ہوا چہرہ......

”یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے...... میں نے کہا تھا ناں مجھ سے ناراض مت کرنا۔“ مسکرا کر ہاتھ بڑھا کر اس کے بال سنوارے قریب ہو کر دوسرا بازو شانے پر رکھا۔

وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

”یہ...... یہ کیا ہے؟“ موبائل کھول کر سامنے کیا۔

جانے کیوں معصوم سی خواہش ابھری...... ابرار کہہ دے کہ یہ جھوٹ ہے، یہ سازش ہے، میں بھی تمہارے لیے بے قرار تھا۔ محو انتظار تھا۔

”ہاہاہا...... یہ...... بڑی جاسوسہ ہو اتنی خبر گیری...... آ گیا تمہاری محبت پر یقین......“

”کہہ دو یہ جھوٹ ہے......“ ابھی تک وہ اس امید پر تھی۔

”یہ سچ ہے...... یہ میں ہی ہوں، میری جوانی، میرے شوق۔“ وہ بے باکی سے کہہ رہا تھا۔

”اور...... اور میں کہاں ہوں......؟“ اس کے آنسو بہہ نکلے۔

”تم اچھا وقت ہو، اچھی لڑکی ہو مگر تم وہ نہیں ہو جو میں...... صالحہ ابراہیم...... میں تمہیں اپنا دوست مانوں گا۔ تم کل تو میری بات مانو......“ ایک دم سے آگے بڑھا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔ ”اب کے تم میرے سامنے آ گئی ہو تو میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔“

صالحہ کے حواس گم ہونے لگے۔

”اتنا تم پر لٹایا ہے اتنا تو میرا حق بنتا ہے نا۔“

وہ اس کے رخسار پر جھکا۔

”چھوڑ دو مجھے......“ مچل کر زور لگا کر بازو پر کاٹ کر اس کی گرفت سے نکلی۔

”تم نے مجھ سے فراڈ کیا، میری معصومیت سے کھیلے...... مجھے، مجھے......“ وہ بپھر گئی۔

”میں کہاں، تم لڑکیاں خود اپنے دام میں پھنستی ہو، تم خود بار، بار آئیں میرے پاس...... میں دوستی چاہتا تھا اور...... تم محبت کرتی تھیں۔ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں...... مگر میں تمہیں جان گیا۔ اس لیے تمہیں اور بے قرار کیا۔ تم نے مجھے جانا ہی نہیں جبھی آج پھر آ گئیں میرا صبر

لوٹنے۔'' وہ اس کی جانب بڑھا۔

خوف و دہشت کے ملے جلے احساس سے وہ پیچھے ہٹی اور صوفے پر گر گئی۔ خوف و دہشت سے دل بند ہونے لگا۔ قریب آ کر ایک پاؤں صوفے پر رکھ کر وہ اس پر جھکا۔ چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا۔ کیچر جانے کہاں گرا تھا۔

''نا..... نہیں..... ہٹو تم.....'' وہ اٹھنے لگی۔

''اب بولو..... جانے دوں یا.....''

''پ..... پلیز.....'' ہاتھ جوڑے۔

قہقہہ لگا کر پہلو میں گرا..... قریب بے حد قریب..... وہ اٹھنے لگی تو دوپٹا گلے میں پھنسا..... اس کے نیچے دبا..... گلا گھٹنے لگا۔ کھانسی کا پھندا۔

ابرار نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''نہیں، نہیں.....'' وہ زور سے چیخی..... اس کی بری حالت ہوئی۔ ابرار لطف لے رہا تھا۔

''مم..... مجھے جانے دو.....'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

اس کی بے بسی پر ابرار نے ہاتھ تھام کر چوم لیے..... بلبلا کر وہ پیچھے ہٹی۔

''مجھے جانے دو.....''

محبت رُل گئی تھی۔ مٹی ہوگئی۔ بھلا عزت سے بڑھ کر محبت ہو سکتی ہے۔

''اگر نہ جانے دوں.....؟'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی..... محبت کی بے خودی پر، اپنے آئیڈیل کے ٹوٹنے پر اپنی سوچ پر.....

''اے خدا..... بس ایک بار..... ایک بار مجھے یہاں سے رہائی مل جائے.....'' دل سے دعا نکلی۔

ابرار احمد کی پیش قدمی اسے ہراساں کر رہی تھی اور وہ اسے ڈرا رہا تھا، دھمکا رہا تھا وہ اس کے چنگل سے چھٹکارے کے لیے مچل رہی تھی۔

تبھی اس کا سیل بجنے لگا زور، زور سے۔ ابرار نے جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ خود کو سنبھال کر کھڑی ہوئی..... سیل بج رہا تھا۔

ابرار نے پلٹ کر سیل اٹھایا۔

''ماما کالنگ.....'' نظر اٹھا کر حراساں سی صالحہ کو دیکھا۔ اسے ترس آ گیا۔

''تم، تم بہت لکی ہو جانے کس، کس کی دعائیں تم پر سایہ فگن ہیں، قدر کرو ان مہربانوں کی۔''

سیل اس کی جانب بڑھایا۔

ساتھ ہی آن کر دیا..... ڈر کر سیل جھپٹا۔

''صالحہ..... صالحہ کدھر ہو، میرا دل گھبرا رہا ہے، گھر آؤ فوراً موسم خراب ہے۔'' حسن آرا کی بے قرار آواز.....

ماں کی آواز اسے ستون لگی..... مضبوطی سے تھام لیا۔

''آ رہی ہوں امی راستے میں ہوں.....''

''جلدی سے آ جاؤ پاپا کو بھیج دوں.....''

''نہ، نہیں بس آ رہی ہوں۔'' فون بند کر دیا۔

خوفزدہ ہو کر ابرار کو دیکھا۔

دل میں محبت کا شائبہ تک نہیں تھا۔

دو قدم پیچھے ہٹی..... ابرار کے ساتھ اتنا عرصہ گزارہ تھا خوف نہیں محسوس ہوا تھا لیکن آج ابھی، ان لمحوں میں ان لمحوں نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔

''جاؤ چلی جاؤ..... آئندہ ان راہوں میں نہیں آنا..... یہ راہیں شریف گھرانوں کے لیے نہیں ہیں صالحہ ابراہیم..... تم آج بچ گئیں۔ تمہیں کسی کی دعاؤں نے بچا لیا۔ جاؤ ان دعاؤں کی قدر کرو..... میرا صبر نہ آزماؤ اور..... اور..... نہ خود کو تماشا کرو۔'' ابرار اٹھتے ہوئے جیسے غرایا..... یہ کیا ہوا تھا، ماں کی دعائیں شامل حال تھیں۔ جبھی وہ شیر کی کچھار سے سلامت چلی آئی تھی۔ وہ پلٹ کر دہشت زدہ ہو کر بھاگی تھی۔ کاریڈور لاؤنج، راہداری، لان کی سیڑھیاں سب عبور کر کے۔ طویل قامت گیٹ کے پاس آ رکی..... پیچھے پلٹ کر دیکھا..... کوئی نہیں تھا۔ اپنے حواس بحال کیے۔ دوپٹا اوڑھا اور باہر نکل گئی..... آٹو والا جانے کیوں کھڑا تھا۔ بڑھ کر اس میں بیٹھی، پلٹ کر بنگلے کی چوکیدار معنی خیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

رکشے والے کو جہاں سے آئی تھی، چلنے کو کہا۔ ایک دہشت و خوف تھا جو اس کے وجود سے لپٹ گیا تھا۔ اس کا آئیڈیل چور، چور ہو گیا تھا۔ مٹی کا بت تھا جو بھربھرا ہو گیا۔

اتنی گھٹیا ذہنیت، اتنی گری ہوئی سوچ..... وجود میں جھرجھری سی بھر رہی تھی۔

سیل فون بج رہا تھا، پاپا کالنگ پر تھے۔

اس وقت کسی سے بات کی ہمت نہیں تھی۔ صرف میسج ٹائپ کر دیا۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ صدمہ شدید تھا، سر بوجھل ہو رہا تھا۔ گھر قریب آ رہا تھا اور وہ خود کو سنبھال رہی تھی۔

☆☆☆

دکھ، صدمہ، خوف، دہشت بخار کی شکل اختیار کر گیا۔ اگلے کئی دن اسی کے لپیٹے میں رہی۔ فیملی ڈاکٹر نے گھر آ کر چیک کیا تھا۔ امی، دادی، بھابی، ابو، بھائی سب کو پوچھ رہے تھے۔ امی دم کر رہی تھیں۔ ایک سکون اور اطمینان کی نیند ہی جو اسے بیدار نہیں ہونے دے رہی تھی۔

کئی دن بعد باہر آئی تو ہر چیز نئی لگی۔ دادی اسے چوم رہی تھیں۔ امی، پیار کر رہی تھیں اور پاپا فتوی دے رہے تھے کہ اب کوئی نوکری نہیں کرنی ہو گیا شوق پورا۔

☆☆☆

نارمل ہوئی تو اس نے اپنا..... موبائل اٹھایا..... اور اس ستم گر، شیطان، ہوس کے پجاری کے نقش مٹانے لگی۔

''محبت کچھ نہیں ہوتی۔ آئیڈیل کچھ نہیں ہوتا۔ قسمت سب کچھ ہوتی ہے، تقدیر میں رقم ہی آخر ہوتا ہے۔ یہ ہم لڑکیوں کے جھوٹے خواب ہوتے ہیں جو خود کو اتنا گرا لیتی ہیں۔ خواب کچھ نہیں ہوتے۔ حقیقت سب کچھ ہوتی ہے۔ والدین کے فیصلے ہی معتبر و محترم ہوتے ہیں۔ وہ اولاد کے بارے میں سب جانتے ہیں اور سب ہم۔'' آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''ہم اپنی ماؤں کو کتنا غلط سمجھتے ہیں۔'' اسے حسن آرا پر پیار آ گیا۔ ان کا انتخاب درست تھا۔

تصویریں، ان باکس، کال، مسز کالز، ایک، ایک کر کے سب ڈیلیٹ کرتی گئی۔ اس کا موبائل ری فریش ہو گیا۔ ابرار کے نمبر کو بلاک کر دیا۔ محبت کا ماتم بھی ہو گیا تھا اور مدفن بھی۔

دھیرے سے اٹھی۔ الماری سے سبز بیل والا لائٹ گرین سوٹ نکالا، جسمانی اور ذہنی گندگی گویا مٹا دی۔ بہت دیر تک غسل صحت لیا۔ باہر نکل کر رب کے حضور شکرانے کے نفل پڑھے۔ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا کافی دیر تک لان میں بیٹھی رہی تھی فرحانہ آ گئی۔ اس کے گلے لگی اور اس کے پہلو میں بیٹھی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہیں اتنا شدید بخار تھا' میں عباس کے ساتھ حیدرآباد گئی ہوئی تھی ایک خبر کے سلسلے میں پھر اس کی تائی کا انتقال ہو گیا۔ بس اس میں بزی رہی۔ تم ٹھیک تو ہو؟'' بغور اس کا جائزہ لیا۔

''ہوں اب ٹھیک ہوں..... بہت شکریہ تمہارا فرحانہ.....'' فرحانہ کو معلوم تھا وہ کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

''میں تمہارا کبھی برا نہیں چاہ سکتی۔''

صالحہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

''ہم لڑکیاں کتنی بیوقوف ہوتی ہیں چمکتی ہوئی چیزوں کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ چمکتی گاڑی، چمکتے گھر، چمکتے چہرے قریب کی صاف ستھری نکھری چیزیں نظر ہی نہیں آتیں۔ آئیڈیل تو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ فریب

خواہش ہے کہ

خواہش ہے کہ ہر راہ پر تیرے ساتھ چلوں
یہی آرزو ہے ہر پل یہی ہے میرا جنوں
خواہش ہے کہ تیری راہ کے سارے خار چنوں
کاش کہ آخری سانس تک تیرے ساتھ رہوں
جو موقع دے مجھے یہ زندگی اے میری ماں
تو میں ہر پل ہر راہ میں تیرے ساتھ رہوں
نہ کوئی مجھ کو تجھ سے جدا کرے
نہ میں یہ بار جدائی اٹھا سکوں
خواہش ہے کہ تیرا ہر خواب میں حقیقت بنا سکوں
خواہش ہے کہ تجھے میں یہ بتا سکوں
تو ہی اولین چاہت ہے میری اے میری ماں
اگر ممکن ہو تو تیری راہ میں یہ پلکیں بچھا دوں
خواہش ہے کہ اے ماں سدا میں تیرے ساتھ رہوں

از: سارہ، لاہور

ہوتے ہیں دھوکا ہوتے ہیں۔'' وہ پُرتاسف لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''مجھے جانے کس کی دعا نے بچایا ہے فرحانہ..... تم بے شک ٹھیک کہتی تھیں۔'' آنسو ڈھلکتے ہوئے رخساروں پر پھیلے۔

''ولید کی محبت کی کتنی توہین کی تھی میں نے کیا، کیا کچھ نہ کہا تھا اسے..... اور..... وہ میرے گرد ہی رہا۔ میں تو اس کے قابل ہرگز نہیں۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رودی۔ فرحانہ نے اسے رونے دیا۔ دل ہلکا ہوگیا تو بوجھ اتر گیا۔

''تم کس کے قابل ہو یہ تمہاری واپسی بتا رہی ہے۔ بس اب اتنا کرنا کہ قدر کرنا پُرخلوص انسانوں کی بھی اور جذبوں کی بھی۔'' فرحانہ اس کا دلاسا بنی تھی۔

مسلسل گریہ سے آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

''میں معافی مانگوں گی اس سے مجھے معاف کردے گا ناں.....؟''

''ہاں..... کیوں نہیں وہ تو اپنے جذبوں میں سچا ہے ناں.....''

''ہاں میں ہی اسے کم مایہ سمجھتی رہی۔ میں نے اپنے قول و عمل سے امی کا بھی بے حد دل دکھایا ہے۔ انہیں منالوں گی۔''

صالحہ گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے فرحانہ کا ہاتھ تھامے ندامت کے آنسو گراتی دھیرے، دھیرے بول رہی تھی۔

فخر و انبساط کے ملے جلے احساس سے فرحانہ اسے دیکھ رہی تھی۔ تبھی زویا بھابی چائے فرائز اور کباب لے آئیں۔

☆☆☆

تو جو کرے پیار مجھ سے
چھوٹا سا گھر تجھ کو دوں گا
دکھ سکھ کا ساتھی بنوں گا
سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جانِ من
تجھ کو میں دے سکوں گا

حسبِ معمول ولید کے موبائل میں یہی دُھن بج رہی تھی۔ وہ اسے کان سے لگائے بیٹھی تھی، یہ گانا اب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ من میں اتر کر شانتی پھیلا رہا تھا۔ ایسے ذومعنی گانے وہ اسی لیے لگاتا تھا۔ وہ جب بھی اسے فون کرتی یہی گانا چل رہا ہوتا اور وہ زچ ہوجاتی۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں، میں مصروف ہوں اگر کال نہیں اٹھا رہا، مجھے یاد ہے مجھے کیا کرنا ہے۔ مت میرا دماغ خراب کرو یار..... میں نے دادی سے کہہ دیا بڑھ جائے گی تاریخ آگے سمجھیں۔'' فون بند ہوگیا۔

سخت الفاظ..... بیزار لہجہ، تنگ انداز اس کے کانوں کو گراں گزرا..... لمحہ بھر کو حواس باختہ ہوگئی۔ جانے کتنا مصروف تھا وہ..... ہاں تم مستحق ہو ان لفظوں کی اس انداز کی..... اپنے دل کو سنبھالا۔

''کہیں دیر تو نہیں ہوگئی۔'' دل دھک، دھک ہوا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا..... دل کو سنبھالا۔ خدشات کو جھٹک دیا۔

وہ لاؤنج میں بیٹھی بڑے سکون سے اندر ہونے والی بڑوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس میں قناعت بھی آگئی تھی اور شکر گزاری بھی۔

''اماں جان نے صاف منع کردیا ہے۔ تاریخ آگے بڑھانے کو اسی عید کے چاند میں شادی ہوگی تینوں کی ولید اور فراز کے ولیمے میں رابعہ کی رخصتی ہوگی۔'' اندر سب بیٹھے ان شادیوں کے متعلق باتیں کررہے تھے۔ صالحہ مسکرا رہی تھی۔

رات گئے ولید کو کال ملائی جانتی تھی جلد سوجاتا ہے سو وہی ہوا۔ نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

''ہیلو..... ہاں کیا ہوا؟''

''آں ہاں..... کچھ نہیں، تمہارے موبائل کی ڈائل ٹیون زبردست ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ولید کھول ہی تو گیا۔

''اتنی رات گئے اس لیے میری نیند خراب کی ہے، دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا تو۔'' فون آف ہوگیا۔

تکیہ سر پر رکھا پھر سونے لگا..... جانے کیا خیال آیا۔ اٹھا اور سیل فون آن کیا صالحہ کا نمبر ملایا کہ بے نقط سنا کر بدلہ لے ہی لے۔

صالحہ کے موبائل کی ٹیون بجنے لگی۔

''تنخواہ میں جب لے کر آؤں گا

لا کر میں تجھ ہی کو دوں گا
جب خرچ ہوں گے وہ پیسے.....''
وہ چونکا۔
''میں تجھ سے جھگڑا کروں گا
تو مسکرا کر ہنسے گی
آ کر گلے سے لگے گی''
ولید جز بز ہوا..... یہ ٹیون..... انگلش کی جگہ.....
اتنی بڑی تبدیلی اس نے فون بند کر دیا۔
کچھ بھی کہنے کا خیال کل پر ڈال دیا۔ اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند کی گہرائیوں میں وہی گانا چلتا رہا۔

☆☆☆

آج سنڈے تھا دادی کی طرف جانے کا سوچا کتنے دن ہو گئے تھے۔ ان سے ملے۔ ولید سے بھی اپنے رویے کی معافی مانگنا بھی کتنی بری تھی وہ..... آگہی کے در کھلتے چلے گئے تھے۔
وہ سادگی سے تیار ہو کر امی کو بتا کر تایا کی طرف آ گئی۔
سرسبز نکھرا، نکھرا لان..... دھلے ہوئے بام و در..... لگتا ہے ابھی صفائی ہوئی تھی گیلی مٹی، سبزے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سوکھے پیلے گندے پتوں کا ذخیرہ کونے میں دھرا تھا۔
''یہ صفائی تو صرف ولید کرتا ہے۔'' دل دھڑکا۔
تیز پھوار اس پر برسی وہ ایک دم مڑی۔ مسکراتا ہوا ولید سامنے تھا ہاتھ میں پائپ پکڑے۔
''خوش آمدید..... راجکماری.....'' سر تسلیم خم کیا۔
الجھے سلجھے بال..... دل دھک، دھک کرنے لگا۔
''اے.....'' پھوار پھر اس پر پڑی۔
''نظر لگاؤ گی کیا؟''
رخ ترچھا کر لیا۔ آج کتنی گہری نظر سے دیکھا تھا۔
''کتنا حسین اور خوب صورت ہے ولید..... خواہ مخواہ خود کو خوار کرتی رہی۔''
''مجھے پتا چلا تھا کہ تم بستر علالت پر ہو، سوری تمہاری مزاج پرسی کے لیے نہیں آ سکا۔ ذرا مصروف تھا۔ کیا اب تم ٹھیک ہو؟'' عقب سے آ کر وہ بولا۔
اِک نگاہ غلط اس پر ڈالی۔
''بولتی بند ہو گئی ہے کیا؟'' وہ نل بند کر کے پائپ ایک جانب ڈال کر اس کے پاس آ گیا۔
''ناراض ہو؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
''مگر اب یہ ناراض وراض ہونے کی عادت چھوڑو میرے پاس ٹائم نہیں منانے کا..... اور ہاں دادی نہیں مان رہیں اب کے عید کے تیسرے دن ہم سب کا نکاح اور رخصتی ہے۔ چوتھے دن ولیمہ..... اور سنو..... یہ آئیڈیل وائیڈیل چھوڑو بھی۔ میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں بنا لینا مجھے جیسا چاہے پھر میں دادی کو دکھ نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی جاب کے سلسلے میں، میں آسٹریلیا جا رہا ہوں تمہیں ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کا راستہ طے نہیں کرنا پڑے گا۔''
چپ چاپ سنتی وہ دل میں ندامت محسوس کر رہی تھی اس کی آخری بات پر وہ چونکی۔
''یہ کب ہوا؟''
''جب تم آئیڈیل کی تلاش میں تھیں میں نے سوچا کہاں ماری، ماری پھرو گی، میں ہی کچھ ہاتھ پاؤں مار لوں.....'' وہ شرارت سے ہنسا۔
''ولید.....''
''بھئی..... ایک خوب صورت گھر، ہینڈسم شوہر..... گاڑی، پیسہ اور کیا کیا.....'' اس نے کہتے ہوئے کالر جھاڑے۔
اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ خفت و خجالت کا احساس رگ و پے میں سرائیت کر گیا۔ اس خواب نے کتنی بڑی ٹھوکر دی تھی اسے۔
''تمہیں گھریلو خانہ جنگی، رشتے ناتے، گھر داری وغیرہ سے بھی نجات مل جائے گی۔'' جانے وہ کیا جتانا چاہ رہا تھا۔
''ایک بات یاد رکھنا صالحہ، پیسہ، زندگی کے لیے بے شک ضروری ہے پیسے سے ہم پیٹ بھرتے ہیں زیست کی ضروریات پوری ہوتی ہیں مگر پیسے کے ساتھ زندگی نہیں گزرتی..... پیسہ ہو، دل میں احساس نہ ہو،

محبت نہ ہو تو ڈھیروں پیسہ بے وقعت ہے۔ شاہانہ مکان ہو محبت نہ ہو تو وہ گھر نہیں بنتا...... پیسہ انسان کو بھٹکا دیتا ہے...... میرے ساتھ رہ کر شکر گزاری کی عادت ڈالنا۔ تمہاری کوئی خواہش رد نہیں کروں گا۔ ان شاء اللہ بس جواب میں مجھے صرف محبت چاہیے، احساس چاہیے، محبت کا عکس اپنے گھر کی در و دیوار پر چھلکنا چاہیے۔''

ولید اسے سمجھا رہا تھا اور صالحہ ابراہیم کتنی سمجھدار ہوگئی تھی کوئی اس سے پوچھتا۔ نگاہ اٹھا کر ایک دم سنجیدہ ہوتے ولید کو دیکھا۔

''دیکھو میں ایک پُرسکون، ازدواجی زندگی گزارنا چاہتا ہوں اور میں سنجیدہ ہوں اب اگر تم کچھ اور چاہتی ہو تو بتا دو...... صرف ایک نام چینج ہوگا، نکاح اسی دن ہو جائے گا۔''

سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''...... ابھی کرلو......''

''اللہ......'' گہری سانس لے کر اور نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''میں اپنے کیے پر، اپنے کہے پر شرمندہ ہوں...... وہ امیچورٹی تھی۔ جاب کرنا چاہتی تھی امی کہتی تھیں ولید کو جاب پسند نہیں اسے برا لگے گا...... تو اس لیے میں اتنی بری بن گئی۔'' ندامت سے سر جھکا لیا۔

''مگر تم تو آئیڈیل تلاش کرنے جا رہی تھیں۔''

وہ بھولا نہیں تھا۔

''سمجھو آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔''

''اور اب......؟'' وہ بولا۔

''امی نے کھول دی ہے۔'' وہ خفت سے مسکرائی۔

''واقعی عقل آگئی ہے اور میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ تمہیں سدھار لوں گا، بس ذرا اپنی جاب کے چکر میں تھا۔''

صالحہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ ولید اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ نک چڑھی صالحہ تو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ اور صالحہ غرقِ شرمندگی تھی۔ وسیع دل ولید نے کیسے اسے معاف کر دیا تھا۔ شرمندہ بھی نہیں کیا تھا۔

''میں دل و جان سے اس کے فرمان پورے کروں گی۔'' دل ہی دل میں وعدہ کیا۔ آنکھیں بھر آئیں مسکرا کر نگاہ اٹھائی اور آنسو رخسار پر......

''ارے......'' ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پوروں پر سمیٹے۔ صالحہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''سنو!'' گمبھیر سی سرگوشی قرب میں ابھری۔

''ڈھال لوں گا اپنے آپ کو تمہارے اصولوں کے ساتھ۔''

آنسو بارش کے قطرے بن گئے۔ مسکرا کر سر ہلایا۔

احساس ہو رہا تھا ولید کو اس سے کتنی محبت ہے اور وہ کتنی ناشکری کرنے چلی تھی۔ اور وجود میں جھرجھری سی اٹھی۔ اٹھ ہی جاتا ایک قدم اس غلط راہ شوق بھی تو...... تو...... پھر کیا ہوتا......؟ بے ساختہ ہاتھ پر گرفت مضبوط ہوگئی۔

ولید نے دل آویز نگاہ اس پر ڈالی۔ صالحہ نے گزرے ماضی پر لعنت بھیجی۔

''کٹ......'' دونوں چونکے۔ فراز لان کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ اور وہ اس خوب صورت منظر کو قید کر چکا تھا۔

صالحہ چونکی۔

ولید نے فراز کو آنکھ ماری اور اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ فراز نے ایک اور...... پوز قید کر لیا۔ اور پھر اس کا کیمرا آن رہا۔

ولید بہت خوش تھا۔ صالحہ شکر گزاری کے احساس سے سرشار اس کے پہلو میں کھڑی پوز بنواتی رہی۔

ہواؤں میں خوشبو بھرا خمار تھا۔ فضا میں ترنگ اور ان کے وجود میں نئی دھنک تھی۔

''بس......'' شرارتی سی زہرہ باہر آگئی۔

''دادی جان کہہ رہی ہیں اندر آجاؤ بچوں مجھے بھی ٹائم دے دو۔''

سب نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور اندر کی جانب بڑھنے لگے۔ جہاں خوشیاں، چاہتیں اور محبتیں ان کی منتظر تھیں۔

❁❁❁

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

عائشہ تنویر

''اتنے اچھے نمبر لیے ہیں طلحہ نے میٹرک میں، پارٹی تو بنتی ہے ناں بھئی۔'' چائے کے کپ کے ساتھ شروع ہونے والی امی، ابو کی ہلکی پھلکی خاندانی گفتگو تند و تیز ہونے لگی تو میرب نے میگزین ایک طرف رکھ کر انہیں متوجہ کیا۔

''ہاں بھئی، ضرور کریں گے پارٹی۔ اے ون لینا کوئی مذاق نہیں ہے۔'' موضوع امی کا پسندیدہ تھا سو خوشی سے کہا۔ اکلوتے بیٹے کی کامیابی سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، میرے دوست کی بیٹی کی بورڈ میں پوزیشن آئی ہے اور یہاں آپ اے ون کو کارنامہ سمجھ رہی ہیں۔'' ابو جی منہ بنا کر بولے تھے۔ پچھلی گفتگو کا اثر ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی ابو جی ''کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی نگاہ سے'' کے قائل تھے۔ دنیا جہان کی آسائشات فراہم کرتے تھے لیکن اپنی مرضی کے

خلاف معمولی بات بھی بہت گراں گزرتی۔

''یہ تو میں نے بھی اسے ہزار بار کہا، تھوڑی محنت اور کرلو۔ پوزیشن آتی تو سارے خاندان میں نام ہوتا پھر بھی شکر ہے نمبر سے زیادہ نمبر ہیں۔'' امی کے لہجے میں فخر کا ایک موقع ضائع ہونے پر افسوس کے ساتھ مقابلہ جیتنے کا سکون امڈ آیا۔

طلحہ کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ بچپن سے نمیر کے ساتھ مقابلے نے اس کی زندگی مشکل کر رکھی تھی۔ نمیر کے نمبر، نمیر کی تقاریر، نمیر کا بی ہیویئر بس یہ ہی سب غصے میں طعنوں کی صورت سننے کو ملتا۔ حد تو یہ کہ امی اور چچی بچوں کی صحت اور قد پر بھی فخر کرتیں۔ طلحہ ذہین تھا، اچھا پڑھتا اور اچھے نمبر لاتا لیکن وہ کتابی کیڑا نہ تھا۔ اسے پڑھائی کے ساتھ کھیلوں میں بھی دلچسپی تھی۔ امی، ابو کو تو غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی تقاریر، کوئز اور اسی طرح کے کام نظر آتے۔ اب بھی اپنی دن، رات کی محنت کے بعد ملنے والی کامیابی پر یہ طرزِ عمل اسے مایوس کر گیا تھا۔

''امی، ابو کو خوش کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔'' اپنی مایوسی اور دل گرفتگی کو مذاق کے پردے میں چھپاتے طلحہ نے میرب کے کان میں سرگوشی کی۔

''چپ رہو بھائی، ورنہ ابھی میرے سائنس چھوڑ کر آرٹس لینے پر کلاس شروع ہو جائے گی۔'' میرب نے جوابی سرگوشی کی۔ گو وہ دونوں بہت عیش و آرام سے پرورش پا رہے تھے لیکن پڑھائی اور دیگر معاملات میں ان پر سختی تھی۔ ظاہر ہے اچھا، برا سکھانا والدین کا فرض تھا لیکن ہر بات میں دوسروں سے مقابلہ انہیں چڑچڑا کر جاتا تھا۔ ناشکری انہیں بھی والدین سے وراثت میں ہی ملی تھی۔ سو آسائشات بھول کر تنقید یاد رکھتے۔ اب بھی موضوع کو غلط سمت میں جاتے دیکھا تو ڈانٹ کے ڈر سے وہ دونوں وہاں سے کھسک لیے کہ آخری نشانہ یہی دونوں ہوتے۔

☆☆☆

''ٹن ٹن، یہ رہا میرا سب سے خاص سوٹ۔'' طلحہ نے چہکتے ہوئے شاپر سے کپڑے نکال کر رونمائی کروائی۔

''طلحہ تم یہ کرتا شلوار پہنو گے پارٹی میں؟'' امی نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

''جی امی، اچھا ہے ناں! سب دوستوں نے وہاں سے ہی لیا ہے۔'' طلحہ نے مشہور برانڈ کا نام لیتے اپنے سوٹ کی تعریف کی۔

''اچھا تو ہے لیکن کوٹ پینٹ لے لیتے، بہت اچھا لگتا ہے لڑکوں پر۔ نمیر نے بھی تھری پیس لیا ہے۔'' امی نے کہتے، کہتے پھر نمیر کا حوالہ دیا تھا۔

''مجھے نمیر سے کیا لینا دینا۔'' وہ جھنجلایا۔

''پھر بھی بیٹا ماحول اور فیشن کا خیال رکھنا پڑتا ہے، تھری پیس نہیں تو بلیزر ہی لے لیتے، اسٹائلش لگتا ہے ناں۔'' امی نے پیار سے اسے قائل کرنا چاہا۔

''امی کوٹ پینٹ کے ساتھ سر پر ٹوپی اچھی نہیں لگے گی۔ امام صاحب کل مسجد میں سر ڈھکنے کے فضائل بتا رہے تھے۔ میں آج کل سر ڈھکنے اور پائنچے اونچے رکھنے کی عادت ڈال رہا ہوں۔'' طلحہ نے امی کا میٹھا لہجہ سنا تو ٹھنڈا ہو گیا۔

''چھوڑو بیٹا، ایک دن سے کیا ہوتا ہے۔ تم یہ عید کی نماز کے لیے رکھ لو اور پارٹی کے لیے نیا سوٹ لے آنا۔'' امی نے مسئلے کا حل نکالا۔ وہ سر ہلاتا اٹھ گیا۔ ٹی وی دیکھتے ابو جی نے گردن موڑ کر تشکر سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

''بیگم ادھر آؤ، میری بات سنو۔'' طلحہ کے جانے کے بعد انہوں نے سنجیدگی سے امی کو بلایا۔

''دیکھو، نماز تو فرض ہے لیکن طلحہ آج کل اس کے علاوہ بھی اجتماعات میں جاتا ہے۔ شیو ابھی آئی نہیں کہ داڑھی رکھنے کا سوچ لیا۔ کسی طرح اس کا دھیان بٹاؤ۔ ایسے نوعمر لڑکوں کا ہی لوگ برین واش کر کے غلط استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کی مرضی سے کسی کمپیوٹر کورس میں، کرکٹ کلب میں، تیراکی یا ڈرائیونگ سیکھنے کے اداروں میں ڈلواؤ تاکہ دین و دنیا میں اعتدال رکھنا سیکھے۔''

پڑھائی اور کھیل میں توازن نہ رکھ سکنے والے ابو جی ... دین و دنیا میں توازن کے... قائل تھے۔ بحث سے بچنے کے لیے انہوں نے دھیرے، دھیرے سمجھایا۔

''ہم...م...بات تو آپ کی درست ہے۔ دراصل اسے گھومنے کا بھی شوق ہے تو اب چھٹیاں ہے تو دوستیاں بنا رہا ہے۔'' امی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''تو گھومے پھرے، بچے جاتے ہیں سمندر پر، کھانے پینے کی جگہوں پر، جم وغیرہ جوائن کرلے لیکن مستقل یہی سوچ بن گئی اس کی تو آگے مسئلہ ہوگا۔ یہ شلوار قمیص تو بیشتر آفس میں بھی پہننا منع ہے۔'' ابو نے مزید آپشن دے دیے تو امی نے متفق ہونے کے انداز میں سر ہلایا۔

''درست کہہ رہے ہیں آپ۔ یوں بھی لباس تو ثقافت کا حصہ ہے، عربی مسلمان اپنا روایتی چغہ پہن لیتے ہیں تو مغربی مسلمان پینٹ شرٹ۔ اس میں کیا حرج ہے۔'' امی کے قائل ہونے پر ابو کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ طریقے سے طلحہ کو اپنے ٹریک پر لے آئیں گی۔ بات ایسی تھی کہ سختی سے کہی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

یوں دیگر تفریحات کے مواقع ملنے پر طلحہ کی صحبت بدلی تو لباس و انداز بھی بدل گیا۔

وہ جو مستقل شلوار قمیص پہننا چاہ رہا تھا، اب جمعے کے جمعے بھی جینز ہی چڑھائے رہتا۔

''نماز تو پینٹ میں بھی ہو ہی جاتی ہے۔'' اب امی کے بار، بار ٹوکنے پر وہ یہی جواب دیتا۔

☆☆☆

''باہر نکلتے ہوئے دوپٹا سر پر لو میرب۔'' امی نے تنبیہ کی تو میرب نے برا سا منہ بنایا۔

''میرے بال خراب ہو جائیں گے۔''

''یوں بھی جینز، کرتے کے ساتھ باہر جانا تمہارے ابو کو اچھا نہیں لگے گا بیٹا۔'' امی نے سمجھایا تو میرب کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

''میں تو بچپن سے جینز اور ٹی شرٹ پہن رہی ہوں امی اب یہ تو پھر لمبی قمیص ہے۔ نیا کیا ہے اس میں؟'' اس نے چڑ کر کہا تھا۔

''پہلے کی بات اور تھی، اب تم بڑی ہو گئی ہو، یوں

بابا جانی کے نام

تیرا ذکر، تیری باتیں، تیرے فسانے
سب کچھ تیرا
میرے ذہن میں اب اس کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف سسکیاں، صرف آنسو، صرف آہیں
سب کچھ میرا
میرے لبوں پر اب اس کے سوا کچھ بھی نہیں
راہ یوں بدلی کہ کچھ بھی نہ رہا
مجھ سے کچھ بھی نہ کہا
تو نے سوچا تو ہوتا
تو نے سوچا بھی نہیں جاتے، جاتے
کیسے زندہ رہوں گی تیرے بعد
کون کہے گا مجھ سے میں ہوں ناں
کون رکھے گا میرے سر پر ہاتھ
اب فقط ذہن میں یہ گونجتا ہے
تو تھا تو سب تیرا، تو نہیں تو بھی سب تیرا
اب بے رنگ، بے مول مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں
میں ایسے ہوں گویا نہ ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں
شاعرہ: صبا فاطمہ

مرسلہ: ذوالنورین، ہری پور ہزارہ

بحث مت کرو۔''

''جو عادت ڈالی ہے، وہی کروں گی ناں۔'' امی کے جھڑ کنے پر جلتے کڑھتے اس نے دوپٹا سر پر ڈالا اور بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ ''بھلا اس پر کون اتنا بڑا دوپٹا لیتا ہے۔''

☆☆☆

کالج میں نئے، نئے لوگوں کی دوستی نے اثر دکھایا اور طلحہ بخوشی ماحول کے حساب سے ڈھل گیا۔

''طلحہ تم پھر یہ پھٹی ہوئی جینز اٹھا لائے۔'' امی نے غصے سے کہا۔

''فیشن ہے امی، یہ پھٹی ہوئی نہیں ہے۔'' طلحہ نے کلائی میں پڑا بریسلیٹ گھماتے ہوئے بے پروائی سے

جواب دیا۔

''اپنا حلیہ دیکھو، یہ بالوں کی پونی، انگوٹھی، یہ بریسلیٹ، یہ عجیب وغریب کپڑے، یہ اچھے لڑکوں کے اطوار نہیں ہیں بیٹا۔'' امی نے ڈانٹا۔

''او نچی شلوار پہن لوں تو آپ کو ملا لگتا ہوں، نیچی پینٹ پہن لوں تو برگر، آخر کیا کروں میں، روبوٹ سمجھ لیا ہے کہ روز نیا پروگرام فیڈ کر دیں گی۔'' غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہ باہر چلا گیا تھا۔

''دیکھو اپنے بھائی کا رویہ، رزلٹ اتنا خراب اور اوپر سے صاحبزادے کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔'' امی نے میرب کی طرف رخ کر کے کہا تھا۔

''امی جی؟ آپ لوگ بھی تو زبردستی اسے انجینئرنگ پڑھا رہے ہیں۔ اسے پڑھنے دیتے اس کی مرضی کے مضامین۔'' میرب نے جواب دیا۔

''تو وہ تو پولیس میں جانے کی بات کر رہا تھا۔ اس قابل ہے ہماری پولیس۔'' امی نے غصے سے کہا۔

''لیکن پھر بھی امی، اپنے رجحان کے خلاف پڑھنا۔ پھر ہر وقت جی پی اے کے طعنے ہی اسے چڑچڑا کر گئے ہیں۔ پھر اس کے بچپن کا دوست آپ نے زبردستی چھڑوا دیا کہ اس کی دیکھا دیکھی داڑھی نہ رکھ لے، اب نئے دوستوں کی صحبت پر بھی اعتراض ہے، وہ کیا کرے بیچارہ۔'' میرب نے صاف گوئی سے کہا۔

''ہاں، شروع ہو جاؤ تم بھی، بہت ظلم کرتی ہوں میں تم دونوں پر۔ تم نے خود کب میری مانی ہے۔ لڑکیاں اتنا تیار ہوتی ہیں، بال کھولتی ہیں اور تم کل شادی میں بھی سر پر دوپٹا لیے بیٹھی رہیں۔ تمہاری خالہ نے بھی کہہ دیا کہ احمد، میرب کے لیے نہیں مان رہا، اسے زمانے کے ساتھ چلنے والی لڑکی چاہیے۔'' امی نے کہیں کا غصہ کہیں نکالا۔

''تو یہاں وہ اس کے مادی خواص بتا رہی ہیں۔ میرب کون سا احمد کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ وہ ممی، پاپا بوائے مجھے ویسے بھی پسند نہیں۔'' میرب نے جھلا کر جواب دیا۔

''اتنی اچھی نوکری، گھر، جائداد... اور کیا چاہیے تمہیں۔''

''امی خدا کے لیے، بس کریں، چھوڑیں اب یہ موضوع.... آپ۔'' میرب نے جھنجلا کر ہاتھ جوڑے۔

''بس والدین کی تو سنتی نہیں تم لوگوں نے، دن رات تم لوگوں کے لیے خوار ہو، ہر بات مانو پھر بھی یہ حال ہے۔ اور وہ جو تمہارا بھائی ہے، مستقبل کی اسے بھی فکر نہیں، پہلے اچھا بھلا تھا۔'' امی پریشانی سے دوبارہ پچھلے موضوع پر واپس آئیں۔ طلحہ کے عجیب وغریب رجحانات انہیں صحیح معنوں میں پریشان کر گئے تھے۔

''امی جی، ہم آپ کی ہی سنتے ہیں لیکن آپ بھی تو فیصلہ کر لیں کہ کرنا کیا ہے۔ دین پر چلیں یا دنیا پر، آپ لوگ ہر حال میں ناخوش ہی ہیں۔ مڈل کلاس ویلیوز کے ساتھ ایلیٹ کلاس میں سروائیو نہیں کیا جا سکتا امی۔ دو کشتیوں کے راہی راستے میں ہی ڈوب جاتے ہیں۔'' میرب لفظ لفظ پر زور دیتی کہہ رہی تھی۔

''ہم نے دین سے کب دور کیا، ہم تو محض حالات کی وجہ سے اور زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے.....'' امی ششدر سی رہ گئیں اور مزید کچھ بول نہ سکیں۔

''اگر آپ طعنے دینے یا دوسروں سے مقابلے کے بجائے ہمیں اعتماد میں لے کر آرام سے سمجھاتیں تو شاید آپ کے اور ہمارے درمیان فاصلے اتنے نہ بڑھتے۔ خود ساختہ سوچوں، فکروں اور مقابلوں نے ہمیں اور آپ کو بھی پریشان کیا۔ فیصلے تھوپنے کے بجائے آپ اچھا، برا سمجھا کر سوچنے کا ایک موقع تو دیتیں۔'' میرب نے تاسف سے کہا اور ایک اداس خاموشی ہر طرف چھا گئی۔

امی جیسے ہاری ہوئی بیٹھی تھیں۔ میرب درست ہی کہہ رہی تھی جب وہ نو عمری میں ان کے بڑے، بڑے دوپٹے اوڑھنا چاہتی تو اسے منع کر رہی تھیں کہ کیا بڑی بوڑھی بن گئی ہو اور پھر جینز اور کرتیوں کی عادت ہو گئی تو اس پر دوپٹے اوڑھنا چاہیے اور یہیں بس نہیں ہوا اسی آدھے تیتر آدھے بٹیر میں جوان ہوتے بیٹا، بیٹی کی شخصیتیں مسخ ہوتی چلی گئیں اور ان کی خداداد صلاحیتیں بھی ماند پڑتی چلی گئیں۔

عید سرپرائز

ام ارسلان

تیرے بنا کیا وجود میرا
تجھ سے اگر ہو جائیں گے جدا
تو خود سے ہی ہو جائیں گے جدا
کیونکہ تم ہی ہو اب تم ہی ہو
زندگی اب تم ہی ہو

خزیمہ کے کمرے سے آتی گانے کی آواز سن کر ثنا اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور جھٹ سے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔

"کس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے ہو؟" اس کی طرف مڑ کر اپنے ہاتھوں کو کمر پر رکھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"تم ہی ہو اب تم ہی ہو زندگی اب تم ہی ہو۔" وہ اسے سامنے پا کر ذرا سا مسکرایا اٹھ کر اس کے قریب آ کر جذب سے گنگنانے لگا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' وہ ابرو اٹھاتے ہوئے غصے سے بولی۔

''تمہارے سوال کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وقت سے پہلے بتایا نہیں جا سکتا۔ انہیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔'' وہ اس کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔

''لیکن تمہیں مجھے بتانا ہوگا کہ وہ کون ہے؟'' وہ ضدی انداز میں بولی۔

''یہ کیا زبردستی ہے؟ ایک تو تم بنا اجازت میرے کمرے میں آ گئی ہو الٹا معذرت کے بجائے مجھ پر غصہ کر رہی ہو۔'' اس نے بات کا رخ دوسری جانب موڑنا چاہا۔ جس میں کافی حد تک کامیاب ہوا۔

''کمرے کے باہر بڑا سا بورڈ لگا دو کہ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔ پھر اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

''مجھے تنگ مت کرو یہاں سے جاؤ۔ اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔'' وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''او مسٹر میں آپ کو کب تنگ کر رہی ہوں؟ باؤلے تو نہیں ہو گئے ہو۔'' اس نے تنگ والی بات کا مذاق اڑایا۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموشی سے اسے تکنے لگا۔ اسے معلوم تھا باتوں میں اس سے جیتنا ناممکن ہے۔ اس لیے خاموشی میں عافیت سمجھی۔

''دریا یک دم پُرسکون ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی سیلابی ریلا آنے والا ہے۔'' اسے اس کی خاموشی نہیں بھائی، اس لیے وہ اسے پھر چھیڑنے لگی۔

''آج صبح ناشتے میں کیا کھایا تھا؟'' وہ اب شرارتی انداز میں بولا لیکن چہرے پر مکمل سنجیدگی طاری کی ہوئی تھی۔

''ممانے پراٹھا اور انڈا بنا کے دیا تھا۔'' وہ ناسمجھی والے انداز میں بولی۔

''نہیں، مجھے تو لگتا ہے آج چاچی نے تمہیں کوّے کھلائے ہیں۔ جو اتنی دیر سے کائیں، کائیں کر رہی ہو۔'' اس کا انداز تپانے والا تھا۔

ثنا نے پاس رکھے صوفے سے کشن اٹھا کر اسے مارا لیکن وہ اس کا ارادہ بھانپتے ہی کمرے سے نکل گیا۔ کشن منہ چڑاتا قالین بوس ہو گیا۔

☆☆☆

فراز احمد اور اظہار احمد دونوں بھائی مقامی کالج میں لیکچرار تھے۔ باپ کا سایہ دو سال پہلے اٹھ گیا تھا۔ دونوں بھائی اپنی ماں کے ساتھ روزویلی پروجیکٹ میں بنے بڑے سے گھر میں رہائش پزیر تھے۔ اظہار احمد اور شگفتہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ثنا تھی جو گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ فراز احمد اور شائستہ بیگم کے دو بیٹے عمیر، خزیمہ اور بیٹی زارا تھی۔ عمیر ایم بی اے کر کے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا تھا۔ وہ خوش شکل، کم گو اور سنجیدہ مزاج کا مالک تھا۔ جبکہ خزیمہ اور ثنا ایم ایس سی کے فائنل ائیر میں تھے۔ دونوں شوخ و چنچل اور لڑاکا مزاج کے مالک ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار جبکہ زارا میڈیکل کے پہلے سمسٹر میں تھی۔ بقول ثنا 'زارا کتابی کیڑا ہے۔ جو ہر وقت کتابوں میں ہی گھسی رہتی ہے۔ عمیر کی نسبت دور پرے کے رشتے داروں میں طے تھی۔ سب مل کر ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت اور مان کا بھرپور خیال رکھتے تھے۔ اس لیے سب ایک چھت تلے پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ لیکن اماں بی کے زیر سایہ یہ فیملی خوشیوں کا گہوارہ بنی ہوئی تھے۔ سبھی ہنسی خوشی رہتے تھے۔ خزیمہ اور ثنا کے دم سے گھر کی رونق قائم تھی۔ ہر وقت ان کی نوک جھوک گھر والوں کو بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیتی۔ اماں بی اپنے چھوٹے سے خاندان کی دائمی خوشیوں کے لیے ہر وقت دعا گو رہتی تھیں۔

☆☆☆

ثنا کا شمار یونی کی ذہین طالبات میں ہوتا

تھا۔تمام اساتذہ اس کے تعلیمی ریکارڈ سے بہت خوش تھے۔خوب صورت نین نقش ... دودھ جیسی سفید رنگت، موٹی، موٹی سیاہ آنکھیں اور ان پر لمبی گھنیری پلکوں کی جھالر ثنا جب اپنے چہرے کے گرد حجاب کا ہالہ بناتی تو بہت ہی خوب صورت لگتی۔دیکھنے والی ہر نگاہ میں اس کے لیے ستائش ہوتی۔عام لڑکیوں والی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔خود سے یکسر بے پروا دوسروں کی فکر کرنے والی اور دوسروں کی خوشی میں خوش ہونے والی لڑکی تھی۔لڑکوں سے بے وجہ بات کرنا تو درکنار ایک نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔اسے اپنی حدود و قیود کا اندازہ تھا۔اس لیے انہیں کبھی پاٹنے کی کوشش نہیں کی۔لیکن خزیمہ کے معاملے میں نہ جانے وہ ہر بات کیوں بھول جاتی۔وہ اس کے بچپن کا دوست اور غم گسار تھا۔دونوں ایک ساتھ اسکول داخل ہوئے اور ایک ہی کالج اور اب یونی میں بھی تھے۔ان کے درمیان کوئی تکلف نہ تھا۔ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر ایک دوسرے کا خوب مذاق بناتے۔گھر بھر کی رونق ان کے دم سے تھی۔جس دن وہ خاموش ہوتے گھر میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی رہتی۔

اس دن سب ناشتے کی میز پر ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ثنا جلدی سے دودھ کا گلاس پیتے ہوئے خزیمہ سے بولی۔

''خزیمہ! پلیز جلدی اٹھو میری کلاس مس ہو جائے گی۔آج کا لیکچر بہت اہم ہے، تم تو ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئے۔''

''میرا آج یونی سے آف کرنے کا ارادہ ہے۔تم عمیر بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔''اس نے جھٹ سرخ جھنڈی دکھائی۔

''عمیر بھائی تو آفس لیٹ جاتے ہیں۔میں اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتی پلیز اٹھو۔''وہ لجاجت بھرے انداز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا شائستہ چاچی غصے سے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔''کیوں بچی کو تنگ کر رہے ہو؟ اٹھو اسے یونی چھوڑ کے آؤ۔''

''ٹھیک ہے مما آپ کی لاڈلی کو چھوڑ آتا ہوں۔''خزیمہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ثنا لیٹ ہو رہی تھی۔اس لیے خاموش رہی۔اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کبھی چپ نہ رہتی۔خزیمہ پورچ سے گاڑی نکالنے چلا گیا۔وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی وہ اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔اگلے ہی لمحے گاڑی گیٹ سے باہر نکلی اور یونیورسٹی روڈ پر بھاگتی چلی گئی۔راستہ خاموشی میں گزر گیا تھا۔اس نے اسے یونی کے گیٹ پر چھوڑا اور گاڑی واپس موڑ لی۔ثنا نے گھڑی پر نظر ڈالی تو کلاس شروع ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانے لگی۔اچانک زور سے کسی سے ٹکرائی، اس سے قبل وہ زمین پر گرتی، دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔وہ جلدی سے سنبھلی تو سامنے ارمغان نظر آیا۔وہ اس سے ٹکرائی تھی۔اس نے سیدھی کھڑی ہو کر سامنے کھڑے ارمغان کی جانب غصے سے دیکھا۔وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اُف! واللہ غصے میں بھی اتنی پیاری لگ رہی ہیں۔سچ میں سیدھا دل میں اتر رہی ہیں۔شاید آپ کو کسی نے بتایا نہیں غصہ آپ کی شخصیت پر بہت جچتا ہے۔''

وہ اس کے چھچھورے انداز پر تلملا کر رہ گئی۔لیکن کچھ بول نہیں سکی۔بس خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔جبھی اس کی ہنسی نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔''آپ یونی میں سب سے منفرد ہو۔جب آپ کو پہلی بار دیکھا تو دل ہار گیا۔اس دن آپ سب سے لاتعلق سی ہو کر ایک کونے میں سر جھکائے نوٹس بنانے میں مصروف تھیں۔حجاب میں لپٹا آپ کا چہرہ بالکل چاند کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔میری جب پہلی دفعہ نظر پڑی تو پھر میں نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔اس دن آنکھوں کے رستے آپ سیدھا دل میں اتر گئی تھیں۔''وہ بولا تو بس بولتا چلا گیا۔

''دیکھیں ارمغان صاحب، میں یہاں علم

حاصل کرنے آتی ہوں۔ آپ کے والدین نے بھی یقیناً اسی مقصد کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ بہتر ہے کہ مجھ پر توجہ دینے کے بجائے آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔'' دوٹوک بات کر کے وہ رکی نہیں۔

''ثنا آپ اب میری ضد بن چکی ہیں۔'' اس وقت پیچھے سے اس کی آواز ابھری۔

وہ خاموشی سے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب چلی گئی۔ دو آنکھیں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہی جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

اس کا اب کلاس اٹینڈ کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ ایک تو دس منٹ پہلے ہی لیٹ ہو چکی تھی دوسرے طبیعت بھی ارمغان کی باتوں سے مکدر ہوگئی تھی۔ اس لیے سست روی سے چلتی ہوئی لائبریری کی طرف آگئی۔ وہ ایک کونے میں آکر بیٹھ گئی۔ اس کی سوچیں ایک ہی دھارے میں بہنے لگیں۔ ارمغان ایک امیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد تھا۔ اس کے خیال میں دنیا کی ہر چیز پیسے سے خریدی جاسکتی ہے۔ لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے اردگرد بھنبھناتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ مغرور سا بنا سب سے لاتعلق رہتا۔ ارمغان کی لاکھ کوشش کے باوجود ثنا ایک نظر بھر کر بھی اسے نہیں دیکھتی تھی۔ اسی بات پر وہ ضد پر اڑ گیا اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ثنا کو زچ کرنے کا کوئی موقع وہ آسانی سے نہیں گنواتا تھا۔ اس کی چبھتی نظریں ہر وقت ثنا کا پیچھا کرتی تھیں۔ خزیمہ کو اس بات کی خبر تھی لیکن یونی میں کوئی تماشا نہ ہو اس لیے وہ خاموش رہا۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ کئی مرتبہ وہ ارمغان کو پیٹنے کا ارادہ کرتا۔ لیکن ثنا اسے روک دیتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بات زیادہ بڑھے۔ اس لیے مجبوراً خزیمہ بھی خاموش رہا۔ بہرحال اسے بھی اپنی کزن کی عزت کا احساس تھا۔ اس کی ایک ذرا سی غلطی سے اس پر کوئی انگلی اٹھائے یہ اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ارمغان کی گھٹیا سوچ کو اچھے سے جانتا تھا۔ وہ اگر اسے کچھ کہتا تو یونی میں یہ بات آگ کی طرح پھیل جاتی کہ ثنا کا ارمغان کے ساتھ معاشقہ تھا۔ جس بنا پر اس کو پیٹا گیا۔ کئی غلیظ نگاہیں ثنا پر اٹھتیں جو اسے گوارا نہیں تھیں۔ اس لیے دونوں خاموش تھے۔

☆☆☆

یونی میں یونین کے کچھ بوائز کا جھگڑا ہو گیا تو ایک ہفتے کے لیے کلاسز آف ہوگئی تھیں۔

کام سے فارغ ہو کر زارا اور ثنا لان میں لگے پودوں کو پانی دینے لگیں۔ دونوں نے مل کر گھر کے صحن کے ایک حصے کو باغیچہ بنا ڈالا جہاں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور اب انار کے چھوٹے، چھوٹے پودے لگے ہوئے تھے۔ جب رنگ برنگے پھول کھلتے تو بہت بھلے معلوم ہوتے۔ اس دن سورج سوا نیزے پر تھا۔ لیکن وہ دونوں گرمی کی حدت سے بے نیاز آستینیں فولڈ کیے، پائنچے پانی سے بھیگے ہوئے اپنی دُھن میں پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھیں۔ اسی اثنا میں گیٹ پر بیل بجی۔ ثنا گیٹ کی جانب بڑھی سامنے دو خواتین جو دیکھنے میں خوش شکل، پڑھی لکھی امیر گھرانے سے لگ رہی تھیں، اسے دیکھ کر مسکرائیں اور ''السلام علیکم'' کہا۔

''وعلیکم السلام' جی آنٹی آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' وہ عمر رسیدہ خاتون سے مخاطب ہوئی۔

''اظہار صاحب کا گھر یہی ہے؟'' انہوں نے الٹا سوال کیا۔

''جی یہی گھر ہے لیکن سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' ثنا غور سے دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ کے ہاں مہمانوں کو باہر کھڑا رکھنے کا رواج ہے؟'' نوجوان لڑکی نے اس سے نخوت سے کہا۔

ثنا اپنی کم عقلی پر شرمندہ ہوگئی اور انہیں اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ ڈرائنگ روم میں انہیں بیٹھایا۔

''آپ بیٹھیں، میں مما کو بلاتی ہوں۔ پاپا تو ابھی کالج گئے ہوئے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر باہر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔

''آپ ثنا ہو ناں؟'' نوجوان لڑکی نے سوال کیا۔

''جی..... لیکن آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟'' وہ

الجھن آمیز انداز میں بولی۔

''ماشاء اللہ، چشم بدور بہت پیاری بچی ہو۔'' دھوپ کی تمازت سے سُرخ وسپید گالوں کو دیکھتے ہوئے ادھیڑ عمر خاتون نے کہا۔

''شکریہ آنٹی۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں سیدھا ماں کے کمرے میں آئی۔ انہیں مہمانوں کی اطلاع دے کر ان کی خاطر تواضع کا انتظام کرنے کچن میں چلی گئی۔

''السلام علیکم!'' شگفتہ بیگم ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''وعلیکم السلام۔'' دونوں نے ایک ساتھ سلام کا جواب دیا۔

''میرا نام شزا ہے اور یہ میری مما شاہینہ ہیں۔'' لڑکی نے تعارف کرایا۔

''میں مسز اظہار احمد ہوں، کہیے کیسے آنا ہوا۔'' شگفتہ بیگم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے آنے کی وجہ پوچھی۔

''آپ کی بیٹی ثنا اور میرا بیٹا ارمغان ایک ہی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ ارمغان کو ثنا بہت پسند ہے۔ اس نے ہمیں آپ کے گھر رشتے کی غرض سے بھیجا ہے۔'' شاہینہ نے بغیر تمہید کے فوری آنے کی وجہ بیان کردی۔

''آنٹی ہمارا امپورٹ ایکسپورٹ کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ ارمغان ہم دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہم دونوں بہنیں شادی شدہ ہیں۔ ہمارا گھر ڈیفنس میں ہے۔'' شزا انہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ اتنی دیر میں اماں بی بھی آگئیں۔ شاید وہ کچھ باتیں سن چکی تھیں۔

''دیکھیں بیٹا ابھی ثنا زیر تعلیم ہے۔ جب تعلیم مکمل ہو جائے گی تو پھر دیکھا جائے گا۔'' اماں بی نے تحمل سے کہا۔

''بڑی اماں شادی کی ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ جب بچوں کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو پھر شادی کریں گے۔ ابھی صرف رشتہ پکا کریں گے۔'' شاہینہ گویا ہوئیں۔

پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر ایک خوشخبری ...... دل پزیر، دل نشیں اور دل گداز تحریروں کی خالق

مصنفہ
دلشاد نسیم

جلد ہی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی کے باذوق قارئین کے لیے اپنا ایک اور دل نواز ناول لے کر آرہی ہیں

معاشرے میں پھیلے ان گنت مسائل اور ان کے موثر حل کا
بے حد خوب صورت اور دل خوش کن انداز میں قلمی اظہار......

یقیناً قارئین کے ادبی ذوق کے لیے باعثِ تسکین ہوگا

''یہ کوئی گڈے گڈی کا کھیل ہے جو اتنی جلدی ہاں کردیں؟'' اماں بی غصے سے بولیں۔

''ماں جی آپ غلط سمجھیں۔ آپ لوگ سوچ سمجھ کر ہمارے بارے میں چھان پھٹک کر کے پھر ہی کوئی فیصلہ کریں۔'' شزا نے بات سنبھالی۔

ثنا کباب، کولڈ ڈرنک اور کیک ٹرالی میں سجائے اندر داخل ہوئی۔ ابھی تک وہ اسی رف حلیے میں تھی۔

''آؤ بیٹا ادھر ہمارے پاس بیٹھو۔'' شاہینہ بیگم نے اسے پاس بٹھانے کا اشارہ کیا۔ لیکن اماں بی کے ماتھے پر بل دیکھ کر ثنا خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

کچھ دیر مزید بیٹھ کر وہ لوگ چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی اماں بی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ ثنا کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ لیکن اصل بات سے بے خبر تھی۔

وہ ڈرتے، جھجکتے اماں بی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''اماں بی آپ نے مجھے بلایا؟'' وہ بمشکل بول پائی۔

''آؤ ادھر بیٹھو.....'' اماں بی نے اسے اپنے پاس بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''جو مہمان خواتین دن کو تشریف لائی ہیں۔ تم انہیں جانتی ہو؟'' اماں بی نے اس سے پوچھا اور نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''نہیں اماں بی، میں نے تو انہیں آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔'' وہ الجھے انداز میں بولی۔

''بیٹا وہ ارمغان کی مما اور بہن تھی۔ وہ جو تمہاری یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ تمہارا رشتہ مانگنے آئی تھیں۔'' اس نے ان کے آنے کا مقصد بتایا۔ ثنا کو ایک دم سو واٹ کا کرنٹ لگا۔

''کیا؟'' وہ صرف اتنا بول پائی۔

''تم ارمغان کو جانتی ہو؟'' اماں بی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی اماں بی وہ میرا یونی فیلو ہے لیکن اس کے علاوہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' ثنا نے صاف گوئی سے بتایا۔

''بیٹا میں جانتی ہوں۔ میری ثنا بالکل شفاف پانی کے مانند ہے۔ ہم سب کو تم پر پورا یقین ہے۔'' اماں اسے پیار کرتے ہوئے بولیں۔ ''تم سے یہ سب اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر تمہیں وہ اچھا لگتا ہے تو ہم بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ورنہ یہی ختم کر دیتے ہیں۔'' انہوں نے رائے مانگی۔

یہ سوچ کر ہی ثنا کا دل پسلیوں سے نکل کر باہر آنے کو بے تاب ہو گیا کہ اگر گھر والوں نے ہاں کر دی تو اس کی خاموش محبت کا گلا گھٹ جائے گا۔ شاید پھر وہ زندہ نہ رہ پائے گی۔ کیونکہ اس کی زندگی تو اس ایک شخص کے بغیر بے معنی ہے۔ اس کی زندگی کی تمام رنگینیاں ایک اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ جو اس سب سے انجان ہے یا شاید انجان بننے کی کوشش کرتا ہے۔

''کیا ہوا بیٹا ایسے خاموش کیوں ہو؟'' اماں بی نے اس کو ایسے کھویا ہوا پایا تو اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔

''اماں بی ابھی میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے پڑھنے دیں۔ آپ انہیں انکار کر دیں۔'' وہ چونکی پھر بولی۔ اور یہ کہہ کر وہ رکی نہیں کمرے سے باہر نکل گئی اور اماں بی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆

''اظہار صاحب میں تو کہتی ہوں آپ چھان پھٹک کر لیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہے۔ ایسے رشتے نصیب سے آتے ہیں۔'' رات کو اظہار صاحب کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب شگفتہ نے انہیں گھیر لیا۔

''شگفتہ دیکھو ابھی ثنا کی تعلیم تو مکمل ہونے دو۔ اس طرح اس کا دھیان بٹ جائے گا اور وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکے گی۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''پڑھائی مکمل ہونے کے انتظار میں اتنا اچھا رشتہ کیسے ٹھکرا دیں؟ یہ تو ناشکری والی بات ہے۔'' وہ اپنے موقف پر ڈٹ گئیں۔

''اللہ نے چاہا تو اس سے بھی زیادہ بہتر رشتہ ہماری بیٹی کے نصیب میں ہو گا۔ تم اللہ کی ذات پر بھروسا

رکھو۔" کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

☆☆☆

"آپا کیا بتاؤں کتنا اچھا رشتہ ہے۔ لیکن معلوم نہیں گھر والے کیوں مان ہی نہیں رہے؟" جب گھر میں دال گلتی نہیں دیکھی تو دوسرے دن انہوں نے آپا کو خاندان فون گھما دیا۔ تاکہ کوئی مشورہ لے سکیں۔

"ارے شگو اتنا اچھا رشتہ ہے اور تم لوگ انکاری ہو۔ یقین کرو اس دور میں ایسے رشتے ملنا نعمت ہوتے ہیں۔ کتنے چاؤ سے انہوں نے رشتہ مانگا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم اپنی بات پر ڈٹ جاؤ۔ لڑکی کی ماں ہو، تم سے بہتر اس کے بارے میں کون سوچ سکتا ہے۔" آپا اپنی دانست میں بہترین مشورہ دینے لگیں۔

"آپا آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں ضرور کر کے بات آگے بڑھاتی ہوں آخر ماں ہوں فیصلے کا حق تو مجھے حاصل ہونا چاہیے۔" انہوں نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔

"ہاں شگو تو تو بالکل سیدھی ہے۔ سسرال والے تجھے جس طرف کھینچیں، اسی طرف کھنچ جاتی ہو۔ اپنی بات بھی منوانا سیکھو ورنہ تیری بیٹی کا ہاتھ کسی بھی ایرے غیرے کو پکڑا دیں گے۔" آپا نے مزید تیلی لگائی۔ آج تک اپنی سسرال والوں سے آپا کی نہیں بن سکی۔ اس لیے اپنے بچوں کی شادیاں خاندان سے باہر کرنی پڑیں۔ سب یہی کہتے جیسی ماں ہے ویسی اولاد ہوگی۔ شگفتہ نے آپا سے مشورہ مانگ کر بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ آپا آگ اور وہ پانی تھیں۔ جو اپنی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں لیکن آپا کی باتوں میں آکر اپنے گھر کے چین و سکون کو برباد کرنے کی ٹھان لی۔ رات کو انہوں نے سب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"ثنا کی ماں ہونے کے ناتے اس کے لیے اچھا رشتہ تلاش کرنا میرا حق ہے اور یہ حق کوئی اور استعمال کرے مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں۔" ان کا لہجہ درشت تھا۔ گھر کے سکون کو برقرار رکھنے کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ اماں بی نے اظہار کو بھی سمجھا دیا۔

"تم کچھ مت کہنا ابھی بہو غصے میں ہے۔ کچھ دن بعد جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا تو ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆☆☆

"مما وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔ مجھے وہ یونی میں بہت تنگ کرتا ہے۔" شگفتہ بیگم کی گود میں سر رکھے وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

"اب تو چھٹانک بھر کی لڑکی مجھے بتائے گی کہ اچھا کون ہے یا برا کون ہے؟" وہ غصے سے بولیں۔

"مما پلیز، سمجھنے کی کوشش کریں مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"ثنا تو اسی لڑکے سے شادی کرے گی جس سے میں چاہوں گی۔" ان کا لہجہ یک دم درشت ہو گیا۔ ثنا حیرانی سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ مما تو نہیں لگ رہی ہیں۔ انہوں نے تو کبھی مجھے جھڑکا تک نہیں اور آج اتنے غصے میں بات کر رہی ہیں۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

دوسرے دن ناشتے کی میز پر عجیب سا تناؤ تھا۔ کسی نے شرارت کی نہ کوئی چٹکلا چھوڑا۔ ثنا کی خاموش آنکھیں شب بیداری کی چغلی کھا رہی تھیں لیکن سب خاموشی سے آدھا ادھورا ناشتا کر کے اٹھ گئے۔ ہر بات کی پروا کیے بنا وہ ارمغان سے ملنے ان کے گھر چلی گئیں۔ شاہینہ جاتے سے اپنا کارڈ انہیں تھما گئی تھیں۔ جس کو انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے جانے سے پہلے انہیں فون پر مطلع کر دیا تھا۔ گیٹ عبور کر کے اندر والے حصے میں داخل ہو ہی رہی تھیں کہ ایک کھلکھلاتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"یار ثنا کی امی مان گئی ہیں۔ آج وہ ہمارے گھر آ رہی ہیں۔ تم سب دیکھو میں انہیں کیسے شیشے میں اتارتا ہوں۔ ایک مرتبہ شادی ہو جانے دو..... اس کے سارے غرور کو خاک میں ملا دوں گا۔ پہلے میں اس سے بات کرنے کو ترستا تھا۔ پھر وہ مجھ سے بات کرنے کو ترسے گی۔" وہ ارمغان تھا جو لان میں ٹہلتے ہوئے کسی

pklibrary.com

ہوں؟'' اماں بی نے کہا۔

''جیسا آپ کہیں۔'' اظہار نے فرمانبرداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ اور یوں بڑوں کی میٹنگ کامیاب رہی۔ جب دروازہ کھول کر باہر نکلے تو سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

ثنا کی جان پچھلے دو گھنٹے سے اٹکی ہوئی تھی۔ سب کے چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہوگئی۔ کسی نے شگفتہ سے ان کا فیصلے بدلنے کی بابت نہیں پوچھا۔ وہ اس بات پر مطمئن ہوگئیں کہ ان کا پردہ اللہ نے رکھ لیا۔

رات شگفتہ بیٹی کے کمرے میں گئیں اور اپنے غلط رویے کی معافی مانگ لی۔ اس رات ارمغان نے ثنا کو کال کی اور برے نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا۔ وہ ساری رات رو رو کر اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اگلی صبح خزیمہ اخبار پکڑے اس کے پاس آیا۔ اخبار میں ارمغان کی موت کی خبر چھپی تھی۔ مشہور بزنس ٹائیکون اظفر خان کے بیٹے ارمغان کا کار ایکسیڈنٹ ہوگیا جس میں وہ موقع پر ہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوگیا۔

یہ خبر پڑھ کر ثنا، خزیمہ اور شگفتہ نے سکھ کی سانس لی۔ برائی کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے۔ ثنا نے دل میں سوچا۔ روز ویلی کی رونقیں پھر سے بحال ہوگئیں اب پھر ہر فرد کے چہرے پر مسکراہٹ احاطہ کیے رہتی تھی۔

☆☆☆

''ثنا برتن صاف کر کے سنک بھی اچھی طرح سے صاف کر دینا۔ میں سبزی بنالوں پھر مل کر کھانا بنالیں گے۔ تمہاری تائی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' شگفتہ بیگم یہ کہہ کر لاؤنج میں جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت خزیمہ کچن میں داخل ہوا غالباً پانی پینے کی غرض سے آرہا تھا۔ ثنا کو شرارت سوجھی۔

''مما! برتن تو میں صاف کر چکی ہوں سینگ کس کے صاف کرنے ہیں۔ مجھے بتا دیں؟'' اس کا انداز شرارتی تھا۔

جسے خزیمہ نے بہ آسانی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا اور فریج سے پانی نکال کر پینے لگا۔ اس دوران ان کا فون بجنے لگا۔ اس وجہ سے وہ ثنا کی بات نہیں سن پائیں۔

خزیمہ کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ثنا کو مایوسی ہوئی۔ لیکن ثنا اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

''خزیمہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ جنہیں برش کے ساتھ رگڑ، رگڑ کے صاف کرنا پڑے گا۔'' اب اس نے ڈائریکٹ اسے مخاطب کیا۔

خزیمہ نے پانی کی بوتل واپس فریج میں رکھ دی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی جانب رخ موڑا۔

''میڈم شاید آپ بھول رہی ہیں کہ عقل نام کی چیز آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس لحاظ سے سینگ آپ کے سر مبارک پر ہونے چاہئیں۔'' اس نے فوراً بدلہ چکایا اور باہر لاؤنج کی جانب نظر دوڑائی جہاں شگفتہ بیگم سبزی بنانے میں مصروف تھی۔ ساتھ میں ان کی نوک جھوک سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کیوں چچی جان ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔'' اس نے ساتھ ہی چچی سے بھی تائید چاہی۔

''ہاں خزیمہ بیٹا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور ساتھ ایک نگاہ اپنی پھولوں جیسی بیٹی پر ڈالی جو اُن کی تائید پر منہ پھلا کر کپے جیسی لگ رہی تھی۔ خزیمہ نے اپنی ہنسی کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے اس کی صحت مند جسامت پر چوٹ کی۔

''چچی لگ پہلے ہی بہت موٹے ہیں، اوپر سے منہ پھلا کر گول گپے کی طرح لگ رہے ہیں۔''

ثنا یہ سن کر کچن میں ہی سخ پا ہوئی۔ اماں بی جو اُن کی نوک جھوک کمرے سے نکلتے ہوئے سن چکی تھیں، دونوں کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

''آخر تم دونوں کو کب عقل آئے گی؟ جب دیکھو ایک دوسرے سے بچوں کی طرح لڑ رہے ہوتے ہو۔ کب تم دونوں کا بچپنا ختم ہوگا؟ جب دیکھو گھر کو میدانِ جنگ بنایا ہوتا ہے۔'' اماں بی نے دونوں کو خوب لتاڑا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں۔

خزیمہ چلتا ہوا اماں بی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنا سر اُن کی گود میں رکھ دیا اور معصومیت سے بولا۔ ''اماں بی میں تو کب کا بڑا ہو گیا ہوں۔ بس آج کل چھوکری کے پیچھے ہوں کوئی مل جائے۔ لیکن آپ کی یہ پوتی ابھی تک فیڈر میں دودھ پیتی ہے۔ اس کو ایسی باتوں کی کہاں سمجھ ہے۔''

اماں بی خزیمہ کی آنکھوں میں ثنا کے لیے پسندیدگی کو پہلے ہی محسوس کر چکی تھیں۔ آج اس نے دبے الفاظ میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ اماں بی نے فاتحانہ مسکراہٹ سے بہو کی طرف دیکھا جیسے بتا رہی ہوں ان کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ شگفتہ مطمئن ہو گئیں اور دل ہی دل میں چپکے سے دونوں کی خوشیوں کی دعا کر ڈالی۔

''تمہیں چھوکری کی نہیں پہلے نوکری کی ضرورت ہے۔ چھوکری تب ملتی ہے جب نوکری ہو۔ نہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔'' ثنا نے طنز کیا۔

''سب کو چھوڑو، تم تو مجھے پوچھو گی ناں؟'' خزیمہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے خودی سے کہا۔

ثنا ایک لمحے کو سٹپٹا گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن یک لخت بہت تیز ہو گئی۔ لیکن اماں بی اور مما کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے خود کو بمشکل سنبھالا۔

خزیمہ بھی اماں بی اور چچی کی موجودگی سے کافی کھسیانا سا ہو گیا۔

☆☆☆

رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو سبھی اللہ کی رحمت سمیٹنے کے لیے بے قرار نظر آئے۔ خواتین بھی خشوع و خضوع کے ساتھ برکتیں سمیٹنے کے لیے کمر بستہ نظر آئیں۔ ہر سو رحمتوں کا نزول ہونے لگا تمام بڑوں نے رمضان کے روزے رکھے عبادتیں کی جو جس قدر برکتیں سمیٹ سکتا تھا سمیٹیں۔ خزیمہ اور ثنا کے یونی میں آخری دن چل رہے تھے۔ انہیں چند دن بعد فری کر دینا تھا تاکہ گھر بیٹھ کر اچھے سے تیاری کر سکیں۔

ثنا، خزیمہ کے ساتھ یونی سے واپس آئی تو دونوں کسی بات پر الجھتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے۔ اسے امی کی آواز سنائی دی۔

''ثنا فریش ہو کر آؤ تمہیں تمہارے پاپا بلا رہے ہیں۔''

''جی بہتر امی۔'' کہہ کر وہ اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں فریش ہو کر پاپا کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی پاپا، آپ نے کیا بات کرنی ہے؟'' وہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اظہار اسے اپنے بازوؤں کے ہالے میں لے کر محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''بیٹا جب دیکھو آپ اور خزیمہ میں نوک جھوک لگی رہتی ہے۔ وہ تمہارا کزن ہے دو ماہ ہی سہی لیکن تم سے بڑا ہے۔ تم اس سے تمیز سے بات کیا کرو۔'' انہوں نے پیار سے اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھایا۔

''پاپا میں اس سے کبھی نہیں الجھی، وہ بلاوجہ ہر وقت مجھ سے لڑتا رہتا ہے۔'' ثنا منہ بسورتے ہوئے اپنی صفائی دینے لگی۔

''بیٹا جب تم ہر وقت اس کی باتوں کی ٹانگیں اور بازو مروڑو گی تو وہ تم سے الجھے گا ہی۔ اب تم میچور ہو گئی ہو۔ ایسی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ اماں بی بھی تمہاری اس عادت سے پریشان ہیں۔'' اظہار احمد نے کہا۔

''اسے بگاڑ بھی تو آپ نے رکھا ہے، جب دیکھو اس کے لاڈ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔'' شگفتہ بیگم نے شکوہ کیا اور ان کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''بیگم کھری بات تو یہ ہے کہ ان کی نوک جھوک کی بدولت ہی تو گھر میں رونق ہے۔'' اظہار نے پیار سے بیٹی کو ساتھ لگا کر کہا تو ثنا مسکرانے لگ گئی۔

''نہ جانے اس لڑکی کو کب عقل آئے گی؟'' شگفتہ بولی۔

''ارے چچی کس لکڑی کی بات کر رہی ہیں؟ لکڑی میں عقل نام کی چیز کہاں؟'' خزیمہ لاؤنج میں داخل ہوا تو سامنے بیٹھی چچی کی بات سن کر بولا۔ لیکن غیر متوقع طور پر چاچو کو وہاں پا کر بمشکل زبان کو بریک لگائی۔ ورنہ ابھی نہ جانے کس، کس القابات سے ثنا کو نوازتا۔

''ہاں تم تو بڑے طرم خان ہو ناں، تمہاری عقل سے ہی تو اس ملک کا نظام چلتا ہے۔'' ثنا نے فوراً بدلہ چکایا۔ اظہار اور شگفتہ دونوں ہنسنے لگے۔

''سب میری بات غور سے سنو، میرے پاس ایک گڈ نیوز ہے۔'' تایا ابا... لاؤنج میں داخل ہوئے تو سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ثنا اپنی اماں بی، تائی اور زارا کو بلا کر لاؤ۔'' تایا ابا نے ثنا کو کہا۔

وہ سب کو بلانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں سب لاؤنج میں اکٹھے ہوگئے۔ اتنی دیر میں عمیر بھائی بھی آفس سے آگئے۔

''تایا ابا... بتائیں کیا بات ہے؟'' ثنا پر تجسس انداز میں بولی۔

''آپ لوگ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے ایگزامز کب شروع ہو رہے ہیں؟'' وہ ان کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔ سب بچوں کے چہرے پر تجسس رقصاں تھا۔

''ابھی ڈھائی ماہ رہتے ہیں۔'' ثنا بے چینی سے بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے عید کے تیسرے دن عمیر کی شادی کر دیتے ہیں۔ ابھی پچیس دن باقی ہیں۔ آپ خواتین آرام سے ساری تیاری کریں گی۔'' تایا ابا نے آخر بم پھوڑ ہی دیا۔

سب کے چہرے خوشی سے نہال ہوگئے۔ عمیر کی آنکھوں میں جگنو جگمگانے لگے۔

''کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔'' خزیمہ نے ثنا کو چڑانے کے لیے کہا۔ لیکن ثنا نے مطلق پروا نہیں کی۔

''واؤ! میں عمیر بھائی کی شادی پر خوب ہلا گلا کروں گی۔ ڈھیر ساری شاپنگ کروں گی۔'' ثنا ایکسائٹڈ ہوگئی۔

''پہلے کبھی تم نے شاپنگ نہیں کی ندیدی؟ مجھے تو لگتا ہے یہ غالباً تمہاری زندگی کی پہلی یا پھر آخری شاپنگ ہے۔'' خزیمہ نے آہستگی سے اسے کہا۔

''تم مجھے خوش دیکھ ہی نہیں سکتے ہو۔ جب دیکھو جلی کٹی سناتے رہتے ہو۔'' ثنا غصے میں کہہ کر واک آؤٹ کر گئی۔

بڑے اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے اس لیے اس کے اٹھ کر جانے کو کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ لیکن خزیمہ کے دل کو اس کے یوں روٹھ کر چلے جانے سے کچھ ضرور ہوا پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتی۔ جیسے ہی غصہ ختم ہوگا پھر سے خونخوار بلی بن جائے گی۔ جو ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ خزیمہ سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔

☆☆☆

عمیر کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ سب تیاریوں میں لگ گئے۔ صبح سویرے روزے کی حالت میں تائی امی اور ممار وزانہ شاپنگ پر جاتیں اور شام ڈھلے واپس آتی تھیں۔ ثنا اور زارا مل کر افطاری کا سامان بناتیں۔ سب ینگ جنریشن نے ایک ساتھ شاپنگ پر جانے کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ انہیں صرف بڑوں کی شاپنگ مکمل ہونے کا انتظار تھا۔ اللہ، اللہ کر کے بڑوں کی شاپنگ مکمل ہوئی تو ینگ جنریشن نے اپنی خریداری کا سوچا۔ افطار کے بعد عمیر کے ساتھ سبھی شاپنگ کرنے بازار چلے گئے تو اماں بی نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

فوراً گٹھ جوڑ کیا۔ اماں بی کے کمرے میں اجلاس طلب ہوا۔ سبھی بڑے اکٹھے ہوئے تو اماں بی بولیں۔

''میرا خیال ہے اب خزیمہ اور ثنا کی منگنی کر دی جائے اور شادی پڑھائی مکمل ہوتے ہی کر دیں گے۔''

''اماں بی جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' اظہار صاحب نے انہیں کہا۔ باقی سب بھی ان کی بات سے متفق نظر آئے۔

''اماں بی آپ ہماری بڑی ہیں۔ آپ کا جو فیصلہ ہوگا یقیناً اس میں ہمارے بچوں کا بھلا ہوگا۔ آپ کا تجربہ ہم سے کہیں زیادہ ہے اور زمانے کی اونچ نیچ کو بھی ہم سے بہتر جانتی ہی۔ آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمیں دل و جان سے قبول ہے۔'' فراز نے بھی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

''جیتے رہو میرے بچو! مجھے تم دونوں پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ ایسی سعادت مند اولاد آج کے زمانے میں کہاں ہوتی ہے، تم دونوں نے آج تک میرے ہر فیصلے سر تسلیم خم کیا ہے۔'' تھوڑی دیر ٹھہر کر سانس لی پھر بات کو آگے بڑھایا۔ ''بیٹی کی کمی تھی لیکن اللہ نے مجھے دو، دو بیٹیوں سے نواز دیا۔ اپنی ماں سے بڑھ کر مجھے ان دونوں نے رتبہ دیا ہوا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جس کے تم جیسے بچے ہیں۔'' اماں بی نے بہوؤں کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھا اور تشکر کے طور پر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''اماں پلیز ہمیں شرمندہ مت کریں۔ یہ سب آپ کی اچھی تربیت کا اثر ہے۔'' اظہار شرمندہ ہو کر بولے۔

''نہیں میرے بچو..... میں تم سب سے بہت خوش ہوں اللہ کی ذات تم سب کو ایسے ہی محبت سے جوڑے رکھے آمین۔'' اماں اٹھ کر ان کے سروں پر دست شفقت رکھتے ہوئے دعا دینے لگیں۔

''پھر عید کے دوسرے دن ان دونوں کی منگنی کر دیتے ہیں۔ عید کا مزہ بھی دوبالا ہو جائے گا اور بچوں کے لیے یادگار عید بن جائے گی۔'' اماں بی نے کہا تو سب ان کے فیصلے پر خوش ہو گئے۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑنے لگا آنکھ جھپکتے ہی رمضان گزر گیا۔ آج انتیسواں روزہ تھا۔ افطار کے بعد سبھی چھت پر آ کر بے صبری سے چاند کا انتظار کرنے لگے۔ عمیر کو چاند نظر آ گیا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے باقی افراد کو بھی چاند دکھایا۔

''چاند کو چاند دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جا کر آئینہ دیکھ لو چاند نظر آ جائے گا۔'' خزیمہ، ثنا کو چھیڑتا ہوا دیکھ کر سرگوشی میں بولا۔

ثنا شرم سے گلنار سرخ ہو گئی۔ اس کی لمبی پلکیں حیا کے بار سے جھک گئیں۔ خزیمہ کی شوخ آنکھیں اسے ڈسٹرب کرنے لگیں تو وہاں سے ہٹ گئی۔ خزیمہ نے اسے اس طرح بلش ہوتے دیکھا تو اس کی سانسیں میں اتھل پتھل ہونے لگی..... وہ شرماتے ہوئے بہت بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ بمشکل اس نے اپنی دھڑکنوں کو اعتدال میں کیا ورنہ آج کوئی گستاخی ہو جاتی۔ اس دوران سبھی ایک دوسرے کو چاند رات کی مبارک باد دینے لگے۔

خزیمہ کی نگاہیں اسے ڈھونڈنے لگیں۔ اسے وہ دوسرے ٹیرس پر کھڑی نظر آئی۔ وہ خاموشی سے دبے پاؤں اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''چاند رات مبارک ہو۔'' چپکے سے اس کے کان میں بولا۔

وہ گھبرا کر پیچھے مڑی اسے اپنے اتنے قریب پا کر بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی۔

''پاگل لڑکی خیر مبارک تو بول دو۔'' خزیمہ نے جب اسے خاموش پایا تو خود ہی بول پڑا۔

''تمہیں بھی چاند رات مبارک ہو۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

وہ سینے پر ہاتھ باندھے یک ٹک اسے دیکھنے لگ گیا۔

''میں زارا کو چاند رات کی مبارک دے آؤں۔'' وہ نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر بولی اور فوراً وہاں سے چلی گئی۔ خزیمہ کو اپنی معصوم سی کزن پر بے انتہا پیار آیا۔

☆☆☆

صبح اٹھ کر کچن میں سب خواتین نے عید کے پکوان

بنائے۔ شیر خورمہ، سویاں اور کچھ نمکین کھانے کے بعد مرد حضرات نماز پڑھنے مسجد چلے گئے اور خواتین تیار ہونے اپنے، اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ ثنا تک سک سے تیار ہوئی جب تیاری مکمل ہوگئی تو اس نے ایک تنقیدی نگاہ میں اپنا سراپا جانچا۔ پنک سوٹ پر ہلکی سی سلور ایمبر ائڈری، سلور پاجامہ، پنک اور سلور رنگ کے امتزاج کا بڑا سا دوپٹا جس کے باہر چاروں جانب گوٹے کا کام اس پر بہت جچ رہا تھا۔ زیادہ بناؤ سنگار اسے پسند نہیں تھا۔ اس نے صرف ہونٹوں پر ہلکے پنک کلر کی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگایا تھا۔ جس سے اس کی کالی بڑی، بڑی آنکھیں نمایاں ہو کر اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔ سلور میچنگ سینڈل اور کانوں میں بھی سلور آویزے ڈالے ہاتھوں میں پنک اور سلور سادہ سی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ سر پر سلیقے سے دوپٹا لیا تو وہ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

تیاری مکمل ہوئی تو نیچے اتر آئی اماں بی سامنے لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ماشاءاللہ .... کہتی ہوئی گلے ملیں۔

''عید مبارک میری گڑیا تو بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے، آمین۔''

''آپ کو بھی عید مبارک اماں بی۔'' اس نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ لیا اسی لمحے خزیمہ بھی آ گیا۔ ثنا نے اس کی طرف دیکھا میرون کرتے اور وائٹ پاجامہ، سلور تلے کا کھسا اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ خزیمہ اسے دیکھتے ہی ذہن پر زور دینے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

''ایکسکیوزمی! آپ مجھے کچھ دیکھی، دیکھی سی لگ رہی ہیں۔ اپنا تعارف کروائیں کی پلیز۔''

اماں بی بے ساختہ مسکرائیں۔ زارا کچن سے باہر نکلتی ہوئی بولی۔ ''بھائی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو سیدھی طرح کر دیں میرے اور اماں بی کے کان بند ہیں۔ ہم کچھ نہیں سن رہے ہیں۔'' اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

ثنا جھینپ سی گئی۔ خزیمہ بھی شرمندہ ہو گیا۔

''تم لوگوں کی عیدی کل سرپرائز کی صورت میں ملے گی۔'' اماں بی معنی خیز انداز میں بولیں تو دونوں نے سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

رات تک کسی نہ کسی طرح منگنی کی خوشی کی خبر زارا نے سن لی اور وہ بھاگتی ہوئی خزیمہ کے پاس لان میں آ گئی۔ جہاں خزیمہ خاموشی سے سنگی بنچ پر بیٹھا تھا۔

''بھائی آپ کو ایک بریکنگ نیوز سناؤں؟ جس سے ہم ینگ پارٹی یکسر لاعلم ہے۔'' خوشی سے وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

''سناؤ!'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''بھائی میری بات غور سے تو سنیں۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

''اب پھوٹ بھی پڑو کہ کیا کہنا چاہتی ہو؟'' وہ بیزاریت سے بولا۔

''آپ کو معلوم ہے اماں بی آپ لوگوں کو کل کیا سرپرائز دینا چاہتی ہیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

''نہیں تو!'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''پتا ہے کل آپ کی آپی ثنا سے منگنی ہونی ہے۔'' زارا پرجوش لہجے میں بولی۔

''کیا واقعی؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''جی بھائی سچ کہہ رہی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اماں بی کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اماں بی کسی کو فون پر کل منگنی پر آنے کا دعوت نامہ دے رہی تھیں۔'' اس نے تمام تفصیل سے بھائی کو آگاہ کیا۔

خزیمہ کی خوشی دیدنی تھی۔ جس بات کے بارے میں ابھی سوچ، سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا کہ کیسے مما، پاپا سے بات کرلے؟ اس کا وہ مسئلہ حل بھی ہو چکا تھا۔ زارا اٹھ کر جانے لگی تو اس نے اسے آواز دی۔

''زارا کہاں جا رہی ہو؟''

''بھائی ثنا کو مطلع کرنے جا رہی ہوں۔'' وہ خوشی سے بولی۔

''تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔ کل خود اسے سب معلوم ہو جائے گا۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی جیسے آپ کہیں۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

رات کو خزیمہ نے ثنا کو میسج کیا۔

"نوکری کا تو ابھی معلوم نہیں لیکن کل مجھے چھوکری مل جانی ہے۔"

ثنا میسج پڑھ کر بہت پریشان ہوئی۔ ساری رات اسی سوچ میں گزر گئی نہ جانے وہ لڑکی کون ہے؟ جس کا ذکر خزیمہ نے کیا ہے۔ ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔ نمازِ فجر پڑھ کر وہ لیٹی تو اسے فوراً نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ فریش ہو کر جلدی سے باہر آئی تو امی پیار سے بولی۔

"بیٹا تم اپنے کمرے میں جاؤ میں ابھی تمہارا ناشتا لے کر آتی ہوں۔ پھر مہندی لگانے والی لڑکی آئے گی۔ وہ تمہیں مہندی لگائے گی۔"

وہ غائب دماغی سے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

"لو مہندی تو چاند رات کو لگانے نہیں دی اب کہہ رہی ہیں مہندی لگوا لینا۔" تھوڑی دیر میں مما ناشتا لائی اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مما کی موجودگی کا سوچ کر دو چار نوالے زہر مار کیے۔ گھر میں آج سب کچھ غیر معمولی ہو رہا تھا۔ ڈیکوریٹر کو بلا کر لان کو رنگ برنگے پھولوں سے سجایا گیا اور ایک طرف خوب صورت سا اسٹیج بنایا گیا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں بند رہی۔ اسے سب کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے سب دیکھ رہی تھی سوچ رہی تھی شاید عمیر بھائی کی شادی کی تیاریاں ہیں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار، مار کر روئے۔ لیکن کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آنسو اندر اتارتی رہی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگ گئی۔

بیوٹیشن اب اس کے چہرے پر اپنے ماہرانہ ہاتھوں کا جادو جگا رہی تھی۔ وہ کسی بت کے مانند ساکت سی بیٹھی تھی۔ شام کو جب اس کے سامنے آئینہ کیا گیا تو وہ بالکل دلہن لگ رہی تھی۔ اس نے حیرانی سے مما اور نانی کی جانب دیکھا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔ دونوں اس کی بلائیں لیتی نہیں تھک رہی تھیں۔ عمیر بھائی کی مہندی اور عید کی تیاری پر وہ سرشار تھی۔

"مما یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آہستگی سے ماں سے پوچھا۔

"بیٹا آج تمہاری منگنی ہے۔" مما اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ پھر اسے ساتھ لیے باہر کی جانب چل پڑیں۔ وہ ایک ٹرانس کی حالت میں ان کے ساتھ چلنے لگی۔

"میری منگنی کس سے ہے؟" اسٹیج پر اس کے برابر والی جگہ پر کوئی براجمان تھا۔ لیکن وہ پلکیں اٹھا کر اسے نہیں دیکھ سکی۔ لان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تالیوں کی گونج میں اس کی انگلی میں کسی نے انگوٹھی پہنا دی۔ اس کے پہلو میں موجود وجود تھوڑا سا اس کی جانب جھکا وہ کسمسائی لیکن اس کے ہاتھ کو اس نے نرمی سے اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا اور سرگوشیانہ انداز میں اس کے کان کے قریب گنگنایا۔

"اب تم ہی ہو تم ہی ہو زندگی اب تم ہی ہو۔"

یہ آواز سن کر وہ حیرت کے سمندر میں اتر گئی غصے اور خوشی کے ملے جلے تاثر سے اس نے اس کی جانب دیکھا۔ خزیمہ اس کے پہلو میں بیٹھا اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو دل چاہ رہا ہے کہ ابھی نکاح پڑھا کر تمہارے تمام حقوق اپنے نام کرا لوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذب سے بولا۔ اس نے شرما کر دوسری طرف رخ پھیر لیا۔

"بچوں کیسی لگی میری سرپرائز عیدی؟" اماں بی ان دونوں کو باری، باری پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"اماں بی یادگار عیدی ہے۔ ہمیشہ یاد رہے گی بلکہ میرے بچے بھی آپ کی اس خوب صورت عیدی پر آپ کا شکریہ ادا کرتے رہیں گے۔" خزیمہ شرارتی انداز میں بولا تو اماں بی نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگا دی۔

"شریر کہیں کا۔" کہہ کر وہ ہنس دیں۔

ثنا کے رگ و پے میں سکون کی لہر سرایت کر گئی آج سچی محبت اپنی فتح پر مسکرا رہی تھی۔

pklibrary.com

وبا کے دن

قرۃ العین خرم ہاشمی

''قیامت آنے والی ہے.....'' رفعت جہاں یہ بات دن میں کئی بار دُہراتی تھیں کہ گھر کے لوگوں کو ان کی سب باتیں اب ازبر ہو چکی تھیں۔

''دادو آپ کو کیسے پتا چلا؟'' سترہ سالہ زوہیب بظاہر تو سنجیدگی سے سوال کرتا مگر اس کی آنکھوں کی شرارت بہت واضح ہوتی۔

''اڑا لے مذاق اپنی دادی کا مگر تمہارا بھی کیا قصور ہے۔ آج کے بچوں کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہی کب ہے۔'' انہوں نے افسوس سے کہا۔

''دادو آپ اتنی ٹینشن کیوں لیتی ہیں؟'' زوہیب نے گویا انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ہائے اللہ! کیسی باتیں کر رہا ہے۔ کیا اب بھی پریشان نہ ہوں۔ ہر وقت تو ہاتھ میں موبائل پکڑ کر بیٹھا ہوتا ہے کیا یہ ڈبا نہیں بتاتا کہ دنیا میں کیسی آفت آئی

ہوئی ہے۔'' رفعت جہاں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کورونا وائرس سے ڈری ہوئی ہیں؟'' زوہیب نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بہت معمولی بات ہے۔

''نہیں تو..... وہ میری سہیلی ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ کھیلے ہیں۔ شرم کر دادی سے بحث کر رہا ہے۔'' انہوں نے منہ بنا کر کہا تو زوہیب ہنستے ہوئے ان کے گلے لگ گیا۔

''ارے پرے ہٹ! پتا بھی ہے کہ ٹی وی پر بار، بار کہتے ہیں احتیاط کرنے کو۔ تم ہو کہ چپکے ہی جا رہے ہو۔'' رفعت جہاں نے ہلکے سے اسے پیچھے کیا مگر زوہیب دادی کے گلے میں بازو ڈالے لاڈ کرتا رہا۔ کچھ دیر میں وہ بھی سب کچھ بھول کر اس سے باتیں کرنے لگیں۔

''دادو چائے۔'' ہما اپنی دُھن میں اندر آئی تو ٹھٹک کر رک گئی۔

''چالاک لڑکے ضرور دادو سے کوئی فرمائش کر رہے ہوگے۔'' ہما نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟ جل ککڑی بہن.....'' زوہیب نے اپنے سے تین سال بڑی بہن کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''کتنی بار تمہیں کہا ہے کہ بڑی بہن کا ادب کیا کرو۔'' دادو نے ڈپٹ کر کہا اور پاس کھڑی ہما کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑ لیا۔ دادو کو اپنی حمایت کرتا دیکھ کر اس نے زوہیب کو ٹھینگا دکھایا تھا۔

''دادو قسم سے دو مہینے پہلے میں نے سوچا تھا کہ آج سے ہما کو بڑی بہن مان کر پوری عزت اور احترام سے باجی یا آپی کہا کروں گا مگر.....!'' زوہیب نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر کیا؟'' دادو نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔ ہما بھی تھوڑا پاس کھسک آئی۔

''کورونا آ گیا ناں.....'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ہما نے حیرانی سے سوال کیا۔

''تمہارے اور میرے ادب کرنے کے درمیان ایک چھوٹا سا وائرس آ گیا۔ اگر کورونا وائرس نہ آتا، ایک مہینہ پہلے تمہاری شادی ہو جاتی۔ تم عام سے خاص، میرا مطلب ہے باجی یا آپی کا مقام پا لیتیں..... مگر لکھا نہ رہے تیرا کورونا.....! میری پیاری بہنا کی شادی بھی رکوائی اور اسے آپی کا لقب بھی نہ ملنے دیا۔'' زوہیب سنجیدگی سے کہتا ہما اور دادو کی حیران شکل دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ابھی بتاتی ہوں تمہیں۔'' ہما پاس رکھا کشن اٹھا کر اس کی طرف بڑھی۔ زوہیب نے اپنی لمبی ٹانگوں سے فوراً کام لیا اور چھلانگ لگا کر کمرے سے باہر۔

''کینگرو کہیں کا۔'' ہما بڑبڑائی۔

''دادو آپ بھی ہنس رہی ہیں؟'' ہما، دادو کو دوپٹا منہ پر رکھتے دیکھ کر روہانسی ہو کر بولی۔

''زوہیب نے بات ہی اتنے مزے کی کر دی ہے۔ ویسے سچ میں اگر تمہاری شادی ہو جاتی تو.....'' رفعت جہاں، زوہیب کی بات یاد کر کے ہنسنے لگیں۔ ہما بھی مسکراتی ہوئی ان کے پاس بیٹھ گئی اور کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

''ہما بیٹی! پریشان مت ہو۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔'' وہ سمجھیں کہ شاید ہما اپنی شادی کی تاریخ آگے ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہے۔

''بے شک مگر دادو میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ لاک ڈاؤن میں غریب لوگ کیا کریں گے۔ کتنی مشکل پیش آ رہی ہوگی لوگوں کو۔'' ہما نے ہمدردی سے کہا۔

''ہاں مشکل تو بہت ہے مگر انسان صرف کوشش ہی کر سکتا ہے۔'' انہوں نے سرسری انداز میں کہا تو ہما سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''بھلا یہ کیا بات ہوئی؟'' رفعت جہاں نے ہما کے سسرال والوں کا نیا مطالبہ سنا تو منہ بنا کر بولیں۔

''اماں حالات کا تقاضا تو یہ ہی ہے۔'' افضل صاحب نے اخبار سے نظر ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''مجھے بھی یہ ہی مناسب لگ رہا ہے۔'' فرحت نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''کیا مناسب لگ رہا ہے؟ ارے، ہم اپنی لڑکی کو چھپ چھپاتے بیاہ دیں؟ وہ جو لاکھوں روپیہ سجاوٹ کے نام پر بڑے، بڑے ہوٹلوں کو دے رکھا ہے۔ وہ حرام جائے گا۔'' رفعت جہاں نے گرج کر کہا۔

''اماں آدھی پے منٹ کی تھی مگر اب تو شادی ہالز میں فنکشن بھی نہیں ہوں گے۔ اس لیے وہ پیسے واپس مل جائیں گے۔'' افضل نے نرمی سے سمجھایا۔

''جو بھی ہے۔ میں تو اپنی اکلوتی اور لاڈلی پوتی کی شادی دھوم دھام سے کروں گی۔ اتنا اعلیٰ اور شاندار جہیز بنایا ہے۔ کیا، کیا نہیں سوچا ہے۔ ہما کی شادی اپنی زندگی میں دیکھنے کا اتنا شوق ہے کہ بیس سال کی عمر میں ہی اسے بیاہنے کا سوچ رہی تھی، نہیں تو کچھ سال اور گھر بٹھاتی۔ میری تو جان ہے اپنی پوتی میں۔'' انہوں نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر جو ملکی حالات ہیں اس طرح تو ہما کی شادی لٹک جائے گی۔ اس کی سسرال والے سادگی سے نکاح کر کے رخصتی پر زور دے رہے ہیں۔'' افضل صاحب نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

''میں نے ایسی شادی ہرگز نہیں کرنی۔ صاف کہہ دو اُن سے۔'' رفعت جہاں نے ضدی انداز میں کہا تو افضل اور فرحت سر پکڑ کر رہ گئے۔ وہ ماں کو کیسے سمجھاتے کہ ہما کی شادی میں جو جمع پونجی وہ لگانا چاہ رہے تھے حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہ سیونگ ہی کام آنے والی تھی۔ کاروبار بند تھے۔ ملازمتوں کا کوئی پتا نہیں تھا۔ افضل کا اپنا ذاتی کاروبار تھا مگر پچھلے کچھ مہینوں سے تو کوئی کمائی نہیں ہوئی۔ صرف خرچہ ہی خرچہ ہو رہا تھا۔ یہ بھی اللہ کا کرم تھا کہ وہ ان حالات میں بھی گھر بیٹھے سکون سے ہر ضرورت پوری کر رہے تھے۔ افضل صاحب ان حالات میں بہت سے اور گھروں کی کفالت بھی کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان حالات میں غریب طبقہ کتنی مشکل کا شکار ہے۔ وہ

سچ کہنا

اس شہرِ وفا کی راتوں میں
جو اندھیارے پی لیتی ہیں
ان روشنیوں کے نرغے میں
جو ہونٹوں کو سی لیتی ہیں
ہم بھی تمہیں یاد آئے کہ نہیں؟
جب برف گری کہساروں پر
اور ہوا چلی ٹھنڈی، ٹھنڈی
یخ بستہ رات کی کھڑکی پر
جب تیز ہوا نے دستک دی
ہم بھی تمہیں یاد آئے کہ نہیں
جب خط میں کسی کو تم نے لکھا
کوئی حرف دعا کوئی حرفِ وفا
کسی یاد کا بھولا نقش کوئی
جب کاغذ پر تحریر ہوا
ہم بھی تمہیں یاد آئے کہ نہیں؟
سچ کہنا اتنے برسوں میں
یہ دنیا تو آباد رہی
ہم نے تو تمہیں کیا بھولنا تھا
تم کو بھی ہماری یاد رہی
ہم بھی تمہیں یاد آئے کہ نہیں؟

شاعر: اعتبار ساجد ..... مرسلہ: عیقہ انا چکوال

لوگ جو پرائیویٹ گاڑی سروس چلاتے تھے...... وہ بے روزگار ہو کر گھر بیٹھ گئے تھے۔ کئی لوگوں کو جابز سے فارغ کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو کئی مہینوں سے تنخواہ ہی نہیں ملی تھی۔ ایک افراتفری کا ماحول تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ان مشکل حالات میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے جتنا ممکن تھا اچھے کام کرنے چاہئیں بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح غفلت کی نیند سوئے رہتے۔

مگر کورونا وائرس کی طرح ہمارے ذہنوں میں بھی لالچ، دھوکا، حرص، خود غرضی کا ایسا وائرس سرایت کر چکا ہے کہ جس کا علاج کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس لیے تو بہت سے مستحق لوگ ضرورت سے زیادہ

pklibrary.com

امداد لے کر اسے اسٹورز پر بیچتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ یعنی ان حالات میں بھی لوگ توبہ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ہیں۔ یہ اکڑ، یہ غرور، یہ ناسمجھی بنی نوع انسان کا ہی تو خاصہ ہے۔ کسی اور جاندار میں اتنی جرأت اور ہمت کہاں کہ ایسے حالات میں بھی رب کے آگے جھکنے کے بجائے آپس کی نفرتوں، حسدوں، نفاق کی آگ کو بھڑکاتے رہیں۔

☆☆☆

''اب لاک ڈاؤن کھل تو گیا ہے۔ ہما کے سسرال والوں سے کہو کہ دھوم دھام سے رخصتی کریں۔'' رفعت جہاں کے نئے مطالبے پر فرحت تلملا کر رہ گئیں۔

''اماں آپ کو سمجھ کیوں نہیں آرہی؟ یہ حالات کوئی ایک یا دو دن کی بات نہیں ہے۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں کہ یہ وائرس دو سے تین مہینے میں ختم ہو جائے گا تو سب کچھ پہلے کی طرح نارمل ہو جائے گا؟ اماں ایسا نہیں ہے۔ ایک لمبی مدت تک ہمیں اس وائرس کے ساتھ لڑنا ہے۔ اس وائرس کے ساتھ جینے کا طریقہ سیکھنا ہے۔'' فرحت نے جھنجلا کر کہا۔

''تو بہو اس میں اتنا برا ماننے والی کیا بات ہے۔'' انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

''اس لیے اماں کہ آپ کی بچوں کی طرح ایک ہی ضد ہے۔ جبکہ اب ضد کا نہیں سوچنے سمجھنے کا وقت ہے۔ ہم کون سے جدی پشتی رئیس زادے ہیں۔ ساری زندگی محنت، مشقت اور بچتیں کر، کر کے جو بنایا آپ کے سامنے ہے۔ اب اس طرح کے مشکل حالات میں شادی پر لاکھوں روپیہ خوچ کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ وہ رقم بچی کو ہی تحفے میں دے دیں تاکہ مشکل وقت میں کام آسکے۔'' فرحت نے کہا۔

''جاؤ بی بی! یہ طریقے ہمیں مت سکھاؤ۔ سب پتا ہے مجھے۔'' اماں نے ناراض لہجے میں کہا۔ فرحت گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ کبھی کبھار بوڑھے اور بچے کو سمجھانا سچ میں بہت مشکل کام بن جاتا ہے۔

☆☆☆

''دادو! آج مجھ سے ایک غلط کام سرزد ہو گیا۔'' زوہیب نے تسبیح پڑھتی دادی کے پاس آکر اداسی سے کہا۔

''کیا میرے لال۔'' دادو اس کی اداسی پر تڑپ اٹھیں۔

''دادو میں نے کان لگا کر کسی کی باتیں سن لی ہیں۔'' زوہیب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

''کس کی؟'' انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

''امی اور ابو کی۔'' زوہیب نے سر اٹھا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''کیا ہوا زوہیب بیٹا۔'' رفعت جہاں نے تڑپ کر سوال کیا۔

''امی اور ابو بہت پریشان ہیں۔ کاروبار میں مسلسل نقصان اور مشکل حالات..... مگر وہ کہہ رہے تھے کہ یہ گھر بیچ کر آپ کی خواہش ضرور پوری کر دیں گے۔'' زوہیب نے کہا۔

''ہائے اللہ! یہ گھر بیچنے کی خواہش میں نے کب کی ہے؟'' دادو نے دل تھام لیا۔

''ہما باجی کی شادی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ساری جمع پونجی تو گھر بیٹھے ہی خرچ ہو گئی۔ اب یہ ہی راستہ رہ گیا ہے کہ.....'' زوہیب کہتے ہوئے چپ ہو گیا۔

''پاگل ہو گئے ہو۔ شادی کے لیے گھر کون بیچتا ہے۔ میرے بیٹے نے سردی، گرمی برداشت کر کے یہ چھت بنائی۔ اب کیا دنیا کی نمود و نمائش کے لیے اسے بھی بیچ دیں۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

''مگر دادو آپ کی خواہش.....'' زوہیب نے کچھ کہنا چاہا۔

''ارے بھاڑ میں گئی میری خواہش۔ میں نے کون سا آخری خواہش کر دی تھی۔'' انہوں نے غصے میں کہا کہ زوہیب کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

''سوچ لیں دادو..... پھر مت کہیے گا کہ ہما باجی کی شادی ایسے ہی کر دی۔'' زوہیب نے کہا۔

''ارے سوچنا کیا..... سادگی سے نکاح کریں

اور لڑکی کو لے جائیں۔ فضول کی رسمیں اور یہ کیا تم نے ہما باجی لگا رکھی ہے۔ وہ کون سا تم سے دس سال بڑی ہے۔ دو تین سال کے فرق سے باجی کہنے کی کیا ضرورت ہے۔'' رفعت جہاں کو کچھ اور سمجھ نہیں آئی تو زوہیب پر ہی چڑھائی کر دی۔ زوہیب زیرِلب ہنسی دباتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر آ کر وہ خوب اونچے، اونچے قہقہے لگانے لگا۔

''بس کرو۔ دادو سن لیں گی۔'' ہما بھی ہنستے، ہنستے بے حال ہو گئی تھی۔

''تم نے دادو کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھے۔ قسم سے بہت مشکل سے ہنسی ضبط کی۔'' زوہیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب امی ابو کو تمہارے جھوٹ کے بارے میں نہ پتا چل جائے۔'' ہما نے پریشانی سے کہا۔

''اس میں جھوٹ نہیں ہے۔ ابو، امی سے کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی اور انتظام نہیں ہوا تو یہ گھر بیچ دیں گے۔'' زوہیب نے سنجیدگی سے کہا تو ہما دل تھام کر رہ گئی۔

''اللہ نہ کرے۔'' ہما نے دل سے دعا کی۔

''آمین مگر ابو، دادو کی بات نہیں ٹال سکتے ہیں۔ وہ ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' زوہیب نے کہا تو ہما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

رفعت جہاں جو زوہیب کو بلانے پیچھے آ رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر خاموشی سے پلٹ گئیں۔ یہ سچ ہے کہ ان کے ڈر سے افضل نے کبھی ان کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی، ہمیشہ ہر بات پر سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئیں۔ ان کا دل عجیب سے کیفیات میں گھرا ہوا تھا۔ ایک ماں اپنی اولاد کے لیے کیا نہیں کرتی اور اچھی اولاد بھی اپنے والدین کے لیے ہر حد تک جاتی ہے مگر جب بات بندے اور اس رحمان کے تعلق کی کریں تو ہم صرف روتے دھوتے ہوئے چند فرض ہی ادا کر پاتے ہیں۔ جبکہ بنی نوع انسان سے تو ساری عمر کی بندگی کا عہد لیا گیا پھر تو ہر پل اللہ کی اطاعت میں ہی گزرنا ہے۔

کسی وائرس، کسی وبا، کسی تکلیف کا آنا قیامت نہیں ہوتا..... قیامت تو ہے کسی کا حق مارنا..... اپنے حق سے زیادہ لینا..... غریب اور نادار لوگوں کی مدد نہ کرنا..... کسی یتیم، کسی مسکین کے سر پر ہاتھ نہ رکھنا..... کسی کو بھوک کی شدت سے تڑپتے دیکھنا، خود غرضی دکھانا قیامت ہے۔

یہ وبا تو اپنے وقت پر حکمِ ربی سے ختم ہو ہی جائے گی مگر اس وبا کے دنوں میں بھی اگر ہم انسان ہو کر انسانیت کا فرض نہ نبھائیں تو اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ وبا کچھ کے لیے تنبیہ ہو..... کچھ کے لیے مزید نیکیاں کمانے کا راستہ ہو..... اور کسی کے لیے خوابِ غفلت سے جاگنے کا الارم ہو..... کچھ کے لیے مزید خیر بانٹنے کا ذریعہ ہو.....

اور یہ وبا کس کے لیے کیا ہے..... اس کا فیصلہ ہم سب کو خود کرنا ہے..... اگر یہ سوچیں کہ ابھی وبا کے دن باقی ہیں تو یہ بھی.....

سوچیں کہ یہ وبا کے دن سدا نہیں رہیں گے۔

اس وبا کے بعد جشن کے دن بھی آئیں گے۔

اس لیے جس نے جتنا خیر کمانا ہے کما لے تاکہ جشن کے دنوں میں شکر کا سجدہ سب سے طویل ہو اور وہ سجدہ ہم میں سے کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔

☆☆☆

خود احتسابی۔ کے عمل سے گزرنے والی رات کے بعد سے رفعت جہاں کی صبح تھوڑی الگ تھی۔ آج انہیں اپنے آس پاس ایسے بہت سے لوگوں کی لسٹ بنا کر افضل صاحب کو دینی تھی جو ان حالات میں سفید پوشی کی چھوٹی پڑتی چادر سے بمشکل اپنا تن ڈھانپ رہے تھے۔ رفعت جہاں کا یقین تھا کہ اس وبا کے بعد آنے والا وقت بہت سنہرا ہوگا..... !سنہرا دن..... سنہرا سویرا ہوگا.....!

''بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''

(سورۃ الم نشرح)

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت... اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے... کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں... غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے... لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے... اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

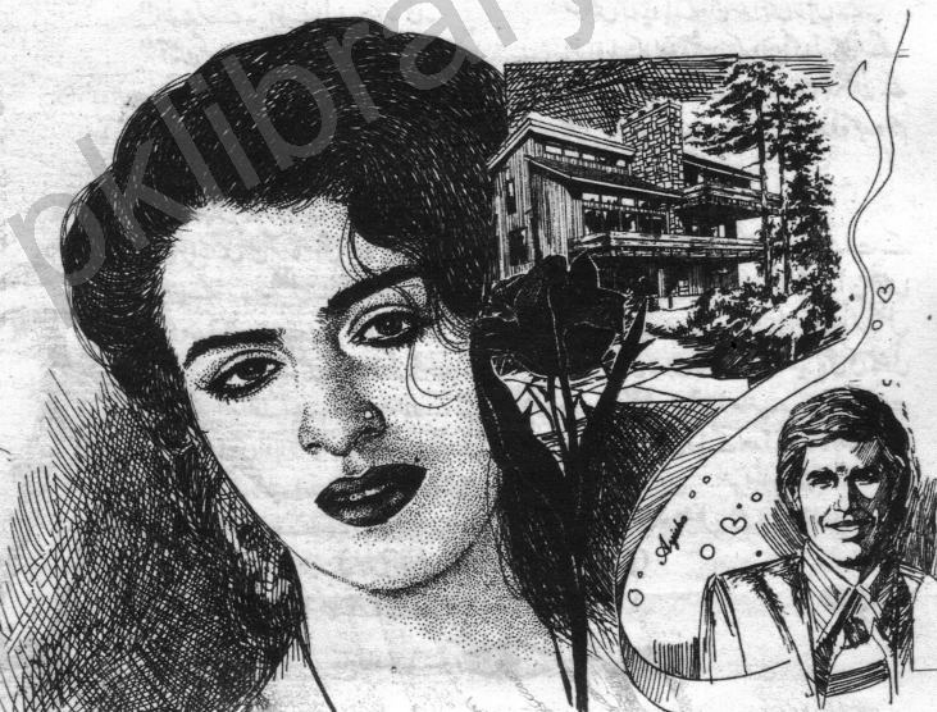

pklibrary.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور اموجان اور تیسری شخصیت دادی پھپو۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ ثریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ثریم پراس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ امو، حریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی، وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... عمائم، اُمِّ رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم اس پیکٹ کو کھول کر دیکھتی ہے لیکن ان عجیب سی چیزوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلپ دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی..... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم کہتی ہے کہ میں نے نہیں کیا تو وہ اسے خبردار رہنے کو کہتی ہے اور کہتی ہے کہ راشن ڈپو میں جا کر راشن اتروائے۔ اسٹور کا ہیڈ عمائم کو کہتا ہے کہ ڈیلر نے نیا ڈرائیور بھیجا تھا جس نے ایکسیڈنٹ کر کے سارے انڈے توڑ دیے ہیں۔ عمائم، ڈرائیور کو دیکھ کر الجھن کا شکار ہوتی ہے اور اسے چھپ کر نورس کی تصویریں لیتے دیکھ کر ساکت رہ جاتی ہے۔ عالی، عمائم کو بتاتی ہے کہ ثریم کی کزن کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔ روشان کو ڈورڈ میں احتشام کو بتاتا ہے کہ مرغی کی تصویریں لیتے ہوئے اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ احتشام کہتا ہے کہ چوزی نے دیکھا ہے تو کوئی پریشانی نہیں۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ برطانوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گٹر سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ...کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی وگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ روشان کے گھر میں اذان اور احتشام تھے وہاں عالی آتی ہے تو احتشام انہیں بتاتا ہے کہ عمائم ان کی باتوں پر چونک رہی ہے۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ ایمان نے کہا کہ میں اموجان کی نفرت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ عمائم کے دل کو بابا صاحب کی باتیں لگی تھیں۔ ایمان، عمائم سے اس کا جواب جاننا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔ ایمان، عمائم کو بتاتا ہے کہ اموں نے اس فیصلے پر خاموشی اختیار کی ہے اور خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی منگنی ہوگی۔ حریم، عمائم پر منگنی کو لے کر غصہ کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اور کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ بسمہ، عمائم کو بتاتی ہے کہ اموکو جیل میں سے کسی نے فون کیا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی ہیں۔ احتشام، عمائم کو کہتا ہے کہ یہ منگنی زیادہ دیر چلتی نظر نہیں آتی۔ دادی، عمائم کو کہتی ہیں کہ مجھے دادی نہ کہا کرو..... میں تمہاری ماں کی ماں ہوں اور عمائم یہ حوالہ جان کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن دادی اسے کہتی ہیں کہ ابھی یہ بات

کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے اور بابا صاحب اس کے لیے وہی فیصلہ کریں گے جو اس کے لیے بہتر ہوگا۔ عمائم کو میسج آتا ہے کہ ایمان دور اندیش نہیں ہے اور اسے ایسے شخص کا ہاتھ تھامنا چاہیے جو دوررس ہو۔ امو کی طبیعت خراب ہوتی ہے احتشام ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے، احتشام سے امو کہتی ہیں کہ ان کا ضمیر انہیں سکون نہیں لینے دیتا۔ احتشام، عمائم سے کہتا ہے کہ تمہاری جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کی جان کو خطرہ ہے لیکن وہ سکیورٹی کی آفر ٹھکرا چکی ہے اگر وہ اسے راضی کر لے تو ان کی آفر برقرار ہے۔ امو، عمائم سے کہتی ہیں کہ تم ہو بہو ویسی ہی ہو، تم جانتی ہو تمہاری ماں نے کسے قتل کیا تھا۔ عمائم کی ایمان سے منگنی ہو جاتی ہے اذان، شریم سے اس کا نمبر مانگتا ہے، عمائم رات کو ماہم کو بے حال دیکھتی ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایمان کے لیے اتنا آگے چلی گئی۔ ایمان، عمائم سے ڈنر پر چلنے کے لیے کہتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اسے منگنی کے بعد فون پر باتیں کرنا پسند نہیں ہے۔ نورس، عمائم کو بتاتی ہے کہ اس نے کرن سے لفٹ لی تھی لیکن پوچھ گچھ کی وجہ سے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ احتشام اور اذان کو بریفنگ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک نجی نمائش میں دہشت گردی کی باوثوق اطلاعات ہیں۔ بسمہ، عمائم کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔ عمائم اس بات پر یقین نہیں کرتی، اذان اور روشان، عمائم کی منگنی پر احتشام کے رویے پر حیران تھے۔ اذان، احتشام سے کہتا ہے کہ وہ ایمان کو سب بتا دے لیکن وہ اس بات پر کان نہیں دھرتا۔ احتشام کو بہت پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عمائم کو سب چھوت سمجھتے ہیں تو وہ اس کی طرف اپنے جھکاؤ کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ احتشام کی ماں اسے بتاتی ہے کہ ان سے ایک گناہ ہوا تھا اور وہ آج بھی اس کی گرفت میں ہیں تو احتشام کہتا ہے کہ کیا ہم کفارہ ادا نہیں کر سکتے تو وہ کہتی ہیں کہ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہے، اسے امو سے بچالو یہی کفارہ ہے۔ میسج آنے پر عمائم، ایمان سے معذرت کرنے جاتی ہے تو امو کی بات سن کر حیران رہ جاتی ہے، وہ ایمان سے کہہ رہی تھیں کہ اس فیصلے سے ماہم، تم، عمائم اور احتشام کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ عمامہ سے عمائم تک کی یہ داستان مت دُہراؤ اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ سب امو کو اسپتال لے کر جاتے ہیں تو کرن کی مما مسز ابرار (سونیا) ان کے گھر آ کر عمائم سے کہتی ہیں کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ عمائم، سونیا کے جانے کے بعد خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہے تو حریم، احتشام کو بلاتی ہے اور اسے بتاتی ہے لیکن وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور واپس چلا جاتا ہے تو حریم چابیاں ڈھونڈنے جاتی ہے۔ حریم کے جاتے ہی احتشام ایک اوزار کے ذریعے کمرے کا لاک کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سونیا گھر واپس آ کر ابرار کو بتاتی ہے کہ عمائم کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ ثبوت مانگ رہی ہے۔ عمائم کو احتشام سمجھاتا ہے کہ اس معاملے میں لگی گرہوں کو ذہانت سے کھولو گی تو ساری الجھنوں کا حل پالو گی لیکن عمائم ان اجنبی راہوں پر چلنے کو تیار نہ تھی۔ بابا، ماہم کو دیکھتی ہیں تو ان کے ذہن کے پردے پر ماضی کے کردار واضح ہو جاتے ہیں لیکن یہ اپنی اور پرائی اولاد کا فرق تھا کہ آج وہ چاہتی تھیں سب کچھ ماہم کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔ حریم سب کو ان خاتون کے بارے میں بتاتی ہے تو کچھ خواتین اندازہ لگاتی ہیں کہ شاید وہ عمامہ ہو تو حریم بتاتی ہے کہ ان کا نام سونیا تھا۔ تائی امی کہتی ہیں کہ لوگ ایسے ہی واردات کرتے ہیں۔ احتشام، ماہم سے کہتا ہے کہ محبت ایثار کا جذبہ ہے۔ ماہم کو اس کی بات سمجھ آ گئی تھی۔ عمائم جامعہ جانے کے لیے نکلتی ہے تو گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے ایمان اسے اپنی گاڑی میں ڈراپ کرنے کا کہتا ہے اور پھر اسے ایک ریسٹورنٹ لے جاتا ہے تو عمائم گاڑی سے نہیں اترتی کہ اسے شادی سے پہلے یہ سب پسند نہیں۔ ایمان غصے میں واپس لے آتا ہے..... تائی امی، عمائم سے اس عورت کے بارے میں پوچھتی ہیں تو وہ بتاتی ہے کہ وہ کرن کی مما تھیں۔ تائی امی کہتی ہیں کہ اب شادی کی تیاری کرو کیونکہ ایمان کو جلدی ہے۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے، جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو طیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور اپنی عزت پیاری ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ طابہ (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ، طابہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ آنے والے فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہو گئی ہے۔ آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں، وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کر لی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہو جاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہو گئیں۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طابہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ

استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال ایک لالچی آدمی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہوجاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ پہلے بہت خوب صورت تھی۔ تقی، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آکر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ (شام کی ماں) کے ساتھ منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔ اور وہ شام کو خود لے آئے تھے۔ تاج بیگم (دادی) شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کردیں گی وہ تیار رہے۔ فیقہ سوچتی ہے کہ اماں اور بھیا نے اس کے لیے شام کا انتخاب کیا ہے تو عمامہ اس کے رستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتی۔ سونیا، عمامہ کو فون کرکے کہتی ہے وہ فیقہ کی برین واشنگ کرکے اس کو صحیح اور غلط فیصلے کی پہچان کروا کر اس کی دوسری جگہ شادی کروادے گی۔ وہ ابھی بات کررہی ہوتی ہے کہ فون کٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فون پھر بجتا ہے تو فون پر سونیا کے دھوکے میں شام کے باپ منصور سے کہہ بیٹھتی ہے کہ وہ شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ طاہرہ، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس نے منصور اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ سونیا، عمامہ کے گھر ایک جوکر کے روپ میں آتی ہے اور پھر کچھ کرتب دکھا کر سب کو خوش کرتی ہے اور پھر اپنا آپ ظاہر کرکے فیقہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ اماں، فیقہ سے سونیا کی دی ہوئی گڑیا یہ کہہ کر لیتی ہیں کہ اس پر کوئی جادو ٹونا بھی ہوسکتا ہے تاکہ اس کی شادی نہ ہو اور طاہرہ ان کی باتیں سن کر فیقہ کے خدشات کو اور بھی ہوا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ تم ان دونوں پر ظاہر کردو کہ تم ان کی سازش سے واقف ہو۔ طاہر اور (وکیل) بسمہ ہمدانی کو منصور ہوٹل میں چائے پیتے دیکھ لیتا ہے۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کرکے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کردیں۔ طاہر اپنی پسند کو لے کر گھوم پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کررہا ہے۔ سونیا کالج نہیں آرہی تھی تو عمامہ فون کرکے اس کی خیریت دریافت کرتی ہے اور اپنے آنے کا کہتی ہے پھر بڑی مشکل سے وہ اجازت لیتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ لیکن طاہرہ، شام کو فون کرکے بلالیتی ہیں۔ سونیا اس کے آنے سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس کی بہن کو محبت ہوگئی ہے۔ عمامہ کہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے..... پھر وہ چونکتی ہے کیا تم دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہوگئی ہے۔ سونیا، طاہر سے مارکیٹ میں ملتی ہے تو منصور سیال اسے دیکھ لیتا ہے اور پھر صوفی صالح کو فون کرکے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا دو، دو لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ میں نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ سونیا، عمامہ کو اپنے منگیتر سے ملواتی ہے تو تقی جو عمامہ کو لینے آتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور عمامہ پر غصہ کرتا ہے۔ فیقہ، سونیا کا نمبر عمامہ کی ڈائری سے لے کر اسے فون کرکے مدد کرنے کا کہتی ہے سونیا، فیقہ کی مدد کرنے کی ہامی بھرتی ہے اور پھر اس کا حلیہ بدل دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ یہ احسان اتار سکتی ہیں۔ شام اور فیقہ کا جوڑ نہیں ہے اور وہ ایک بہت زبردست پروپوزل لائی ہے لیکن دادی اس کی بات ماننے سے انکار کردیتی ہیں کہ ہمارے ہاں بچپن کے رشتے توڑے نہیں جاتے۔ شام، عمامہ کے استفسار پر کہتا ہے کہ تمہارے علاوہ کوئی بھی ہو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ صوفی صالح، طاہر سے لڑکی کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ایڈووکیٹ ہمدانی کی بیٹی بسمہ کا سونیا کی بہن ہونے کا سن کر فوراً اس کی شادی طے کردیتے ہیں۔ عمامہ، سونیا سے کہتی ہے کہ محبت حق نہیں مقدر ہوتی ہے اور اس نے محبت اور عزت کی جنگ میں عزت کو جیت لیا ہے۔ شام کو دیکھ کر عمامہ کا ساکت ہونا تقی کو بہت عجیب لگتا ہے۔ شام، طاہرہ سے معافی مانگتا ہے کہ میں نے عمامہ کا دل توڑا ہے۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ طاہرہ کہتی ہیں کہ تم اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرو وہ تمہارے رستے میں کبھی نہیں آئے گی۔ حالانکہ ابھی دو دن پہلے ہی وہ صوفی صالح کے پاس گئی تھیں کہ کسی طرح وہ یہ شادی رکوادیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا تھا کہ میں زبان دے چکا ہوں وہ میری بیٹی جیسی بہن ہے میں اس کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔

اب آگے پڑھیے.....

قسط نمبر:17

''یہ ممکن نہیں..... کبھی نہیں۔ زبان دے چکا ہوں..... پھر کیسے زبان سے پھروں.....؟ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے ''امتحان'' میں مت ڈالو۔ میں اپنی ماں کے سامنے ''حقوق'' کی جنگ اور فرائض کی ''ضد'' میں ہارنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی بیٹی کی خوشی پر میری بیٹی کو فوقیت نہیں دیں گی۔ اتنی سی بات آپ کو سمجھ نہیں آرہی..... میں کس منہ سے اپنی بہن کی شادی کو رکوادوں؟ میری چھوٹی سی معصوم بہن..... وہ مجھے عمامہ سے کم پیاری نہیں..... میں اس کا باپ نما بھائی ہوں..... اس کے ارمانوں کا ''قتلِ عام'' کیسے کروں.....؟'' ان کی بے بسی نے طاہرہ کو عمر بھر کے لیے خاموش کردیا تھا۔ دیوانِ خاص

میں ہونے والی یہ "جنگ" ہار اور جیت سے پہلے ہی اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ پھر طاہرہ زندگی میں کبھی بھی شوہر سے کچھ منوانے "دیوانِ خاص" میں نہیں گئیں..... اور شکستہ قدموں سے پلٹ آئیں۔

☆☆☆

بارات کا فنکشن گھریلو سا تھا۔ پھر بھی طاہر اور حاذق کے منچلے دوستوں نے "بارات" کو سجا ڈالا۔ صوفی صالح کی ہزار ناگواری اور شام کے بے انتہا "بیزاریت" ظاہر کرنے کے باوجود ان کے مشترکہ دوستوں نے ایسی ہوائی فائرنگ کی کہ زمین پر جیسے زلزلہ آ گیا۔

اوپر سے ڈھول بجانے والوں نے ناک تک عاجز کر دیا تھا۔ پھر جو بھنگڑا ڈالا گیا تو جیسے بھونچال ہی آ گیا۔ صوفی صالح بڑے ناراض نظر آئے۔ کل بھی اور آج بھی..... بھلا اتنے "دین دار" گھرانے میں اس طرح کی شادیاں کیا معنی رکھتی ہیں؟ لوگ کتنی باتیں بناتے ہوں گے؟ ویسے تو بڑے وعظ اور تبلیغ کی جاتی ہے۔ اور اپنے گھر کا دستور نرالا ہے۔ انہیں آج بھی لوگوں کی فکر تھی۔ لوگ باتیں نہ بنائیں، طعنے نہ دیں..... آخر پہلے بھی تو چار بیٹے بیاہے تھے۔ اسلامی طریقے سے نکاح اور ولیمے کیے۔ اب تو وقت ہی نرالہ آ گیا تھا۔ وہ گھر کی سجاوٹ کو دیکھتے اور بڑبڑاتے رہتے۔

باہر ایک ہنگامہ بپا تھا۔ رات کی رانی مہک رہی تھی۔ باہر جگنوؤں کی بارات اتر آئی تھی۔ ستاروں کی فوج اتر آئی تھی۔ ڈھولک کی آواز اور شہنائیوں کی گونج..... محفل اپنے بامِ عروج پر تھی۔ شام اودھ گنگنا رہی تھی..... فضا میں بلبلوں کی چہکار تھی۔ وہ اتنے ہنگامے سے اچانک بیزار ہو کر اندر چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں شدید اضطراب تھا۔ اس کا چہرہ شدید لال تھا۔ اندر حدت تھی یا باہر وہ سمجھ نہیں پایا۔

ہال میں لہراتے آنچل اور خواتین کا راج تھا۔ بچوں کا الگ شور، کہیں لڑکیوں کی ہنسی اور کہیں گیتوں کی دُھن..... کہیں بوڑھیوں کی کھسر پھسر، وہ بے قراری سے کسی کو تلاشتا رہا..... لہنگا سنبھالے، چھ ماہ کے بچے کو بمشکل کندھے سے لگائے، تھپکتے ہوئے کھلے بالوں والی حسین سی مغرور طاہبہ اسے دکھائی دے گئی تھی۔ آج وہ معمول سے ہٹ کر تیار تھی اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ گو کہ اوپر تلے کے تین بچوں کا ساتھ تھا پھر بھی وہ اپنے حسن سے کبھی غافل نہیں رہی تھی۔

اسے عمامہ کے مقابلے میں ہر دم خود کو پرفیکٹ رکھنا ہوتا تھا۔ وہ ظاہر کرتی یا نہ کرتی..... تقی ضرور جانتا تھا اس کی بیوی ہمہ وقت اپنا اور عمامہ کا موازنہ کرتی تھی۔ اور دل ہی دل میں مقابلہ رکھتی۔ تقی کی بیوی اپنی طرز کا کوئی "منفرد" ہی پیس تھی۔ وہ ہجوم میں طاہبہ کو دیکھتا رہا۔ اور پھر آگے بڑھ کر اس کی کہنی کو دبوچا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ طاہبہ اس افتاد پر اچانک گھبرا گئی تھی۔ بچہ الگ واویلا کرنے لگا۔ تقی نے بچے کو پکڑا اور کسی لڑکی کو تھما کر اندر بڑھ گیا۔ پیچھے لڑکیوں کی ہونک اور بڑی بوڑھیوں کی "ایں ہیں" سنے بغیر وہ گیلری کی طرف مڑ گیا تھا۔ آنٹیوں کی کھلی ڈھلی گفتگو اور تبصروں پر طاہبہ بری طرح خفیف سی تقی کے ساتھ اندر آ گئی۔

"ارے تقی! تمہاری بے، ایسے کیوں گھسیٹ رہے ہو؟ جیسے بھگا کر لے جانا ہو....." اس کے گال ابھی تک گلاب ہو رہے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی شوہر کو دیکھنے لگی۔ لیکن یہ کیا.....؟ وہاں تو کوئی بھی رومینٹک تاثر نہیں تھا۔ طاہبہ کے ارمانوں پر اوس سی گری تھی۔ اس کا خیال تھا، تقی اس کے "حسنِ جہاں سوز" کو سراہنے کے لیے الگ گوشے میں لایا ہے لیکن یہاں تو معاملہ کچھ الگ لگتا تھا۔ وہ تھوڑا متفکر ہو گئی تھی۔

تقی کا وجیہہ چہرہ سوچوں کا غماز لگتا تھا۔ اسے اچانک کیا ہوا تھا۔ وہ پریشان سی ہو اٹھی۔ شوہر کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ وہ اتنا سنجیدہ عام معاملے پر ہوتا نہیں تھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟" اس نے گوری سڈول کلائیوں میں پھنسی چوڑیوں کو ذرا ڈھیلا کرتے ہوئے پوچھا۔ سونے کے بھاری جھمکوں سے کان الگ بوجھل تھے۔ اونچی ہیل نے بھی تھکا رکھا تھا۔ چونکہ تقی نے کل کی طرح سراہا نہیں تھا اس لیے طاہبہ کو سارا سنگار فضول لگ رہا تھا۔

تقی اچانک چونک گیا۔ جیسے سوچوں کے پاتال سے نکلا ہو..... پھر ٹھٹک کر طاہبہ کو دیکھنے لگا۔

''یہاں بیٹھو.....'' اس نے طابہ کا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ طابہ کچھ حیران، حیران سی بیٹھ گئی تھی۔

''ایک بات بتاؤ..... بغیر مبالغے اور جھوٹ کے.....'' تقی نے بہت سرد اور برفیلے انداز میں کہا تھا۔ طابہ کچھ گھبرا اٹھی۔

''اللہ جانے، کیا پوچھنے کا ارادہ ہے؟'' جو بھی تھا۔ وہ تقی سے بہت ڈرتی تھی اور محبت بھی بے حساب کرتی تھی۔ عمامہ کے معاملے پر بہت دفعہ اسے ورغلانے اور اکسانے کے باوجود اور کسی قسم کی حوصلہ افزائی وہ کر نہیں سکی تھی۔ اس لیے کہ وہ تقی اور اپنے بچوں کے بغیر رہنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اگر عمامہ کسی بھی طرح ''منہ زور'' ہو کر شام کے ساتھ بھاگ جاتی تو جب بھی معاملہ کھلتا طابہ کا نام آتا..... تقی نے تو اسے کھڑے، کھڑے طلاق دے دینی تھی۔ وہ اگلے آپشن ذہن میں رکھ کر محتاط تھی۔

''پوچھیں.....'' اس نے سہم کر کہا۔ اندر سے وہ ٹھٹک ضرور گئی تھی۔ ''کیا تقی کچھ جان تو نہیں گیا؟ وہ بھی اس مقام پر.....؟ آج کی رات؟ جب شام اور فیقہ کا نکاح قریب تھا۔ ہائے، عمامہ کی بدقسمتی۔''

''دیکھو طابہ..... بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ ایک نکتے کی غلطی ہوئی تو تم شدید پکڑ میں آجاؤ گی۔'' تقی کا انداز سنجیدہ اور وارننگ دینے والا تھا۔ طابہ کچھ اور سہم گئی۔ معاملہ گمبھیر تھا۔

''کیا؟'' اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر سی اٹھی تھی۔ تقی کچھ دیر کے لیے سوچ میں گم ہو گیا۔ جیسے بڑے ''محتاط'' الفاظ کا چناؤ کرنا چاہتا تھا۔

''تمہاری عمامہ کے ساتھ کوئی چپقلش تو نہیں.....؟''

''نہیں۔'' طابہ نے فوراً کہا۔ وہ تقی کو کیوں بتاتی.....؟ عمامہ کے ساتھ کوئی رنجش نہیں تھی لیکن وہ اس سے جلتی ضرور تھی۔ اس کی اہمیت طابہ کو گوارا نہیں تھی۔

''تم اسے پسند نہیں کرتیں..... یہ بات تو مجھے معلوم ہے.....'' تقی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ طابہ کچھ گڑبڑا گئی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی.....؟ باہر فنکشن عروج پر تھا اور اندر تقی نے کیسی عدالت لگا رکھی ہے۔'' وہ سخت بیزار ہوئی تھی۔ آج کے دن بھی ''عمامہ نامہ'' سننا پڑ رہا تھا۔

''ایسی بات بھی نہیں.....'' طابہ جز بز سی ہوئی۔ ''پسند کرنا نہ کرنا الگ بات ہے۔ لیکن عمامہ آپ کے حوالے سے میرے لیے کم نہیں.....'' وہ بھی محتاط ہو گئی تھی۔ کیونکہ تقی بڑی سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا جیسے کھوج رہا تھا۔

''تو پھر میں جو پوچھوں، سچ بتانا، پورا سچ.....؟'' اس کا انداز بہت واضح اور دو ٹوک تھا۔ طابہ سہم سی گئی۔ اسے یوم حساب قریب لگ رہا تھا۔

''جی.....'' طابہ کے حلق سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی..... تقی پھر سے سوچوں کے پاتال میں اتر گیا۔

''کیا عمامہ اور شام کے درمیان ''کچھ'' تھا؟'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر تقی نے طابہ کی سانس تک کھینچ لی تھی۔ اس کا رنگ لمحوں میں ''فق'' ہو گیا تھا۔ اس کے حواس ''اڑ'' گئے تھے۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ ہکلا کر بمشکل بولی۔

''مطلب مجھے بتاؤ.....؟ میرے سوال کا جواب دو.....'' تقی یک لخت دھیمی آواز میں غرایا تھا۔ طابہ کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ اس کا حلق تک سوکھ گیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''کچھ تھا تو.....'' وہ بمشکل پھنسی، پھنسی آواز میں بولی تھی۔ تقی کی آنکھوں کا رنگ یک لخت انگارہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک، ایک تاثر بگڑ گیا۔ برہم ہو گیا۔

''کیا.....؟'' تقی دھیمی آواز میں پھنکارا۔ طابہ کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس صورتِ حال سے لطف اٹھاتی۔ لیکن اس وقت جان پر بنی تھی۔ تقی نے اپنا سوال پھر سے دہرایا تھا۔ طابہ نے سوکھے حلق کو بمشکل تھوک سے تر کیا۔

''وہ دونوں محبت کرتے تھے۔'' طابہ نے بالآخر دھماکا کر دیا تھا۔ تقی کسی اسپرنگ کی طرح نہیں اچھلا، نہ اسے کوئی کرنٹ لگا تھا۔ کیونکہ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انگارے سے بھر گئے تھے۔ اسے

شام کی ''بیزاریت'' اور عمامہ کی ''بے خودی'' اور غم ناکی، غمزدگی اور اذیت کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ شام اپنی شادی پر خوش نہیں تھا..... وہ طاہر کی طرح ذرا بھی پُرجوش دکھائی نہیں دیتا تھا اور عمامہ نہ چھوٹے بھائی کی شادی پر سرشار دکھائی دیتی تھی اور نہ اسے اکلوتی پھوپی کی شادی کا کوئی ارمان نظر آتا تھا۔ وہ اپنے انداز میں عجیب سی لگ رہی تھی۔ جیسے ایک ''بت کدے'' میں قید تھی۔ جیسے ایک ''غم'' اور ''روگ'' کے اثر میں تھی۔ جیسے ایک اذیت کے حصار میں تھی۔ وہ کسی اسٹوپا کی دیوی لگتی تھی۔ ساکت، خاموش، بے سانس، اداس، وہ ایسی کیوں تھی؟ وہ اتنی پُراذیت کیوں تھی؟ وہ کسی غم کے حصار میں تھی؟ وہ کس عذاب کا شکار تھی؟

تقی سمجھ گیا..... وہ اسی ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا۔ جب عمامہ اماں کے ہمراہ زینہ اتر رہی تھی۔ اور شام سیاہ لباس میں لاؤنج کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ ان آنکھوں کا ایک، ایک تاثر تقی کے سینے اندر بھونچال لا رہا تھا۔ وہ سرد سی آنکھیں، وہ برف سی آنکھیں..... وہ بے خودی آنکھیں..... وہ مایوس آنکھیں..... تقی ایک عجیب سی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں.....'' وہ پلٹ کر جیسے غرایا تھا..... لیکن اس کا لہجہ پہلے کی طرح گرجدار نہیں تھا۔

''بہت دفعہ کوشش تو کی تھی۔ آپ نے سنا نہیں..... توجہ نہیں دی..... الٹا مجھے ڈانٹ دیا۔'' طاہبہ نے پچھلے کئی طرح کے حوالے دیے تھے۔ تقی لب بھینچ کر باہر نکل گیا۔ وہ ایک لامحدود اضطراب کا شکار تھا۔ وہ گیلری میں چل رہا تھا..... معاً کہیں پٹاخا چھوٹا۔ طاہر کے دوستوں نے فائرنگ کی۔ کسی نے تقی کے کان میں اطلاع دی تھی۔

''نکاح ہو گیا.....'' وہ لڑکھڑا سا گیا تھا۔

☆☆☆

رافعہ اور طاہبہ کچن میں کھڑی تھیں۔ وہ دونوں ابھی، ابھی پنڈال سے آئی تھیں۔ بچوں کو بھوک لگی تھی۔ وہ ان کے لیے فیڈر تیار کر رہی تھیں۔ باہر اب بھی ہنگامہ تھا، شور تھا، وہی کھانے کے وقت کی مخصوص ہڑبونگ..... دادی پورے طمطراق سے پنڈال میں گھوم رہی تھیں۔ مہمانوں کی ٹیبلز پر جاتیں..... مبارک بادیں وصول کرتیں..... گردن تان کر چل رہی تھیں۔

سرخ لباس میں سارے لوازمات سے لیس سدا کی سادہ فقیہہ پرٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ میک اپ کی تہوں میں چھپا چہرہ، سحر انگیز خوب صورت ترشے نقوش، خوب صورت بالوں کا اسٹائل، حسین وجود، آج تو فیقہ کی سج دھج نرالی تھی۔ وہ جانِ محفل لگ رہی تھی۔ ہر نگاہ کا مرکز..... لیکن شام کو دیکھ کر عورتوں نے انگلیاں منہ میں دبالی تھیں۔ انہیں بے اختیار فیقہ کے نصیب پر رشک آیا تھا۔ ہر آنکھ میں ستائش تھی۔ ہر لب پر تعریف تھی۔

اور وہ اپنی سحر انگیز جھکی آنکھوں کے ساتھ لمحہ بھر کے لیے پنڈال میں آیا اور چلا گیا۔ فیقہ کے دل کی دھڑکنیں صرف ایک لمحے میں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ اوپر سے خواتین کی باتیں، تبصرے، تعریفیں، وہ جیسے شام کے ''حسن'' اور ''وجاہت'' پر واری جا رہی تھیں۔ فیقہ کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔ پلکوں پر سنہرے خواب اتر آئے۔ ملن کی گھڑیوں کا احساس ''روح افزا'' تھا۔ دل افروز تھا۔ دل نشین تھا۔ اس کی پلکیں بارِ حیا سے جھکتی چلی گئی تھیں۔

طاہبہ اور رافعہ رشک سے دیکھتی رہیں۔ دنیا میں کیسے، کیسے بانصیب لوگ تھے۔ کیسے، کیسے باکمال لوگ تھے۔ عمامہ کو دیکھ کر ''ترس'' آتا اور فیقہ کو دیکھ کر ''رشک'' آتا۔

اور اس وقت طاہبہ اور رافعہ کچن میں کھڑی فیقہ کی سجاوٹ پر تبصرے کر رہی تھیں۔

''ارے سوا لاکھ کا تو لہنگا ہوا۔ اوپر سے بھاری زیورات، دادی نے جانے کب سے بند تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے۔ ہماری ساس صاحبہ تو بیس تولے سونا اور عام سی بری بنا کر ہمیں بیاہ لائیں..... اوپر سے نکاح اور شادی کی ایک بھی رسم نہیں کی.....'' رافعہ نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا۔ اسے رہ، رہ کر ان دو شادیوں کی دھوم، دھام سے جلن محسوس ہو رہی تھی۔

''تب اسلام اور شریعت کا بڑا شور مچا رہے تھے۔ یہ سنت کے خلاف ہے، وہ سنت کے خلاف ہے۔ اب تو ڈھول

بھی بجوالیے....." طابہ نے بھی اندر کا ابال نکالا۔

"اور شادی ایسے کی جیسے "رسم قل" ادا ہو....." رافعہ نے دانت پیس کر کہا۔

"ذرا بھی مزہ نہیں آیا..... سارے ارمان فنا ہوئے تھے۔ میرا تو شرارہ بھی آؤٹ آف فیشن تھا۔ اتنا بکواس نہیں....." طابہ نے مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی۔ اسے ویسے بھی ایک کی تین لگانے میں کمال تھا۔

"اور عمامہ کے کپڑے دیکھے.....؟ اماں نے کیسے عالیشان بنوائے ہیں۔" رافعہ کو اچانک خیال آیا تو گفتگو موضوع بدل گیا تھا۔ طابہ دودھ ابال کر ٹھنڈا کرتی استہزائیہ مسکرائی تھی۔

"کیا فائدہ..... چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی عالیشان مسکراہٹ سے آرڈر پر بجوالیتیں۔ بھول کر بھی لبوں پر مسکان نہیں دیکھی۔" وہ تلخ سی بولتی چلی گئی تھی۔

"مسکراہٹ کہاں سے آتی؟ عمامہ کے اندر تو "صف ماتم" بچھی ہوئی ہے۔" رافعہ نے تاسف کا اظہار کیا۔ یہ اور بات تھی کہ تاسف مصنوعی تھا۔

"بیچاری عمامہ.....!" طابہ نے دکھی انداز میں کہا۔

"بلکہ بیچارہ فرخ....." رافعہ نے ٹکڑا لگایا تھا۔ طابہ چونکی۔

"فرخ بیچارہ کیوں.....؟" اس نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"جس کے پلے عمامہ پڑے گی، وہ بیچارہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟" رافعہ نے وضاحت سے سمجھایا تھا۔ طابہ سمجھ گئی تھی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا تو تقی اور اپنی کچھ دیر پہلے والی ساری گفتگو دہرائی۔ رافعہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

"تو اب کیا ہوگا؟ تقی بھائی کو سب پتا چل گیا؟"

"ہونا کیا ہے؟ وہ اس انکشاف پر دم بخود ہیں۔ کچھ دنوں تک سنبھل جائیں گے۔" طابہ بے پروائی سے بولی۔ وہ خوف کے حصار سے نکل چکی تھی۔ قصور وار عمامہ تھی سو طابہ کیوں ڈرتی؟

"اور ان کا ری ایکشن؟" رافعہ نے بڑا گہرا سوال کیا تھا۔

"کچھ خاص نہیں ہوگا....." اس کی بے نیازی قائم و دائم تھی۔ "فیقہ اور شام کی شادی ہو چکی ہے۔ عمامہ کی کچھ عرصے تک ہو جائے گی۔ کہانی ختم..... جو گزر چکا، اس پر جھگڑا، غصہ، طیش یا ری ایکشن کیا؟" اس نے دودھ کی بوتلیں بھری تھیں پھر رافعہ کو پنڈال میں آنے کا کہہ کر باہر نکل گئی۔ اسے رخصتی کا سین بھی دیکھنا تھا۔ کیونکہ فیقہ اب یہاں آنے کے بجائے شام کے پورشن میں جانے والی تھی۔ پھر طابہ بھی زہر اگل کر پنڈال میں چلی گئی اور رافعہ بھی..... پورے گھر پر خاموشی کا راج پاٹ قائم ہو گیا۔ سارا ہنگامہ جگمگاتے پنڈال تک محدود تھا۔

عمامہ کچن کی کھڑکی سے ہٹ کر نیم اندھیرے میں چلنے لگی۔ اس کا وجود سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"تو کیا تقی بھائی کو پتا چل گیا.....؟" اسے چکر سے آنے لگے تھے۔

☆☆☆

ہر چند کے رات تاریک تھی۔ لیکن عمامہ کی ذات اور شہر دل سے بڑھ کر تاریک نہیں تھی۔ ہر چند کے رات میں سناٹے تھے... لیکن عمامہ کی ذات سے بڑھ کر سناٹے کہیں نہیں تھے۔ اس نے سر اٹھا کر ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھ میں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اس کے لب پر کوئی دعا نہیں تھی۔

ہر چند اندیشۂ جاں ہے بہت لیکن اس کار محبت میں
کوئی پل بیکار نہیں جاتا، کوئی بات فضول نہیں ہوتی

وہ ستاروں بھرے آسمان کو دیکھتی رہی، ہر چیز سے لاتعلق ہو کر، ہر شے سے بے نیاز ہو کر.....

سر کوچۂ عشق آ پہنچے ہو لیکن ذرا دھیان رہے
کوئی نیکی کام نہیں آتی یہاں کوئی دعا قبول نہیں ہوتی

اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کا وجود لرز رہا تھا۔ اس کا دل غمزدہ تھا۔ اس کا دل غبار آلود تھا۔

اے رنگِ جنوں بھرنے والو، اے شب بیداری کرنے والو
عشق وہ مزدوری ہے جس میں اجرت وصول نہیں ہوتی

وہ تھک کر ٹوٹ گئی تھی۔ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ ایسے لگا صدیوں کا سفر طے کر آئی ہو، عمر بھر کی تپسیا بیکار کر آئی ہو، عمر بھر کی پونجی لٹا آئی ہو۔

وہ نڈھال ہو کر برآمدے کے آخری قدمچے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر گھٹنوں سے آلگا۔ وہ بازو لپیٹ کر گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھ گئی تھی۔

باہر ذرا فاصلے پر پنڈال میں اب بھی ہنگامہ بپا تھا۔ ایسا ہنگامہ جو اس کے اندر قیامت کا شور اٹھا لایا۔ اس کی سماعتیں جیسے گونگی اور بہری ہو گئیں۔ دل چاہا کانوں میں روئی ٹھونس لے یا قوتِ سماعت کے بہرہ ہو جانے کی دعا کرے..... لیکن بعض دعائیں کب قبول ہوتی ہیں؟ وہ سوچتی رہی بکھرتی رہی۔

ہجر کے ہاتھ میں لوحِ محفوظ تھی
عشق لکھتا رہا، وہ مٹاتا رہا

وہ اِک دھول بھری راہ میں تنہا کھڑی تھی۔ اور کوئی رحم دل مسافر اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے دکھ اور دل پر اتری قیامت کا قصہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے دل کی حکایت کا فسانہ پوچھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھہر گئی۔ رک گئی، ذرا جھک گئی، اس کے دل پر بڑا بوجھ سا لدا تھا۔ اسے اِک سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے اپنے دل پر لکھا فسانہ سنانے کی ضرورت تھی۔

تم بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو
کون سے دکھ کی کریں بات ذرا یہ تو بتا
موسموں، سرد ہواؤں کی مسیحائی کا دکھ
راہ کی دھول میں بکھری ہوئی بینائی کا دکھ
سنگ کے شہر میں خود دکھ سے شناسائی کا دکھ
یا کسی بھیگتی برسات میں تنہائی کا دکھ
کون سے دکھ کی کریں بات ذرا یہ تو بتا
اتنی طغیانی کی زد پہ ہے کہ کچھ یاد نہیں دل کا دریا
کب ہمیں چھوڑ گیا کون سے ہرجائی کا دکھ
تم بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

وہ دھول بھری راہ میں اب بھی تنہا کھڑی اداسی کا نغمہ سنا رہی تھی..... وہ رحم دل مسافر اس کا دکھ ''سہہ'' نہ سکا اور چل بسا، بھلا دکھوں کے ''بار.....'' عام لوگ اٹھا سکتے ہیں؟

معاً دھول بھری تنہا راہ پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ عمامہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ گردن موڑ کر نہیں دیکھا..... وہ آنے والے کی خوشبو سے اسے پہچان لیتی تھی۔ وہ اب بھی گھٹنوں پر سر رکھے آنے والے کی مہک سے اسے پہچان گئی تھی۔

عمامہ کو حیرانی ہوئی..... وہ اب کیوں آیا تھا؟ کس لیے آیا تھا؟ کیا عمامہ کا تماشا دیکھنے؟ اسے پنڈال سے یہاں آنے پر کس شے نے مجبور کیا؟ عمامہ سوچتی رہی، سوچتی رہی۔

معاً وہ آخری قدمچے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ عمامہ بغیر دیکھے بھی جان گئی۔ ان دونوں کا ''غم'' اب بھی الگ نہیں تھا۔ وہ ''درد'' اور ''کرب'' کے ایک ہی اثر میں تھے۔ ایک ہی حصار میں تھے۔

عمامہ بغیر دیکھے بھی جان گئی..... وہ دھول بھری راہ میں عمامہ کو دیکھنے چلا آیا تھا۔ کہیں وہ منزل بھول کر ''بے راہ'' تو

نہیں ہو رہی تھی؟ اسے گھر اور بام کی راہ یاد تو تھی۔ عمامہ رستہ تو نہیں بھول رہی تھی؟ وہ آخری قدمچے پر خاموش بیٹھا تھا۔ چار اطراف تاریکی اور خاموشی تھی۔ مہیب اندھیرے میں جگمگاہٹ تھی بھی تو عمامہ کے وجود سے..... ایک روشنی کا ہالہ تھا جو اس کے گرد لپٹ رہا تھا۔ اِک خوشبو کا حصار تھا جو اس کے گرد کھینچ رہا تھا۔

سناٹوں کے پار سے پھر اِک سوز بھری آواز آئی۔ عمامہ کی بہری ہوتی سماعتیں بحال ہوئیں۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ بول رہا تھا، عمامہ نے سر اٹھایا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ گستاخ ہوتی آنکھوں کو روک نہ سکی۔ وہ اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اتنا قریب کے ہاتھ بڑھاتی اور چھو لیتی..... لیکن یہ جسارت وہ عمر بھر سے نہیں کر سکی تھی۔ اب بھلا کیونکر کرتی؟ جب وہ ویسے ہی پرایا ہو چکا تھا۔ عمامہ کی آنکھیں بھر آئیں..... دل بھر آیا۔

شام نے اچانک نیم رخ کیا..... وہ اس کے سامنے ہوا، عمامہ کی آنکھیں اٹھیں اور پھر جھک نہ سکیں۔ وہ اس کے قریب قدموں کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ عمامہ کے دل کی دھڑکنیں تھمنے لگیں۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ جیسے جان نکلنے لگی..... وہ شام اودھ کا روپ لیے سراپا اذیت تھا، سراپا غم تھا، سراپا شکست تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح..... کسی لٹے ہوئے مسافر کی طرح بول رہا تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا، کچھ سنا رہا تھا۔

''عمامہ! میں ''قرض'' اتار آیا ہوں..... میں خود کو ''ہار'' آیا ہوں.....'' اس نے شام کی آواز میں نوحہ سنا..... اس کا دل جیسے دھڑکن سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس کا جسم جیسے روح کی قید سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کا جسم جیسے ریت کی دیوار ہو گیا تھا۔ اس کا عشق جیسے ''ہجر'' سے ''وصال'' ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''جو محبت روزانہ نہیں اگتی وہ روزانہ مرتی رہتی ہے۔'' کسی نے لکھا اور خوب لکھا تھا اور لکھ کر سنہری کتاب میں محفوظ کر دیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اس کتاب کو کھول لیتا۔ غور بھی کرتا اور سوچتا بھی..... پھر حیران بھی ہوتا۔

''بھلا بیچ میں محبت کہاں سے آ گئی تھی؟ یہ ایک انسیت تھی جو بہت طریقوں سے محبت میں ڈھل جاتی۔'' گو کہ انسیت کو محبت کے قالب میں ڈھالنے کے لیے کچھ اپنائیت، ملائمت، رویّوں میں نرماہٹ اور ذرا اصولوں میں جھکاؤ چاہیے ہوتا ہے جو اس کے مقابل کھڑے وجود میں نہیں تھا۔

ہمیشہ سے ایک سرد، ٹھس اور اونچی دیوار درمیان میں حائل تھی۔ پھر بھی کوئی چیز ایسی ضرور تھی جو اسے باندھ لیتی تھی۔ جکڑ لیتی تھی۔ اموکی ناپسندیدگی کے باوجود، ہزار دلیلوں کے باوجود.....

وہ جانتا تھا ان دونوں میں زمین آسمان جتنا فرق تھا۔ مزاجوں میں، رویّوں میں، اصولوں میں، اس کے زندگی گزارنے کے اپنے طریقے تھے، عمامہ کے اپنے طریقے تھے۔ وہ مغرب تھا، عمامہ مشرق تھی۔ وہ جنوب تھا، عمامہ شمال تھی۔ پھر بھی کوئی ایک چیز ضرور تھی جو اُن دونوں کو جوڑے ہوئے تھی لیکن کہیں نہ کہیں ''دراڑ'' ضرور آ رہی تھی۔ اور ایمان چاہتا تھا اس ''دراڑ'' کے واضح ہونے سے پہلے وہ ایک مضبوط بندھن میں بندھ جائیں۔ اس کے نیچے والوں تک اپنی خواہش پہنچا دینے کے بعد اوپر والوں میں ہلچل کیوں نہ نظر آتی۔ سب سے پہلے اس کی بہن آمنہ نے سوال اٹھایا تھا۔

''ایمان! تم واقعی سنجیدہ ہو.....؟'' اس کا سوال تعجب میں ڈالنے والا تھا۔ ایمان کی بھویں سکڑ گئیں۔ یعنی آج تک وہ ''جھک'' مار رہا تھا کیا؟

''تمہیں کیا لگتا ہوں.....؟'' ایمان نے الٹا آمنہ کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''کم از کم وہ نہیں لگتے جو نظر آ رہے ہو.....'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد آمنہ نے جواب دیا تھا۔

''مطلب.....؟'' وہ ایک بھوں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔

''کیسی حیرانی کی بات ہے، اموکا مان جانا، منگنی کا ہونا..... شادی کی شروعات کے حوالے سے بڑوں کے درمیان مشاورت اور پھر.....'' آمنہ بولتے، بولتے اچانک رک گئی تھی۔ جیسے اگلے الفاظ ادا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایمان نے سوالیہ نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔

''اور پھر......؟''

''کچھ نہیں......'' وہ صاف ٹال گئی تھی۔ شاید بدشگونی کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایمان نے اسے مجبور کیا۔

''تم جانتی ہوناں مجھے ادھورے جملوں سے نفرت ہے۔'' اس نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ آمنہ لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔

''ہاں، بولوناں......چپ کیوں کر گئیں......'' وہ چڑ کر بولتا چلا گیا تھا۔ آمنہ لحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ جیسے مناسب الفاظ سوچنا چاہتی ہو...... جو ایمان کو برے بھی نہ لگتے۔

''ادھورے جملوں سے نفرت کرتے ہو......دھورے انسان کے ساتھ کیسے رہو گے؟'' آمنہ کے اگلے الفاظ اسے بھونچکا کر گئے تھے۔ وہ لحہ بھر کے لیے گم صم رہ گیا تھا جیسے آمنہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھنا چاہ رہا تھا۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ تم کیا سمجھنا چاہتے ہو؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم الجھن میں ہو......اور کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟'' آمنہ نے سنجیدگی سے مزید کہا تھا۔ وہ الجھی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''مطلب......؟''

''کتنی آسان فہم بات ہے ایمان! تم ہر چیز میں پرفیکشن کے قائل ہو...... پھر اتنی بڑی بات پر کیسے سمجھوتا کر گئے ہو......؟'' آمنہ چلتے، چلتے اس کے قریب آ گئی تھی۔ پھر اس نے ایمان کے کندھے پر ملائمت سے ہاتھ رکھا۔

''یہ مت سمجھنا، ماہم کی وکالت میں اور عمائم سے عداوت میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں......لیکن ایک بات سمجھ لو......عمائم کو اپنی زندگی میں لا کر تم امو کو امتحان میں ڈالو گے۔ چلو، امو تمہاری محبت میں سر تسلیم خم کرتی ہوں......لیکن تم کیسے گوارا کرو گے کہ عمائم کے دو بڑے ''عیبوں'' کے ساتھ زندگی گزارو......'' آمنہ نے ایمان کی شفاف آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک ہی پھونک کے ساتھ سارے خواب اڑا ڈالے تھے۔ ایمان جیسے ششدر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اور احتشام نے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ احتشام بھائی غلط کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ حریم کو اگلے ہی دن یقین آ گیا تھا۔ جب سارے چھوٹے بڑے کزنز نے ''مہمان آنٹی'' کا حدود اربعہ تفصیل کے ساتھ پوچھا تھا۔ اور چھپ چھپا کر ہی سہی، گھر کی ساری معزز عورتوں نے حریم کو بار، بار کریدا۔ مہمان آنٹی کے نقش، بالوں کا رنگ، شکل، لباس، انداز کے بارے میں جانچ پڑتال کی تھی۔

حریم اس اہمیت پر پھولے نہیں سمائی تھی۔ کچھ سچ، کچھ جھوٹ ملا کر سب کو ''مسالے دار'' اسٹوری سنائی۔ یوں کہ سب کی آنکھوں میں حیران کن سوال اتر آئے تھے۔

''تو پھر وہ کون تھی؟ کیوں آئی تھی؟ اس کے آنے کا مقصد......؟ کیا خبر وہ سچی ہو......؟ کاش کوئی بڑا موجود ہوتا۔ جانے اب آئے یا نہ آئے......'' خواتین نے جیسے مایوسی سے ہاتھ ملے تھے۔ پھر حریم کو گھر کا بھی۔

''اس کا نمبر لے لیتیں یا گھر کا اتا پتا؟'' یہ بے چین سی ماما تھیں۔ باقیوں نے بھی تائید کی تھی۔ حریم سے یہ عقل مندی نہیں ہو سکی تھی۔ سو ذرا خفیف ہو گئی تھی۔ پھر جلد ہی مزید ''بریکنگ نیوز'' جاننے کے لیے گول کمرے میں پہنچ گئی تھی۔

آج ''جیل والوں'' کی ملاقات کا دن بھی تھا۔ بابا صاحب، تایا ابا اور بڑے ابا صبح سویرے نکل گئے تھے۔ ڈھیروں پکوان اور دھلے ہوئے خاکی کپڑوں سمیت ان کا لشکر بڑا اداس سا گھر سے گیا تھا۔ واپسی میں بھی وہ اداسی ساتھ لائے تھے۔ جب بھی ''ملاقات'' سے آتے، گول کمرے میں ''بزرگوں'' کی محفل جمتی تھی۔ جس میں تائی امی، بڑی امی، تایا ابا، بڑے ابا، بابا صاحب اور دادی کے علاوہ صرف بسمہ چاچی کو بلایا جاتا۔ جیا امی، امو اور ماما کی شمولیت ضروری نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی شاید ایک ''معما'' تھا۔

گھر میں ینگ جنریشن میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ بابا صاحب کس کی ''ملاقات'' کو جیل میں باقاعدگی کے ساتھ جاتے تھے۔ اگر کوئی کرید میں پڑتا بھی تو اسے کھرا سا جواب مل جاتا۔ امی کی جھڑکیاں یا تائیوں کا غصہ......سو کوئی بھی

pklibrary.com

اس ''سراغ'' کو آج تک نہیں پا سکا تھا۔

جیل میں کون تھا؟ کیوں تھا؟ کس جرم میں تھا؟ اور آج تک ''رہا'' کیوں نہیں ہو سکا۔ یہ بھی ایک ''معما'' تھا۔ جسے کوئی بھی حل نہیں کر سکا تھا۔

اور اس وقت جب حریم روشن دان کی درز سے جا کر چپکی تب تک ''جیل والوں'' کے ''احوال'' کا ذکر اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اب صرف ایمان اور عمائم کو ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ ان کی عنقریب ہونے والی شادی پر مشاورت چل رہی تھی۔ حریم کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ وہ بڑے ''موقع'' پر ''جائے واردات'' کا جائزہ لینے پہنچ گئی تھی۔

اس نے کان لگا کر بابا صاحب اور تائی امی کی باتیں سنیں..... باقی سب بھی ہمہ تن گوش تھے۔ بس دادی کچھ بے چین لگتی تھیں۔ بار، بار سنہری فریم والا چشمہ اتار دیتیں پھر چڑھاتیں۔ پھر صاف کرتیں جیسے بہت اضطراب میں تھیں..... جیسے بہت بے چین تھیں؟ کیوں بے قرار تھیں؟ حریم سمجھ نہیں سکی۔

''نیک کام میں دیر کیوں؟ میں تو دل سے چاہتا ہوں، عمائم ہماری زندگی میں اپنے گھر بار کی ہو..... ہماری زندگیوں کے چراغ اب گل ہونے کے قریب ہیں۔'' بابا صاحب نے نم آواز میں اپنی شریکِ حیات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جن کی گدلی بادامی آنکھوں میں اضطراب کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ بار، بار ململ کے دوپٹے سے ماتھے کا نادیدہ پسینہ پونچھ رہی تھیں۔ حریم سمجھ گئی تھی کہ دادی کچھ بے چین ہیں۔

''اور پھر ایمان کی ماں کو اب اعتراض بھی نہیں..... ایمان کی خوشی بھی ہمارے لیے اہم ہے۔ عمائم بھی رضامند ہے تو کوئی اچھی سی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔'' بابا صاحب نے باری، باری اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے ان کی رائے جاننا چاہ رہے تھے۔ باقیوں نے تو تائید میں سر ہلایا تھا۔ پاپا تھوڑے بے چین ہو کر پہلو بدل گئے تھے۔ اور چاچو نے یوں اظہار کیا..... جیسے کہہ رہے ہوں۔ جو آپ مناسب سمجھیں۔ بابا صاحب نے نگاہوں کو موڑ کر اپنی شریکِ حیات کی طرف نیم رخ کیا تھا۔ گویا اب ان کی رائے اور فیصلے سے آگاہی چاہتے تھے۔ بیٹوں اور بہوؤں کی طرف سے اطمینان پا کر اب وہ نصف بہتر کی طرف متوجہ تھے۔

''خاتونِ! آپ کیا خواہش رکھتی ہیں؟'' انہوں نے گلا کھنکھار کر نرمی سے پوچھا۔ ''کیا ہم نئے مہینے کا پہلا مبارک جمعہ نکاح اور رخصتی کے لیے رکھ لیں؟'' ان کی سوالیہ نگاہیں بیوی کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ وہاں صدیوں کے ''سناٹوں'' کا ''راج پاٹ'' قائم و دائم تھا۔ ازل کی گہری خاموشی اور مہیب سکوت طاری تھا۔ کسی منہ بند قلعے کی طرح کسی بند کتاب کے راز کی طرح..... وہ قرنوں سے خاموش تھیں۔ سالوں سے مہر بہ لب تھیں بھلا اب رائے یا مشورے سے کیسے نوازتیں؟ ان کے پاس دینے کے لیے اپنے شوہر کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک معمولی سا مشورہ بھی نہیں۔

''عمائم کے فرض سے سبکدوش ہونا ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے اماں! کم از کم ''قیدیوں'' کی رہائی سے پہلے، پہلے۔'' یہ تایا ابا کی آواز تھی..... وہ پہلی مرتبہ گفتگو میں مداخلت کر رہے تھے۔ شاید اپنی ماں کے تذبذب کو جان رہے تھے۔ کون سی چیز ماں کے بولنے میں ''مانع'' تھی؟ وہ سمجھ رہے تھے۔

''آپ کو علم تو ہے، خدا کے فضل سے ''سزا'' کی مدت پوری ہو رہی ہے۔ قیدی ''قید'' سے آزاد ہونے والے ہیں..... اس گھر میں خوشیوں کی بادِ نسیم آ رہی ہے تو اس سے پہلے یہ اہم فریضہ ادا کرنا ضروری ہے کیونکہ بعد کے حالات کیا ہوں؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔'' تایا ابا نے نرمی سے مزید وضاحتی انداز میں کہا تھا۔ انہیں ماں کا اضطراب بے چین کر رہا تھا۔

''بعد کے حالات؟ یعنی ایمان کا مکر جانا؟ شادی سے انکار؟'' تائی امی نے بہت مضطرب انداز میں لب کشائی کی تھی۔ ان کا کلیجا جیسے کانپ گیا تھا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ کیا ان کی عمائم کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ انہوں نے ساس کی طرف دیکھا۔ وہاں اب بھی مضطرب خاموشی کا راج پاٹ قائم تھا۔

''تو پھر آپ بتائیں.....؟ کیا مشورہ دیتی ہیں آپ؟'' بابا صاحب نے گلا کھنکھار کر پھر سے نصفِ بہتر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ انہوں نے خالی، خالی نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی گدلی بادامی آنکھوں میں جیسے ریت اڑ رہی تھی۔ بابا

صاحب کا دل کانپ سا گیا۔ اس اڑتی ریت میں کوئی اور بھی اڑ رہا تھا۔ بگولوں کی زد میں تھا..... غبار میں کھو رہا تھا۔ گم ہو رہا تھا۔ ان کا دل کانپتا چلا گیا تھا۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد بھی جواب نہیں آیا..... تاہم تائی امی نے ضرور لب کشائی کی تھی۔

''بابا صاحب! کیا ایمان کو اعتماد میں لینا ضروری نہیں؟'' سب کی آنکھوں کے رخ تائی امی کی طرف مڑ گئے تھے۔ انہوں نے بات ہی کچھ حیران کن کی تھی۔

''کیوں.....؟'' تایا ابا نے سوال اٹھایا۔

''یہ ضروری ہے۔'' تائی امی بے چینی سے بولیں

''کیوں ضروری ہے؟'' سوال پھر سے ترنت آیا۔

''کیونکہ ایمان کے لیے یہ انکشاف ہوگا.....'' تائی امی نے مضطرب انداز میں مزید کہا تھا۔ وہ اپنی بات کو ٹھیک طرح سے پہنچا نہیں پا رہی تھیں۔

''لیکن ایمان کیوں اعتراض اٹھائے گا؟'' بڑے ابا نے بھی گفتگو میں مداخلت کی۔ اِدھر روشن دان سے چپکی حریم کچھ اور چوکنا ہو گئی تھی۔

''کیونکہ عمائم.....'' تائی امی بولتے، بولتے خاموش ہو گئی تھیں۔ ان کا ذہن الجھ سا گیا۔ ایسے لگا تھا جیسے دوراہے پر آ کھڑی ہوئی ہیں۔

''کوئی مسئلہ نہ ہو..... مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔'' وہ ایک ماں تھیں۔ اپنی بیٹی کے لیے ٹھیک تحفظات کا شکار تھیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا.....'' تایا ابا ان کی بے چینی کو سمجھ کر تسلی دینے والے انداز میں بولے۔

''اللہ بہتر کرے۔'' بڑی امی نے بھی دعائیہ انداز میں کہا۔

''اور آنے والا'' اس نئے رشتے کو قبول کرے گا؟ وہ جو ازل کا ضدی ہے۔ جذباتی ہے، غصہ ور ہے۔ جو ''بے گناہ'' سزا بھوگ کر آ رہا ہے۔ کسی اور کے حصے کا کشٹ اٹھا کر آ رہا ہے۔ اپنی جوانی کو جیل کی سلاخوں میں بدبودار کر کے آ رہا ہے۔ اپنی زندگی کے اتنے ''سنہرے'' اور قیمتی سال تباہ کر کے آ رہا ہے۔ وہ کیا اس نئے رشتے کو تسلیم کر لے گا؟ اس کے اندر سے نفرت کا زہر ختم ہو چکا ہوگا؟ وہ مٹی ہو کے راندے لوگوں کو معاف کر سکے گا؟'' تائی امی پھٹی، پھٹی آواز میں چیخ پڑی تھیں۔ سدا کی نرم خو تائی امی کی ''چیخ'' پر حریم گرتے، گرتے بمشکل بچی تھی۔ اس نے روشن دان کو دونوں ہاتھوں سے بمشکل تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ تائی امی کے الفاظ پر حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی نے بھی اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت سب لوگ مہر بہ لب ہو چکے تھے۔

''ممکن ہے کہ دلوں کے زنگ اتر چکے ہوں..... ممکن ہے کہ ہمارے بڑھاپے پر کسی کو رحم آ جائے.....'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد بابا صاحب نے سنجیدگی سے سب کے خدشوں کو ایک، ایک کر کے اکھاڑ دیا تھا۔ اس وقت سب کے سوال دم توڑ گئے تھے۔ بابا صاحب نے ایک مرتبہ پھر شریکِ حیات کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے اپنا سوال آنکھوں ہی آنکھوں میں دُہرایا ہو۔

''کچھ بولیں خاتون.....!'' وہ آنکھوں کا سوال پڑھ رہی تھیں..... انہیں آنکھوں کا سوال پڑھنا ہی تھا۔ بادامی آنکھوں میں اڑتی ریت کو رگڑ، رگڑ کر صاف کرتے ہوئے بالآخر انہوں نے قرنوں کی خاموشی کو توڑ دیا تھا۔

''بہت سال پہلے میرے کہنے پر اس شادی کو روکا تھا آپ نے؟ جواب اتنے سال بعد پھر سے میرے کہنے پر اس شادی کو روک دیں گے؟'' ان کے عجیب جواب نے ہر آنکھ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کیونکہ جواب ان سب کی توقع کے عین خلاف تھا۔

سب لوگ لمحوں میں بھونچکا رہ گئے تھے۔ ہر کوئی سوال تک بھول گیا تھا۔ اماں نے کیا کہا.....؟ کیوں کہا؟ کس لیے کہا؟ کیا وہ اس شادی پر خوش نہیں تھیں؟ رضا مند نہیں تھیں۔ عنقریب ہونے والی اس شادی کو وہ روک دینا چاہتی تھیں؟ ایسی شادی جس کی تاریخ کو مقرر کیا جا رہا تھا؟ پھر ایسی بدشگونی کی خواہش کیوں؟ اماں نے ایسا کیوں کہا؟ وہ اس

شادی کے خلاف تھیں مگر کیوں؟ وہ اپنی ناگواری کا اظہار کر رہی تھیں مگر وجہ.....؟ سب کی آنکھوں میں اضطراب اور تحیر کروٹ لے رہا تھا۔ یہ کروٹ یقیناً اضطراب رکنے والا نہیں تھا کیونکہ اماں اچانک محفل سے اٹھ کر باہر نکل رہی تھیں۔ حریم کی آنکھیں جیسے خوشی سے پھٹ پڑیں..... تو کیا یہ شادی اب رکنے والی تھی؟

☆☆☆

لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن تھی۔ بیڈ روم میں ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ پورے انہماک سے کام میں مصروف تھا۔ اذان اور روشان کی غلطیوں پر اسی طرح احتشام کو وقت ضائع کرنا پڑتا تھا۔ اب اگر یہ ادھوری ''رپورٹ'' اوپر پہنچا دی جاتی تو باس نے اس کا کورٹ مارشل تو کر ہی دینا تھا۔ اس کی تیوری پر رپورٹ کی لوڈنگ پڑھتے دیکھ کر بل پڑ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا لیپ ٹاپ اٹھا کر روشان کے سر پر دے مارے۔ بہت ڈس انفارمیشن تھیں اسے بری طرح تپ چڑھی تھی۔

اگلے دو گھنٹے تک وہ اسی میں بزی رہا تھا۔ معاً بیڈ روم کے دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ احتشام نے چونک کر گردن موڑی۔ حریم دبے قدموں اندر آ رہی تھی۔ احتشام کے ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اذان اور روشان سے تو حریم بہتر تھی۔ کم از کم ''رپورٹ'' سو فیصد درست لاتی تھی۔ جس میں غلطی کی گنجائش نہ نکلتی۔ وہ دبے قدموں چلتی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''کیا پاکٹ منی ختم ہو گئی حریم!'' احتشام کو اسکرین سے نگاہ ہٹانا پڑی۔

''نہیں.....'' اس نے پہلی مرتبہ پاکٹ منی کے نام پر سچ بول دیا تھا۔ ورنہ وہ تو پیسے نکلوانے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔

''تو پھر.....؟'' وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ یعنی کوئی دھماکا خیز نیوز لائی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا دبا، دبا جوش بتا رہا تھا۔

''وہاں عمائم اور ایمان بھائی کی شادی ڈسکس ہو رہی تھی۔'' حریم نے چھوٹتے ہی بتا دیا تھا۔ وہ زیادہ دیر صبر نہیں کر سکی تھی۔ احتشام نے چونکنے کی اداکاری کی۔

''تو؟'' وہ ایک بھوں اچکا کر پوچھ رہا تھا۔ ''ڈیٹ فکس ہو گئی؟''

''ہاں ہوئی تو ہے مگر.....'' حریم کا انداز تجسس پھیلانے والا تھا۔ احتشام نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''مگر کیا.....؟''

''اگلے مہینے کا پہلا مبارک جمعہ..... لیکن ایک مسئلہ بھی ہوا اچانک.....'' اس نے آنکھیں جہاں تک ممکن ہو سکا تھا پھیلائی تھیں۔ احتشام نے بھویں سکیڑیں۔ جیسے بار، بار حریم کے ''بریک'' لگانے پر ناگواری محسوس کر رہا ہو۔

''اچانک کیا ہوا؟'' اس کے انداز میں بے چینی تھی۔ حریم کو گدگدی سی ہوئی تھی۔ اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے..... بڑا بے نیاز بنتا ہے احتشام بھائی..... مزہ چکھے۔

''دادی نے اچانک کہا۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں..... باقی بابا صاحب کی مرضی.....'' حریم نے سارا واقعہ کچھ مرچیں لگا، لگا کر سنا دیا تھا۔ احتشام گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''مامی کی مرضی شامل کیوں نہیں.....؟'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔

''اب یہ تو مجھے نہیں پتا ناں.....'' حریم نے کندھے اچکا دیے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر سوچ میں گم ہوا تھا۔ حریم کو باتیں سنانے کا موقع مل گیا۔

''تم مراقبے فرماتے رہنا..... ادھر عمائم کی بارات آ جائے گی۔ پھر ساری زندگی کنوارے رہنا احتشام بھائی۔'' حریم نے لگے ہاتھوں جلے دل کا پھپھولا پھوڑا تھا۔ احتشام بری طرح ٹھٹک گیا۔ پھر اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ یہ حریم بھی ناں.....

''کنوارا کیوں؟ کیا تم نہیں ہو.....؟'' اس نے بڑے مزے سے حریم کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی

نہیں پائی تھی۔ پھر عقل شریف میں بات سمائی تو بری طرح شرما کر چیخ پڑی۔

''اللہ.....'' اس کا دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ ''احتشام بھائی! تم بھی ناں.....'' وہ لال ٹماٹر ہو گئی تھی۔

''اچھا..... نو ایکٹنگ۔'' وہ کچھ سنجیدہ ہوا تھا۔ حریم بھی چونک گئی تھی۔ پھر ہمہ تن گوش ہوئی۔

''اب کیا کریں حریم.....؟ اس نے معصوم صورت بنا کر حریم سے مشورہ لینا چاہا۔

''شادی رکوانے میں؟'' حریم کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''نہیں، کروانے میں.....'' اس نے حریم کو شاک لگایا۔ وہ جھٹ سے آنکھیں بدل گئی..... جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

''مجھے تو لگتا ہے احتشام بھائی! تم عمائم میں انٹرسٹڈ ہی نہیں ہو۔'' حریم نے منہ پھلا لیا تھا۔ وہ اتنی کوششیں کر رہی تھی اور احتشام بھائی کیے کرائے پر پانی پھیر رہا تھا۔

''میں کسی کی فیانسی میں کیسے انٹرسٹڈ ہو سکتا ہوں حریم! جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہو.....'' وہ بیچارگی سے بولا۔

''تو منگیتر نہ بننے دیتے ناں..... اپنی منگیتر بنا لیتے۔'' حریم نے چڑ کر کہا۔

''چلو، موقع ملا تو کوشش کریں گے۔'' اس نے حریم کو پچکارا تھا۔ وہ اسے گھور کر دیکھتی رہ گئی۔

''بڑے تم نصیب والے ہو۔'' حریم نے ناک چڑھائی۔ احتشام ہنس پڑا۔ حریم کی معصومیت اور معصومانہ خواہش پر۔

''اچھا..... اب کام کی بات پر آؤ۔ اس رپورٹ کے بدلے کیا لو گی۔'' اس نے حریم کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ بے ساختہ کھل اٹھی۔

''بھور بن ٹرپ کے ساتھ جانے کی اجازت۔'' حریم نے اپنی دلی خواہش جھٹ سے بتا دی تھی۔ اس کی ساری کلاس ٹرپ پر جا رہی تھی۔ بس حریم کو اجازت نہیں ملی تھی۔ اور یہ کام صرف احتشام کر سکتا تھا۔ وہی امی کو منا سکتا تھا۔ اور

مئی 2021ء کے صفحات کے دھنک رنگ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل،
محفل شعر و سخن
اور
ملک سفدر حیات کی تفتیش

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، مظہر سلیم ہاشمی، آصفہ ضیا احمد، بابر نعیم، غلام قادر، منظر امام، شبینہ گل، اور شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

بولتی آنکھیں

حرص و ہوس کے ہاتھوں ایک معصوم دوشیزہ کی بکھرتی زندگی کے شب و روز کا احوال، آخری صفحات پر **نشور ھادی** کا کمال

محبت گزیدہ

ماضی کے اوراق پر ایک دلگداز محبت کے غمگین و سنگین واقعات کا احاطہ..... ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کی سحر انگیزی.....

شہ زوز

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

اسے احتشام کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ وہ امی کو منا سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے تم نہ ہی جاؤ.....'' احتشام نے ملائمت سے سمجھایا تھا۔ حسبِ عادت حریم کا منہ پھول گیا۔

''مجھے اجازت چاہیے، مشورہ نہیں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔ احتشام لب بھینچ کر کچھ دیر کے لیے چپ کر گیا۔

''او کے، اب تم جاؤ۔'' اس نے لیپ ٹاپ کی طرف توجہ کر لی۔ حریم اس کا اشارہ سمجھ کر خوشی، خوشی قلانچیں بھرتی باہر نکل گئی تھی۔ احتشام ماتھے پر تفکر سجائے سوچتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی بے چینی واضح نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ کام اپنا بھی نہیں کر سکا۔ دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اداسی اور بوجھل پن تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔

بیڈ روم کی فضا میں حبس بھر گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ونڈو کے سلائڈ کھول دیے۔ باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ کچھ کثافت کم ہوئی تھی سلائڈ ہٹانے سے نیم تاریکی میں روشنی کی لکیر پھیل گئی تھی۔ وہ ماتھے کو ٹہوکا دیتا گہری سوچ میں گم تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر کچھ عکس بکھر رہے تھے۔ کچھ نقش ابھر رہے تھے۔ ایک چہرہ جو کبھی پھیلتا، کبھی سمٹ جاتا، کبھی سامنے آتا، کبھی غائب ہو جاتا۔

پھر امی کی خواہش..... شادی کی تاریخ مقرر ہونے کا سن کر وہ کیسا ردِعمل دیں گی؟ یہی ناں کہ ''تم کچھ نہیں کر سکے۔ بزدل ہو بزدل، اپنے باپ کی طرح بزدل.....'' اسے امی کے الفاظ کی خبر تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی ساری بہادری کو ایک لفظ بزدل میں لپیٹ کر اس کے منہ پر دے مارتی تھیں۔

عمائم کے لیے ان کی خواہش اچانک نہ تھی۔ ورنہ وہ تو ماہم کے لیے ارادہ رکھتی تھیں پھر ان کے دل نے کیسے پلٹا کھایا؟ عمائم کے لیے نفرت..... نرمی اور ملائمت میں کیسے بدلی۔

وہ عمائم جسے آج تک اس کی ماں نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ تو جانتی بھی نہیں تھیں عمائم کے نقش کیسے ہیں؟ وہ بڑی ہو کر کتنی خوب صورت نکلی، وہ ان کے بیٹے کے ساتھ سجے گی بھی یا نہیں؟

قرنوں کی اس نفرت کا انجام صرف ایک خواہش پر ہوا تھا۔ ''احتشام! عمائم کو بچا لو.....'' وہ اتنا حیران ہوتا جتنا سمندر میں پانی..... اگر اس کہانی کا پس منظر نہ جان چکا ہوتا۔

ضمیر کی چبھن نے اس کی ماں کے اندر سے عمائم کے لیے نفرت کا پودا اکھاڑ دیا تھا؟ یا اللہ نے ان کے دل میں عمائم کے لیے نرمی اور رحم ڈال دیا۔ وہ کبھی اندازہ نہیں کر سکا..... پھر بھی اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ دیر سے ہی سہی، وہ سمجھ ضرور گئی تھیں۔

اور اب حریم بتا رہی تھی۔ بڑے گھر میں شادی کی تاریخ طے ہو رہی ہے۔ اس نے پوروں پر حساب نہیں لگایا تھا۔ وہ جانتا تھا، اگلے مہینے کا پہلا جمعہ شادی کے لیے مخصوص ہوگا..... اور دوسرا جمعہ ''قیدیوں'' کی رہائی کے لیے..... اور اس کے بعد جیسے ایک مرتبہ پھر زندگی کی پُرسکون ''ندی'' میں بھونچال آ جائے گا۔

احتشام کو سمجھ آ گئی۔ اس کی ماں نے ''عمائم کو بچا لو.....'' جیسی التجا کر کے کس ''بچاؤ'' کی طرف اشارہ دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں۔ احتشام، عمائم کو بچا لے۔ آنے والے حالات سے، اس تکلیف سے جو عمائم کو ملنے والی تھی۔ اس غم سے جو کبھی عمائم سہہ نہ پاتی۔ اس درد سے جس کی کوئی دوا نہیں تھی۔

عمائم کو بچا کر، اسے محفوظ ہاتھوں میں تھما کر وہ اس ''بوجھ'' سے رہائی چاہتی تھیں جو اُن کے ضمیر پر کسی چٹان کی طرح دھرا ہوا تھا۔ شاید عمائم کو خوش دیکھ کر اس ''بوجھ'' میں کچھ کمی آ جاتی۔ اسے اپنی ماں کو ضمیر کی قید سے رہائی دلانے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ کچھ ایسا جو بنیادیں ہلانے کا باعث کبھی نہ بنتا..... جو نسلوں کی بقا کے لیے خوش آئند عمل ہوتا۔ جو ہر آنے والے بچے کے لیے ''باعثِ ندامت'' نہ ہوتا پھر کوئی بچہ اپنی ''ماں'' اور اپنے ''باپ'' کے حوالے سے شرمسار نہ ہوتا۔

وہ احتشام ہوتا یا عمائم..... دونوں کے سر جھکے نہ ہوتے۔ دونوں کے سر اٹھے ہوئے ہوتے۔ ماں، باپ کو ایسا ''قابلِ فخر'' ہونا چاہیے جن پر بچوں کو نہیں، دنیا کو فخر ہو، لوگ ان پر رشک کریں..... اور احتشام جانتا تھا وہ ایسا..... ''بانصیب'' نہیں تھا جس پر اس کے باپ کی پچھلی زندگی کے حوالے سے ''فخر'' کیا جاتا۔ یا عمائم اتنی خوش قسمت نہیں تھی جو اپنی ماں کی نسبت سے پورے ننھیال پر سر اٹھا کر راج کرتی۔ وہ دونوں کئی حوالوں سے انتہا کے بدنصیب تھے۔

احتشام ''آگہی'' کے عذاب سے دو چار تھا۔ عمائم اور اذان اس لحاظ سے کچھ بہتر تھے کہ وہ ''ادراک'' کی پُراذیت، بھیانک اور خوفناک کیفیت سے محفوظ تھے۔ یہ تو احتشام تھا جو ''جل'' رہا تھا۔ کل بھی اور آج بھی..... کھڑکی کے پار منظر میں خون سا بہنے لگا..... ماضی کا ہر در بچہ ایک شرمناک کہانی کھولے کھڑا تھا۔ احتشام کو خود سے بھی نگاہ چرانی پڑی تھی۔ جی چاہتا تھا ہر شے کو آگ لگا دے۔

''ایسی محبت سے موت بہتر ہے جو نسلوں کے لیے ذلت اور ندامت کا باعث ہو۔'' اتنی سی تو کہانی ہے اگر کوئی آسانی سے سمجھ لے۔ بے لگام ''نفس'' کو کنٹرول کر کے تزکیۂ نفس کی لذت محسوس کرنا اور عمر بھر کے لیے سرخرو ہو جانا۔

کیا ضروری ہے محبت کی انتہا ''دلدل'' میں گرا ڈالے؟ کیا ضروری ہے محبت کا جنون رشتوں کی پہچان بھلا ڈالے؟ یہ محبت ہے کیا؟ چار ہجوں کی کہانی..... جو چاہے تو فرشتہ بنا دے، چاہے تو شیطان۔ اس نے ہمیشہ اللہ سے ایسی ''منہ زور'' محبت سے پناہ کے لیے دعا کی تھی۔

عمائم کسی الہامی جذبے کی طرح اگر من میں اتر چکی تھی تو ضروری نہیں تھا اس کا ''حصول'' بھی ممکن ہوتا۔ وہ نصیب میں نہیں تھی۔ سو نہیں ملی۔ اس نے کوشش بھی نہیں کی۔ ضد بھی نہیں کی۔ حالانکہ روشان اور اذان نے اسے بہت مرتبہ اکسایا تھا۔

''بندہ ''مقدمے'' کے لیے کھڑا تو ہوتا ہے..... ہار جیت نصیب کی بات ہے۔ کوشش تو کرنی چاہیے۔'' وہ ''آگہی'' کے عذاب سے دو چار ہوتے تو ایسے سوال کبھی نہ کرتے۔ اس نے مقدمے کے لیے کھڑا ہونا تھا۔ نہ مقدمہ لڑنا تھا، اسے تقدیر کے فیصلے کا انتظار تھا۔ اگر لوحِ محفوظ میں کچھ ''اچھا'' لکھا ہوا ہے تو اسے مل کر رہے گا..... اس کے اندر ''یقین'' بولتا تھا۔ اور یقین بہت خاص لوگوں کے اندر بولتا تھا۔ یہ ''جنگ'' محبت کی نہیں عزت کی جنگ تھی۔ بقا کی جنگ تھی۔ اس احساس کی جنگ تھی جو سر جھکاتا نہیں، سر اٹھاتا ہے۔

ایمان کی جگہ کوئی اور حریف بھی ہوتا تب بھی احتشام بقا کی جنگ میں محبت کو آرام سے ''ہار'' دیتا۔ اب تو پھر مقابل ایمان تھا۔ اس کا دوست، اس کا عزیز، ہر بری گھڑی میں اس سے مدد کی ''اپیل'' کرنے والا اور اگر وقت گواہی دیتا تو بہت کچھ منظر پر آ جاتا۔

امو کو عمائم کے لیے منانے میں کس کا ''کمال'' تھا؟ کیا ایمان کی جذباتی بلیک میلنگ کا؟ یا ایمان سے محبت کا؟ غالباً ہرگز نہیں۔

یہ تو احتشام تھا جس نے امو کے سخت دل پر ''سوراخ'' ڈالا تھا۔ عمائم کے لیے ان کو منایا تھا۔ اگر کوئی سمجھ لیتا تو..... تاریخِ محبت میں کوئی نئی تاریخ رقم کرنی ہو تو ''مرنے'' کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آپ ''ایثار'' کا ہتھیار اٹھالیں..... ہر ہاری جنگیں ایسے ہی جیتی جاتی ہیں۔

سو احتشام کی زندگی کا ایک اصول قائم تھا..... مرو بھی شان سے اور مارو بھی شان سے..... اور وہ چاہتا تھا ماہم بھی اس اصول کو پالے۔ جو ماضی کے عذاب تھے وہ نہ دُہرائے جاتے۔ جو کتابچے بند تھے وہ بند ہی رہتے۔ اور ماہم نے احتشام کی زندگی کا اصول پا کر خود کو ہمیشہ کے لیے امر کر لیا تھا۔

وہ محبت نہیں تھی..... جو سالوں پہلے ''بے لگام'' ہوئی۔ گلیوں، چوراہوں اور رستوں میں ''رسوا'' ہوئی۔ محبت تو یہ تھی..... جو سالوں بعد بھی ''سرفراز'' رہی۔

وہ کھڑکی کے پار گدلے منظر دیکھتا رہا۔ بڑے، بڑے دالانوں اور محرابوں والا ماربل کا اونچا بلند اور عظیم گھر..... آج بھی ''بارِ ندامت'' سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ شرمندہ اور شرمسار.....

احتشام کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے رہے..... درخت ہلتے رہے، پتے بکھرتے رہے، سالوں پہلے کے مدھم عکس ابھرتے رہے، باغیچے میں لاجوردی کنٹھے والے منال ٹہلتے رہے۔

معاً دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا..... وہ گردن موڑے بغیر بھی جانتا تھا۔ آنے والا کون ہے؟ وہ اس کی تیز خوشبو

سے پہچان گیا تھا۔ وہ تیز رفتار آدمی تھا۔ ہر چیز میں ''تیزی'' پسند کرتا۔

وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا تھا۔ احتشام گہری سانس کھینچتا سنبھل گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا یہ آمد بے مقصد نہیں ہے۔

''تم بزی تو نہیں تھے؟'' ایمان نے بنا تمہید کے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ احتشام پہلی نظر میں سمجھ گیا..... وہ جب بھی ڈسٹرب ہوتا..... احتشام کے پاس چلا آتا تھا۔

''فی الحال تو نہیں..... کیا تم مجھے بیل جوتتے دیکھ رہے ہو؟'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ایمان کو یہ ہلکا پھلکا انداز بھی برا لگا تھا۔ گویا معاملہ گمبھیر تھا۔ احتشام گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ خیریت لگتی نہیں تھی۔

''اب کیا ہوا؟ تمہاری خواہش تو پوری ہونے جا رہی ہے۔ پھر کیوں یہ منہ لٹکا رکھا ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' احتشام نے سنجیدگی سے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ایمان سلگی، سلگی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کس بات پر خوش ہونا چاہیے؟'' اس نے بھویں سکیڑ لی تھیں۔ احتشام کھٹک گیا۔ اس کی چھٹی حس الرٹ ہو رہی تھی، یہ ایمان کو کیا ہوا تھا؟

''شادی کا آغاز ہو تو غالباً خوش ہوا جاتا ہے۔ سوگ نہیں منایا جاتا۔'' اس نے ایمان کے لٹکے مضطرب منہ کی طرف اشارہ کیا۔

''کون سی شادی؟'' ایمان نے عجیب سے انداز میں کہا تھا۔ احتشام کا دماغ ہی گھوم گیا۔

''کیا یاد دلاؤں؟'' اسے بے طرح غصہ آ گیا تھا۔ ایمان ایسے بن رہا تھا جیسے ساری کارروائی سے بے خبر ہو۔ یا بڑوں کی میٹنگ سے لاعلم ہو۔

''کوئی شادی نہیں ہو رہی۔'' ایمان نے مزید کہا۔ وہ بے چینی سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔ احتشام چونک گیا پھر اس کا کندھا تھما کر اپنی طرف رخ کیا تھا۔ پھر پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ غور کرتا رہا..... سمجھتا رہا۔

''تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟'' اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائی تھی اب کے غصہ نہیں تھا..... جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔

''مجھے تمہارا فیور چاہیے۔'' ایمان نے گہرے اضطراب کو جھٹکتے ہوئے لب بھینچ لیے تھے۔

''کیسا فیور.....؟'' وہ چونکا۔

''احتشام..... ! اس شادی کو رکوا دو.....'' ایمان نے بے تابی سے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ احتشام کو غور کرنے پر پتا چلا تھا اس کی آنکھیں سرخ بھی تھیں، سوج بھی رہی تھیں۔ کیا وہ روتا رہا تھا؟ احتشام کو دھچکا لگا۔ ایمان کے ساتھ کیا ہوا؟ احتشام کا ذہن تیزی سے چلنے لگا۔

''اچھا.....'' اس نے گہری سانس کھینچ کر بس اتنا کہا۔ وہ بغور ایمان کو دیکھ رہا تھا..... اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایمان کو ایسے حال میں دیکھا تھا اتنا ڈسٹرب، اتنا غمگین، اتنا بے قرار، یہ اپنا ایمان تو لگ نہیں رہا تھا۔ یہ تو کوئی اور ایمان تھا۔

''مشورہ لینے آئے ہو یا فیصلہ سنا کر مدد لینے؟'' احتشام نے بہت دیر کی خاموشی کو بالآخر توڑ دیا تھا۔ ایمان سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے ٹوٹے کانچ بکھر رہے تھے۔ احتشام کے دل کو کچھ ہوا..... ایمان کے ساتھ کچھ عجیب ہوا تھا؟ ورنہ وہ اتنے انتہائی اقدام کی طرف نہ آتا۔ عائم تو اس کی خواہش تھی۔

''مجھے ہیلپ چاہیے.....'' اس نے اپنی بات دُہرائی تھی۔

''میں ''وجہ'' پوچھ سکتا ہوں؟ شادی، منگنی، نکاح کوئی کھیل تماشا تو نہیں..... تم اس کے جذبات کے ساتھ مذاق نہیں کر سکتے۔ کیا وہ انسان نہیں؟ تم اسے سب کی نگاہ میں سوالیہ نشان نہیں بنا سکتے۔'' احتشام کو کہنا ہی پڑا، جتانا ہی پڑا..... گو کہ وہ ایمان کے رویے اور اس کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ اپنی ''خواہش'' سے دستبردار نہیں ہونے والا تھا۔ یقیناً کچھ ہوا ضرور تھا..... آخر کیا؟

''ان سب باتوں کو چھوڑو..... جا کر تائی امی کو بتا دو..... ایمان بدعہد نکلا۔ میں یہ رشتہ نباہ نہیں پاؤں گا..... اس شادی کو روک دیں۔'' وہ بے قراری سے احتشام کے کندھے سے آ لگا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ احتشام دھک سے رہ گیا تھا۔

''اور وہ ''وجہ'' دریافت کریں گی؟ میں ریزن کیا دوں.....؟'' احتشام کی کن پٹیاں سلگ گئیں..... یہ ایمان بھی ناں دوستی، دوستی میں ہمیشہ اسے ''امتحان'' میں ڈال دیتا تھا۔

''یہ تمہارا ہیڈک ہے میرا نہیں..... کچھ بھی کہہ دو.....'' اس کی آواز بھراتی جا رہی تھی۔ وہ ابھی تک احتشام کے کندھے سے لگا تھا۔ احتشام کو اپنے کندھے پر نمی محسوس ہوئی۔ کیا ایمان رو رہا تھا؟ وہ تھرا اٹھا... ایمان... کیوں رو رہا تھا؟ وہ کیوں اپ سیٹ تھا؟

''ایمان، ہوا کیا تھا؟'' احتشام نے فکرمندی سے پوچھا۔ اسے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ کہیں ایمان کچھ جان تو نہیں گیا؟ لیکن اس میں عمائم کا کیا قصور.....؟

''اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں؟'' اس نے ایک دم احتشام کے کندھے سے سر اٹھا کر بھاری آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں اب بھی لال انگارہ تھیں جن میں ایک احساس ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ زیاں کا احساس تھا۔

''تم بتاؤ شام.....! آخر ہوا کیا تھا؟'' ایمان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

''جیل والے جیل میں کیوں تھے؟ کیوں ہیں؟ میری ماں کو دورے کیوں پڑتے ہیں؟ تمہاری ماں کس عذاب میں ہے؟ ہماری زندگیاں ایب نارمل کیوں ہیں؟ بتاؤ احتشام..... ورنہ میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔'' وہ اس شدت سے چلایا تھا کہ احتشام کو لگا اس کے کانوں میں سوراخ ہو جائیں گے۔ اس نے بہت شدت کے ساتھ آنکھیں میچ لی تھیں۔

تو یوم حساب قریب آ رہا تھا۔ ایک عدالت لگنے والی تھی۔ ایک کچہری سجنے والی تھی۔ اور کٹہرے میں کھڑی تھی اکیلی عمائم..... لیکن وہ اکیلی یوں تھی؟ احتشام ناں..... اس کے ہم قدم نہ سہی..... اس کے پیچھے تو ضرور تھا۔ لیکن کچھ مقام ایسے تھے جن پر عمائم کو تنہا کھڑے ہونا تھا۔ ان سوالوں کے جواب دینے کے لیے جنہیں وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ ان گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے جو اس سے سرزد ہوئے ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

بے شک وہ ہاتھ جو کانٹوں کے تاج بناتے ہیں ان ہاتھوں سے بہترین ہیں جو کچھ نہیں کرتے۔ کانٹوں کے تاج بنا کر پھر ہم پھولوں کے ہار کی خواہش کیوں رکھتے ہیں؟ دونوں ہاتھوں سے ''خار'' دے کر پھر گلاب بدلے میں کیوں طلب کرتے ہیں؟

اگر وہ پانے اور کھونے کا حساب کرتی تو صرف اور صرف خسارے ہاتھ میں آتے۔ عمر رواں سے بھلا شکوہ ہوتا بھی کیوں.....؟ اپنی نادانیوں کو وقت کے سر تھوپ دینے سے ضمیر چبھن نامی احساس سے بچ نہیں سکتا۔ سو وقت کے پہیوں تلے رگڑ کھا، کھا کر بھی وہ جینے اور زندہ رہنے پر مجبور تھی۔

کرن کی دائمی جدائی کے بعد شاید زندگی آگے کبھی نہ بڑھتی اگر وہ عمائم کو نہ دیکھ لیتی۔ عمائم جو ایک بیتے لمحے کا نام تھا۔ عمائم جو ''یادِ ماضی.....'' کا نام تھا۔ عمائم جو ایک احساس کا نام تھا۔ ایک ایسا احساس جسے سونیا نے خود کھینچ کر خود سے جدا کر دیا تھا۔

اور اب اسی ''احساس'' کی تڑپ اسے بے قرار رکھتی تھی۔ وہ پہروں دیوانہ وار گھومتی، تڑپتی، سسکتی، جلی ہوئی روح کے بھبھوت میں عمائم نام کی چنگاری نے آگ بھر دی تھی۔ اس کے اندر باہر آگ بھڑکتی، پھیلتی جھلساتی۔ جی چاہتا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔ ہر احساس کو آگ لگا دے ہر ''یاد'' کو آگ لگا دے۔

بس ماضی کے فریم میں ایک فوٹو کا عکس تابناک ہو، ایک ایسا جسم جس پر سونیا کا پسندیدہ چہرہ فٹ ہو۔ جس کا ایک، ایک نقش بولتا تھا۔ اپنے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ جو چیخ، چیخ کر پکارتا تھا۔

''مجھے دیکھو، مجھے دیکھنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ مجھے چاہو، مجھے چاہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔''

پھر اس چہرے پر ایک گول گوتھنا سا چہرہ فٹ ہو جاتا۔ ہو بہو ویسا ہی..... بڑی، بڑی بادامی آنکھیں..... گھنگرو سے

بال، ملائی رنگت، ننھا سا دہانہ..... وہ ایک ہی تصویر کا دوسرا رخ تھا..... جس، جس نے دیکھا، متحیر رہ گیا۔
ایسی مشابہت نہ دیکھی گئی تھی نہ سنی گئی..... دل تھا کہ دیکھے، دیکھ کر بھرتا ہی نہیں تھا۔ پھر وہ کیسے دل پر پتھر رکھ کر ایسی مڑی کے دوبارہ پلٹی ہی نہیں۔
اور اب اتنے سالوں بعد وہ دل افروز چہرہ پھر سے ہلچل مچا گیا تھا۔ بے قرار تو وہ اسی روز ہوگئی تھی جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں اسے دیکھا تھا۔
کرن کا صدمہ نہ ہوتا تو وہ تب ہی اسے اپنے آنسوؤں میں باندھ کر ہمیشہ کے لیے روک لیتی۔ لیکن سوال تو یہ تھا وہ اس کے روکنے پر رک جاتی؟ بنا سوال کیے اسے بخش دیتی؟ بنا حساب کے اسے معاف کرتی؟ شاید کبھی نہیں..... اس مقام پر سونیا بے بس ہو جاتی تھی۔ جیسے اب بھی بے بس تھی۔ اختیارات ہوتے ہوئے بھی بے اختیار تھی۔
کس منہ سے عمائم کے سامنے دوبارہ کھڑی ہوتی؟ اگر اس نے پھر سے ثبوت مانگ لیے تو؟ یہاں آ کر سونیا کا دل تھم جاتا تھا۔ سانس رک جاتی تھی۔ روح کانپ جاتی تھی۔ اس نے تھکے، تھکے انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ ابرار برابر میں سو رہے تھے۔ سونیا کی سسکاری پر ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ بے چین ہو کر آنکھیں مسلتے اٹھ گئے تھے پھر سونیا کو روتا دیکھ کر ان کے اندر کروٹ لیتا اضطراب جاگ گیا تھا۔ وہ گہری سانس کھینچ کر سیدھے ہوئے۔ جیسے اس کے اضطراب کی وجہ جان گئے تھے۔
''رونا نہ تکلیف کم کر سکتا ہے نہ مسئلے کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔'' مہیب خاموشی میں ابرار کی آواز کا مدہم ارتعاش محسوس ہوا تھا۔ سونیا نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا..... وہ کسی غیر مرئی نکتے پر نگاہ جما کر بیٹھی تھی..... اردگرد سے قطعی طور پر لاتعلق.....
''کرن کا جانا تقدیر میں لکھا تھا۔ سوائے صبر کے کیا کر سکتے ہیں ہم۔'' ان کی آواز میں گہری کربناک خاموشی تھی۔
''بغیر کسی جرم کے بے گناہ ہماری بیٹی کو قتل کر دیا گیا۔ مجرم لاپتا ہیں اور ہم کچھ کر نہیں سکتے..... یہ سب تقدیر میں لکھا تھا سو ہو کر رہا۔'' پیشانی کو مسلتے ہوئے ابرار بے حد مضمحل تھے۔
''اور عمائم کا جانا.....؟ کیا وہ بھی تقدیر میں لکھا تھا؟ ہمارا کوئی قصور نہیں تھا؟ ہم بے گناہ ہیں؟'' سونیا کی ساری حسیں اچانک بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اچانک غصے کی اِک طویل لہر ابھر کر آئی تھی۔
''میں نے یہ کب کہا.....'' ابرار شرمسار سے بولے۔ ''بس جوانی کا جوش اور جذباتیت غلط فیصلوں پر اکساتی ہے۔ بعد میں عمر بھر انسان پچھتاتا رہ جاتا ہے مگر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔''
''آپ کی اس لاجک کو عمائم کیا سمجھ لے گی؟'' سونیا جیسے پھٹ پڑی۔ ''ہرگز نہیں مسٹر ابرار..... یہ بھول ہے تمہاری۔ اصل امتحان کی پکڑ میں تو اب آئے ہو تم..... عمائم کو خود ٹھکرایا تھا اور کرن کو تقدیر نے ہم سے جدا کر دیا..... اب بیٹھ کر خسارے گنو..... کہ تم کہاں غلط تھے۔ اور میں کہاں غلط تھی۔''
''تم سارا ملبہ مجھ پر نہیں گرا سکتیں۔ اس سب میں تم بھی برابر کی شریک تھیں۔ یہ ہم دونوں کا مشترکہ فیصلہ تھا۔'' ابرار نے لطیف طنزیہ انداز میں سونیا کو بہت کچھ جتلایا تھا۔ اس مقام پر سونیا سرسوں کے مانند زرد پڑ جاتی تھی۔
''اسی کی سزا بھگت رہی ہوں۔'' اس نے سسک کر کہا۔
''کیا تم اتنی سی بات پر شکر ادا نہیں کرتیں؟ کہ جسے سالوں سے ڈھونڈ رہے تھے کم از کم اس کا سراغ تو مل گیا۔ کرن کے چلے جانے کا صدمہ الگ تھا۔ اسی غم میں اللہ نے تمہیں عمائم سے ملوا دیا۔'' ابرار اس کی حالت کے پیشِ نظر حلیم سے ہو گئے تھے۔
''لیکن یہ ملنا ادھورا ہے۔'' سونیا تڑپ سی گئی تھی۔
''اللہ مکمل بھی کر دے گا۔'' انہوں نے مطمئن انداز میں کہا تھا۔ وہ آج بھی سالوں کی طرح مطمئن تھے۔ ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
''جانے کب.....؟'' وہ بے صبری سے بولی تھی۔
''امید اچھی رکھو..... ہم نے کل بھی اپنی بقا کے لیے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ تم خواہ مخواہ گلٹی فیل کرتی ہو..... ورنہ ان

حالات میں کوئی اور آپشن تھا ہی نہیں....." ان کا انداز تسلی دینے والا اور سمجھانے والا تھا..... وہ اتنے سالوں سے بہلتی آرہی تھی لیکن اب بہلنا مشکل تھا۔

"سب ضمیر کو تھپک تھپک کر سلا دینے کے بہانے ہیں۔" سونیا نے تلخی سے کہا۔ ابرار نے بے ساختہ نگاہ چرالی تھی۔

"تم کہو تو میں عمائم سے ملوں.....؟" انہوں نے اندر مچلتی خواہش کو دبا کر سنجیدگی ظاہر کی تھی..... اندر کہیں دور بہت دور سے دیکھنے کی ہڑک بیدار ہو رہی تھی۔

"ہرگز نہیں....." سونیا چیخ پڑی۔

"مگر کیوں؟" وہ حیران ہوئے۔

"وہ ہمیں تسلیم نہیں کرے گی۔" اس نے تڑخ کر کہا۔

"ایک دفعہ اسے حقیقت معلوم ہوگئی تو وہ ہمارا یقین بھی کرے گی اور ہمیں تسلیم بھی کرے گی۔" ابرار ہمیشہ کی طرح پُرامید تھے۔ سونیا کی آنکھوں میں طنز پھیل گیا تھا۔

"بہت خوش فہم ہو تم....." وہ چیخی۔

"پلیز سونیا! کول ڈاؤن....." ابرار نے ملائمت سے اس کے دونوں ہاتھ دبائے..... وہ کنپٹیاں دباتی رونے لگی۔

وہ ہمیشہ سے رو رہی تھی۔ سالوں سے رو رہی تھی..... کبھی چھپ کر، کبھی سامنے، کبھی تنہائی میں، کبھی محفلوں میں..... رونا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ جو ہاتھ آئی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔ رونا ان کے مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے۔ سو ایسے لوگ کبھی کرن کے لیے روتے ہیں اور کبھی عمائم کے لیے۔

☆☆☆

"وقت پر ایک ٹانکا، بے وقت کے نو ٹانکوں سے بہتر ہے۔" وہ جتنا چاہے بے نیاز بنتی لیکن اس عبارت سے نگاہ نہیں چرا سکتی تھی۔ بارہا اس عبارت نے عمائم کو ڈسٹرب کیا تھا۔ بہت دفعہ وہ بے چین ہوئی تھی۔ بہت دفعہ اضطراب کے عالم میں کمرے سے باہر نکل کر واپس آئی تھی۔

اسے کیا کرنا چاہیے تھا؟ وہ کیا کرنا چاہتی تھی؟ وہ ایک عجیب گورکھ دھندے میں الجھ گئی تھی۔ کیا مناسب تھا کیا غیر مناسب؟ سوچ، سوچ کر دماغ پھٹنے لگا تھا۔ کل جو بھی ہوا تھا اچھا یا برا.....؟ وہ اس کی گہرائی میں نہیں اترنا چاہتی تھی۔ اسے بس اتنی فکر ضرور تھی کہ کل اس کے انتہائی روڈ بی ہیویئر پر ایمان کو غصہ آیا تھا۔ اسی غصے میں ایمان نے شادی کی ڈیمانڈ بھی رکھ دی تھی۔ اور اسے لگ رہا تھا۔ سارے بڑوں کے درمیان شادی کے حوالے سے بہت کچھ طے پا گیا تھا۔ تائی امی نے تصدیق بھی کر دی تھی۔ گو کہ عالمہ کی ڈگری سے پہلے شادی کا ارادہ غیر مستحکم تھا لیکن اگر دیکھا جائے تو وہ انکار کے لیے کوئی جواز بھی نہیں رکھتی تھی۔ اگر بڑے چاہ رہے تھے تو یوں ہی سہی.....

لیکن اصل معاملہ تو ایمان کے بگڑے موڈ سے مشروط تھا۔ کل تک عمائم کو اس کے غصے کی قطعاً پروا نہیں تھی..... لیکن آج بہت سے حوالوں کو سوچ کر وہ ایمان کے لیے اپنے دل میں کچھ نرمی پا رہی تھی۔ کم از کم اتنی ملائمت جو وہ براہِ راست ایمان سے معافی مانگ لیتی..... ایک معمولی سی سوری کے بعد اگر ایمان کا موڈ بہتر ہو جاتا تو یہ بڑا خسارہ نہیں تھا۔

ایمان کے غصے پر سوری کا بروقت ٹانکا، آنے والا وقت کی تلخی سے بہت بہتر تھا۔

ویسے بھی غلطی معلوم ہو جائے تو حکم ہے فوراً اسے درست کر لیا جائے۔ جو لوگ ہٹ دھرمی پر اتر آتے ہیں وہ اپنی غلطیوں کے لیے جواز پیش کرتے ہیں وہ صرف سینہ زوری کرتے ہیں۔ گو کہ اس کے اصول غلط نہیں تھے پھر بھی آئندہ آنے والی زندگی میں تلخی سے بچنے کے لیے وہ اصولوں میں نرمی لا سکتی تھی۔ لیکن اوپر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ اوپر جا چکی تھی۔ تب کیا ملا تھا؟ جواب مل جاتا؟ ویسا ہی کوئی انکشاف.....؟ جو اسے باور کروا دیتا کہ وہ ایمان کی محبت نہیں محض وقتی خواہش ہے یا پھر ایمان کو اس سے ہمدردی تھی یا وہ اس پر ترس کھاتا تھا۔ اتنے انکشاف سہنے کے بعد بھی وہ ایمان کے ساتھ رشتہ نباہنا چاہتی تھی۔ محض ایک مضبوط اور مستحکم حوالے کے لیے..... اس گھر میں سر اٹھا کر چلنے کے

لیے..... ایک ٹھوس اور باعزت زندگی جینے کے لیے..... جس میں ضروری نہیں تھا کہ شادی سے پہلے دھواں دھار عشق لڑایا جاتا۔ شادی کے بعد بھی تو محبت ہو جاتی ہے اور اگر نہ بھی ہو تب بھی زندگی گزارنا مشکل نہیں تھا۔ سوچ کی آخری گہرائی تک وہ دل میں اٹھتے نارسائی کے میٹھے، میٹھے درد کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتی تھی۔ کیونکہ اسے زندگی کو آگے بڑھانا تھا۔

اس نے آخری دفعہ اپنے فیصلے کو مضبوطی بخشی تھی پھر بہت سوچ کر موبائل اٹھایا اور ایمان کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔ مطلوبہ نمبر دوسری لائن پر مصروف تھا۔ عائم رک سی گئی تھی۔ شاید ایمان کی فراغت کا انتظار کر رہی تھی..... کچھ دیر بعد ٹرائی کیا۔ لائن اب بھی بزی تھی۔ وہ پھر سے رک گئی تھی۔ ایمان کہاں بزی تھا؟ شاید کسی دوست کے ساتھ یا پھر آفیشلی کال میں مصروف ہو۔

پھر وہ اگلے دو گھنٹے تک ٹرائی کرتی رہی..... تب اچانک اسے خیال گزرا۔ نمبر بزی نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر بزی موڈ پر لگایا ہوا تھا۔ اس انکشاف نے عائم کو "ہلا" سا دیا تھا۔ تو کیا ایمان محض عائم کی کال سے بچنے کے لیے نمبر بزی کر رہا تھا؟

ساری رات عائم کو نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے روم میں چکراتی رہی۔ فجر کے قریب جب سر درد سے پھٹ رہا تھا تب اچانک عالی کی کال آ گئی۔ عائم اتنی سویرے اس کی فون کال سن کر کچھ متفکر ہو رہی تھی۔

''ہوا کیا ہے.....؟'' اس نے گھبراہٹ میں پوچھا تھا۔ ایک تو ایمان کے کٹھور رویے کی پریشانی تھی اوپر سے عالی کے انداز بھی پریشان کن تھے۔

''کیا تمہیں نہیں پتا.....؟'' عالی الگ حیران ہوئی تھی۔

''کیا نہیں پتا؟'' اسے فکر لگ گئی۔

''نورس نے ارجنٹ ''نمائش'' کی ڈیٹ کا اعلان کر دیا ہے۔ اور نمائش کی جگہ کا فیصلہ بھی ہو گیا۔'' عالی کے انکشاف نے عائم کو سچ مچ دنگ کر دیا تھا۔

''اتنی اچانک.....؟ ڈیلے کرنے کے بعد راتوں رات ڈیٹ فکس کر دی، یا حیرت؟'' عائم چیخ پڑی تھی۔

''اور جگہ سنو.....'' عالی نے اس کی چیخ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں عجیب سی کوئی بات تھی۔ جو عائم سمجھ نہیں سکی تھی۔

''نمائش جامعہ کے گراؤنڈ میں نہیں بلکہ فورٹ پارک میں ہوگی۔ کینٹ ایریا سے دو سو گز دور فورٹ پارک میں۔'' عالی نے ایک معروف پارک کا نام لیا تھا جو مختلف فیسٹیول کے لیے زیادہ مشہور تھا۔ عائم حیران ہوئی۔

''اور سیکورٹی''

''ہائی الرٹ ہے..... مطلب پریشانی کی بات نہیں..... باقاعدہ ''اجازت نامہ'' لیا گیا ہے۔'' عالی نے مزید بتایا۔ ''تم اپنی ٹیم کو تیار کر لینا.....'' وہ اسے یاد دہانی کروا رہی تھی۔

''اور تم.....؟'' عائم نے عجلت میں پوچھا۔

''آف کورس میں تو ہوں گی۔ آفٹر آل میری ''کوریج'' کے بغیر سب کچھ ادھورا ہے۔'' عالی نے معنی خیزی سے کہا تھا۔ عائم اس کی معنی خیزیت کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ ویسے بھی اس کے ذہن میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ ایمان کا رویہ، آنے والے حالات، سالانہ امتحانات اور نورس کی یہ نمائش.....

''سنو..... عائم.....'' عالی کا لہجہ کچھ محتاط اور سرگوشیانہ ہو گیا تھا۔ اس کا گھومتا سر لمحہ بھر کے لیے رکا۔

''ہوں..... کیا.....؟'' عائم چونک سی گئی تھی۔

''عنقریب تم پر کچھ انکشاف ہوں گے۔ بہت حیران کن۔ لیکن وعدہ کرو..... ہم سے بدگمان نہیں ہو گی۔'' وہ بہت ملائمت سے کہہ رہی تھی۔ عائم تھکی بھلا..... ''ہم'' کا مفہوم کیا تھا؟ عالی اور اس کے ساتھ اور کون، کون.....؟

''مطلب.....؟''

''وقت آنے پر مطلب بتاؤں گی۔'' عالی لحظہ بھر کے لیے مسکرائی تھی۔

''پھر بھی..... کچھ تو بتاؤ.....'' وہ بے چین ہوئی۔ اسی دوران موبائل میں میسج ٹیون بجی تھی۔ عمائم چونکی نہیں..... اس کی ساری توجہ عالی کی طرف تھی۔

''ابھی وقت نہیں..... اور تم، اپنی ٹیم کو تیار کر لینا۔ نور وغیرہ تو بہت ایکسائٹڈ ہیں..... اور ثریم بھی۔'' عالی نے مزید اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے کھٹاک سے فون رکھ دیا تھا۔ عمائم پریشان ہو گئی۔

''یہ نورس بھی ناں..... اللہ اسے سمجھے..... کبھی کچھ تو کبھی کچھ اعلان کرتی ہے۔'' عمائم نے جلدی سے اپنی ٹیم کی لڑکیوں کو میسج کر دیے تاکہ وہ اپنی ادھوری تیاری مکمل کر لیں۔ کیونکہ اتوار کا دن مقرر ہو چکا تھا۔

اسی دوران نیا میسج اسکرین پر چمک گیا۔ اس نے جلدی سے ان باکس کھولا..... وہاں ایمان کا نمبر تھا۔ عمائم کی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں۔

اس نے ٹیکسٹ پڑھا اور پھر سے متحیر رہ گئی۔ وہاں ایک لفظ..... ''سوری'' عمائم لکھا تھا۔ اس نے جلدی سے میسج ٹائپ کیا۔

''ایمان! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز تم نیچے آ جاؤ.....'' میسج بھیج کر وہ ریپلائی کا انتظار کرتی رہی۔

ایک منٹ بعد جواب آ گیا تھا۔

''سوری عمائم!'' وہی دو لفظ..... حیران کُن، مختصر اور جامع بھی۔ عمائم کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئی تھیں۔ یہ ایمان کو کیا ہو رہا تھا۔ اس نے دوبارہ میسج لکھا۔

''پلیز ایمان! غصہ ختم کرو..... دیکھو، میں تم سے اپنے روڈ لی بی ہیوئر کی معافی مانگتی ہوں۔'' عمائم نے بے بسی سے لفظ گھسیٹے تھے۔ بندے کو کس، کس مقام پر اپنی اَنا کو سرنگوں کرنا پڑتا ہے۔ وہ اداسی سے سوچتی رہی..... ایمان کا ترنت جواب آیا تھا۔ لیکن پہلے کی طرح وہی گھسا پٹا۔

''سوری عمائم.....'' اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ آخر ایمان کو ہوا کیا تھا؟ وہ یہ سب کیوں لکھ رہا تھا؟ اس معذرت کا مطلب کیا تھا؟ ایمان چاہتا کیا تھا؟ اس کی گھبراہٹ دوچند ہو گئی تھی۔ عمائم کا دل چاہ رہا تھا وہ اوپر چلی جائے لیکن اس سے پہلے عمائم نے پھر سے آخری کوشش کے تحت میسج لکھا۔

''تم ایک ہی میسج مجھے بار، بار بھیج رہے ہو؟ کیوں؟ تم مجھے ستا رہے ہو؟ پریشان کر رہے ہو؟ میری بات تو سن لو۔'' اس نے بھیگی آنکھوں کو نرمی سے پونچھ کر میسج سینڈ کر دیا تھا۔ جواب پھر سے ترنت آیا۔

''سوری عمائم.....'' وہ تھک کر ٹوٹ گئی تھی۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ اس کا دماغ جیسے گھومنے لگا۔ وہ سوچتی رہی تھی، غور کرتی رہی تھی۔ الجھتی رہی تھی۔ پھر اک نکتے پر پہنچ کر تیزی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

گیلری اب بھی اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ دائیں بائیں کے سارے کمرے بند تھے۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ باہر بھی اندھیرا تھا، اندر بھی اندھیرا تھا۔ جانے وہ اندھیرے سے نکل رہی تھی؟ یا اندھیرے کی طرف بڑھ رہی تھی؟ جانے خاموشی باہر زیادہ تھی یا سناٹے اندر بے بہا تھے؟ جانے اذیت باہر بہت تھی یا تکلیف اندر زیادہ تھی؟ یہ عجب سا موڑ تھا۔ یہ انتہائی تکلیف دہ موڑ تھا۔ بہت پُراذیت دوراہا تھا۔

وہ چلتی رہی، آگے بڑھتی رہی..... ایک، ایک قدم بہت بھاری تھا۔ ایک، ایک قدم بہت دور دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھند بڑھتی رہی۔ کہر چھاتی رہی۔ ریت اڑتی رہی۔ وہ ایمان کے پورشن تک پہنچ گئی۔ رستے میں کئی مرتبہ دھند آئی۔ اس نے آنکھیں مسل، مسل کر دیکھا تھا۔ کوئی بھی عکس واضح نہیں تھا۔ معاً کوئی اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ عمائم کی آنکھوں میں بے یقینی سی پھیل گئی تھی۔ جیسے وہ اس چہرے کی اس وقت توقع نہیں کر رہی تھی۔

''ایمان گھر میں نہیں.....'' وہ نرمی سے اطلاع دے رہا تھا۔ عمائم چونک گئی۔ وہ گھر نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟ اس کی آنکھوں میں سوال اتر آیا تھا۔

''کہاں گیا؟''

''وہ رات سے گھر نہیں ہے۔'' اس کے انداز میں اب بھی ملائمت تھی۔ عائم کچھ مضطرب ہوگئی۔

''فلائٹ پر چلا گیا؟''

''نہیں.....'' وہ سنجیدہ تھا۔

''تو پھر؟ وہ کہاں گیا احتشام!'' اس کی بے قراری کا کوئی انت نہیں تھا..... احتشام سب سمجھ رہا تھا۔ وہ بھی جو عائم کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ وہ بھی جو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بھی جو عائم بتا نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی جو بن کہے احتشام سمجھ سکتا تھا۔

''شاید اپنی تلاش میں.....'' احتشام نے گہری سانس کھینچ لی۔

''میں سمجھی نہیں.....'' اس نے بے قراری سے کہا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ سب سمجھ لوگی.....'' احتشام نے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف سر پر باندھ لیے تھے۔ جیسے وہ اپنے اعصاب کو ڈھیلا اور پُرسکون کررہا تھا۔ احتشام اس کے اندر چڑھنے اور اترنے والے ''ابال'' کو جانتا تھا اس لیے بہت مطمئن تھا۔ اس نے ایمان کے انکار کی بابت بالآخر اسے بتادیا تھا۔

''قبل از وقت اطلاع کے لیے شکریہ..... میں مزید ایمان کے سامنے ''نکو'' بننے سے بچ گئی ہوں.....'' بالآخر عائم نے ثابت کردیا تھا وہ کٹھن حالات کی پیداوار تھی۔ وہ بزدل نہیں، بہت بہادر تھی۔ احتشام کے اندر سے پھانس نکلنے لگی۔

''میں ایمان سے وجہ دریافت نہیں کروں گی، میری ''انا'' یہ گوارا نہیں کرتی۔'' اس نے احتشام کو بتادیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے اندر کی بات بتادیتی تھی۔

''گریٹ.....'' احتشام پہلی مرتبہ ذرا سا مسکرادیا۔ اس کے کشیدہ اعصاب ڈھیلے ہوگئے تھے۔

''اور زندگی رکتی نہیں عائم! چلتی رہتی ہے۔'' وہ اس کے ذرا اور قریب کھڑا ہوا۔ سنجیدہ اور گہری نظر سے دیکھتا ہوا۔ کچھ سوچتا ہوا۔

''کوئی ساتھ چلے یا نہ چلے.....'' عائم بھی پہلی مرتبہ مسکرادی تھی۔ اس کے کندھوں سے اجنبی سا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ ایسا اجنبی بوجھ جو ایک ناپسندیدہ فیصلے کی وجہ سے کندھوں پر لدا ہوا تھا۔ وہ فیصلہ جو صرف ایمان کا تھا۔ جس میں نہ امو کی مرضی شامل تھی نہ تائی امی اور نانی کی..... اور شاید عائم کی بھی نہیں۔

وہ تو بابا صاحب کے پُرشفقت ہاتھ کی حدت اور سائے کو نبھا رہی تھی۔ ایمان اگر خود ہٹ گیا تھا تو یہ بہت بہترین تھا کیونکہ احتشام ٹھیک کہتا تھا۔ جو بھی ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے اور احتشام کبھی غلط نہیں کہتا۔ یہ حریم کا دعویٰ تھا۔ اور حریم کا دعویٰ کبھی غلط نہیں ہوتا۔

عائم دور تلک پُرسکون ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر وہ ویسے ہی پُراعتماد قدموں سے پلٹ گئی۔ اس کی چال میں ٹھکرائے جانے کی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

☆☆☆

خبر اتنی معمولی نہیں تھی۔ جو جنگل کی آگ سے کم نہ پھیلتی۔ ایمان کا ''انکار'' من وعن سب بزرگوں تک پہنچ گیا تھا۔ اور عجیب بات تو یہ تھی، کسی نے بھی ایمان کو کٹہرے میں کھڑا نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی ایمان سے سوال نہیں کیا۔ کسی نے بھی اسے برا بھلا نہیں کہا۔ بلکہ سب بزرگوں کا رویہ بڑا حیران کن اور عجیب تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے نگاہ چرا رہے تھے۔ ایک دوسرے کی سوالیہ نظروں سے بچ رہے تھے۔

امو اور ماما کے علاوہ سب اپنی ذات میں گم صم اور ندامت کے بار تلے دبے اور خاموش تھے۔ امو بہت خوش نہیں تھیں۔ گو کہ عائم ان کی پسندیدہ بہو بننے نہیں جارہی تھی لیکن پھر بھی ایمان کے انکار نے انہیں بھونچکا کردیا تھا۔ کہاں تو عائم کے لیے اس قدر اتاؤلا ہورہا تھا اور کہاں ایسا منہ زور جواب؟ جبکہ ماما کا رویہ کچھ الگ تھا۔ انہوں نے طنز تو نہیں کیا۔ بہت خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ بہت حیرانی بھی نہیں دکھائی۔ وہ بھی عجیب کیفیات کا شکار تھیں۔ عائم سے لاکھ بیزاری اور تنفر کے باوجود اچانک ایمان کے رویے کا بدلاؤ سب کو متحیر ضرور کرگیا تھا۔

عمائم اندر سے جتنی بھی اپ سیٹ ہوئی بظاہر بہت مضبوط تھی۔ پورا دن پُرسکون رہی، جامعہ میں بھی کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن رات کو جب بابا صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنی آرام گاہ میں طلب کیا تب وہ اتنی پُرسکون نہیں رہ سکی تھی۔ کہیں نہ کہیں اعتماد میں دراڑ بھی پڑی تھی۔ کہیں نہ کہیں ضبط کی طنابیں بھی چھوٹی تھیں۔ کہیں نہ کہیں صبر کا دامن بھی ہاتھ سے کھسک گیا تھا۔ دل میں کہیں نہ کہیں شکوے کا ہلکا سا ابال بھی اٹھ رہا تھا۔ آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ میں ہی امتحان میں کیوں...... لیکن پھر بھی بڑے ضبط کے ساتھ وہ بابا صاحب کے سامنے کھڑی تھی۔ صرف اسی احساس کے تحت کہ ایمان کے ٹھکرانے پر ہی سہی...... انہوں نے ذرہ برابر ہمدردی کے تحت اس کی دل جوئی کی غرض سے اتنے بے شمار سال بعد اسے اپنی بوند برابر شفقت سے نوازا تھا۔ عمائم کے لیے فقط یہ معمولی سا احساس ہی کافی تھا۔

کیا تھا جو اگر ایمان نے بیانگِ دہل رشتہ جوڑا اور پھر توڑ دیا۔ وجہ کوئی بھی تھی۔ عمائم کے لیے اونچے محرابوں والے اس گھر کی رہائش گاہ سے ذرا ہٹ کے اس ''دیوان خانے'' تک آنا پوری عمر کا ''حاصل حصول'' تھا۔ وہ اتنی قناعت پسند تھی۔ ایمان کی دی گئی بے عزتی اور ذلت کو محض اتنے سے احساس پر بھلا سکتی تھی۔ اور بابا صاحب دوسری مرتبہ اس سے نگاہ چرا کر کھڑے تھے۔ بے بس سے ہاتھ ملتے ہوئے۔

''امید نہیں تھی، وہ اتنی جلدی فیصلے بدلنے والا ہوگا...... امید تو کوئی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر توقع کے برخلاف ہو جاتا ہے۔ ہم سوچتے کچھ ہیں ہوتا کچھ ہے۔'' وہ بھیگی آواز میں تمہیداً کہہ رہے تھے۔ عمائم ان کی ندامت کو سمجھتی تھی۔ ان کی شرمندگی کو محسوس کر سکتی تھی۔ ان کی تکلیف کو جان سکتی تھی۔ وہ اذیت میں تھے اور نظر بھی آرہے تھے۔

''اور جو ہوتا ہے بھلے کے لیے ہوتا ہے۔ کوئی رشتہ گمان ہوتا ہے، کوئی یقین۔ تم گمان سے یقین کی طرف آؤ گی۔ میرا یقین کہہ رہا ہے۔ اور یقین کبھی غلط نہیں کہتا۔'' ان کا لہجہ پُرنم تھا۔ افسردہ، سنجیدہ، بھیگا سا۔ عمائم کے دل کو کچھ ہوا...... یہ بزرگ نما پُرشفقت، بے نیاز سا وجود کتنا عظیم تھا۔ کتنا اپنا تھا...... اس کی ماں کے حوالے سے بہت قریبی رشتہ تھا۔ اتنا قریبی کہ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹا کر ان کے سینے سے لگ کر عمر بھر کی اپنی محرومیوں کے سوال اٹھا سکتی تھی۔ ان سے اپنی ماں کے ''جرم'' اور ''سزا'' کا سبب پوچھ سکتی تھی۔ اپنے ''دھتکارے'' جانے کی وجہ دریافت کر سکتی تھی۔ لیکن آج بھی مہر بہ لب تھی۔ وہ کل بھی مہر بہ لب تھی۔ اسے نانی کے عہد کا پاس بھی تھا۔ اور وقت کا انتظار بھی۔

''عمائم......! کچھ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ کچھ چیزیں بھی سمجھ نہیں آتیں۔ جب تک کہ کسی دوسرے کو اپنی جگہ نہ رکھ کر سوچا جائے۔ شاید میں کل بھی غلط تھا...... میں آج بھی غلط ہوں گا۔ لیکن یقین کرو، میں کل بھی مجبور تھا۔ میں آج بھی خود کو مجبور سمجھتا ہوں۔ کل بھی بے بس تھا۔ آج بھی بے بس ہوں...... کل ان کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ آج تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔'' وہ بھیگی آواز میں بولتے چلے جارہے تھے۔ عمائم کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بابا صاحب کو اس ندامت کے ''بار'' تلے دبا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جبکہ وہ قصوروار بھی نہیں تھے۔ قصوروار تو شاید ایمان بھی نہیں تھا۔ سارا قصور عمائم کے اپنے نصیب کا تھا۔

''آپ ایسی باتیں نہیں کریں۔ شاید یہی مناسب ہوگا...... اسی میں کوئی اللہ کی مصلحت ہوگی۔'' اس نے بالآخر لب کشائی کی تھی۔ بابا صاحب کی آنکھوں میں نمی چمکتی رہی...... ان کا کانپتا ہاتھ عمائم کے سر پر سایہ فگن ہوا۔

''صبر......'' ان کا لہجہ بھی بھرا گیا۔ ''صبر سے بہتر کچھ نہیں...... جو لوگ نصیب پر صبر کرتے ہیں اور شکر کو سمجھ لیتے ہیں وہ بامراد ہوتے ہیں عمائم...... یاد رکھنا، صبر کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ تم...... کبھی ناکام نہیں ہوگی۔'' ان کا کانپتا ہاتھ ٹھہر سا گیا۔ عمائم کی آنکھوں سے سیلِ رواں بہتا رہا۔ صرف ان چند الفاظ کی خاطر وہ زندگی گزار سکتی تھی، خود کو ''ہار'' سکتی تھی۔

☆☆☆

رات دوسرے پہر سے نکل کر تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی کھلے آسمان تلے کھڑے تھا۔ ستاروں سے خالی آسمان تلے۔ اس وقت آسمان پر بادلوں کا گھیرا تھا۔ اتنے بادل اچانک نہ جانے کہاں سے امڈ آئے تھے۔ سارے آسمان پر روئی جیسے گالوں کا ڈیرا تھا۔

وہ نم گھاس پر چلتا رہا۔ رات کی تاریکی میں شہرِ دل کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ شہرِ دل کی ویران اور اداس

گلیاں.....سنسان اور بیابان گلیاں.....

اس کے دل میں ویرانی کے سایوں کا گھیرا تنگ ہوا۔ وہ مضطرب سا چلتا رہا۔ چلتے، چلتے رک سا گیا۔ شہرِ دل کی گلیاں اسے روک رہی تھیں۔ گلی کے اک سنسان موڑ پر عمامہ کھڑی تھی۔ وہ تھم سا گیا، رک سا گیا۔ اس نے آنکھیں مسل، مسل کر دیکھا۔ وہاں عمامہ نہیں تھی۔ عمامہ تو سبز کھڑکیوں والی بالکونی سے جھانک رہی تھی۔ اس کی دھڑکنوں میں تلاطم آیا۔ وہ بے اختیار بڑھتا رہا۔ آگے چلتا رہا۔ وہ بھاگتا رہا.....عمامہ کی طرف لپکتا رہا۔ لیکن عمامہ کہیں نہیں تھی۔ نہ شہرِ دل کی گلیوں کے سنسان موڑ پر..... نہ سبز کھڑکیوں والی بالکونی کے دریچوں میں.....زمین کے نیچے، نہ زمین کے اوپر، آسمان پر نہ پاتال میں.....عمامہ تو کہیں نہیں تھی۔ شہرِ دل کی ویران گلیوں میں وہ اکیلا کھڑا تھا۔

وہ بے دم سا ہو کر برآمدے کے قدمچے پر بیٹھ گیا۔ نڈھال سا، ویران سا، بے حال سا، عمامہ کی طرح.....سر جھکائے، سر نیہواڑے۔

معاً کوئی چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ شام نے اپنی شام رنگ آنکھوں سے دیکھا۔ وہ عمامہ کا منال تھا۔ لاجوردی کنٹھے والا..... بہت خوب صورت منال..... جو طاہر، عمامہ کی فرمائش پر لایا تھا۔ اس کے بھائی ایسے ہی اس کے منہ سے نکلی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ وہ عمامہ سے ایسے ہی بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اس لیے کہ سراپا محبت وہ خود بھی تھی۔ ہر کوئی اسے بے دریغ چاہتا اور چاہے چلا جاتا۔ اور اگر عمامہ منہ زور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کوئی انتہائی قدم اٹھاتی تو کون اسے رہتی دنیا تک اچھے الفاظ میں یاد کرتا.....؟ شاید کوئی بھی نہیں.....اس کے بھائی بھی نہیں..... جان لٹانے والی ماں بھی نہیں.....اونچی دستار والا باپ بھی نہیں۔

وہ بے خیالی میں منال کو دیکھتا رہا۔ اور بے خودی میں سوچتا رہا۔ پھر اسے خیال گزرا.....منال بھی اسی کی طرح سر نیہواڑے کھڑا تھا۔ شام ٹھٹک گیا۔ کچھ چونک گیا۔ منال اداس تھا؟ وہ خاموش تھا؟ منال چپ اور اداس کیوں تھا؟ نہیں، منال اداس نہیں بلکہ غمزدہ کھڑا تھا۔ وہ کیوں غم زدہ کھڑا تھا؟ شام بے قرار ہوا بے تاب ہوا.....مضطرب ہوا۔ عمامہ کا منال اتنا لٹا پٹا کیوں کھڑا تھا؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر منال کو اٹھا لیا۔ وہ اس کے بازوؤں میں پھڑ پھڑایا۔ جیسے..... بے چین ہوا ہو۔ جیسے اسے ناگوار گزرا ہو۔ جیسے اسے برا لگا ہو۔ جیسے اسے غصہ آیا ہو۔ شام پھر سے چونک گیا تھا۔ آخر منال کو کیا برا لگا؟ اس کا اٹھانا؟ کیا واقعی اٹھانا؟ اس نے پھڑ پھڑاتے منال کو زمین پر رکھ دیا۔ وہ پھر سے پُرسکون ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح سر نیہواڑے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ پہلے کی طرح غمزدہ تھا۔ انتہائی غمگین اور اداس.....

شام جیسے سمجھ گیا۔ وہ عمامہ کے لیے اداس تھا۔ پھر منال نے سر ہلا، ہلا کر ناراضی کا اظہار بھی کر دیا۔ غصہ بھی دکھایا۔ حلق سے آوازیں بھی نکالی تھیں۔ پھر اپنے پیروں کو زمین پر مار، مار کر چلا گیا۔

شام جیسے بے دم ہو کر سیدھا ہوا۔ وہ معصوم پرندے کے غصے کو سمجھ گیا تھا۔ وہ عمامہ کے دکھ پر افسردہ تھا اور عمامہ کے دل کو توڑنے والے سے ناراض تھا۔ منال بھی شام سے ناراض تھا۔ شام کی شام رنگ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

وہ اونچے محرابوں میں اتری سیاہی کو دیکھتا رہا۔ معاً گیلری کے دروازے کی کنڈی ہلی تھی۔ پھر کوئی چپکے سے باہر نکل آیا۔ شام نے بلا وجہ ہی مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ وہاں طاہرہ آپا کھڑی تھیں۔ بادامی آنکھوں میں خفگی لیے پھر تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی قریب آئیں۔

''شام ابھی تک سوئے نہیں۔ اپنے کمرے میں نہیں گئے؟ حد ہو گئی شام! تم سے ایسی غیر ذمے داری کی امید نہیں تھی۔'' وہ انہیں خفا ہوتا دیکھ کر چونک گیا تھا پھر سنبھل گیا۔ بادلوں ڈھکے آسمان تلے کھڑے ہونے کا کیا جواز دیتا؟ وہ طاہرہ آپا کو کیا جواب دیتا؟

''نیند نہیں آ رہی تھی۔'' شام دھیمی آواز میں بولا۔ اتنا دھیما کہ بمشکل طاہرہ سن سکیں۔

''حد ہے شام! فیقہ اندر ہے اور تمہارا انتظار کر رہی ہو گی چلو تم بھی۔ بلکہ رکو تم..... میں تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں۔ پیو گے تو نیند آئے گی۔'' وہ ملائمت سے ڈپٹ کر کہہ رہی تھیں۔ شام ''بے بس'' سا ہوا۔

''رہنے دیں آپا! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' اس نے بلا ارادہ روکا تھا۔ طاہرہ رک کر پلٹ گئیں۔

''تو پھر اپنے پورشن میں جاؤ۔''

''جاتا ہوں.....'' وہ پھر سے بے بس ہوا۔ طاہرہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئیں۔ پھر بول پڑیں۔

''نہیں، ابھی جاؤ..... میرے سامنے بلکہ میرے ساتھ۔'' انہوں نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شام کی بے بسی کا کوئی انت نہیں رہا تھا۔

''آپا! پلیز.....''

''کیا بچپنا ہے شام! یہ رکنا کیوں.....؟ کیا تم نہیں جانتے.....؟ کس دین دار، فرض شناس گھرانے کے چشم و چراغ ہو۔ کیا بھول رہے ہو۔ آج کی شام اللہ اور اس کے رسولؐ کو گواہ بنا کر ایک عورت کی ذمے داری کا حلف اٹھایا ہے۔ عہد کیا ہے، کیا پہلے مرحلے پر بدعہدی کرنے اور مکرنے کا ارادہ ہے؟'' ان کی خفگی کا گراف کچھ اونچا ہوا تھا۔ شام لب بھینچ کر نظر چرا گیا۔

''میں نے کب.....؟'' وہ بولتے، بولتے رک سا گیا تھا۔ طاہرہ خفگی سے اسے دیکھتی رہیں۔

''دیکھو، سارا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ سب لوگ سو رہے ہیں۔ اور تم ابھی تک یہاں؟ اگر کوئی اچانک اٹھ آئے؟ تمہیں یہاں دیکھے اور صبح تک افسانہ بنا دے۔'' طاہرہ جن باریک نزاکتوں کا ذکر کر رہی تھیں، شام ان سے بیگانہ نہیں تھا..... ہر اونچ نیچ کو سمجھتا تھا۔ ہر بات سے واقف تھا..... ہر مصلحت کو جانتا تھا۔ لیکن یہ بے بسی..... جو آکٹوپس کی طرح جکڑتی تو ہے لیکن دکھائی نہیں دیتی۔

''سمجھتا ہوں آپا! سب سمجھتا ہوں.....'' اس نے اک اضطراب کی لہر کو دبا کر کہا۔ پھر طاہرہ کے اشارہ کرنے پر ان کے ہمراہ چل پڑا۔

''تو پھر بے پروائی کیوں.....؟'' وہ کہنا چاہتی تھیں مگر یہ کہہ نہیں سکیں..... وہ بھی سر جھکائے چلتی رہیں۔ وہ اونچے محرابوں والے گھر سے الگ گوشے میں آ گئے..... یہاں سے شام کے پورشن کی حدود شروع ہوتی تھیں۔

شام نے بلا ارادہ ہی پیچھے کی طرف دیکھا۔ اونچے محرابوں کو دیکھا۔ پیچھے چھوڑے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ وہ رک، رک کر چلنے لگا۔ وہ طاہرہ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ عمامہ کہاں ہے؟ کیا وہ سوئی؟ لیکن کچھ پوچھ نہ سکا۔ کاش، وہ ان سے اتنا کہہ دیتا۔ وہ عمامہ کے ساتھ رہیں۔ اسے اکیلا نہ چھوڑیں۔ وہ عمامہ کا سایہ بن جائیں..... کاش وہ آپا سے کچھ بولنے کی جرأت کر لیتا۔

لیکن اس نے کہا بھی تو بہت الگ.....

''گھر میں سب سو چکے آپا.....؟''

''ہاں تو..... بہت پہلے، بچے بڑے سب ہی تو تھکے ہوئے تھے۔ اتنی راتوں کے جاگے ہوئے۔ اماں بھی دوا کھا کر سو گئیں.....'' انہوں نے دھیمے انداز میں بتایا۔ وہ باڑ بنے دروازے سے اندر آ گئے تھے۔ شام نے رک کر پوچھا۔ آہستہ سے کہا۔

''تو آپ کیوں نہیں سوئیں.....؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔ کیا خبر، وہ عمامہ کا ذکر کرتیں۔ وہ عمامہ کے لیے نہیں سوئیں..... وہ کچھ تو بتاتیں۔

''عمامہ کو بخار تھا۔'' طاہرہ کے منہ میں آئی بات رک گئی تھی۔ انہوں نے اچانک بات بدل دی۔ وہ عمامہ کا ذکر ان لمحوں میں کر کے شام کی سوچ اور خیالوں کو بھٹکانا نہیں چاہتی تھی۔ ''بس نیند نہیں آئی تم چلو.....'' وہ گرل کے پاس ٹھہر گئی تھیں۔

''اور آپ.....؟'' شام کے قدم بھی رک گئے تھے۔

''میں بھی چلوں گی۔ پہلے تم اندر جاؤ.....'' انہوں نے گرل کا دروازہ کھول دیا تھا۔ شام بے بسی سے کھلے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ چلائے نہ چلتے تھے۔

لیکن آپا وہیں کھڑی رہیں..... جب تک اسے اندر نہیں بھیج دیا۔ جب وہ سر جھکائے جا رہا تھا تب طاہرہ نظر چرا کر

بادلوں ڈھکے آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھ سے ایک ستارہ ٹوٹ کر گرا اور کھو گیا۔ بکھر گیا یا گم ہو گیا۔ دل میں دکھ کی اِک ٹیس سی اٹھی تھی۔ انہوں نے زیرِلب بڑبڑا کر کہا۔

''جب ہر ادیں مقدر کی چالوں کے دکھ.....''

وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

''میری منزل کہاں ہے؟ کدھر ہم سفر.....؟
مار ڈالیں گے اب ان سوالوں کے دکھ''

وہ نیم اندھیرے میں کھڑا رہا۔ سامنے وہی خوب صورت لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی روشنی نیم اندھیرے میں لکیر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

سامنے شام کا کمرا تھا۔ اس کی ذاتی پناہ گاہ..... جس پر ڈٹ کا موٹا پردہ گرا تھا۔ دروازہ بند نہیں کھلا تھا۔ اس نے گہری طویل سانس کھینچ کر اردگرد نگاہ ڈالی۔ یہ شام کا پورشن تو تھا لیکن بدلا ہوا۔

وہ پچھلے کئی دن سے ''دیوانِ خاص'' میں سو رہا تھا۔ اس پورشن پر طاہر اور تقی نے قبضہ جما رکھا تھا۔ تزئین و آرائش سے لے کر زیبائش تک، سب کام ان دونوں کے ذمے تھے۔ انہوں نے شام کے پورشن کو ٹوٹل بدل دیا تھا۔ اس کا..... بے رنگ پورشن کسی نئی نویلی بہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ انتہائی خوب صورت اور دل افروز..... فیقہ کا سارا جہیز یہاں سیٹ تھا۔ نیا کلر پینٹ اور خوب صورت فرنیچر، پردے اور دیدہ زیب آرائشی سامان کے ساتھ ہر چیز میں نیا پن نظر آ رہا تھا۔ لیکن شام کو کچھ بھی اچھا نہیں دکھ رہا تھا۔ اس کا دل کچھ اور بوجھل ہو گیا۔ جانے وہ کتنی دیر برآمدے میں کھڑا رہا۔ گھڑیال نے تین بجانے کا اعلان کیا تب وہ تھکے، تھکے قدم اٹھاتا ڈٹ کا پردہ اٹھا کر اندر چلا آیا۔ معطر گلابوں کی خوشبو جیسے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ اِک خوشگوار سا دلفریب احساس کہیں سے ابھرا تھا۔ شام سمجھ نہ سکا۔ اور آگے بڑھ آیا۔

پورا کمرا جگمگا رہا تھا۔ نئی پینٹ شدہ دیواریں، فرنیچر، گلاب، موتیے، خوشبوئیں اس کا دھیان ہر چیز میں اٹکا تھا۔ بس فیقہ کی طرف نہ گیا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر چاہتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ سامنے ہی موجود تھی۔ ویسی ہی سجی بنی..... عام دونوں سے الگ..... بہت منفرد یا پھر خوب صورت.....؟ اس نے دیکھا ہی نہیں تھا سو فیصلہ نہ کر سکا۔

جانے وہ کب تک بے دم سا کھڑا رہتا..... اس خاموش فضا میں فیقہ کی چوڑیوں کا ارتعاش ابھرا تھا۔ شام چونک گیا۔ کچھ ٹھٹک گیا۔ آنکھوں کا رخ بھی بدل گیا تھا۔ وہ نظر چرا، چرا کر جیسے تھک گیا۔ پھر نڈھال قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ فیقہ بھی سمٹ سی گئی تھی۔

وہ کچھ دیر فیقہ کے جھکے سر کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے وہیں بیٹھ گیا۔ فیقہ کے دل کی دھڑکنیں بے لگام ہو گئی تھیں۔ اس کا قریب بیٹھنا ہی قیامت تھا۔ فیقہ کے اندر دھکڑ پکڑی چلنے لگی۔

شام سر جھکائے سوچتا رہا۔ لفظوں کی بُنت کرتا رہا۔ فقرے جوڑتا رہا۔ خود کو سمجھاتا رہا۔ بہت کچھ باور کرواتا رہا۔ وہ نکاح نامے پر دستخط کر کے آیا تھا۔ وہ شادی نباہنے آیا تھا۔ وہ شاہ میر منصور تھا۔ منصور سیال سے بہت مختلف..... جب ایک دفعہ ارادہ کر لیا تو بس کر لیا۔ بات کی تو نباہ دی۔ اگر ی مٹ کیا تو پورا کیا۔ جیسے زندگی جاتی یا جان جاتی..... شاہ میر منصور کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ اسے فیقہ سے کیا کہنا تھا؟ کیا بولنا تھا؟ وہ اس کی کزن تھی۔ بہت بچپن میں اسے بہت پیار بھی کرتی تھی۔ لاڈ بھی اٹھاتی اور کبھی مار بھی لیتی۔ شام بھی اسے پسند کرتا تھا۔ وہ عمامہ کی طرح نہیں تھی مگر پھر بھی خوب صورت اور مہربان تھی۔ پھر اس کی زندگی میں اِک عجیب سا موڑ آیا تھا۔ جب اس کا چہرہ بدل گیا۔ تب فیقہ بھی بدل گئی تھی۔ اس کا مزاج بھی بدل گیا تھا۔ انداز بھی بدل گیا تھا۔ تب وہ سب افراد خانہ سے الگ تھلگ ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو ایک کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ پھر بہت سال گزرتے رہے ہم سے بدلتے رہے..... بیچ میں زندگی نے کئی کروٹیں لیں

اور کئی سمتیں بدلیں۔ اور آج پت جھڑ کے سارے موسموں کا احساس لیے وہ شام کے روبرو بیٹھی تھی۔ خاموش اور ساکت..... عمروں کے تفاوت کے باعث وہ کبھی بے تکلف نہیں تھے۔ شام اسے ضرورت ہوتی بھی تو کبھی مخاطب نہیں کرتا تھا۔ اور آج عجیب امتحان تھا۔ اسے فیقہ کو مخاطب کرنا تھا۔ وہ چاہتا یا نہ چاہتا..... اسے بولنا تھا..... دل کرتا یا نہ کرتا..... اس کے اندر تذبذب کی جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ شور تھا جو بڑھ گیا تھا۔ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر وہ سنبھل گیا اور شور بھی تھم گیا۔ اس نے بہت سوچا..... اب بھی اور تبھی بھی.....

فیقہ بہت زبردستی کے ساتھ اس کی زندگی میں داخل نہیں کی گئی تھی۔ وہ چاہتا تو انتہائی خودغرضی سے خالہ کے احسانات اور محبتوں کو لات مار کر فیقہ کو دھتکار جاتا۔ خالہ نے کیا کر لینا تھا؟ کتنا واویلا کر لینا تھا؟ آخر وہ تھک ہار جاتیں۔ لیکن پھر کیا ہوتا؟ شام کے لیے گنجائش اس گھر میں قیامت تک نہ نکلتی۔ وہ اس گھر سے دھتکار کر نکال دیا جاتا۔ فیقہ سے بچنے کے لیے وہ یہ زہر بھی پی لیتا۔ لیکن پھر ہوتا بھی کیا..... ؟ اس کے پاس اگرچہ ڈگری بھی تھی اور تجربہ بھی..... جاب بھی بہترین مل جاتی۔ محنت کرتا تو مقام بھی بنا لیتا..... پھر شادی کا مرحلہ آتا۔ اسے کوئی بھی مل جاتی۔ فیقہ سے زیادہ بہتر، حسین، ایجوکیٹڈ، شوخ، کم عمر لیکن وہ عمامہ تو نہ ہوتی..... اور وہ عمامہ بھی نہ ہوتی۔ تو جب عمامہ کہیں نہیں تھی تو پھر کوئی بھی کیوں نہ ہوتی۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ فیقہ ہوتی یا کوئی بھی اس کی ڈیمانڈ حسن، دولت یا علم نہیں تھا۔ اس کی چاہ تو بس محبت تھی وہ بھی عمامہ کی محبت اور جب وہ محبت نہیں تھی تو پھر کچھ نہیں تھا۔ سو اس نے فیقہ کو قبول کر لیا۔ فیقہ اس کی زندگی میں آئی یا نہ آئی۔ ایک بات تو طے تھی۔ عمامہ اسے کبھی نہ ملتی۔ اور عمامہ کے بعد کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جو اسے متاثر کرتا۔ عمامہ کے بعد کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جو دل میں جگتا۔ آنکھوں میں عکس بناتا یا دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرتا۔ اس نے خالہ کی خواہش کو پورا کر دیا۔ ان کے سارے احسان کا بوجھ اتار دیا۔

اگر دل ٹوٹا تھا تو عمامہ کا ٹوٹا تھا یا پھر شام کا ٹوٹا تھا۔ اس سے خالہ کو کیا غرض..... ؟ وہ تو ازل سے خودغرض تھیں۔ انہوں نے اپنی خودغرضی نباہ دی تھی اب شام کو اپنی مخلصی نباہنی تھی۔

سو وہ اپنی ''مخلصی'' نباہنے فیقہ کے سامنے موجود تھا۔ اس لیے کہ شام کو حلف اٹھا کر ''عہد'' نباہنے آتے تھے۔ وہ عہد کا کھرا، بات کا سچا اور قول کا پکا تھا۔ کیسے ''حقوق'' اور ''فرائض'' سے نظر چرا لیتا۔ اس نے بالآخر گہری سانس کھینچ کر پل صراط پر ٹنگی فقیہہ کو مخاطب کر ہی لیا تھا۔ اس کے لہجے کا وہ ہلکا اضطراب اب کہیں نہیں تھا۔ وہ بے چینی اب مفقود تھی جو آتے ہوئے دل محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں فیقہ سے کہا۔

''مجھے کبھی بہت لمبی باتیں کرنا نہیں آتیں۔ نہ میں بڑے، بڑے مکالمے بول سکتا ہوں جو گزر چکا ہے اسے گزار کر اور بھلا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ امید کرتا ہوں، گزری باتوں کو دُہرایا نہیں جائے گا۔'' اس کے نرم لہجے کے بھاری پن کی کثافت پر فیقہ کچھ بے چین ہوئی تھی۔ وہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ شام کس گزری ہوئی بات اور قصے کی طرف اشارہ کر رہا تھا؟ اس کے اندر بے چینی اتری۔

''انسان کی زندگی میں بہت سے مقام ایسے بھی آتے ہیں۔ جب انسان کو اپنے لیے نہیں، اپنے پیاروں کے لیے یا بقا کی جنگ کے لیے فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ گو کہ کچھ فیصلے کرنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ایک دفعہ جب ارادہ کر لیا تو پھر کوئی رکاوٹ روک نہیں..... '' شام کی آواز کا بوجھل پن اب کہیں نہیں تھا۔ اس کا لہجہ رواں اور نرم تھا۔ بہت ملائم، گلابوں سا، مہکتا ہوا۔

''میں بہت بڑے دعوے نہیں کرتا..... پھر بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں ہمیشہ آپ سے مخلص رہوں گا۔'' شام نے گمبھیر لہجے میں وضاحت کی تھی۔ فیقہ کے اندر ہلچل سی مچی..... اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ ''میں ہمیشہ آپ سے محبت کروں گا۔'' فیقہ کے اندر ایک اضطراب نے چٹکی بھری۔ کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیاں بج اٹھی تھیں۔ شام کی توجہ لمحہ بھر کے لیے ہٹ سی گئی تھی۔

''اور کبھی اپنی طرف سے آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔'' شام کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ ہلکی سی بہت ہلکی سی مسکان ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

''اور آپ سے بھی یہی توقع رکھوں گا۔ مجھے بھی کبھی کوئی تکلیف نہ دیں۔ کم از کم لفظوں اور رویوں سے۔'' وہ فیقہ کی چوڑیوں کا شور سن رہا تھا۔ جو بار بار گفتگو میں مخل ہوتا۔

''اور ایک آخری بات، آپ کبھی یہ گمان مت کیجیے گا۔ یہ شادی کوئی زبردستی کی شادی ہے۔ میں نے خلوصِ دل کے ساتھ آپ سے رشتہ بنایا ہے۔ یہ سب سے مقدس، قریبی اور پاکیزہ رشتہ ہے۔ میں اسے عمر بھر نبھاؤں گا۔'' اس نے فیقہ کا بے چین چوڑیوں والا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب گفتگو میں چوڑیاں مخل نہیں تھیں۔ فیقہ کے اندر اِک برقی لہر سی اتر گئی۔ دل میں خدشات اب بھی موجود تھے لیکن شام کے رویّے اور نرم گفتگو سے وقتی طور پر معدوم ہو گئے۔ وہ اس کے نرم لہجے کی برکھا رُت میں بھیگ رہی تھی۔ وہ اس کے شفاف لہجے کے اتار چڑھاؤ میں کھو رہی تھی۔

یہ ان لمحات کا ''فسوں'' تھا یا شام کی قربت کا اثر..... فیقہ کے من میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اسے لگا، عمامہ کبھی ان کے درمیان تھی ہی نہیں..... وہ صدیوں سے شام کے ہمراہ تھی۔ اسے قرنوں سے جانتی اور چاہتی تھی۔ وہ شام کی محبت اور قربت میں کھو رہی تھی۔ گم ہو رہی تھی۔ فنا ہو رہی تھی۔

''زندگی کا نیا سفر مبارک ہو فقیہہ!'' شام کی سرگوشی پر فیقہ کے دل سے اِک آخری پھانس بھی نکل گئی تھی۔

☆☆☆

جن کی آنکھیں نہیں، وہ نہ روئیں کبھی
جان جائیں اگر آنکھ والوں کے دکھ

اور راتیں قیامت بھی ہوتی ہیں، عمامہ نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اور راتیں عذاب بھی ہوتی ہیں۔ عمامہ کو پہلے خبر نہیں تھی۔ آگہی اور ادراک کا مزہ بھی کیا مزہ تھا۔ جب خواب لکھنے بیٹھی تو کاغذوں نے چیخ، چیخ کر کہا۔ ''خواب لکھو گی یا عذاب لکھوں گی۔''

کوئی اس کے اندر رات بھر دھمالیں ڈال کر چلاتا رہا۔ روتا رہا، تڑپتا رہا۔ اور آنکھیں رو، رو کر اندھی ہونے لگیں۔ جیسے پھٹ کر ریزہ، ریزہ ہو جائیں گی۔ جن میں روشنی کبھی آئے گی نہیں۔ اتنے دنوں سے لگائے ضبط کے ٹانکے اچانک اُدھڑ گئے تھے پھر سیل رواں ایسا بہا کہ رکا ہی نہیں..... طاہرہ اسے بہلا، بہلا کر تھک گئیں تو خود بھی رونے لگیں۔

عمامہ ایک سوتین ڈگری بخار میں مدہوش تڑپ رہی تھی۔ اور طاہرہ کو سمجھ نہیں آتی تھی۔ صبر کا کون سا گھونٹ اس کے حلق میں اتار دیں؟ کون سا اسم پھونکیں جو عمامہ سارے دکھ، سارے غم، بالی عمر کے سارے روگ ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ وہ ایک ممتا کی ماری ماں تھیں۔ اولاد کے دکھ پر کیسے نہ تڑپتیں۔ اور ابھی جب وہ شام کو فیقہ کے حوالے کر کے اندر آئیں تب عمامہ سبز ریچوں سے دیکھ رہی تھی۔ نیم اندھیروں میں کھڑی بے انتہا روتی ہوئی اتنی وحشت سے کہ طاہرہ کا کلیجا پھٹنے لگا۔

عمامہ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جب طاہرہ اوپر آئیں تو تب عمامہ اُن کے پیروں میں گر پڑی تھی۔ اور اونچی آواز میں بین ڈالے رو رہی تھی۔ طاہرہ نے ایسی پر وحشت، اذیت بھری، غبار آلود آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان کے دل کو دھکا لگا تھا۔

جن کی آنکھیں نہیں، وہ نہ روئیں کبھی
جان جائیں اگر آنکھ والوں کے دکھ

انہوں نے کرلاتی عمامہ کو پیروں سے اٹھانا چاہا تھا۔ لیکن ان کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بکھری عمامہ کو سمیٹ نہیں سکی تھیں۔ وہ عمامہ کے ساتھ ہی رونے لگیں۔

''آپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا اماں.....! آپ نے ایک کوشش بھی نہیں کی۔ آپ کرتیں تو سہی۔'' عمامہ اونچی آواز میں کرلا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ طاہرہ بے دم ہونے لگیں۔ عمامہ کی آواز باہر جا رہی تھی۔ کاریڈور میں کوئی کھٹکا بھی ہوا تھا۔

''میرے لیے کیوں نہیں اماں.....! میں کسی کی بیٹی نہیں تھی؟ میرا کوئی رفیق نہیں تھا۔ مجھ پر کسی کو ترس نہیں آیا؟ مجھ پر کسی کو رحم نہیں آیا۔'' وہ تڑپتی جا رہی تھی۔ باہر پھر کھٹکے کی آواز آئی۔ باہر بھلا کون تھا؟ طاہرہ اٹھ کر دیکھ بھی نہ سکیں۔

''مجھے محبت چاہیے تھی، اعزاز میں نہ سہی، خیرات ہی سہی.....'' عمامہ کے بین طاہرہ کا دل پھاڑ رہے تھے۔

''میں پیچارن سے بھکارن بن گئی ہوں۔'' اس کا کرب بڑا بھیانک تھا۔

''ہے کوئی سخی.....؟ جو سخاوت کرے؟'' وہ چیخ، چیخ کر التجا کر رہی تھی۔ طاہرہ نڈھال ہو گئیں..... ان کی سانسیں الجھنے لگیں۔

''اماں.....! میرے لیے دعا کریں ناں..... میرے مرنے کی دعا کریں.....'' اس نے طاہرہ کے پیروں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ طاہرہ کے دل پر گھونسے سے پڑے۔ وہ تڑپ اٹھی تھیں۔

''یا پھر میرے لیے صبر کی ہی دعا کریں۔'' اس کے ہاتھ کانپتے رہے۔

''ایسا صبر جو مجھے سکون عطا کر سکے۔'' عمامہ کی التجائیں معدوم ہو رہی تھیں۔ طاہرہ نے بکھری بکھری عمامہ کو بے ساختہ سمیٹ لیا۔

''میری جان! میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔'' طاہرہ نے اس کی غبار آلود پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم وعدہ کرو، اب روؤ گی نہیں؟'' انہوں نے اپنی خالی ہتھیلی عمامہ کے سامنے پھیلا دی تھی۔ وہ یک ٹک ان کی ہتھیلی کو دیکھتی رہی۔ وہاں ایک وعدے کا لو دیتا دیا رکھا تھا۔

''تم سب کچھ بھلا دو گی۔'' طاہرہ تڑپ کر بولتی رہیں۔ ''اور کچھ بھی یاد نہیں رکھو گی؟'' ان کا لہجہ بکھرتا رہا۔ ''کبھی شام کی راہوں میں نہیں آؤ گی؟'' وہ اس کے دل پر خنجر چلاتی رہیں۔ عمامہ بے یقینی سے ماں کو دیکھتی رہی۔ ''اس کی منزل کو کھوٹا نہیں کرو گی؟'' طاہرہ نے خالی ہاتھ پھیلائے رکھے۔ ''اس کی زندگی کو مشکل نہیں بناؤ گی۔ اس کے سامنے نہیں آؤ گی۔ مجھ سے وعدہ کرو عمامہ.....!'' انہوں نے مدہوشی ہوتی عمامہ کو جھنجوڑ دیا تھا۔

''مجھ سے وعدہ کرو عمامہ.....!'' طاہرہ چلا رہی تھیں۔ باہر کھٹکے کی آواز معدوم ہو چکی تھی۔ اب کوئی دروازے کی جھری میں سے جھانک رہا تھا۔ وہ کوئی بھلا کون تھا؟ طاہرہ کو پتا نہ چلا..... اور عمامہ کو تو ہوش نہیں تھا۔ جھانکنے والے نے اپنی آنکھوں سے ایک، ایک منظر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور تجسس در آیا۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی اور سنتی رہی تھی۔

''اُف توبہ! ایسی بے شرم اولاد.....'' دیکھنے والے نے دل میں سوچا۔ اور کان لگا لیے۔ ''حد ہے بے حیائی کی۔ اور پاکباز ماں کو دیکھو..... کیسے غم دور کیا جا رہا ہے؟'' وہ جل کر سوچتی رہی۔ ''اب کہاں گئی نصیحتیں..... بیٹی کے معاشقے پر بجائے اسے چار چوٹ کی مار دینے کے دل جوئی میں لگی ہیں۔ ہونہہ.....'' اس کا انداز جلا کٹا تھا۔ ''توبہ توبہ.....'' اندر سے آتی چیخوں پر وہ دہل سی گئی۔ ''ایسا عشق جو سر چڑھ کر بولے۔'' اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ اور گال پیٹ لیے۔ ''کیسے مر رہی ہے؟ ایسی منہ زور خواہشوں سے اللہ بچائے۔'' رافعہ نے تنفر سے سر جھٹکا اور بیٹی کا فیڈر بنانے چل دی تھی۔ صبح طاہبہ کو مرچ مسالا لگا کر پوری اسٹوری بھی سنانی تھی۔ ابھی نیند پوری کرے گی تو جلدی اٹھ کر سنائے گی۔ وہ سوچتی ہوئی زینہ اتر گئی۔ چہرے کے تاثرات بڑے پُرلطف قسم کے تھے۔ ''اف، عمامہ بیچاری، کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اور کچھ ہو گا بھی نہیں.....''

☆☆☆

دو گھڑی کے لیے پاس بیٹھو ذرا
بھول جائیں گے ہم کتنے سالوں کے دکھ

وقت مرہم بناریت کی طرح پھسلنے لگا۔ پھر موسم بدلنے لگا، خزاں جانے لگی، بہار آنے لگی، پتے آتے رہے۔ پھول کھلتے رہے، سے گزرتے رہے۔ بہار جاتی رہی۔ خزاں آتی رہی۔ پتے گرتے رہے، درخت سوکھتے رہے، پھول جھڑتے رہے۔ اور وقت کے کشکول میں دن، ہفتے اور مہینے گرنے لگے تھے۔

یہ طاہرہ کی دعا کا اثر تھا یا عہد کا پاس..... عمامہ کی آنکھوں میں آنسو جم ضرور گئے تھے لیکن طاہرہ کے سامنے گرے نہیں..... وہ مہر بہ لب ہو چکی تھی۔ بولتی تھی، نہ ہنستی تھی، نہ روتی تھی۔ اس کی خاموشی طاہرہ کے اندر سناٹے اتار دیتی تھی۔ شادی کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔ زندگی اپنے معمول پر تھی۔ کئی مہینے گزر چکے تھے۔

طاہر اور بسمہ تیسری مرتبہ ناردرن ایریاز گھومنے کے لیے جا چکے تھے۔ ان کے قدم گھر میں کم ہی ٹکتے۔ سونیا گھر میں بور ہوتی تو عمامہ کے پاس آجاتی۔ فیقہ کے ساتھ سونیا کے تعلقات پہلے کی طرح نہیں تھے۔ کہاں وہ فیقہ کا ذہنی اور ظاہری علاج کرنے کے لیے دنیا بھلائے کہاں، کہاں کی خاک چھانتی تھی۔ اور کہاں اب اسے کوئی فیقہ یاد بھی نہیں تھی۔ اس کے ایڈونچرز بس چار دن کے ہوا کرتے تھے۔ کہاں وہ فیقہ کے لیے جو کر بنی، کرتب دکھاتی رہی، لاسبریاں چھانتی، پارلرز کے چکر کاٹتی، ڈاکٹرز سے سیشن کرتی۔ اور کہاں اب اس نے کبھی بھول کر بھی عمامہ کے سامنے فیقہ کا نام نہیں لیا تھا۔ جیسے اسے کوئی فیقہ یاد ہی نہیں تھی۔ بہر حال اس کے ایڈونچر نے فیقہ کی زندگی سنوار دی تھی۔ عمامہ نے تو دیکھا نہیں۔ طاہ اور رافعہ سے پتا چلتا تھا۔ فیقہ کے رنگ وروپ پر کمال آیا ہوا تھا۔ وہ اسٹائلش لباس پہنتی، زیورات سے سجتی اور گلابوں میں مہکتی تھی۔ اس پر بہار کے موسم تھے، شام کی سنگت نے اس کے سارے بے رنگ رنگ اتار دیے تھے۔

جب کبھی وہ اس طرف آتی تو بالخصوص عمامہ سے ملنے اوپر آتی۔ شروع میں تو نہیں البتہ بعد میں وہ عمامہ سے خاص طور پر ملتی تھی۔ شاید اپنی خوشحال زندگی عمامہ کو دکھانا چاہتی تھی۔ شام کو بینک میں بہت اعلیٰ جاب مل گئی تھی۔ وہ فیکٹری سے الگ ہو گیا تھا۔ اور شاید بہت مصروف بھی۔ صبح منہ اندھیرے جاتا اور رات کو بہت دیر سے واپس لوٹتا تھا۔

طاہر بھائی سے ہی پتا چلا تھا کہ شام نے کوئی سائڈ بزنس بھی شروع کر لیا تھا۔ اس کی مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ مہینوں دکھائی نہیں دیتا تاہم طاہ ضرور بتاتی رہتی تھی کہ اسے ہزار مصروفیت میں بھی فیقہ کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ بہت پیار کرتا تھا۔ بہت احساس کرتا تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں تھا۔ عمامہ جانتی تھی۔ وہ خود سے منسوب ہر رشتے کے لیے بہت حساس تھا۔ پھر فیقہ تو اس کی بیوی تھی۔ اس کا بہت قریبی اور اہم رشتہ..... وہ اس کا خیال کیوں نہ رکھتا؟

عمامہ کو طاہ اور رافعہ کے ایسے تبصرے سن کر کوئی جلن محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ذرا حسد محسوس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن شاید طاہ کو لگتا تھا عمامہ، فیقہ سے جلتی ہے۔ اس لیے وہ آئے دن کوئی نہ کوئی قصہ اٹھالاتی۔ کبھی بتاتی، شام فیقہ کو گھمانے لے گیا۔ کبھی بتاتی وہ شاپنگ کرنے گئے ہیں، کبھی ہوٹلنگ اور کبھی آؤٹنگ..... طاہ کے نزدیک ''مزے'' تو سارے فیقہ کے تھے۔ ان کی لائف تو بہت بور تھی۔

پھر آج کل تو فیقہ کے دن ہی اور تھے..... دادی کے قدم نہ زمین پر ٹکتے، وہ فیقہ سے زیادہ ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ اور اسے یہاں زبردستی لے آئی تھیں گو کہ فیقہ آنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بار، بار دبی آواز میں کہتی۔

''شام کو پریشانی ہوگی۔''

''پریشانی کیسی؟ وہ پہلے بھی تو یہاں سے کھانا کھاتا تھا۔ اب بھی یہیں سے کھائے گا۔'' دادی نے مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔ فیقہ چپ کر گئی تھی۔ تاہم وہ کچھ بے چین ضرور ہو گئی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ شام کھانا کھانے کے لیے بھی یہاں آئے۔ کیونکہ شادی کے بعد وہ اس طرف بھول کر بھی نہیں آیا تھا۔ یا پھر وہ نہیں چاہتی تھی کہ شام کا عمامہ سے سامنا ہو۔

جب نو کے قریب وقت ہوا تو گھر کے مرد اپنے، اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گھر چلے آئے۔ ان کے آنے کا کوئی ایک وقت مقرر نہیں تھا۔ اس لیے کھانا اکٹھے نہیں کھاتے تھے۔

کچھ دیر بعد شام بھی آ گیا۔ وہ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے اپنے پورشن کی طرف چلا گیا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ پھر فائلیں نکال کر بیٹھ گیا۔ اسے خبر تھی فیقہ نہیں ہے۔ سو چائے اور کھانے کا سوال نہیں تھا۔ وہ کام میں لگ گیا تھا۔ پھر کافی دیر گزر گئی۔ وہ گھڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس طرف جانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ بھوک سے سر میں الگ درد تھا۔ آنکھیں بھی سرخ تھیں۔ کام کے دباؤ سے وہ تھک رہا تھا۔

''سرکار! کھانا تناول فرمالیں، آپ کی زوجہ محترمہ کا حکم نامہ ہے۔ تشریف لے آئیں۔'' کچھ دیر بعد طاہر نے اس

کے کمرے میں جھانکا تھا۔ اور اونچی آواز میں بولا۔

''تم ٹرے اٹھا کر یہیں لے آتے۔'' شام بیزاری اور سستی سے بولا۔

''میں تمہاری ''زوجہ'' نہیں ہوں.....'' طاہر نے جتا کر کہا۔

''صد شکر کہ تم نے مجھے بتا دیا ہے۔'' شام کو اٹھنا ہی پڑا..... اب تو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ سب لوگ سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکے ہوں گے۔ اس گھر میں سبھی کو رات جاگنے کی عادت نہیں تھی۔

''تم آج گھر میں کیسے دکھائی دے رہے ہو؟'' شام نے اس کے برابر چلتے ہوئے بات برائے بات پوچھا تھا۔ ''تمہارا تو ابھی ہنی مون پیریڈ چل رہا ہے۔''

''اور ابھی اگلے دس سال تک چلے گا۔'' طاہر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''دس سال تو کم ہیں یار.....'' شام نے حیرت سے کہا۔

''کیا واقعی.....؟'' طاہر نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔ شام نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔ طاہر ڈھیٹوں کی طرح ہنسنے لگا۔

''یہ بتاؤ، تمہارا ہماری ''بیویوں'' سے پردہ ہے؟'' طاہر نے کچھ دیر بعد معنی خیزی سے پوچھا۔

''مطلب.....؟'' وہ چونکا۔

''آج پوروں پر حساب لگاؤ..... کتنے مہینے ہو چکے ہیں، تم گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو۔ اس طرف آتے کیوں نہیں.....'' اس نے خاصے طنزیہ انداز میں جتایا تھا۔ شام چپ سا کر گیا۔ کم از کم اس بات کا شام کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ طاہر کو کیا بتاتا.....؟ شام کیوں نہیں آتا؟ وہ عمامہ کے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور اب بھی خواہش کر رہا تھا کہ عمامہ سے سامنا نہ ہو۔

وہ اندر داخل ہوا تو لاؤنج خالی تھا۔ بچے اور بھابیاں اپنے کمروں میں غروب تھیں۔ طاہرہ آپا بھی نہیں تھیں۔ خالہ اور فیقہ موجود تھیں۔ بسمہ کچن سے کھانے کی ٹرے لے آئی۔ اور اس کے پیچھے ایک گلابی آنچل لہرایا تھا۔ محض لمحہ بھر کے لیے..... ابھرا اور معدوم ہو گیا تھا۔ شام کے دل کی دھڑکنیں تھم گئی تھیں۔ وہ عمامہ تھی۔ جو سامنے آتے، آتے پلٹ گئی تھی۔ کچن کے دوسرے دروازے سے گیلری میں گئی اور باہر نکل گئی۔

شام نے گہری سانس بھر کر نگاہیں موڑ لی تھیں۔ فیقہ کے سر سے جیسے تلوار اتر گئی تھی۔ وہ اٹھی اور چائے بنانے چل دی۔ کچھ دیر بعد طاہرہ بھی آ گئی تھیں۔ معاً تقی بھی اندر آ گیا۔ اس کے انداز میں عجلت سی تھی۔ وہ ماں سے مخاطب تھا۔

''اماں! عمامہ کالج نہیں جا رہی؟'' وہ کافی خفگی سے پوچھ رہا تھا۔ طاہر بھی چونک گیا اور غیر محسوس انداز میں شام بھی چونک گیا تھا۔ وہ کھانا کھاتے، کھاتے رک گیا۔

''کس کے ساتھ جائے؟'' طاہرہ نے بے ساختہ تقی کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولیں۔ ان کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔ شام نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ برہمی سے تقی کو دیکھ رہی تھیں۔ شام کو لگا جیسے وہ اسے بھی دیکھ رہی ہیں۔ شام، عمامہ کو کالج لے کر جاتا اور آتا تھا۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ ہر ڈیوٹی سے آزاد تھا۔ اس ڈیوٹی کو دوبارہ کوئی نباہنے بھی نہ دیتا۔ اور عمامہ اتنے مہینوں سے کالج نہیں جا رہی تھی۔ اتنے مہینوں سے؟ وہ جیسے شاکڈ رہ گیا تھا۔

''تم بھائیوں کے پاس فرصت ہے عمامہ کے لیے؟ تمہارے اپنے کام ختم نہیں ہوتے۔ ڈرائیور کے ساتھ تمہارے بابا نہیں مانتے۔ ویگن کوئی لگوانے کے حق میں نہیں..... عمامہ اڑ کر تو جا نہیں سکتی۔'' انہوں نے کتنے دنوں کا غبار اچانک نکال دیا تھا۔ شام کے ہاتھ سے نوالہ بے جان ہو کر پھسل گیا۔ اس کی بھوک اچانک مٹ گئی تھی۔

''اور امتحان قریب ہیں..... اس کا اتنا حرج ہو چکا۔'' تقی نے مارے تفکر کے خفگی سے کہا۔ ''آپ اسے کل سے تیار کریں..... میں خود اسے ڈراپ کروں گا۔'' اس نے آناً فاناً فیصلہ کر لیا۔ طاہرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تو خود چاہتی تھیں عمامہ کی پڑھائی دوبارہ شروع ہو اور وہ مصروف ہو جائے۔ اس کی خاموشی سے انہیں ہول اٹھتے تھے۔ اب تقی نے

ذمّے داری اٹھائی تو طاہرہ مطمئن ہوگئی تھیں۔ تقی اب طاہر سے مخاطب تھا...... بلکہ اس کی کلاس لے رہا تھا۔

''اور تم کب تک نئے نویلے دولہا بنے رہو گے۔ کسی کام دھام کو ہاتھ لگالو...... یا اگلے سال تک ہنی مون مناتے رہنا ہے۔'' تقی نے بھی بالکل شام والی بے عزتی سے نوازا تھا۔ وہ بسمہ کے سامنے اپنی عزت افزائی پر منہ بنا کر رہ گیا۔

''عمامہ کو کالج سے چھٹی کے وقت تم اٹھاؤ گے...... دونوں کانوں سے سن لو......'' تقی نے برہمی سے حکم دیا۔ طاہر اچھل پڑا تھا۔

''میں کیسے......؟'' طاہر نے حواس باختہ ہو کر کہا۔ ''میرا روٹ ہی نہیں بنتا...... اس شام کو کہو ناں...... اس کا بینک بھی کامرس کالج کے قریب ہے۔ دو بجے یہ آف بھی لیتا ہے۔ عمامہ کو چھٹی کے وقت گھر ڈراپ کر سکتا ہے۔ کیونکہ تین بجے اسے دوبارہ جانا ہوتا ہے۔ شام کے ساتھ ٹائمنگ سیٹ کرو......'' طاہر کے مشورے پر دادی نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔ چائے لاتی فیتہ کے ماتھے پر بھی سلوٹ نمودار ہوئی۔ طاہرہ بھی جیسے جز بز ہوگئی تھیں۔ شام کچھ بے چین ہوا اور تقی گہری سوچ میں گم ہوا تھا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''شام دو بجے آف ضرور لیتا ہے لیکن گھر نہیں آتا...... اور تم تو کام چور ہی رہنا...... میں خود کچھ کرلوں گا۔'' تقی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ پھر سب کی جیسے جان میں جان آئی۔ دادی کے سر سے بلا ٹلی تھی۔ فیتہ نے بھی سکون کی سانس لی تھی۔ شام کی بے چینی بھی کم ہوئی۔ طاہرہ بھی پُرسکون ہوگئیں۔ کیونکہ اگر تقی کہہ دیتا تو شام کے لیے انکار کرنا مشکل ہو جاتا اور پھر دادی اور فیتہ بھی روک نہیں سکتیں۔ اور طاہرہ نہیں چاہتی تھیں شام اور عمامہ کا سامنا ہو۔

☆☆☆

میری سوچوں کے جلتے ہوئے دشت سے
چھین لے آ کے اپنے خیالوں کے دکھ

گرما کے بہت اداس اور طویل دن کی شروعات ہو چکی تھی۔ وہ تھنی دھوپ کی تپش سے بے نیاز اب بھی برآمدے کے قدمچے پر بیٹھ جاتی تھی۔ منال اسے دیکھتے ہی بھاگ آتے۔ اس کے پیروں سے لپٹتے اٹکھیلیاں کرتے، غنغناتے، وہ ان کے لاجوردی کنٹھوں کو چھوتی، چھیڑتی اور پہنچتی، منال خوشی سے چک پھیریاں کھاتے تھے۔ زندگی ایک نئے ڈھب پر چل پڑی تھی۔ بالآخر زندگی کی شروعات ہوگئی تھی۔

وہ صبح سویرے تقی بھائی کے ساتھ تیار ہو کر نکل جاتی...... دوپہر کو گھر آتی...... پھر امتحان نزدیک آئے تو عمامہ نے ٹیوشن رکھ لی تھی۔ پہلے شام ٹیوشن دیتا تھا۔ اب کوئی پڑھانے والا نہیں تھا۔ سونیا نے ہی اس کی ٹیوشن کا بندوبست کیا تھا۔ پھر ایک آدھ سبجیکٹ تو بسمہ بھی پڑھا دیتی تھی۔

ان دنوں ہی بسمہ، عمامہ کے بہت قریب آگئی تھی۔ وہ سونیا کا پرتو تھی۔ اسی کی طرح معصوم، پُرخلوص اور شوخ، عمامہ کو لگتا اگر بسمہ نہ ہوتی تو اس کی زندگی جمود کا شکار ہو جاتی۔ اسے زنگ لگ جاتا۔ اور وہ اندر ہی اندر گھل، گھل کر ختم ہو جاتی۔

بسمہ اور عمامہ کی دوستی پر طابہ کو خاصا اعتراض تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ طابہ، عمامہ کو خوش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس دن بسمہ، طاہر کے لیے چاکلیٹ کیک بنا رہی تھی۔ عمامہ اس کے ساتھ کچن میں کھڑی تھی۔ بلکہ بسمہ اسے کمرے سے گھسیٹ کر باہر لائی تھی۔ اور اب بسمہ اسے بہت پرانے قصے سنا رہی تھی۔ اپنی اور طاہر کی ملاقات سے لے کر سونیا کی ابرار سے انڈر اسٹینڈنگ تک...... وہ لبرل فیملی سے تھیں۔ سو یہ باتیں ان کے ہاں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔

☆☆☆

وہ چھٹی کے وقت کالج سے باہر شیڈ تلے کھڑی تھیں۔ آگے درختوں کی طویل قطار تھی۔ شیڈ تلے شدید گرمی تھی۔ عمامہ کو تقی بھائی کا انتظار تھا۔ اور سونیا تب تک تو وہاں رہتی جب تک تقی بھائی نہ پہنچتے...... وہ عمامہ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتی تھی۔ قریب ایک گھنٹے سے وہ دونوں انتظار میں تھیں۔ ابھی تک تقی بھائی کے آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ سونیا کی کار خراب تھی۔ وہ آج وین سے آئی تھی اور واپس بھی اس پر جاتی۔ عمامہ کو وین پر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے تقی بھائی کا انتظار کرنا تھا۔

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چونگی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63، فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کورنگی روڈ، کراچی۔ فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

''تقی بھائی نہ جانے کہاں رہ گئے۔ حد ہے یار! ہم تو گرمی میں فرائی ہو جائیں گے۔ مجھے تو دھوپ سے الرجی ہو جاتی ہے۔'' سونیا نے گرمی کی شدت سے عاجز آ کر کہا۔ سونیا کی نزاکت کا کوئی انت نہیں تھا۔ عمامہ بے بسی سے دور، دور تک دیکھتی رہی۔ تقی بھائی کی گاڑی آتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔'' عمامہ نے تفکر سے کہا۔

''انتظار ہی تو کر رہے ہیں۔'' سونیا کسل کر بولی۔ اس کی برداشت اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔

''میرے ساتھ وین پر چلو......'' کافی دیر بعد اس نے عمامہ کو ایک حل پیش کیا تھا۔ عمامہ جیسے اچھل پڑی۔

''مرواؤ گی کیا؟ دادی چھوڑیں گی نہیں......'' وہ سہم سی گئی تھی۔ سونیا نے اسے گھور کر دیکھا۔

''تو پھر تمہیں بینک چھوڑ آؤں......؟ وہاں شام ہوگا...... تمہیں گھر ڈراپ کر دے گا؟''

''نن...... نہیں......'' عمامہ بے ساختہ چیخی تھی۔ ''مجھے شام کے ساتھ نہیں جانا......'' وہ اتنی ہراساں ہوئی کہ حد نہیں...... سونیا نے اسے پھر سے گھور کر دیکھا تھا۔

''اب تو پرابلم نہیں...... تمہاری دادی اور پھوپو کو...... ہونی بھی نہیں چاہیے۔ وہ شادی شدہ ہو چکا ہے۔ اعتراض کی کوئی تک نہیں بنتی......'' اس نے کلس کر ناک چڑھائی تھی۔ عمامہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ بھلا سونیا کو کیا بتاتی......؟ یہ جرم ایسا معمولی نہیں تھا۔ جو معاف کر دیا جاتا۔ دادی اور فیقہ نے اسے کچا چبا دینا تھا۔ اب وہ خود ہی بہت محتاط رہتی تھی۔ کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کو مزید تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''بڑی شکی مزاج عورتیں ہیں، حد ہے...... جب شادی ہو گئی، اب کیا فکر ہے انہیں؟ شام کہیں نہیں جاتا...... فیقہ کو اتنا سمجھ لینا چاہیے......'' سونیا نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ عمامہ لب کاٹتی رہ گئی۔

''تمہیں نہیں پتا سونیا! فیقہ شک نہ بھی کرے...... ارد گرد ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو رائی کا پہاڑ بنا کر فیقہ کو دکھاتے ہیں۔ اور فیقہ اپنی آنکھ سے نہیں...... دوسروں کی آنکھ سے دیکھتی ہے۔'' اس نے اذیت بھرے انداز میں بتایا۔ اچانک طابہ کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ دل میں بڑے گہرے گھاؤ پڑے تھے جو بھولتے نہیں تھے۔

''دیکھ لینا...... پچھتائے گی۔'' سونیا نے تبصرہ کیا پھر اچانک چونک پڑی۔ سامنے جانی پہچانی کار آتی دکھائی دی تھی۔ سونیا نے عمامہ کو بے ساختہ ٹہوکا دیا تھا۔

''اُدھر دیکھو شام......'' سونیا جیسے اچھل پڑی تھی۔ گاڑی سے شام اتر کر قریب آتا دکھائی دیا تھا۔ عمامہ تک فریز ہو گئی تھی۔ اسے اپنی بینائی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ شام کیسے ہو سکتا تھا؟ معاً وہ قریب آ گیا۔ سونیا اخلاقاً سلام دعا کرنے لگی۔ وہ عمامہ کو بغیر دیکھے سونیا سے مخاطب تھا۔

''تقی نہیں آ سکا...... فیکٹری میں کچھ ورکرز کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ مجھے بینک میں کال کی، میں عمامہ کو لینے آیا ہوں...... آؤ، تمہیں بھی ڈراپ کر دوں......''

''نیکی اور پوچھ پوچھ......'' سونیا نے عجلت میں کہا اور عمامہ کا بازو کھینچتی گاڑی میں گھس گئی تھی۔ عمامہ اس افتاد پر بھونچکی رہ گئی تھی۔ چاہے جو بھی ہو جاتا۔ وہ شام کے ساتھ کبھی نہ گھر جاتی...... لیکن وہ خود سے نہیں آیا تھا۔ اسے تقی بھائی نے بھیجا تھا۔ سو عمامہ کو چپ ہونا پڑا۔ پھر بھی وہ اندر سے ڈر رہی تھی۔ نہ جانے گھر میں کیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا؟ وہ سارے رستے خوفزدہ رہی تھی۔ دل میں وسوسے پنپتے رہے۔ فیقہ، شام کے ساتھ اسے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ گھر میں ہونے والی بدمزگی اور تماشے سے سخت خوفزدہ ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کی چھٹی حس کچھ بہتر اشارہ نہیں دے رہی تھی۔

سونیا کے گیٹ پر گاڑی رکی تو عمامہ چونک گئی...... اسے پتا نہیں چلا تھا کہ کب سونیا انہیں اندر آنے پر مجبور کر کے چلی گئی تھی۔ گاڑی نے ٹرن لیا تو عمامہ ٹھٹکی...... اتنے ڈھیر سے مہینوں بعد وہ اس کے روبرو تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے اتنا قریب تھا۔ عمامہ کی جیسے جان پر بن آئی تھی۔ عمامہ کی پاگل ہوتی دھڑکنوں میں تلاطم آ گیا۔ کنپٹیوں میں

گرم خون جوش مارنے لگا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔ وہ نگاہ، چرا چرا کر نڈھال ہوگئی تھی۔ اور وہ بے نیاز بن، بن برسی تھک نہیں رہا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی۔ وہ مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ اور عمامہ نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اس کی راہوں میں نہیں آئے گی۔ سو دونوں اپنے، اپنے ''حلف'' پر برقرار تھے۔ اور کسی اجنبی مسافر کی طرح محوِ سفر تھے۔ ایک گھر میں ایک ہی جگہ پر رہتے ہوئے یہ کیسے ناممکن تھا کہ دونوں کا ''ٹکراؤ'' نہ ہوتا۔ لیکن یہ ضرور ممکن تھا کہ دونوں ''شناسائی'' کے سارے پچھلے حوالے بھلا دیتے اور اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے۔

گاڑی میں بہت بوجھل خاموشی تھی۔ جسے نہ شام نے توڑنے کی کوشش کا سوچا تھا نہ عمامہ نے کوئی تردد کیا۔ وہ دونوں ہی اپنے، اپنے فیصلے پر ''کاربند'' تھے۔

دل میں دونوں طرف تلاطم خیز سوالوں اور باتوں کا شور تھا۔ اور وہ دونوں ہی سماعتوں کو بہرہ کیے اپنی، اپنی ذات کے ''قید خانے'' میں گم تھے۔ اس کی سوچوں میں عمامہ حی اور عمامہ کے خیالوں میں وہ مجسم تھا۔

وہ لب بھینچے ڈرائیونگ کرتا عمامہ کو سوچ رہا تھا۔ وہ عمامہ جو دو ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔ وہ عمامہ جو اجنبی سی تھی۔ وہ عمامہ جو کھلے بالوں میں گلاب اٹکا کر باغیچے میں منال کے پیچھے بھاگتی تھی۔ جب بالوں سے گلاب پھسل کر گر پڑتا تو رونے لگتی۔ پھر اٹھا کر بالوں میں اٹکاتی۔ گلاب پھر گر پڑتا..... تب اس میں اتنا شعور نہیں تھا۔ وہ بالوں کو باندھ کر گلاب نہیں اٹکاتی تھی۔ اسی لیے وہ پھسل جاتا۔ شام چپکے سے اٹھتا اور اندر سے طاہرہ آپا کی پنوں کا ڈھیر اٹھا لاتا۔ روتی ہوئی عمامہ کے بالوں میں لگاتا، تازہ گلاب اٹکاتا اور پھر وہ گلاب بالوں میں لگا، لگا..... سوکھ کر جھڑ جاتا مگر گرتا نہیں..... عمامہ اسے سوکھنے سے پہلے اتارتی بھی نہیں تھی۔ وہ سوکھے گلاب کی پتیوں کو کسی متاع کی طرح سنبھال لیتی۔

''یہ کس طرح سے جی رہی ہے.....؟'' شام سوچ رہا تھا۔ ''اسے صبر آیا تو کیسے آیا.....؟ ضبط سے گزری تو کیسے گزری..... جدائی کا غم سہا تو کیسے سہا.....؟ کیا اپنی تپسیا سے؟ یا ماں کی دعاؤں کا اثر تھا؟''

اور اسے یقین تھا کہ اگر جو عمامہ آج بڑے ضبط کے مراحل سے گزر رہی تھی تو صرف اور صرف اپنی ماں کی لمبی، لمبی تہجد میں مانگی دعاؤں کی بدولت..... ورنہ عمامہ ایسی مضبوط نہیں تھی جو آج وہ نظر آ رہی تھی۔

اس نے شام کو دیکھا نہیں..... نہ نگاہوں کو گستاخ ہونے دیا۔ شام نے بھی اس پر ایک نگاہ نہیں ڈالی۔ نہ آنکھوں کو دیکھنے کا ''گناہ'' کرنے دیا..... لیکن دونوں ہی اپنی، اپنی سوچوں سے ایک دوسرے کے خیالوں کا عکس اکھاڑ نہیں سکتے تھے۔

میری سوچوں کے جلتے ہوئے دشت سے
چھین لے آ کے اپنے خیالوں کے دکھ

معاً گاڑی گھر کے گیٹ پر رکی تھی۔ عمامہ چونک کر کتابیں سنبھال کر باہر نکل آئی۔ اور اسی طرح سر جھکائے، کتابیں اٹھائے بغیر پیچھے دیکھے اندر چلی آئی تھی۔

شام نے بھی لمحہ بھر کی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دھول اڑاتا چلا گیا۔ پیچھے غبار راہ کھڑی تھی۔ بڑی حیرانی سے دیکھتی..... بڑی افسردگی سے سوچتی ہوئی۔ اور بڑے درد سے کراہتی ہوئی۔

عمامہ پتھریلی روش پر چلتی رہی۔ سر جھکائے، خود میں مگن، گم، حیران، افسردہ، غمزدہ..... معاً کوئی بالکونی سے ہٹا تھا اور تیزی سے نیچے چلا آیا..... پھر تخت پر موجود دادی کے کانوں میں کوئی صور پھونکا گیا تھا۔ بس لمحوں کا کھیل تھا اور افسانہ کچھ سے کچھ بن گیا۔

دادی ننگے پاؤں باہر کی طرف بھاگیں۔ ان کا چہرہ ''جلال'' سے تپ رہا تھا۔ ان کا چہرہ غیظ سے ''دہک'' رہا تھا۔ ان کا چہرہ آگ سے زیادہ سرخ تھا اور سورج سے زیادہ پُرتپش تھا۔

سر جھکائے روش پر چلتی مگن سی عمامہ کو پتا نہیں چلا..... وہ اپنے دھیان میں گم تھی۔ جب دادی چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ پھر انہوں نے لہرا کر عمامہ کے گال پر تھپڑ مارا تھا۔ عمامہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے ساری کتابیں ایک ساتھ گر پڑی تھیں۔

(جاری ہے)

عورت اور وہم

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار **فرحین اظفر** نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

وہم کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں لیکن وہم پھر بھی ایک حقیقت ہے۔ یہ وہ بیماری ہے کہ جس کو چمٹ جائے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی جینا حرام کرتے ہیں۔ اس نے پہلے کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی اس کا پالا کسی وہمی سے پڑا ہی نہیں تھا۔

یہ تو شادی کے بعد جب اس نے اپنی ساس کو دیکھا، جانا تو اسے اندازہ ہوا کہ ایک ذرا سی چیز..... محض وہم کی بنیاد پر کیسا تماشا بنتی ہے۔

شکر تھا کہ یہ وہم کی بیماری جو بڑھ کے واقعی ایک نفسیاتی بیماری میں بدل چکی تھی، گھر میں صرف اس کی ساس کو ہی لاحق تھی۔ کوئی اور گھر میں اس کا شکار نہ تھا۔ بلکہ کئی بار دبے لفظوں میں اس کی جیٹھانی ان کی عادت سے بیزاری کا اظہار بھی کر دیتی تھیں۔

گھر میں کسی بھی قسم کی چھپکلی کا مارنا منع تھا۔ چاہے وہ روز آ کے درشن کرواتی رہے۔ اسے بھگانا ہے، تین بار کا وظیفہ پڑھ کے لیکن مارنا نہیں ہے۔ اوپر سے وہ ڈرپوک بھی انتہا کی تھیں۔ چھپکلی، کاکروچ، اندھیرا، تنہائی یا باہر کے حالات..... ہر چیز سے ان کا خوف عروج پر ہوتا تھا۔

ہر ایک دن چھوڑ کے نظر اتارا کرتیں۔ اپنی بھی اور بچوں کی بھی..... کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو کتنا بھی ضروری کام ہو آگے نہیں جاتیں، واپس پلٹ آتی تھیں..... اور بس..... ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔

اکلوتی بیٹی کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ ان کو لڑکے کا گھر بار دیکھنے جانا تھا۔ ٹائم، دن سب فکس ہو گیا۔ صبح صبح کسی فقیرنی نے دروازہ بجایا۔

یوں تو گھر میں سب ہی صبح جلدی جاگتے تھے لیکن چھٹی کا دن تھا اور وہ اس طرح کے خاص دن پر دروازے پر آنے جانے والوں کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ صدقے کے لیے جو الگ سے پیسے نکال کے رکھے تھے وہ جگہ پر نہ ملے۔

''ہائے.....'' ان کا دل رک سا گیا۔

''بی بی جی.....'' باہر سے فقیرنی نے ایک لمبی صدا لگائی اور ان کا دل ڈوب، ڈوب گیا۔

بھاگم بھاگ جا کے اخبار کے مطالعے میں گم شوہر کو جھنجوڑ ڈالا۔

''ارے سنتے ہیں۔ غضب ہو گیا۔'' انداز ایسا تھا

کہ اگر کوئی شخص ان کی طبیعت سے واقف نہ ہوتا تو واقعی گھبرا جاتا۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے اطمینان سے اخبار سے منہ اٹھایا۔

''وہ جو نمل کے رشتے کے لیے صدقے کے پیسے ہٹا کے رکھے تھے ناں۔ وہ غائب ہو گئے ہیں۔''

''ارے وہیں کہیں ہوں گے۔ کہاں جائیں گے.....'' انہوں نے..... بے پروائی دکھانی چاہی لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔

''کہاں جائیں گے سب کو پتا ہے میں ریڈ والے بٹوے میں رکھتی ہوں۔ اس میں سے کوئی پیسے نہیں نکالتا بھئی۔''

''بی بی جی..... ی..... کہاں چلی گئی ہو۔''

باہر سے ایک بار پھر سُر نکلے۔ وہ رونکھی ہو گئیں۔

''مانگنے والی دروازے پر کھڑی ہے۔ میں دینا بھی چاہتی ہوں۔ لیکن پیسے غائب ہیں..... یا اللہ..... میری بیٹی کے رشتے کی خیر ہو۔''

وہ جس انداز میں خوفزدہ ہو کے بولیں۔ اشفاق صاحب بھنّا ہی گئے۔

''لاحول ولا.....''

بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ جا کے مانگنے والی کو فارغ کیا۔ واپس آئے تو وہ چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھیں۔

''اوہو..... کیا ہو گیا مل جائیں گے پیسے.....''

وہ سخت عاجز تھے ان کے اس رونے سے.....

''مل بھی گئے تو کیا فائدہ۔ بدشگونی تو ہو گئی ناں..... اور ابھی کیوں نہیں ملے۔ جب میں نے ایک جگہ بنائی ہوئی ہے تو وہاں سے کہاں جا سکتے ہیں۔''

چھٹی کا دن تھا۔ ابھی سورج چڑھنا شروع ہی ہوا

تھا کہ یہ بات ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے سب کو جگا دیا۔ جن کو سونے کا ایک ہی دن ملتا تھا۔ وہ بھی اٹھ بیٹھے۔ صرف چھوٹا دیور اپنی ڈھٹائی کی وجہ سے کمرا بند کیے پڑا تھا۔

جب تک ناشتا تیار ہوا۔ اچھا خاصا ہنگامہ گرم رہا۔ ایک، ایک بندے سے الگ الگ پوچھا گیا کہ کیا کسی نے لال والے بٹوے میں سے پیسے نکالے ہیں۔

جوں جوں سب کا جواب نفی میں آتا گیا۔ زلیخا کی حالت غیر ہوتی گئی۔

بمشکل ان کو ناشتا کروایا گیا۔ وہ تو ایک لقمہ بھی منہ میں رکھنے کو تیار نہیں تھیں اور بڑی بھابی کئی بار منہ بھر، بھر کے اس فقیرنی کو برا بھلا کہہ چکی تھیں۔ جس نے اچھا خاصا دن خراب کروادیا تھا۔

ناشتے کے برتن سمیٹنے تک ان کا بی پی لو ہوگیا۔

انہوں نے خود اٹھ کے کئی بار بٹوا جھاڑا، دوسری جگہیں اور دراز الٹ پلٹ کر دی لیکن پیسے ہوتے تو ملتے ناں.....

دوپہر بارہ بجے، گھر کا سب سے کم عمر اور لاابالی فرد آنکھیں ملتا ہوا کچن میں آیا۔ تو سب گھر والوں کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔

کہیں الجھن، کہیں بیزاری اور کہیں فکرمندی.....

بھابی نے ناشتے کی ٹرے اس کے آگے تقریباً پٹخی ہی تھی۔

''خیر تو ہے بھابی کیا ہوگیا؟''

''ہونا کیا ہے۔ یہاں روز ایک سے ایک عجیب مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔'' ان کے لہجے کی تلخی نے خاموش ہونے پر مجبور کردیا۔

یوں بھی گھر کا ماحول بڑا اچھا تھا۔ بڑے چھوٹوں سے محبت کرتے۔ چھوٹے ادب لحاظ اور تمیز کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ گھر کے کاموں میں خواتین کے درمیان کوئی کل کل، چل چخ، چخ نہیں ہوتی۔

جو بھی کام تھے مل جل کر نمٹا لیے جاتے۔ معاشی طور پر کچھ آرام تھا۔ اس لیے بھی کوئی چیز مسئلہ نہیں بنتی تھی۔

سسر کی پینشن آتی تھی۔ تو اضافی خرچہ وہ سہار لیتے تھے۔

زلیخا محبت سے میل جول رکھنے والی ساس تھیں۔ بہوؤں پر پابندیاں لگاتی تھیں نہ ان کو کڑوی کسیلی سناتی تھیں۔ مجموعی طور پر ایک دوستانہ فضا تھی جو پورے گھر کے ماحول میں رچی بسی تھی۔

لے دے کے اگر کوئی مشکل تھی تو بس یہی زلیخا کا حد سے زیادہ وہمی ہونا..... یہی بات خود ان کو اور بہوؤں کو مشکل میں ڈالتی تھی۔ اور یہی عادت تھی جس سے کم زیادہ سب ہی چڑتے تھے۔

وہ کچھ غیر معمولی صورتِ حال محسوس کر کے چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔

خیال تھا کہ چونکہ آج بڑی بہن کا رشتہ دیکھنے جانا ہے تو اسی کے متعلق کوئی معاملہ ہوگا۔ اب وہ معاملہ کتنا بھی گمبھیر ہوتا اس کی حیثیت گھر کے چھوٹے جیسی تھی تو وہ خود سے کچھ بولنے سے گریز ہی کرتا تھا۔

اتنے میں نمل اندر آئی۔

''بی پی تو نارمل ہوگیا ہے۔ لیکن امی کے سر میں درد شروع ہوگیا ہے۔ اور وہ کہہ رہی ہیں کہ.....''

وہ کچھ رکی کہ..... بھابی بول پڑیں۔

''کہ لڑکے والوں کو منع کر دیں کہ ہم نہیں آ رہے..... ہے ناں؟''

نمل نے آہستگی سے سر ہلایا۔

''پتا نہیں امی تمہارا رشتہ ہونے بھی دیں گی یا نہیں..... آخر کیوں نہیں سمجھتیں..... اتنی معمولی سی بات کو افسانہ بنالیا۔'' بھابی سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔

فرخ جو ناشتا کر رہا تھا سوالیہ نظروں سے نمل کو دیکھنے لگا۔

اس نے پوری رام کہانی سنائی۔

وہ سن کے جو ہنسا شروع ہوا تو ہنستا ہی چلا گیا..... بھابی پہلے حیران اور پھر تپنا شروع ہوگئیں.....

''تم نے نکالے ہیں ناں پیسے؟''

اس نے ہنستے، ہنستے سر ہلایا۔

''میں ابھی جا کے امی کو.....''

نمل فوراً نکلنے لگی تھی کہ بھابی نے اس کا بازو تھاما۔

"رک جاؤ..... یہ مت کہہ دینا کہ اس نے کہیں اڑا دیے..... یہ کہنا کہ کل رات ہی فرخ نے کسی کو صدقہ دے دیا تھا۔ تاکہ ان کی تسلی ہو جائے۔"

نمل سر ہلاتی ہوئی نکلی تو انہوں نے باقی کے لتے لینے کو فرخ کی طرف رخ موڑا۔

"تمہارے اندر شرم نام کی کوئی چیز ہے فرخ..... ہیں..... اول تو بنا پوچھے پیسے نکالنے کی کیا ضرورت تھی اور پتا تھا کہ ریڈ والے پاؤچ میں سے لیے ہیں تو کم سے کم ابا کو تو بتا دیا ہوتا..... امی کی حالت خراب ہے صبح سے....."

فرخ بیچارہ سا منہ بنا کے رہ گیا۔

"کیوں لیے تھے پیسے؟"

"دوست کے ساتھ جانا تھا۔ نوٹس فوٹو اسٹیٹ کروانے تھے تو....."

"اونہہ..... اب دیکھنا امی جو تمہارا حال کریں گی۔"

"چھوڑیں بھابی بچہ ہے یہ ابھی۔ اس عمر میں ہو جاتی ہے بے پروائی۔" بیلا نے چائے کپ میں نکالی۔

فرخ نے شکر گزار نظروں سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

نمل کا رشتہ طے پا گیا۔ اور بیلا ان ہی دنوں امید سے ہو گئی۔ بیلا کا یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار جب وہ امید سے ہوئی تو ایک بار امی کے گھر سے واپس آتے ہوئے اسے بائیک پر ایسا جھٹکا لگا کہ اس کا مس کیرج ہو گیا۔

امی کے لیے یہ خبر جیسے اندوہ ناک پہاڑ بن کے ٹوٹی۔ انہوں نے بیلا کو وہ، وہ سنائیں جس نے گھر کی پوری تاریخ بدل دی۔ اس دن سے پہلے کبھی کسی کو ایسی جھاڑ نہیں پڑی تھی۔ بیلا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے۔ ناشتے کے وقت سب گھر والے سامنے ہی تھے۔

"میں نے کہا تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے صدقہ دے کے جاؤ۔ اور مغرب کے بعد تو باہر ہی نہ نکلو..... ارے سو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں راستے میں..... اور یہ محترمہ آدھی رات کو بائیک کی سواری کر رہی ہیں وہ بھی اس حالت میں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

ابا، بڑے بھیا اور فرخ کی موجودگی اس کے لیے انتہائی شرم کا باعث تھی۔

وہ بہت مجبوری کے عالم میں گئی تھی..... اسے معلوم تھا کہ امی اس پر پابندیاں ضرور لگائیں گی۔ اپنے شوہر کی محبت میں وہ ہر پابندی قبول کرنے کو تیار تھی۔ لیکن ایک دن پہلے صبح اس کے بھائی کا فون آیا تھا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ لاکھ دل کو سمجھایا لیکن ماں کے معاملے میں بیٹیوں اور وہ بھی بیاہی بیٹیوں کا دل ویسے ہی بہت نازک ہو جاتا ہے۔ احمر کے ذریعے ساس امی سے اجازت لے کے وہ اس کے آفس سے آنے کے بعد نکلی تھی۔ عصر تو ہو ہی چکی تھی۔ امی خود بھی جانتی تھیں کہ وہ مغرب تک واپس نہیں آ سکتی تھی۔ پھر بھی مغرب کی اذانوں کے بعد سے ہی ان کے فون آنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کے میکے والوں اور اس کی امی نے بھی نوٹ کر لیا۔

وہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔

جلدی، جلدی نوالے حلق سے اتارے۔ امی نے اس کی پسند کا کھانا بنوایا تھا۔ لیکن وہ ٹھیک سے نہ ان کے پاس بیٹھی نہ ان سے باتیں کیں نہ ہی کھانا کھایا۔ بس بھاگم دوڑی میں نکلی، تب بھی اس کا فون بج رہا تھا۔ راستے میں بھی بار بار کال آتی رہی۔

اسی فون کو چلتی بائیک پر نکالنے کے چکر میں اسے الٹا سیدھا جھٹکا لگا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم ہو گئی تھی۔ اوپر سے الزام بھی اس ہی کے سر پر تھا۔

احمر کے سامنے وہ کتنے ہی دن روتی، جلتی اور کلستی رہی تھی۔ لیکن یہ احمر ہی کی تاکید تھی کہ امی سے کوئی بدتمیزی نہ کی جائے۔

"اولاد کی نعمت اللہ کی دین ہے۔ امی کی باتوں کو دل پر نہ لو۔ جب اللہ کا حکم ہوگا۔ ہم بھی ماں باپ بن جائیں گے....."

"آمین!" صدقِ دل سے اس کے لبوں سے

نکلا تھا۔

اب کافی عرصے کے بعد دوبارہ یہ وقت آیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ امی کی جھاڑ پھونک اور ٹوٹکے عروج پر تھے۔

روزانہ صبح سب گھر والوں اور خاص طور پر بیلا پر دعائیں پڑھ کے پھونکیں۔

اللہ کے کلام میں واقعی برکت ہوتی ہے لیکن وہ اس کے بعد بھی گھر کے مرد جب تک صحیح سلامت گھر لوٹ کے نہ آجاتے، دل ہی دل میں پریشان رہتیں۔ یہی چیز غلط تھی۔

کبھی منہ سے اظہار کر دیتیں۔ کبھی کسی کو دیر ہو جاتی تو ہر تھوڑی دیر کے بعد فون پر فون.....

یہاں تک کہ بندہ یا تو گھر آجاتا یا گھبرا کے فون اٹینڈ ہی نہ کرتا۔

ابا تو ان کو فون پر ہی جھاڑ دیتے۔ وہ پھر بھی باز نہ آتیں۔

نمل کی شادی تک انہوں نے جانے کتنے پیسے صدقے میں دیے اور آخری وقت تک ہوتی ہی رہیں۔ یہاں تک کہ لڑکی رخصت ہو کے پیا سنگ گاڑی میں بیٹھ کے سسرال چلی گئی..... لیکن ان کے لیے فکرمندی کا نیا دروازہ کھول گئی۔

رخصتی کے وقت سر پر سایہ کرنے کو جو قرآن پاک فرخ کو گھر سے لانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ وہ نہ آسکا۔

بھری محفل میں امی تلملا کر رہ گئیں۔ فرخ کو دانت کچکچا کے دیکھتی رہیں لیکن کچھ بول نہیں سکیں۔ سب نے بہتیرا اطمینان دلایا۔ کچھ خواتین نے تو اس رسم کو غیر ضروری اور غیر شرعی تک کہہ دیا لیکن ان کی ٹینشن کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔

حد یہ ہوئی کہ گھر آ کے سب آرام سے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔ لیکن وہ سکون سے سو نہ سکیں اور مصلیٰ بچھالیا۔

☆☆☆

نمل رخصت ہوگئی۔ تو امی کی پوری توجہ بیلا کے اوپر ہوگئی۔

کبھی، کبھی وہ الجھ جاتی، بیزار ہو جاتی۔ بڑی بھابی اسے دیکھ دیکھ کے ہنستی رہتیں۔

میکے جانے پر مکمل پابندی تھی اور وہ مکمل بے بس تھی..... احمر سب سمجھتا تھا۔ لیکن ماں کے آگے بے بس.....

ان کو سمجھانا بے سود تھا۔ بڑی بھابی کے دن اس کی یادداشت میں پوری طرح تازہ تھے۔ انہوں نے ان کا بھی اسی طرح خیال رکھنے کے چکر میں جینا مشکل کر دیا تھا۔

اب بیلا چھت پر نہیں جا سکتی تھی۔ نہ بال کھول سکتی تھی۔ نہ کوئی خوشبو لگا سکتی تھی۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند تو وہ تھی۔ لیکن ایسی سختی تو زندگی بھر کسی نے نہ کی تھی۔

چاہے وقت ملے نہ ملے دل چاہے یا نہ چاہے۔ امی کی بتائی ہوئی ہر گھریلو ٹوٹکے کی چیز اسے لازمی لینی تھی۔ نظر روز اترتی تھی۔ دودھ روز پینا تھا۔ اور پھر ایک دن.....

''دلہن.....''

دوپہر میں اک ذرا سے اونگھ آئی تھی کہ امی کی سرگوشی نما آواز اپنے کان میں سن کے وہ ہڑبڑا سی گئی۔

''آرام سے بھئی..... کیا ہوگیا۔''

ان کو کمرے میں اپنے بستر کے پاس کھڑا دیکھ کے، وہ بوکھلا سی گئی تھی۔

''یہ لو.....'' انہوں نے مٹھی میں دبی کوئی چیز اس کے آگے کی۔

''پروفیسر صاحب ہیں ناں..... ان سے خاص چینی پڑھوا کے لائی ہوں۔ ان شاء اللہ..... اس بار جو بھی ہوگا۔ اللہ کے فضل سے خوب صحت والا اور ساتھ خیریت کے ہوگا..... چائے، شربت، جوس جس چیز میں چاہو ڈال کے پی لینا.....'' ان کی آواز اب بھی بہت دبی ہوئی تھی۔

بیلا نے دھیرے سے پڑیا ان کے ہاتھ سے لے لی اور سوچ میں پڑ گئی۔ پتا نہیں کس طرح کی چینی تھی اور کیا پڑھ کے دیا تھا پروفیسر صاحب نے اس پر.....

پروفیسر صاحب کی شخصیت بھی خوب تھی..... جلیبہ ان کا کسی بھی طرح اس لقب سے میل نہیں کھاتا تھا۔ منحنی سا جسم، چھوٹا قد، سفید براق شلوار قمیص پر جناح کیپ لگا کے، دو گلی چھوڑ کے ان کا مطب تھا۔ کہنے کو حکمت کرتے تھے۔ لیکن سائڈ بزنس کے طور پر امی جیسی خواتین کی دلی تسلی کے لیے یہ دم درود بھی کر دیا کرتے تھے اور بڑے ٹھسے سے خود کو پروفیسر صاحب کہلواتے تھے۔

گئی تو وہ تھیں اپنے دائمی نزلے کے علاج کے لیے..... جو خود بھی نزلے کی طرح دائمی تھا۔ سالوں سے چلے چلا جا رہا تھا۔ نزلہ ختم ہوتا تھا نہ علاج.....

وہیں کسی وقت انہوں نے حکیم صاحب کے سامنے کسی خاتون سے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے اور نتیجہ اس کے سامنے تھا۔

بیلا کا دل خراب سا ہو گیا۔

اس کے میکے میں ان چیزوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ احمر سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ اور یہ چینی وہ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ایسی بات سوچنا بھی ساس کی طرف سے شامت کو بلاوا دینا تھا۔

اس نے بجھے دل سے چینی کی پڑیا ڈریسنگ پر رکھ دی۔

☆☆☆

کمرے سے بیلا کی ہلکے سے چیخنے کی آواز آئی..... ہمیشہ کی طرح زلیخا ڈر گئیں۔

''الٰہی خیر.....!''

وہ اور ابا کمرے میں پہنچے تو ڈریسنگ کے اوپر ایک چھپکلی چپکی بیٹھی تھی..... اور بیلا سامنے بیڈ پر چڑھی ہوئی تھی۔

''امی..... یہ روز کمرے میں آ رہی ہے۔ فرخ سے کہیں اس کو مارے۔'' اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

''ارے مارو نہیں بھگا دو بس.....''

ابا، فرخ کو بلانے کے لیے پلٹ رہے تھے جب ہمیشہ کی طرح امی نے فرمان جاری کر دیا۔

''نہیں، نہیں..... ابا اس کو مار دیں، یہ رات میں سوتے میں میرے اوپر نہ گر جائے۔'' وہ سوچ کر ہی کانپ گئی۔

ابا، فرخ کو بلا لائے۔ فرخ بھی جھاڑو اٹھائے فٹافٹ آ گیا۔ اسے ایسے ایڈونچرز میں بہت مزہ آتا تھا۔

امی کی جان پر بن گئی۔

''فرخ میں کہہ رہی ہوں..... تو اس کو مارے گا نہیں..... ارے دوسرے جی سے ہے دلہن..... خدانخواستہ کچھ الٹا ہو گیا تو..... اللہ نہ کرے۔''

''کچھ نہیں ہو گا امی!'' وہ بھی آج اُن کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

بیڈ پر کھڑی بیلا اور امی میں ٹھن گئی۔ وہ یوں ہو گئیں گویا چھپکلی میں ان کی جان بند ہے۔

''مارو فرخ، میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ نہیں بھاگے گی۔ روز آتی رہے گی۔'' اس کے اپنے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

فرخ نے جھاڑو چلائی۔ امی اسے روکنا چاہتی

عکس

اس نے چاند
اور چاند نے اس کو دیکھا ہے
باتیں کرتے اور سسکاتے دیکھا ہے
اس منظر کو، خوابیدہ سا
بدلی میں جاتے دیکھا ہے
سو ہم نے بھی
اِک دوجے کو
چاند، چکور کی بے تابی میں
روتے، ہنستے دیکھا ہے
عشاقی میں
خوب سنورتے
اور نکھرتے دیکھا ہے

شاعر: ظریف احسن
پسند: عرشیہ جنید، کراچی

pklibrary.com

تھیں لیکن متوقع اچھل کود کے ڈر سے باہر کو ہو گئیں۔

چھپکلی تو مری نہیں..... لیکن وہ ہو گیا جو امی اور بیلا میں سے کسی کے گمان میں نہیں تھا۔

چھپکلی تیر کی سی تیزی سے روشندان سے باہر نکل گئی اور ڈریسنگ کے اوپر رکھی چینی کی پرات میں پر آ رہی۔

امی نے اندر جھانکا تو فرخ اوپر دیکھ رہا تھا۔ اور چینی اس کے پیروں کے پاس بکھری پڑی تھی..... ان کو لمحہ لگا تھا اس پڑیا اور چینی کو پہچاننے میں..... ان کی آنکھیں ابل پڑیں اور بیلا کا خون خشک ہو گیا۔

ایک ہفتے سے اوپر ہو چلا تھا ان کو یہ پڑیا دیے ہوئے۔ اور یہ اب تک جوں کی توں رکھی تھی۔ بیلا نے اس کا ایک دانہ تک منہ میں نہیں ڈالا تھا۔

انہوں نے پڑیا کو دیکھا پھر بیلا کو.....

بیلا نے ان کو دیکھا پھر فرخ کو.....

جو انجان نظروں سے امی اور اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

تین دن سے ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ بیلا منانا منا کے تھک چکی تھی۔ لیکن وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھیں۔

''تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ ہم بوڑھے ہیں تو کیا، پرانے زمانے کے ہیں مطلب جاہل ہیں۔ ہمیں کچھ نہیں پتا..... ہم نہیں جانتے..... یہ چار، چار بچے ایسے ہی جوان کر دیے۔''

خدا، خدا کر کے ان کا منہ کھلا اور گولہ باری شروع ہوئی تو بیلا نے شکر ادا کیا۔ اندر ہی اندر غصہ دبا کے بیٹھنے سے بہتر تھا کہ وہ بالآخر اپنا غبار نکال دیں۔ یہی بہتر تھا۔ ورنہ وہ اندر ہی اندر اپنے وہم اور وسوسوں کے ہاتھوں اپنی طبیعت تو خراب کرتی ہی تھیں۔ گھر والے الگ پریشان ہو جاتے تھے۔

''تم کو تعویذ، دم درود مذاق لگتا ہے۔ تمہیں احساس بھی ہے۔ لوگ مرتے ہیں اولاد جیسی نعمت کے لیے۔ مزاروں پر جا کے منتیں مانتے ہیں اور سالوں جھولی پھیلاتے ہیں تب بھی جھولی خالی رہتی ہے۔ تمہیں بن مانگے دوسری بار عطا کی رب نے..... اور تم اب بھی ناشکری پر تلی ہو.....''

''امی آپ یقین کریں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ احمران سب باتوں کا برا مانتے ہیں اس لیے میں نے ان سے چھپا کے وہاں رکھی تھی کہ کسی دن چپکے سے کھالوں گی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ گر جائے گی ورنہ میں اسے پہلے ہی وہاں سے اٹھا لیتی..... یہ سب اس منحوس چھپکلی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' آخر میں روانی سے اس کے لبوں سے نکل گیا۔ زلیخا اچھل پڑیں۔

''ارے خدا کا خوف کرو لڑکی..... ایک انجانی مخلوق کو کچھ بھی الٹا سیدھا بولنے سے ڈرو..... کیا پتا وہ چینی اسی لیے گرگئی ہو..... کیونکہ تم چھپکلی کو مروانے پر تلی بیٹھی تھیں.....'' ان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ پھر ایکا ایکی وہ اپنے ہاتھ ملنے لگیں۔

''ہے ہے..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ ضرور اسی نے یہ چینی گرائی ہو گی..... ہائے اللہ..... بھی کہتی ہوں کہ ایسی چیزوں کو مارنے، نقصان پہنچانے کی بات نہیں کرتے۔ ان کو برا لگ جاتا ہے..... یا اللہ.....!''

بیلا کا منہ کھل گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح ان کو دیکھ رہی تھی۔

''ضرور..... ضرور اسی نے یہ چینی گرائی ہے..... ہائے بیلا..... اب کیا ہو گا..... ارے دعا کرو۔ کچھ الٹا سیدھا نہ ہو اب کے..... مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا.....'' وہ روہانسی ہو گئیں۔ بیلا کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

''امی..... ان شاء اللہ کچھ نہیں ہو گا..... ہو سکتا ہے یہ آپ کا وہم.....''

''ارے دماغ خراب ہے کیا تمہارا۔''

وہ بدک اٹھیں۔

''اب بھی یہ تمہیں وہم لگ رہا ہے..... تم..... تم پچھتاؤ گی بیلا دیکھنا..... تم پچھتاؤ گی۔''

بیلا کا دل دہل گیا۔

''اللہ نہ کرے۔'' اس کے خاموش لبوں سے التجا نکلی۔

☆☆☆

چند ہی دن گزرے تھے۔ جب مسلسل اس کا بی

پی لورنے لگا۔ ابھی شروع کے ہی دن تھے۔ اس سے چلا جاتا نہ کوئی کام کیا جاتا..... یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے سے بھی جان جانے لگی..... ڈاکٹر مسلسل طاقت کی دوائیں، پھل، دودھ اور فوڈ سپلیمنٹ لکھ لکھ کے دیتے رہے۔ لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا..... وہ سوکھ کے کانٹا ہوتی چلی جارہی تھی۔

گھر میں سب کی فکرمندی عروج پر تھی۔ امی کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ان کا اعتقاد اور پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ یقیناً بیلا نے کسی نادیدہ مخلوق کو ناراض کیا تھا اسی کے نتیجے میں یہ مشکل آئی تھی۔

وہ اب بھی اپنی پرانی روش پر قائم تھیں۔ نظر بھی اتارتی تھیں۔ روز صدقہ نکال رہی تھیں۔ اس کے کھانے پینے دوا اور ہر چیز کا خیال، اپنی بیٹی سے زیادہ ان کو اس کی فکر تھی لیکن بیلا کو ان کی فکر اور محبت سے کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ روز بروز بجھتی چلی جارہی تھی۔

احمر الگ فکرمند تھا۔ اس نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آفس سے آکر مستقل اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اس سے باتیں کرتا اس کا دل بہلاتا..... لیکن بیلا کا دل کسی شے میں نہیں لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کچھ ہونے والا ہے..... شاید کچھ برا.....

وہ دن میں کئی بار اپنی ہونے والی اولاد کے لیے دعا کرتی۔ رو، رو کر اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ کبھی کبھی ساس کی کہی ہوئی باتیں یاد آتیں تو اس کا ایمان ڈولنے لگتا۔

''کیا پتا واقعی میں میں نے کسی نادیدہ مخلوق کی دل آزاری کردی ہو۔ اور اب وہ مجھ سے اپنا بدلہ لینا چاہتی ہو۔''

وہ احمر کو ایک، ایک بات بتاتی۔ اپنے خیالات اس سے شیئر کرتی..... وہ ان سب باتوں کو چٹکی میں اڑا دیتا۔ یقین تو بیلا کو بھی نہیں تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ مایوسی کی ان انتہاؤں پر پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹر نے الٹراساؤنڈ کے لیے بلایا تھا۔ وہ بہت بے دلی سے احمر کے ساتھ جانے کو تیار ہوئی۔ ورنہ دل کررہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز کو بھاڑ میں جھونک دے۔

میکے گئے ہوئے بھی کتنے دن گزر گئے تھے۔ امی کی بہت یاد آرہی تھی لیکن وہی پہلے کی طرح رات کو دیر تک باہر رہنے کی ممانعت تھی اور احمر سسرال میں رک نہیں سکتا تھا۔

گھر سے نکلنے سے پہلے امی کمرے میں آئیں۔

''دلہن.....''

اس نے تھکی، تھکی آنکھیں اٹھا کے ان کو دیکھا۔

''دیکھو تو کیسی اتی سی شکل نکل آئی میری بچی.....''

انہوں نے اس کو چوم کر سینے سے لگایا۔

پھر چپکے سے ایک چوکور چھوٹا سا تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

''پروفیسر صاحب سے خاص تمہارے لیے لکھوایا ہے، تعویذ ہے۔ کھولتے نہیں ہیں۔ موم جامہ کر دیا ہے۔ بازو پر باندھ لینا۔''

اس کے دل میں بیزاری کی شدید لہر اٹھی لیکن کچھ بھی بولنے سے پرہیز کرتے ہوئے اس نے تعویذ لے کر پرس میں رکھ لیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے الٹراساؤنڈ کے بعد کوئی اچھی خبر نہیں سنائی تھی۔

بچے کی نشوونما بہت سلو تھی اور رک بھی سکتی تھی۔ چند دن اور دیکھنے کے بعد اس حمل کو ضائع کرنے میں ہی عافیت تھی۔

وہ جان بوجھ کے واپس گھر نہیں گئی۔ احمر سے ضد کر کے امی کی طرف آ گئی اور پھر رات وہیں رک گئی..... اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں جائے جہاں اس کی ساس رہتی تھیں۔ آج جانے کیوں اسے رہ، رہ کے ان کے الفاظ یاد آرہے تھے۔

''تم پچھتاؤ گی۔''

انہوں نے دنیا جہان کی احتیاطیں، اپنے وہمی دل کو سمجھانے کے لیے کر لی تھیں لیکن ان سے اپنی زبان کنٹرول نہ ہو سکی تھی۔

یہ بات تو ہمیشہ سے کہی جاتی ہے کہ منہ سے کوئی بھی بات نکالتے وقت سو چنا سمجھنا چاہیے۔ قبولیت کی گھڑی کوئی بھی ہوسکتی ہے اور زلیخا جس حساب سے وہم کرتی تھیں وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ غلط یا برا ہونے کو ہی سوچتی بھی تھیں اور منہ سے بے دھڑک کہتی بھی تھیں۔ ان کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ زبان سے نکلی ہوئی بات اگر پوری ہوجائے تو ان کے لیے کتنا مسئلہ بن سکتی ہے۔ اس کا دل اتنا بھاری تھا کہ ماں کو سامنے دیکھ کے خود پر ضبط کا یارا نہیں رہا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی۔

خدا دوسری بار اس سے اپنی نعمت دے کے واپس لینے والا تھا اور وہ بالکل بے بس تھی۔

☆☆☆

ایک رات رک کے وہ گھر آئی تو سب نے محبت سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بمشکل مسکراتی رہی۔ کہنے کو کوئی بات باقی نہیں بچی تھی۔

رات کو احمر پھر اسے تسلی دینے لگا تو وہ پھٹ ہی پڑی۔

''کیا کروں میں۔ کیسے حوصلہ کروں کیسے خوش ہوؤں..... امی کی باتیں سنی ہیں آپ نے؟ وہ تو جیسے کسی بری خبر کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔ کیا فائدہ ایسے احساس کا کہ انسان کو پتا ہی نہ ہو، وہ کہہ کیا رہا ہے اور کر کیا رہا ہے.....''

احمر سوچ میں ڈوبا اس کی سنتا رہا۔

بات سچ ہی تھی۔ انسان کو واقعی پتا نہیں چلتا کہ اس کی بات کس انداز میں سامنے والے کے دل پر کیسی قیامت ڈھا رہی ہے۔

''میں کس تکلیف سے گزر رہی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہوں نے مجھے یہ نہ سنایا ہو کہ یہ سب میری کسی غلطی کا نتیجہ ہے.....''

بات کرتے، کرتے اسے کچھ یاد آیا..... اس نے اٹھ کر اپنے ہینڈ بیگ میں سے کچھ نکالا۔

''اب کیا کر رہی ہو اس ٹائم۔''

احمر نے اسے دیکھا۔ بنا جواب دیے کاغذ کی کوئی چھوٹی سی چٹ کھول کے پڑھ رہی تھی۔

''کیا ہوا۔ کیا ہے یہ.....؟'' وہ لیٹے، لیٹے ہی پوچھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں.....''

وہ یہ بتانے کی بھیانک غلطی نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے زلیخا کا دیا ہوا تعویز نہ صرف کھول لیا ہے بلکہ پڑھ بھی لیا ہے.....

ایک ہفتے بعد چیک اپ کے لیے جانا تھا۔

اس نے خاموشی سے کاغذ لپیٹا اور بیگ میں رکھ لیا۔

☆☆☆

دوسرے الٹرا ساؤنڈ کی ڈیٹ آگئی۔

اس دن احمر نے آفس سے چھٹی کر لی۔ نمل بھی رات سے رکنے آئی ہوئی تھی۔ مسلسل اپنی بھابی کی دلجوئی میں لگی ہوئی تھی۔

اسے سب گھر والوں خصوصاً اپنی اکلوتی نند اور نٹ کھٹ دیور سے بہت پیار تھا۔ یہ دونوں اس کے لیے چھوٹے بہن بھائی جیسے ہی تھے۔ وہ ان کی شرارتوں اور نوک جھوک کو بہت انجوائے کرتی تھی۔ فرخ نے اس سے معافی مانگ کے اس کے دل میں اپنی قدر و منزلت بڑھا لی تھی۔ حالانکہ اس کا تو سارے قصے میں کوئی قصور تھا ہی نہیں.....

وہ منحوس چھپکلی بھی اس دن کے بعد سے ایسے غائب تھی جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔

صبح، صبح امی نے اپنی مخصوص دعائیں پڑھ کے، ان کا صدقہ اتارا..... پھر مخصوص وہموں کے سائے تلے رخصت کیا۔

''اللہ خیر ہی کرے بس.....''

وہ بار، بار یہی کہتی تھیں اور بار، بار بیلا کی شکوہ کرتی نظریں احمر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

سارا راستہ وہ دل ہی دل میں دعاؤں اور قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی۔

ابا نے بہت چاہا کہ امی ان کے ساتھ آئیں لیکن ان کے بقول ان کا جی اچھا نہیں تھا۔ اور وہ کسی بری خبر کی

متحمل نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس لیے مجبوراً نمل ساتھ آئی تھی۔

آج وہ لوگ بائیک کے بجائے، بڑے بھیا کی گاڑی لے آئے تھے۔ بیلا کی صحت بائیک کے سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ڈاکٹر نے الٹراساؤنڈ کیا۔ اور اسے سب ٹھیک ہونے کی خوشخبری سنائی..... تب تک اس کی جان سولی پر ہی ٹنگی رہی۔

''ماشاء اللہ..... گروتھ بڑھ گئی ہے۔ اب بس تمہیں جان بنانی ہے۔ ان شاء اللہ تمہارا بے بی بالکل ہیلدی ہوگا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میڈیسن دے دوں گی۔ ریگولر یوز کرنا..... اوکے؟'' پیشہ ورانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ مسکرائی اور بیلا کے اندر کسی نے نئی روح پھونک دی۔

وہ الٹراساؤنڈ روم سے باہر آئی تو اندرونی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ نمل اور احمر دونوں ہی سمجھ گئے کہ ڈاکٹر نے کوئی اچھی خبر سنائی ہے۔

بیلا کو واپسی پر پھر اس کے گھر ڈراپ کر کے وہ نمل کو لے کے واپس پہنچا۔ نمل کو اس نے خاموش رہنے کی خصوصی ہدایت کردی تھی۔

امی توقع کے عین مطابق بے چینی سے اندر باہر ٹہل رہی تھیں۔

''کیا ہوا..... احمر سب خیر تو ہے ناں؟'' احمر کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کے انہیں ہول اٹھ رہے تھے۔

گھر پر ان کے علاوہ ابا اور بڑی بھابی تھے۔ بھابی بھی اسے اتنا سنجیدہ دیکھ کے سوالیہ نظروں سے نمل کو دیکھنے لگیں۔

نمل ان کو لے کے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا کہا ڈاکٹر نے۔ جلدی بتاؤ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔'' ابا بھی وہیں تھے لیکن کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے بیٹے کے تیور دیکھ رہے تھے۔

''آپ کا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے امی! آپ نے پہلے سے سوچا ہوا ہے کہ یقیناً کچھ نہ کچھ غلط ہوگیا ہے۔''

وہ ایک دم کچھ بولتے، بولتے گڑبڑا گئیں۔

''نہیں، نہیں۔ خدانخواستہ میں کیوں ایسا سوچنے لگی۔''

''آپ چاہیں نہ چاہیں..... مانیں یا نہ مانیں..... آپ ایسا ہی سوچتی ہیں۔ جانے انجانے میں کسی نہ کسی بری خبر کی منتظر رہتی ہیں آپ.....'' احمر نے جیسے پٹاخا چھوڑا۔ وہ اچھل ہی تو پڑیں۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن احمر نے موقع نہیں دیا۔

''ایسا ہی ہے..... یہ جو فالتو کے وہم اور وسوسے ہر وقت دل میں پال کے رکھتی ہیں۔ یہ آپ کو نہ مطمئن ہونے دیتے ہیں۔ نہ کچھ اچھا سوچنے دیتے ہیں اور نہ ہی بولنے دیتے ہیں۔'' وہ ناراض سا تھا۔

''ارے پاگل تو نہیں ہوگیا..... میں کیوں کچھ برا بولنے لگی۔ کیا میں تم لوگوں کی دشمن ہوں۔ ماں ہوں میں..... اور ماں کے دل کو سو دھڑکے ہوتے ہیں..... تم کیا جانو.....'' احمر کی ذرا سی بات نے انہیں روہانسا کردیا تھا۔

''تو پھر جب دعائیں پڑھ، پڑھ کے ہم پر پھونک دیتی ہیں۔ اللہ کی حفاظت میں دے دیتی ہیں تو اس اللہ پر یقین کیوں نہیں رکھتیں۔ جو ہر شے پر قادر ہے۔''

زلیخا کا منہ کھل گیا۔ ان سے کوئی بات بن نہیں پڑی۔

''آپ خود بتائیں..... جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کو ہر وقت ہم سب کے لیے پریشان ہی دیکھا ہے۔ کبھی نظر بد کا ڈر، کبھی ہوائی مخلوق کا خوف، کبھی جراثیم، کبھی وائرل بیماریاں..... کبھی یہ کبھی وہ..... زندگی کا حصہ ہے یہ سب..... چلتا رہتا ہے زندگی کے ساتھ ساتھ..... لیکن اسے زندگی کا روگ کون بناتا ہے ایسے جیسے آپ نے بنالیا ہے معمولی باتوں کو.....'' آج وہ ٹھیک ٹھاک غصے میں تھا۔ نہ چیخنا نہ چلانا، نہ بدتمیزی..... لیکن وہ، وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا جو اس کے دل دماغ میں جانے کب سے چل رہا تھا۔

''آیت الکرسی پڑھتی ہیں؟ دم کرتی ہیں ہم سب پہ.....؟ پھر ہمیں اللہ کی امان میں دے کے بے فکر کیوں نہیں ہوجاتیں.....''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو..... میرا ایمان کمزور ہے؟'' وہ تنک گئیں۔

''نہیں، آپ کا ایمان نہیں۔ آپ کا دل کمزور ہے اور.....''

''ماؤں کے دل کمزور ہی ہوتے ہیں۔'' اپنے تئیں انہوں نے بات ختم کردی۔

''بالکل نہیں۔'' وہ آگے جھکا اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ جانتا تھا جو وہ کہنے جارہا تھا۔ اس سے اس کی ماں کا دل دکھ سکتا تھا۔ لیکن کہنا ضروری بھی تھا۔

''ماؤں کے دل مضبوط ہوتے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے وہموں کا سر کچلنا جانتے ہیں..... وہ اپنی اولاد کے لیے منہ سے بدفالیں نہیں نکالتے۔''

زلیخا منہ کھول کے اسے دیکھنے لگیں۔

''کیا آپ نے بیلا سے کہا تھا کہ تم بچھتاؤ گی۔ تم اس کا نتیجہ بھگتو گی۔''

زلیخا جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

''آپ دعائیں دیتی ہیں امی..... لیکن ساتھ میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتی ہیں۔ ان وہموں کے ہاتھوں مجبور ہوکر جو شیطان آپ کے دل میں ڈالتا ہے۔ آپ کے دل میں دعا کا نہیں۔ وہم کا یقین بولتا ہے۔ اس کو ختم کریں..... آپ کو اس کو ختم کرنا ہی ہوگا، ورنہ.....''

''ورنہ.....'' انہوں نے سہم کر احمر کے ہاتھوں کو دبوچ لیا۔

''بیلا کیسی ہے..... وہ ٹھیک ہے ناں!''

''الحمدللہ..... بالکل ٹھیک ہے..... ویسا کچھ بھی نہیں ہوا جیسا آپ سوچ، سوچ کے پریشان تھیں.....''

ایک گہری جانے کب کی رکی ہوئی سانس ان کے لبوں سے خارج ہوئی۔

''یا میرے مالک تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے میری بچی سلامت ہے.....''

نمل اور بھابی بھی مسکراتی ہوئی باہر آگئیں۔

''دیکھا آپ نے اس کو کب سے باتیں بنا رہا ہے میری جان سولی پر ٹنگی ہے..... یہ نہیں کہ آتے ہی بتا دیتا..... میں جلدی سے شکرانے کے نفل پڑھ لوں اور ہاں سن لے تو..... یہ سب اس تعویذ کا کمال ہے جو میں نے اسے دیا تھا۔''

''جی، جی وہ بھی میرے پاس ہے بیلا نے بھجوایا ہے آپ کے لیے.....'' اس نے پینٹ کی جیب سے تعویذ نکالا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اسے ٹوکتیں..... اس نے اونچی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

''آلو، ڈھائی کلو، پیاز ایک کلو، ٹماٹر آدھا کلو.....''

نمل اور بھابی کی زوردار ہنسی گونج کر رہ گئی۔ ابا بھی منہ نیچا کر کے مسکرانے لگے۔

زلیخا ایک دم ہی کھسیانی ہوگئیں۔

''اڑا لو مذاق، یہ بھی کہہ دو کہ صدقہ، خیرات نہ دیا کریں وہ بھی آپ کا وہم ہے۔''

''بالکل نہیں۔ اس کی حقیقت اپنی جگہ ہے۔ لیکن فضول قسم کی سوچوں سے خود کو آزاد کرائیں امی..... یہ آپ خود ہی کرسکتی ہیں۔ اور کوئی نہیں کیونکہ وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔''

ہنستے، ہنستے بھابی کو کچھ یاد آیا۔

''اور ہاں..... نمل کا رشتہ جس دن فائنل ہونا تھا۔ اس دن صبح، صبح جو پیسے غائب ہوئے تھے اور فرخ نے کہا تھا کہ وہ اس نے کسی مانگنے والی کو دیے تھے۔ ان پیسوں سے بھی اس نے فوٹو اسٹیٹ کروائی تھی۔ اور آپ کی تسلی کے لیے آپ سے جھوٹ بول دیا تھا۔''

سب ایک بار پھر ہنس رہے تھے۔

''اچھا جبھی تو..... دیکھا نہیں تھا کیسی بدشگونی ہوئی تھی۔ نمل کی رخصتی کے وقت قرآن تک نہ ملا تھا سر پر رکھنے کو.....'' وہ بے ساختہ بولیں اور اب کی بار سب کے قہقہے اور بلند تھے۔

وہ مصنوعی خفگی سے سب کو دیکھتی کمرے میں چل دیں۔ ابھی انہیں اپنی بہو اور ہونے والے پوتے یا پوتی کے لیے شکرانے کے نفل بھی پڑھنے تھے۔ اور خود کو باور کرانا تھا۔

دلوں میں وہم اور وسوسے شیطان ڈالتا ہے۔ اور جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ وہم نہیں کرتے۔ اچھا گمان رکھتے ہیں۔

تعزیرِ وحدت

سعدیہ ہما شیخ

''بھابی آپ انتہا کی طرف جارہی ہیں، ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا کہ آپ اپنے گھر کا خود ہی شیرازہ بکھیرنے پر تلی بیٹھی ہیں، اپنی گرہستی کو خود آگ لگا رہی ہیں۔'' ایک ہفتے سے عرفی اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور وہ خاموشی کی بکل تانے اپنے فیصلے پر جمی تھی۔

''آگ تو میرے بھائی اس گھر کو گھر کے چراغ سے اسی دن لگ گئی تھی جب گھر والے کی نظروں کا رخ بدلا۔ اسے باہر ہریالی نظر آئی اور وہ گھر والی کو فراموش کر کے باہر والی کی زلفوں کا اسیر ہوا اب تو شعلے اٹھ رہے ہیں اور ان میں گرہستی بھسم ہو رہی ہے اور آگ ہی سزا ہے اس گناہ کی۔'' آیت سرتاپا اداسی اور غم کی مورت بنی ہوئی تھی اور جیسے اس کی سوچ بے وفائی کی سزا سے آگے کچھ نہیں سوچ رہی تھی، وہ اپنا آپ بھول گئی تھی تو باقی سب کیسے یاد رکھتی۔

''مگر بھابی آپ یہ بھی تو دیکھیں مرد کے لیے باہر ان چلتی پھرتی نیم برہنہ گناہ کی دعوت دیتی عورتوں سے بچنا کتنا مشکل ہے آپ نہیں جانتیں ان کے جال جو یہ بچھاتی ہیں۔ دن رات اپنے گھر کے لیے معیارِ زندگی بہتر بنانے والا مرد باہر ان اشتہاروں کو کہاں تک اگنور کرے، آج کل دامن بچانا بہت مشکل ہے اور پھر میڈیا کس طرح لبھا رہا ہے اور ہم مرد ان کو اگنور کر کے اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں، کیا ہوا نوفل نے اک ذرا دل پشوری کر لی اور بس وہ آپ اور بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں۔''

''واہ عرفی بھائی واہ......''

''پہلی بات وہ میرے اور بچوں کے بغیر ہی رہ رہا ہے معاشرے میں وائٹ کالر کے لیے بیوی بچوں کا ٹیگ ضروری ہے باقی سب تو باہر میسر ہے اور رہ گئی بات بہکنے کی تو خوب کہی...... یعنی مرد کے بہکنے کی ذمے داری بھی عورت پر ہی ہے۔ آپ مردوں کی اسی غلیظ سوچ نے عورت کو عورت کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ عورت بہکاتی ہے شادی شدہ مردوں کو اور ان کا بچنا مشکل ہے کیونکہ وہ دن رات عورتوں میں رہتے ہیں۔ یعنی دستیابی...... مرد کے لیے گناہ آسان ہے کیونکہ وہ باہر رہتا اسے میسر ہے......تو کیا عورت کے لیے دستیابی نہیں۔'' وہ عجب نظروں سے عرفی کو دیکھ رہی تھی۔

''مجھے بتائیں کیا عورت کے پاس میڈیا نہیں، عورت تو سارا دن مردوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس کی تو صبح کا آغاز مرد کی ڈور بیل سے ہوتا ہے وہ کیوں نہیں بہکتی صبح اخبار والا آتا ہے، کیا وہ مرد بہکا نہیں سکتا پھر دودھ والا کیا وہ ڈورے نہیں ڈالتا ہوگا اور ڈرائیور کہیں بھی جانا ہو تو تیار ہو کر بیوی، بچے ڈرائیور کے ساتھ عورت اس کے ساتھ دل پشوری نہیں کر سکتی وہ اس کی دسترس میں نہیں ہوتا۔ درزی صبح شام جس کے پاس چکر لگتے شاپنگ مالز کہاں مرد نہیں موجود، عورت کے پاس زیادہ دستیابی ہے، وہ زیادہ بہتر طریقے سے مرد کو چیٹ کر کے اپنی دنیا رنگین بنا سکتی ہے۔ بڑے، بڑے مالز میں بیٹھے سجے سنورے نکھرے مرد عورت کو بھی لبھائیں گے۔ صبح کا نکلا شام کو گھر لوٹا تھکن سے چور مرد کیا اٹریکٹ کرے گا مگر اس سب دستیابی کے باوجود عورت اپنے نوکر کے ساتھ چکر نہیں چلاتی جبکہ مرد کام والی ماسی کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ بیوی کی موجودگی میں اس کی دوستوں پر غلط نظر ڈالتا ہے فنکشنز پر ہر عورت پر ٹھرک جھاڑتا ہے۔ کیوں، کیا مرد کو لائسنس مل گیا ہے ہر برائی کا۔ یہی سب عورت کرے تو دو نمبر، مرد کرے تو دل پشوری، واہ بھئی واہ۔''

وہ چند لمحے توقف کر گئی تھی باتیں تو عرفی کو بھی درست لگ رہی تھی۔ مگر بہر حال وہ بھی ایک مرد تھا کیسے نہ حمایت کرتا۔

''اور بارہ سال بھی نہیں شادی کو بیس سال بھی گزر جاتے تو واپسی ناممکن تھی جب اللہ کی حدوں کو توڑ کر حلال کو چھوڑ کر مرد حرام کھانے لگے تو پھر اس کے لیے حلال پھیکا ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ میں لذت ہے اسی لیے شیطان نکاح سے ڈرتا ہے۔ یہ پھندے عورت کے نہیں یہ جال شیطان کا ہے یہ بساط اس نے بچھائی ہے مرد اور عورت دونوں کے لیے اور قیامت تک بچھی رہے گی کیونکہ میرا رب منصف ہے اس نے زانی مرد اور عورت دونوں کے لیے کوڑوں کی سزا رکھی ہے اور شادی شدہ کے لیے سنگساری کہیں نہیں کہ سزا صرف عورت کو ملے گی شرابی مرد اور عورت دونوں کو اسی کوڑے لگیں گے اور چوری کرنے والے مرد اور عورت دونوں کا ہاتھ کاٹا جائے گا، یہ میرے رب کی حد ہے۔ ہاں آپ کے معاشرے کی تعذیر صرف عورت کے لیے ہے مرد تعذیر سے بری ہے وہ جو مرضی کرتا پھرے اس کے لیے عام معافی کا اعلان ہے کیونکہ وہ مرد ہے مگر میرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔ اسے نہ ماں باپ کچھ کہیں گے نہ دوست سمجھائیں گے نہ سسرالی لعن طعن کریں گے۔ وہ معاشرے کی تعذیر سے بری ہے مگر عرفی بھائی بتا دیجیے گا نوفل کو وہ میرا نہیں اپنے رب کا مجرم ہے، معافی بھی اسی سے مانگے میرے رب کی حد اس کے لیے ہے وہ بری صرف تعذیر سے ہے اللہ کی حد سے نہیں۔''

وہ پھر شروع ہو گئی تھی، کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔

pklibrary.com

''گو بچے میں جہیز میں نہیں لائی اور نہ میں اکیلی دنیا میں لانے کی خطاوار ہوں مگر وہ میری تخلیق ہیں، انہیں کوکھ میں رکھنے کی، جننے کی اور دودھ پلانے کی ذمے داری میرے رب نے مجھے سونپی ہے اس لیے... میں اپنے بچوں کی ذمے داری نبھاؤں گی کیونکہ خالق اپنی تخلیق کو بہت پیار سے سنبھالتا ہے۔ میرا رب اپنے بندے سے پیار کرتا ہے اور ان بندوں میں آپ اور نوفل جیسے بھی شامل ہیں میں ان بچوں سے نفرت نہیں کروں گی کہ یہ نوفل جیسے مرد کی اولاد ہیں اور نہ ہی میں باپ کے خلاف کروں گی وہ خود شعور آنے پر سمجھ جائیں گے۔ میں بچوں سے بہت محبت کرتی ہوں کیونکہ یہ میری تخلیق ہیں، ہاں اب میں بیوی کی ذمے داری نہیں نبھا سکتی میرے اندر اب صرف ایک ماں ہے بیوی نے خودکشی کرلی ہے۔''

☆☆☆

آیت میری راج دلاری بہن کا شمار بھی انہی عورتوں میں ہوتا ہے جو شوہر کی ہر بات پر یقین کرلیتی ہیں اور محبت کے نام پر شوہر انہیں ڈاج کر جاتے ہیں اور بیوی نام کی یہ چڑیا ان کے بچھائے سنہری جال میں پھنس کر انہی کے نام کا دانہ چگتی رہتی ہے۔

مگر جب اس محبت گزیدہ عورت کا اعتماد ٹوٹتا ہے اور وہ شوہر کی ہیرا پھیریوں سے باخبر ہو کر انتہائی فیصلہ کرتی ہے تو ان بھونرا صفت مردوں کے ساتھ خاندان اور دوست احباب کی بند آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں جو مرد کی ہر، ہر حرکت سے پہلوتہی کرتے ہیں اسے ہر حد پار کرنے کی اجازت دیتے ہیں مگر عورت کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتے ہیں اور دھوکے پر مبنی رشتے کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس سے ایک مکھی نہیں بلکہ صبح شام مکھیاں نگلنے کا بخوشی اقرار کرواتے ہیں کہ اپنا گھر بچانا ہے تو اپنے شوہر کی طرف سے آنکھیں پھیر لو گویا اندھی بن جاؤ۔

میں جو بحیثیت وکیل کتنے عرصے سے ایسے ہی مقدمات نمٹا رہی تھی اور عورت کو انصاف دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی، آج بہن کے مسئلے کے آگے خود کو بے بس محسوس کررہی تھی۔ معلوم نہیں یہ اس کے لیے بہتر تھا یا نہیں...... اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکی۔

والدین، بھائی، رشتے دار، دوست سب ہی اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کررہے تھے مگر میں محبت میں ملے اس کے بے وفائی کے اس درد کو بخوبی سمجھ رہی تھی اور اس کے فیصلے کے ساتھ تھی کیونکہ میں جانتی تھی محبت گزیدہ بیوی نے شوہر کی جھوٹی محبت کا چولا اتار پھینکا ہے۔ کئی سالوں کا ساتھ، شوہر کی منت سماجت، والدین کی عزت، دوستوں کی التجا، اولاد کا واسطہ اب کوئی اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی سب اسے تارِ عنکبوت میں رہنے پر مجبور کررہے تھے۔ اس آشیانے میں جس کی چھت تھی اور نہ آسمان اور اس کمزور گھروندے میں وہ کبھی اپنے بچوں کو مضبوط مستقبل نہیں دے سکتی تھی اور اب دنیا کی تعذیر بھگتنے سے انکاری تھی اور رب کی حد لاگو کرچکی تھی۔

آپ کیا کہتے ہیں قارئین کیا آیت کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا؟

❀❀❀

شاداب چہرے

شگفتہ، شگفتہ وہ شاداب چہرے
ملکوتی سی وہ مسکان پُرحجاب چہرے
نگاہوں میں الفت، لمس میں تھی شفقت
اُف کہاں ڈھونڈوں، گم گشتہ وہ چہرے
حیا تھی جن کی اداؤں کا خاصہ
خلوص تھا ان کی زندگی کا حاصل
جھکی سی وہ مژگاں، گلال ان کے عارض
وہ معصوم، دلکش، دلبر وہ چہرے
خوابوں کے مسکن میں اب جا بسے ہیں
تا ابد تیری رحمت کے سائے گھنے میں

از: رفعت اشفاق، لاہور

ناولٹ

غصیلی اور شرمیلی

فوزیہ سرور

''امی جان کیا کوئی مہمان ہمارے گھر میں قدم رنجہ فرمانے والے ہیں ؟'' شرمیلی نے ننھی ستواں ناک پر پھسلتی نظر کی عینک کو دوبارہ ناک پر ٹکا کر ملازمہ نفیسہ کو دل جمعی سے لاؤنج کی صفائی میں مشغول دیکھ کر استفسار کیا۔ نفیسہ کو ہدایات دیتی شکیلہ بیگم نے اچنبھے سے اپنی شرمیلی بیٹی کو دیکھا جو کبھی کبھار ہی اپنے کمرے سے قدم باہر نکالنے کی زحمت کرتی تھی۔

''ہاں، میری چچازاد بہن سلیمہ جو کراچی میں رہتی ہے اس کے دو بیٹے قدم رنجہ فرمانے والے ہیں۔'' لہجے میں طنز سا گھلا تھا۔

''یعنی اب ہم کمرے سے باہر نکل نہیں پائیں گے۔'' شرمیلی روہانسی ہوگئی۔

''او بی بی کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے تم ہمہ وقت ہمارے آس پاس پائی جاتی ہو۔ کمرا بھی تنگ آگیا ہوگا

pklibrary.com

تمہاری بوتھی دیکھ، دیکھ کر۔ شرم کی پڑیا تجھے بیاہنا بھی ہے۔ میں نے تمہارے کمرے میں تمہارا مزار نہیں بنانا..... جسے تم نے پھولوں سے سجا کر مزار کی شکل دے رکھی ہے۔'' شکیلہ بیگم کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔ ان کی بات سن کر شرمیلی نے دہل کر اپنے سر پر جمی چادر کو اور اچھی طرح سر پر جمالیا۔

''اب یہ تنبو گھر میں تو اتار دیا کرو۔ یہاں کون سے نامحرم افراد پھر رہے ہیں۔ جس سے میری شرمیلی بٹی کو لاج آتی ہے۔'' شکیلہ بیگم نے طنز کے گولے بھگو، بھگو کر مہر النسا عرف شرمیلی کو مارے تھے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے ناک تک عاجز آچکی تھیں۔ گھٹی تو انہوں نے خود ہی دی تھی، پتا نہیں یہ کس پر جا پڑی تھی۔ بچپن

سے لے کر جوانی تک شرم کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے وہ ہر رشتے سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ اسکول میں تھی تو کسی سے بالکل دوستی نہ رکھی۔ ٹیچر کی باتوں کا جواب تک دینا گوارا نہ تھا۔ صد شکر کتابوں سے دوستی تھی۔ گریجویشن کرتے ہی مزید تعلیم پر فل اسٹاپ لگائے وہ کمرا نشین ہوگئی تھی۔ بائیس سال کی ہوچکی تھی۔ کوئی رشتہ دیکھنے آتا تو منہ سے من، من کی آوازیں نکلتیں۔ جھکا سر نہ اٹھاتی۔ شکل صورت کمال تھی لیکن رشتہ دیکھنے والے یہ کہہ کر انکار کردیتے۔ ''صرف شکل صورت کا اچار ڈالنا ہے لڑکی تو بولنا تک نہیں جانتی۔'' اوپر سے ''ہم'' کا صیغہ استعمال کرکے خود کو مہارانی شرمیلی بناڈالا تھا۔ پے در پے رشتوں کے انکار نے شکیلہ بیگم کو سیخ پا کردیا تھا اس لیے وہ اب شرمیلی کو بے نقط سنانے لگی تھیں۔

''تم جاؤ نفیسہ، صفائی ہم کرلیں گے۔'' شکیلہ بیگم کے غصے اور جلال سے خائف شرمیلی نے جھٹ نفیسہ کے ہاتھ سے جھاڑن لے لی۔

''ہاں، ہاں جاؤ جا کر کچن میں زاہدہ باجی کا ہاتھ بٹاؤ۔ مہارانی شرمیلی بھی کچھ ہاتھ پیر ہلالیں گی۔'' شکیلہ بیگم کا لہجہ اب بھی درشتگی کے رنگ میں رنگا تھا۔ نفیسہ دانت نکوستی کچن کی جانب چل دی۔ جانتی تھی صفائی اب ہوجائے گی۔ ماں کا غصہ شرمیلی باجی کو تیر کی طرح سیدھا رکھے گا۔

''ارے تم کہاں تھمی آرہی ہو کچن میں..... صفائی کرو جا کر.....'' کھیر پر بادام سجاتی زاہدہ بیگم نے کچن میں داخل ہوتی نفیسہ کو گھرکا۔

''وہ جی صفائی شرمیلی باجی کررہی ہیں تو بیگم صاحبہ نے مجھے آپ کی مدد کے لیے کچن میں بھیج دیا۔'' نفیسہ نے کچن میں پھیلاوے کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ کچن ابتر حالت میں تھا۔

''اچھا میں بھی کہوں شکیلہ کس پر اپنا غصہ نکال رہی ہے۔ چلو یہ بھی اس کے لیے غنیمت ہے، شرمیلی ماں کے غصے سے تو ڈرتی ہے اور ڈانٹ بھی خاموشی سے سن لیتی ہے۔ ایک ہماری اولاد ہے، غصہ ہمہ وقت ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اِدھر کوئی سخت بات کہی اُدھر پھوں، پھوں شروع..... اب میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے۔ شکیلہ کی طرح اب میں بھی اپنی اولاد کو تیر کی طرح سدھار رکھوں گی۔ لیکن نہ جانے یہ کس صدی میں وقوع پزیر ہوگا کہ ہماری اولادیں بھی نارمل انسانوں کی طرح رہنا سیکھیں گی۔'' زاہدہ نے سرد آہ بھری۔

''غصیلی باجی.....'' نفیسہ کے باقی کے الفاظ زاہدہ بیگم کی گھوری پر منہ میں ہی رہ گئے۔ جھٹ لفظوں کی تصحیح کی۔

''وہ میرا مطلب ہے کہ نازنین باجی کیا اپنے کمرے میں ہیں؟''

''شرمیلی'' لفظ شکیلہ بیگم اور زاہدہ بیگم کے لیے قابلِ قبول تھا۔ خود بھی مہرالنسا کو اسی نام سے پکارتی تھیں لیکن نازنین کو (جو ہمہ وقت غصے میں رہتی تھی) اسے غصیلی نہ کہنے دیتی تھیں اور نہ خود کہتی تھیں۔ کیونکہ نازنین ایسی توپ تھی جس کی گولہ باری سے نفیسہ شہادت کا رتبہ بھی پاسکتی تھی۔

''تو اور اس نے کہاں جانا ہے؟ اپنے کمرے میں ہی ہے میری بگڑی اولاد..... اب سوال جواب بند کرو اور سنک میں پڑے برتنوں کا ڈھیر ختم کرو..... اور کچن کو اپنی اصل حالت میں لاؤ۔ کھانا تو تقریباً تیار ہی ہے۔ شکیلہ کو بھیجتی ہوں باقی کا دیکھ لے گی۔'' زاہدہ فریج میں کھیر کا باؤل رکھتے ہوئے بولیں۔ نفیسہ ان کے گھر سات سالوں سے کام کررہی تھی۔ تیرہ سال کی تھی جب آئی تھی۔ اب بیس کی ہوچکی تھی۔ اس گھر کے مکینوں میں رچ بس گئی تھی۔ نفیسہ سے پہلے نفیسہ کی ماں یہاں کام کرتی تھی اب وہ بیمار تھی۔ نفیسہ، زاہدہ بیگم کا حکم سن کر سنک کی جانب بڑھ گئی۔ اور وہ کچن سے نکل گئیں۔ نفیسہ کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔

☆☆☆

فرہاد اور تیمور نے رکشے سے اتر کر پھولوں کی بیل سے ڈھکے گیٹ کے ساتھ لگی نیم پلیٹ کو بغور پڑھا۔ فرہاد نے موبائل میں سیو ایڈریس کو نیم پلیٹ پر لکھے

ایڈریس سے ملایا وہ مطلوبہ گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ فرہاد اور تیمور نے پُرسکون سانس خارج کی۔ آخر کار وہ لاہور کے اس خوب صورت علاقے ڈیفنس میں خوب صورت پھولوں سے ڈھکے گھر میں بنا خوار ہوئے پہنچ گئے تھے۔ جونہی تیمور نے بیل بجانا چاہی فرہاد نے ذیلی گیٹ کی طرف اشارہ کیا جو کھلا ہوا تھا۔ دونوں کو گھر کے مکینوں کے اطمینان پر حیرت ہوئی۔ جنہوں نے گیٹ یونہی کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ کوئی بھی چور اچکا اندر داخل ہو سکتا تھا۔

''یار معیوب لگتا ہے یوں بنا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا..... بیل بجاؤ۔'' فرہاد نے تیمور کو احساس دلایا جو گھر کے اندر قدم رکھنے کو تھا۔ تیمور نے بیل پر ہاتھ رکھا تو علم ہوا بیل خراب تھی۔

''چلو اب ایک تو سفر نے تھکا ڈالا ہے، اوپر سے تمہاری سوچ بچار.....'' تیمور، فرہاد کی مزید سنے بغیر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اسے بھی پیش قدمی کرنا پڑی۔

''واؤ.....'' بے ساختہ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا..... پورچ کے دائیں طرف واقع لان میں گویا پھولوں کی بہار اتری ہو۔ ہر طرف پھول ہی پھول، سرسبز نرش گرین گھاس..... دیوار کے ساتھ سرسبز درختوں کی قطار..... درخت زیادہ اونچے نہ تھے۔ ان درختوں پر لٹکتے پنجرے جن میں رنگ برنگ چڑیاں اور طوطے قید تھے۔ لان کے بیچوں بیچ کین کی چار عدد کرسیاں اور میز رکھی تھیں۔ وہ سراہتے ہوئے آگے بڑھے تو مین ڈور جو لاؤنج میں کھلتا تھا اس کے آس پاس سجے گملے دیکھ کر وہ اس گھر کے مکینوں کے ذوق کو داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ اس گھر میں اتری فطرت کے نظاروں کی بہار نے ان کی آدھی تکان سمیٹ لی تھی۔ وہ گملوں میں سجے پھولوں کو سراہتے ہوئے اپنی ہی دُھن میں لاؤنج کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو تیمور بری طرح کسی سے جا ٹکرایا۔

☆☆☆

شرمیلی تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکی تھی۔ لیکن صفائی مکمل ہو چکی تھی پوری صفائی کے دوران اس نے

قرآن کا حق

قرآن کا حق سال میں کم سے کم دو بار ختم کرنا ہے اگر نہیں کیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے فریاد کرے گا کہ یہ کون سے مسلمان تھے جنہوں نے یہ کلام پڑھنا گوارا ہی نہیں کیا۔

ایک رکوع روزانہ پڑھنے سے سال میں تین قرآن پاک مکمل ہو سکتے ہیں۔

جس طرح ہم دنیاوی کاموں کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں تو کلام پاک کے لیے کیوں نہیں جبکہ ہماری، دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔

از: نگہت غفار، کراچی

اپنی بڑی سی چادر کو اپنے پورے وجود سے سرکنے نہ دیا تھا۔ شکیلہ بیگم جو جائزہ لینے آئی تھیں، شرمیلی کو لاؤنج کے دروازے کے پاس کھڑے دیکھ کر ارد گرد کا جائزہ لیا تو گونا گوں سکون محسوس ہوا۔

''چلو شکر ہے کسی کام کی تو ہے..... یا اللہ اس کا گھر بنا دے۔'' رقت سے پُر لہجے میں آہستگی سے انہوں نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی۔

''شرمیلی اب اپنے کمرے میں جا کر اپنا حلیہ درست کر لو..... میں ذرا پائے چیک کر لوں..... مہمان بھی پہنچنے والے ہوں گے۔'' نرمی سے کہہ کر وہ کچن کی جانب چل دیں۔ شرمیلی نے تنقیدی نگاہوں سے لاؤنج کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر جھاڑو اور پوچا اٹھا کر لاؤنج کے دروازے سے باہر نکلنے ہی لگی تھی کہ اندر آتے وجود سے بری طرح ٹکرائی۔ جھاڑو ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ ناک سے عینک پھسل کر لبوں تک آ پہنچی۔ تیمور نے چادر میں لپٹی اس نازک سی لڑکی کو دیکھا۔

''سوری، آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔'' نرمی بھرا استفسار..... شرمیلی کے ہوش اڑا گیا۔ گھبراہٹ میں وہ چادر سیٹ کرتی اپنے منہ کو بھی چادر میں لپیٹ گئی۔

''ملازمہ ہو کر اتنا گہرا پردہ..... آپ کو نظر کیسے آتا ہوگا۔ آپ لوگوں کے گھروں میں اتنا تنبو لپیٹ کر

کام کیسے کر لیتی ہیں۔'' تیمور کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ شرمیلی کے دل پر گھونسا پڑا۔

''مجھے گھر، گھر کام کرنے والی ملازمہ سمجھ لیا۔'' آنسو تو جیسے تیار بیٹھے تھے فوراً نینوں میں بھر گئے۔ جھاڑو اور پوچا چھوڑ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بھاگی یہ الگ بات ہے کہ دو دفعہ صوفے سے بھی ٹکرائی۔

''اُف میرے اللہ عجیب لڑکی ہے۔ منہ پر چادر لپیٹی ہوئی ہے اور اندھا دھند بھاگ رہی ہے۔ ٹکریں تو کھانی ہی تھیں۔'' تیمور حیران تھا۔ فرہاد خاموشی سے سارا منظر ملاحظہ کر رہا تھا۔

''چلو اب اندر.....'' فرہاد نے تیمور کو آگے دھکیلا تو دونوں ہی اپنے قدموں میں پڑے جھاڑو اور پوچا دیکھ کر رہ گئے۔ عجیب استقبال ہوا تھا ان کا..... اچانک کمرے سے نکلتی نفیسہ کی نظر دو لڑکوں پر پڑی تو وہ ٹھٹکتی ہوئی اپنا رنگین پراندہ لہراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی جو جھاڑو اور پوچے کو پھلانگ کر قدم آگے بڑھا چکے تھے۔

''آپ دونوں مہمان ہیں ناں.....؟'' نفیسہ کے لہجے میں اشتیاق بھی تھا اور جوش بھی۔

''جی ہم ہی ہیں مہمان..... جن کے استقبال کے لیے نہ صرف آپ لوگوں نے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا بلکہ قدموں میں جھاڑو اور پوچا بھی نچھاور کر دیا۔'' تیمور لاؤنج کے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے شائستگی سے بولا۔ فرہاد البتہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ارد گرد کا طائرانہ نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔

''اوہ جی بس مجھ سے غلطی ہوگئی میں ابھی بند کر کے آتی ہوں۔'' نفیسہ لاؤنج کے دروازے کی طرف لپکی جاتے، جاتے جھاڑو، پوچا بھی اٹھا کر لے گئی۔

''یار ابھی تک ملازماؤں سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ عجیب ہیں گھر کے مکین۔ مہمان بیٹھے ہیں اور میزبان ندارد.....'' فرہاد نے بھی لب کشائی کی۔ اسی وقت نفیسہ پھر بوتل کے جن کی طرح ان کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

''جی کیا لیں گے ٹھنڈا یا گرم؟'' اس نے مہمان نوازی میں ادب آداب کو بھی ملحوظ رکھا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ مہمان جواباً کوئی فرمائش کرتے یا میزبانوں کو بلانے کی درخواست کرتے۔ ایک چنگھاڑ تھی جو بلند ہوئی تھی اور در و دیوار کو لرزا گئی تھی۔

''نفیسہ، نفیسہ کہاں مر گئی ہو، فوراً میرے کمرے میں پہنچو.....'' نفیسہ کا خون خشک ہوا ساتھ ہی چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''جی، جی، جی آئی ابھی..... فوراً آئی۔'' نفیسہ بدربط جملے بولتی بجلی کی سی رفتار سے بھاگتی سیڑھیوں کو دھپ، دھپ پھلانگتی اوپر غائب ہوگئی۔ سیڑھیاں لاؤنج سے اوپر جاتی تھیں۔

''توبہ! آواز تھی کہ شیر کی دھاڑ۔ لگتا ہے محترمہ کے گلے میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہے۔ دل ہی دہلا کر رکھ دیا۔'' تیمور کا ہاتھ اب بھی دل پر تھا۔ صد شکر اب لاؤڈ اسپیکر خاموش ہوگیا تھا۔ فرہاد کا اپنا دل دھک، دھک کر رہا تھا۔ آواز تو لڑکی کی تھی لیکن خاصی خوفناک تھی۔ وہ اپنا سامان قدموں میں رکھے ارد گرد دیکھنے لگے کہ شاید کسی طرف سے کوئی معقول خاتون بھی نمودار ہو جائیں۔

☆☆☆

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری چیزوں کی ترتیب خراب کرنے کی۔'' نازنین اب ذرا دھیمی آواز میں غرائی تھی کیونکہ ابھی، ابھی اسے یاد آیا تھا کہ گھر میں مہمان تشریف لانے والے ہیں۔ غصہ تو وہ کنٹرول کر نہیں کر سکتی تھی۔ آواز پر بمشکل کنٹرول کیا تھا۔ غصے کے باعث اس کا گلابی چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ نفیسہ کونے میں کھڑی جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرتی کانپ رہی تھی۔ شکیلہ اور زاہدہ جو اپنے، اپنے کمروں میں اپنا حلیہ درست کر رہی تھیں۔ نازنین کی چنگھاڑ سن کر اس کے کمرے میں بھاگی چلی آئی تھیں۔ بارہ مرلے کے گھر میں شرمیلی، عصیلی، زاہدہ اور شکیلہ کے کمرے اوپر تھے۔ لاؤنج، ڈرائنگ روم، کچن کے علاوہ .... گیسٹ روم کے دو کمرے نیچے تھے۔ اہل خانہ کی رہائش اوپر ہی تھی۔ وہ دونوں نازنین کے کمرے

میں آئیں تو اسے شدید غصے میں پایا۔

''اب غصہ تھوک دو نازنین..... غلطی ہوگئی نفیسہ سے۔ ابھی ٹھیک کر دیتی ہے۔'' شکیلہ نے نازنین عرف غصیلی کا غصہ فرو کرنا چاہا۔ لیکن نازنین کو اپنے غصے پر کنٹرول ہوتا تو وہ غصیلی کیوں کہلاتی۔ وہ اس آگ برساتی نگاہوں سے نفیسہ کو دیکھتی رہی اور وہ کانپتے ہاتھوں سے اس کے کمرے کی اشیا کو ترتیب دیتی رہی جسے وہ اپنی مرضی سے سیٹ کر کے غصیلی باجی سے داد وصول کرنا چاہتی تھی۔ اسے بہت اچھی داد مل چکی تھی۔ دل میں وہ پکی توبہ کر چکی تھی۔ آئندہ وہ کوئی کوتاہی نہیں کرے گی۔

''کچھ شرم لحاظ کر لو..... یا تھوڑی سی شرمیلی سے مستعار لے لو۔ گھر میں مہمان آنے والے ہیں اور تم نے نیا تماشا لگا لیا ہے۔ خبردار اب تمہاری اونچی آواز بھی مجھے سننے کو ملی۔ گلا گھونٹ دوں گی تمہارا۔'' زاہدہ کا نادرانہ جلال عود کر آیا تھا۔ نازنین نے جواباً پھر نفیسہ کو گھوری سے نوازا تھا۔

''وہ بی بی جی مہمان تو آگئے ہیں، لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ میں ان کو چائے پانی کا پوچھ ہی رہی تھی جب نازنین باجی کی چنگھاڑ میرے کانوں میں پڑی۔''

اس کی بات پر نازنین کے غصے کا غبارہ پھر پھولنے لگا تھا۔

''کیا کہا تم نے؟'' وہ پھر غرائی۔ نفیسہ کے ہاتھ پیر نئے سرے سے پھول گئے۔ شکیلہ اور زاہدہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

''کیا سوچتے ہوں گے وہ دونوں..... غصیلی اب تمہاری آواز نہ آئے۔ وگرنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' زاہدہ نے دانت پیس کر دھیمی آواز میں تنبیہ کی۔

''میرا نام نازنین ہے۔'' بے نیازی بھری اطلاع ماں کے گوش گزار کی۔

''جس دن غصے نے تمہاری جان چھوڑ دی۔ اس دن تمہیں غصیلی نہیں نازنین کہہ لوں گی۔ چلو شکیلہ یہ اولاد ہمیں اس عمر میں خوار کرے گی۔'' وہ دونوں تیزی سے اس کے کمرے سے نکلی تھیں۔

''معاف کرنا بیٹا..... ہم اپنے کمروں میں تھے، تم دونوں کب پہنچے.....؟'' شکیلہ اور زاہدہ دونوں بہنیں والہانہ انداز میں تیمور اور فرہاد کے سر پر باری، باری پیار دیتے ہوئے بولیں۔

''بس آنٹی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔'' فرہاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ زاہدہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر دونوں کا حال احوال پوچھنے لگیں۔ شکیلہ بیگم کچن میں چلی گئیں۔ ان کے لیے تازہ پھلوں کا جوس نکالا تھا۔ پہلے وہ سرو کرنا تھا۔ پھر کھانا لگانا تھا۔ نفیسہ کو تو غصیلی نے کمرے سے نکلنے ہی نہیں دینا تھا۔ ان کی اپنی اولاد شرم کی بُو بُو مر کر بھی کمرے سے نہ نکلتی، اب جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ فرہاد اور تیمور کی خوب خاطر مدارت کر کے شکیلہ اور زاہدہ دونوں کو الگ، الگ کمروں میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ فرہاد اور تیمور تو اتنی عزت افزائی پر بے حد خوش تھے۔ تھے تو وہ دونوں بھائی لیکن الگ، الگ کمرے کی سہولتوں سے مستفید ہونے میں جو مزہ تھا وہ انہیں اب ملنے والا تھا۔ وہ اصل میں نہیں جانتے تھے کہ شکیلہ اور زاہدہ آنٹی نے دونوں کو الگ، الگ روم کیوں دیے تھے۔ شکیلہ بیگم نے تیمور کو اپنی شرمیلی کے لیے اور زاہدہ نے فرہاد کو اپنی غصیلی کے لیے پسند جو کر لیا تھا۔ شرمیلی اور غصیلی کی شادی ایک ایسا بلند و بالا پہاڑ تھا جسے سر کرنا دونوں ماؤں کو ناممکن لگتا تھا۔ شاید اب سر ہو جائے۔ وہ نئے سرے سے امید باندھ چکی تھیں۔

☆☆☆

شکیلہ بیگم اور زاہدہ بیگم دونوں سگی بہنیں ایک ہی گھر میں سگے بھائیوں سے بیاہی گئی تھیں۔ زاہدہ بیگم کے شوہر خلیل احمد اور شکیلہ بیگم کے شوہر جلیل احمد کا چھوٹے پیمانے پر بزنس تھا۔ جو رفتہ، رفتہ ترقی کرتے وسیع ہوتا گیا۔ ڈیفنس میں شاندار گھر تعمیر کروایا اور پوری فیملی وہاں شفٹ ہوگئی۔ دونوں بھائیوں نے مارکیٹ میں چند دکانیں خرید کر کرایے پر چڑھا دیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ زاہدہ بیگم اور خلیل احمد

کی اکلوتی اولاد نازنین جو بچپن سے ہی غصیلی طبیعت کی مالک تھی۔ دونوں کی مزید اولاد ہوئی نہیں اس لیے ساری محبتیں نازنین پر نچھاور کردیں۔ باپ کی وفات کے بعد تو وہ خودسر بھی ہوگئی۔ اسکول میں کبھی کسی کا سر پھاڑ دیتی تو کسی سے جھگڑ لیتی۔ پورے تعلیمی کیریئر کے دوران اس کی لڑائی کی داستانیں زاہدہ بیگم کا فشارِ خون بلند کیے رکھتیں۔ سہیلی کیسے بنتی اس کی۔ غصہ ہی اس کی گاڑھی سہیلی بن گیا اور وہ کلاس فیلوز میں آس پاس کے گھروں میں غصیلی مشہور ہوگئی۔ وہ غصے میں کسی کو نہ بخشتی تھی۔ بھلے نقصان اٹھانا پڑ جائے یہ الگ بات اس کے غصے کے ہر جانے ہمیشہ زاہدہ بیگم نے بھرے تھے۔ غصیلی نے بی ایس سی کرکے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ زاہدہ بیگم اللہ کا کروڑ، کروڑ شکر ادا کرتیں کہ بی ایس سی تو اُن کی اولاد نے کرلی تھی۔ دوسری طرف شکیلہ بیگم اور جلیل احمد کی اکلوتی اولاد مہرالنسا تھی۔ بے حد شرمیلی طبیعت کی مالک وہ نازنین کے بالکل الٹ تھی۔ مہرالنسا، نازنین سے دو سال چھوٹی تھی۔ مہرالنسا نہ کسی سے گھلتی ملتی، بس اپنے آپ میں مگن رہتی، بہت کم بولتی۔ صد شکر گریجویشن وہ بھی کرچکی تھی۔ کتابوں سے گہری دوستی تھی۔ انسانوں سے کٹ کر رہتی۔ کتابوں سے دوستی کا نتیجہ تھا۔ نظر کی عینک اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں پر سج چکی تھی۔ جلیل احمد اور خلیل احمد دونوں بھائی بزنس کے سلسلے میں دوسرے شہر جارہے تھے جب ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ دونوں موقع پر ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تب غصیلی چھٹی کلاس میں اور شرمیلی چوتھی کلاس میں تھی۔

زاہدہ بیگم اور شکیلہ بیگم اپنے، اپنے شوہروں کی وفات کے بعد مرد بن گئیں۔ پھر بزنس یا اعتماد منیجر کے سپرد کیا۔ پہلے بزنس کے معاملات خود دیکھے، خود بھی مسلسل چیک کرتی رہتیں۔ دکانوں کے کرایے کی وصولی ہر ماہ باقاعدگی سے ہوجاتی۔ روپے پیسے کی تنگی نہیں تھی۔ پریشانی ان کی تب شروع ہوئی جب شرمیلی اور غصیلی تعلیم سے فارغ ہوکر گھر بیٹھیں۔ وجہ، پریشانی دونوں کا رشتہ طے نہ پانا تھا۔ کوئی جائداد کے لالچ میں بھی غصیلی جیسے طوفان سے شادی پر آمادہ نہ تھا۔ شرمیلی اپنے ہی حجرے میں صبح شام مقیم رہتی۔ بقول شکیلہ بیگم کے غصیلی اور شرمیلی کزنز ہونے کے باوجود مہینوں ایک دوسرے سے کلام نہ کرتی تھیں۔ دونوں کے رشتے طے نہ ہونے کے باعث دونوں بہنوں کی راتوں کی نیندیں اڑ چکی تھیں لیکن دونوں نمونے اپنی، اپنی روش بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ کراچی میں رہائش پزیر ان کی چچازاد بہن سلیمہ نے اپنے بیٹوں کی لاہور آمد کے متعلق بتایا کہ دونوں کو مشہور ملٹی نیشنل کمپنیوں میں جاب مل گئی ہے اِدھر ان دونوں نے جھٹ دونوں لڑکوں کو اپنے گھر رکھنے کی پیشکش کر ڈالی کہ بچوں کو گھر کا سکون، آرام ملے گا۔ جب سلیمہ نے ان کو یہ بتایا کہ ''دونوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں اور میں تو ان لڑکیوں کو بہو بناؤں گی جو میرے بیٹوں کو پسند ہوں گی۔ زندگی تو میرے بیٹوں نے گزارنی ہے'' تب ان کے دل میں یہ امید بندھ گئی۔ ہوسکتا ہے، ہماری ''نمونیاں'' ان لڑکوں کے دل کو بھا جائیں اور ان کے نصیب کھل جائیں اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں حد سے زیادہ حد میں رہنے کی قائل ہیں۔ سوفرہاد اور تیمور کو گھر میں رکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ لیکن غصیلی نے اپنا بھونپو سنا دیا تھا، نہ جانے شرمیلی کس انداز میں سامنے آتی وہ دونوں یہ نہیں جانتی تھیں کہ شرمیلی تو دونوں لڑکوں سے ملازمہ کا خطاب پہلے ہی پا چکی ہے۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا روشن طلوع ہوا۔ فرہاد اپنے بیڈ پر لیٹا پُرسکون نیند میں ڈوبا تھا، اس کے کمرے کی کھڑکی لان میں کھلتی تھی۔ کھلی کھڑکی سے تازہ ہوا، روشنی اور پرندوں کی مدھر چہکار نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تو اس کی آنکھیں کھل گئی۔ وہ کسلمندی سے بستر پر لیٹا تھا۔ پھر بستر چھوڑ کر کھڑکی میں آکھڑا ہوا تو نگاہیں جیسے پلٹنا بھول گئیں۔ وہ جو کوئی بھی تھی بے حد حسین تھی۔ گلابی رنگت، ننھی سی ستواں ناک، لمبے، چمکدار براؤن بال

پشت پر بکھرے تھے۔ وہ اس پل اسے صبح کی پری لگی تھی۔ فرہاد جیسے کھو سا گیا اس کے حسن و دلکشی میں۔ تھی تو یہ فضول حرکت لیکن اس کا دل اس مہ وش پر اسی پل لٹو ہو گیا تھا۔ اس دوران نفیسہ اس حسین مورت کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ فرہاد پردے کی اوٹ میں ہو کر حسین پری کو دیکھنے لگا۔

''تم نے میرے پرندوں کو پانی نہیں ڈالا اور نہ تم نے پنجروں کی صفائی کی ہے۔'' وہ حسین پری نفیسہ سے کرخت لہجے میں مخاطب ہوئی تھی گو آواز زیادہ بلند نہ تھی لیکن اسے آواز نہیں چنگھاڑ کہنا زیادہ مناسب تھا جو فرہاد کی سماعتوں تک بخوبی پہنچ چکی تھی۔ اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ حسین پری کا لب ولہجہ انتہائی درشت، کھردرا اور آگ برساتا تھا۔

''وہ نازنین باجی..... وہ جی۔'' نفیسہ ہکلانے لگی۔

''کیا وہ جی، وہ جی کی رٹ لگا رکھی ہے، فوراً پنجرے صاف کرو اور ان کو پانی ڈالو۔'' نازنین تو عام حالات میں بھی غصے میں رہتی تھی اب پھر نفیسہ کی غلطی تھی، وہ بخشنے کو تیار نہیں تھی۔ نفیسہ جلدی، جلدی حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ غصیلی شہزادی چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی پھولوں کے چھوٹے، چھوٹے گملوں کی جانب بڑھ گئی۔ فرہاد سمجھ گیا یہ زاہدہ آنٹی کی بیٹی ہوگی۔ ابھی وہ اس غصیلی شہزادی کو نگاہوں کے حصار میں لیے کھڑا تھا کہ اچانک ہو کی آواز سے اچھل پڑا۔

''کسے یوں مدہوش ہو کر دیکھا جا رہا ہے کہ چھوٹے بھائی کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔'' تیمور جو... بھرپور نیند لے کر فریش ہو کر فرہاد کے کمرے میں آیا تھا جس کا لاک رات فرہاد نے لگانے کی زحمت تک نہ کی تھی سو دروازہ کھول کر وہ بت بنے فرہاد کے پاس آ کھڑا ہوا جو ٹکٹکی باندھے پردے کی اوٹ سے نہ جانے کس کے حسین تصور میں گم تھا۔

''کچھ نہیں دیکھ رہا بھائی..... بس لان کی خوب صورتی ملاحظہ کر رہا تھا۔'' فرہاد اپنی نگاہوں کی چوری تیمور پر ابھی آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''واقعی یار لان کی خوب صورتی تو واقعی مسمرائز کر دینے والی ہے ذرا میں بھی تو نظروں کو تراوٹ بخشوں۔'' تیمور، فرہاد کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ لان میں نفیسہ پنجروں کی صفائی کر رہی تھی اور ایک بے حد حسین لڑکی لان میں ٹہل رہی تھی۔

''واہ بھئی واہ کیا خوب صورتی ہے، میرے بھائی نے تو گم شدہ ہونا ہی تھا۔ ویسے فرہاد لڑکی اچھی ہے، تمہارے ساتھ سوٹ کرے گی۔'' فرہاد جواباً سرد آہ بھر کر رہ گیا کہ لڑکی واقعی حسین تھی لیکن غصے کا طوفان تھی۔ وہ دونوں پنچھروں کو دیکھنے لگے جن میں خوب صورت رنگ برنگی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ نفیسہ دل جمعی سے آخری پنجرہ صاف کر رہی تھی کہ پنجرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رنگ برنگی چڑیاں پنجرے کے کھلے دروازے سے پھر سے اُڑ گئیں۔ نفیسہ کے بدن میں خوف سے گویا لہو جم گیا کیونکہ نازنین جو اس پنجرے کے چڑیوں کو نرم نگاہوں سے تک رہی تھی۔ اب خوب صورت آنکھیں شرارے اگل رہی تھیں۔ فرہاد کو یقین ہو گیا کہ اب نفیسہ کی خیر نہیں جبکہ تیمور اس لڑکی سے اتنے برے ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا جو نفیسہ کی اس غلطی کے بعد اس کی آنکھوں نے ملاحظہ کیا تھا۔

''اُف تم نے میری چڑیا اڑا دیں۔ نفیسہ تم نہیں بچو گی آج میرے ہاتھوں، تمہارے ہاتھوں میں جان نہیں تھی کیا۔'' نازنین گلا پھاڑ کر چیخی تھی آواز بھی بیچی کرنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔ تیمور اور فرہاد نے بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

''توبہ، توبہ یہ تو پوری بلا ہے بلا..... اب اس بات پر اتنا چیخنے کی کیا ضرورت..... غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔'' تیمور کو بہت برا لگا تھا اس لڑکی کا یوں چلانا جبکہ فرہاد بس دیکھے گیا نازنین کو جس نے کرسی اٹھا کر نفیسہ کو دے ماری تھی۔ نفیسہ کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گئی تھی لیکن نازنین اتنے غصے میں آ چکی تھی وہی پنجرے جن کی خاطر وہ نفیسہ پر اپنا طیش اگل رہی تھی درختوں سے اتار، اتار کر نفیسہ کو مارنے لگی۔ پنجروں

میں چڑیاں بھی اس نئی افتاد پر پریشان ہوئیں۔ وہ غصے سے پاگل ہوچکی تھی۔ نفیسہ اس کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جہاں فرہاد اور تیمور پردے کی اوٹ میں ہوکر سارا سین ملاحظہ کررہے تھے۔ پنجرے نفیسہ کو تو نہ لگے کیونکہ وہ خود کو جھکائی دے کر بچالیتی تھی۔ پریکٹس تھی شاید لیکن پنجرے کھڑکی کے ساتھ ٹکراتے ضرور تھے۔ نازنین کا نشانہ پختہ نہیں تھا۔ پھر پنجرے ختم ہوئے تو گملوں میں لگے ننھے، ننھے پودوں کی شامت آگئی۔ نفیسہ شاید تیمور اور فرہاد کو پردے کے پیچھے دیکھ چکی تھی وہ کھڑکی کے سامنے سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''اُف یہ لڑکی پاگل لگتی ہے۔ انسانوں سے تو کیا ان پرندوں اور پودوں سے بھی پیار نہیں جنہیں محترمہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔''

حسین مورت کے اندر غصے کا خوفناک جن چھپا تھا۔ فرہاد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ دل کو اچھی لگی تھی لیکن خوف زدہ بھی کرگئی تھی۔ عصیلی شہزادی.....

☆☆☆

''تمہاری نازنین باجی اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں۔'' فرہاد نے اپنے لہجے کو سرسری بنا کر کمرے کی صفائی کرتی نفیسہ سے استفسار کیا۔ تیمور نے معنی خیز انداز میں بھائی کا مصنوعی سرسری انداز ملاحظہ کیا تھا۔

''کیا بتاؤں آپ کو صاحب..... اکیلی جان پورے گھر کا کام..... ابھی بتانے بیٹھی ناں تو کہیں بڑی بیگم صاحبہ سے چھترول ہی نہ ہوجائے۔'' نفیسہ کہہ کر اپنے کام میں مگن ہوگئی۔

''تم اکیلی کام کیوں کرتی ہو..... وہ دوسری باپردہ ملازمہ کیوں نہیں کرتی کام..... جس نے اس دن چادر لپیٹ رکھی تھی؟'' تیمور کا اتنا پوچھنا تھا کہ نفیسہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اوئے ہوئے صاحب جی، آپ نے شرمیلی باجی کو ملازمہ کہہ دیا۔ وہ تو شکیلہ بیگم صاحبہ کی بیٹی ہیں، حد سے زیادہ شرمیلی..... کمرے سے بہت کم نکلتی ہیں، بولتی بھی بہت ہی کم ہیں۔ لیکن جب بولتی ہیں بہت عزت دے کر بولتی ہیں۔'' نفیسہ کی ہاتھ کے ساتھ، ساتھ زبان بھی چل پڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف کچھ کہتی نگاہوں سے دیکھا۔

''اُف امی نے تو ہمیں نفسیاتی مریضوں کے گھر بھیج دیا ہے۔''

''صاحب جی ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو۔'' وہ جھاڑن چھوڑ کر ان سے مخاطب ہوئی۔ دونوں وہیں کھڑے کھڑے ہمہ تن گوش ہوگئے۔

وہ کمرے کے کھلے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''دونوں بیگمیں ناں آپ دونوں کو داماد بنانا چاہتی ہیں۔'' فرہاد اور تیمور نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ ''جب شرمیلی باجی اور عصیلی باجی کے ابو فوت ہوئے تھے ناں تب دونوں بہت چھوٹی تھیں۔ زاہدہ بیگم اور شکیلہ بیگم کو کاروبار نے مصروف کردیا۔ وہ باہر کا کام دیکھنے کے لیے بچیوں کو میری ماں کے پاس چھوڑ کر چلی جاتیں تب میری ماں ان کے گھر کام کرتی تھی۔ ماؤں کی مکمل توجہ تو دونوں کو تب نصیب ہوئی جب وہ بڑی کلاسوں میں پہنچیں۔ لیکن تب تک وہ اپنی، اپنی الگ دنیا بسا چکی تھیں۔ یہ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کیونکہ جب بھی نازنین باجی وہ عصیلی باجی، ناں مجھے مارتی ہیں تو میری ماں مجھے سمجھاتی ہے۔ ''اس گھر کے مکینوں نے ہمیشہ ہمارا بہت خیال رکھا ہے۔ اس لیے برداشت کیا کرو.....'' اور پتا ہے ان لوگوں نے پورے تین مرلے کا مکان میری ماں کے نام لگایا ہے چونگی محلے میں۔ اس لیے تو مار کھا کر بھی یہاں ٹکی ہوئی ہوں اور تو اور ایک اور بات سنیں..... عصیلی باجی کے لیے ایک رشتہ آیا۔ لڑکا خود بھی ماں، بہنوں کے ساتھ آیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا لڑکے والوں کو عصیلی باجی بے حد پسند آئی تھیں اور لڑکا تو ان پر فریفتہ ہوگیا بس عصیلی باجی کے ایک نظر دیکھنے پر جذبات میں آکر وہ آنکھ مارنے کی حماقت کر بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا۔ عصیلی باجی تو گویا جلتے توے پر آبیٹھیں۔ اپنی جوتی اتاری اور تابڑ توڑ لڑکے کے سر پر برسادی۔ پھر کیسا رشتہ، کاہے کا رشتہ... لڑکے کی ماں اور

بہنیں کوسنے اور بددعائیں دیتے اپنے خوفزدہ بیٹے کو لے کر چلی گئیں، بدلہ لینے کے لیے لڑکے کی ماں نے پوری سوسائٹی میں مشہور کردیا کہ لڑکی پر جن عاشق ہے۔ سو دونوں لڑکیوں کے رشتے آنے ہی بند ہوگئے۔'' تیمور کا تو یہ سن کر حلق ہی خشک ہوگیا تھا۔ فرہاد کے کان سائیں، سائیں کرنے لگے۔ نفیسہ تو اپنے کام میں لگ گئی لیکن دونوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اب یہاں اس گھر میں کتنی احتیاط سے پھونک، پھونک کر رہنا ہوگا۔

دونوں کا آفس شروع ہوچکا تھا۔ امی کو وہ مطمئن کرچکے تھے کہ یہاں ہمیں ہر طرح کا آرام وسکون میسر ہے۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ زاہدہ آنٹی اور شکیلہ آنٹی ان کا بہت خیال رکھتی تھیں لیکن دوسری جگہ بھی رہائش کے لیے وہ کوشش کررہے تھے لیکن تب تک انہیں یہیں رہنا تھا۔ ابھی تک فرہاد اور تیمور کا نازنین اور مہرالنسا سے باقاعدہ سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ چاہتے تھے کہ سامنا ہو۔ فرہاد نے بھی دل کو لگام ڈال دی تھی۔ لیکن ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ملاقات نہ ہونا کیسے ممکن تھا۔ اور یہ ملاقات اتنی خوفناک تھی کہ فرہاد کئی راتوں اٹھ، اٹھ کر ڈرتا رہا۔

☆☆☆

اس روز عشا کے بعد تیمور اور فرہاد کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کررہے تھے۔ کیونکہ لان میں غصیلی صاحبہ براجمان تھی۔ اوائل نومبر کے دن تھے موسم بہت دلکش رہنے لگا تھا۔ وہ دونوں صاف ستھری سڑک پر چہل قدمی کے دوران گفتگو بھی فرمارہے تھے۔ تیمور اپنی عادت کے مطابق کوئی کنکر اٹھا کر دور پھینکتا۔ اس وقت دونوں کے علاوہ سڑک پر کوئی نہ تھا۔ تیمور نے پھر جھک کر موٹا سا کنکر اٹھایا اور بنا سوچے سمجھے سامنے پھینک دیا۔ گلی کا موڑ مڑ کر ان کے سامنے آتے کتے کو وہ کنکر لگا۔ کتا خاصا موٹا اور تگڑا تھا۔ اس کے منہ پر کنکر لگا تھا کنکر بھی پورا پتھر تھا۔ کتا سیخ پا ہوگیا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا ان کی طرف غرا کر بھاگا۔ دونوں کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ دونوں الٹے قدموں بھاگے تھے۔ فرہاد بھی کتے کے غصے کی لپیٹ میں آچکا تھا اس وقت تیمور کو کوسنے کا وقت نہیں تھا صرف بھاگنا تھا اور گھر پہنچنا تھا۔ وہ دونوں کھلے گیٹ سے گھر کے اندر داخل ہوئے تو کتا بھی ان کے ساتھ ہی داخل ہوگیا۔ فرہاد لان میں گھس گیا۔ جہاں غصیلی چیئر پر بیٹھی موبائل فون میں گم تھی۔ تیمور سیدھ میں بھاگتا لاؤنج میں داخل ہوا اور جھٹ لاک لگا دیا۔ یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی کہ کتا اس کے پیچھے ہے بھی یا نہیں..... پھولتا تنفس، ہانپتا وجود لیے وہ لاؤنج کے صوفے پر بے دم ہوکر گرنے کے انداز میں ڈھے سا گیا یہ جانے بنا کہ کوئی حواس باختہ ہوکر صوفے سے اٹھا تھا۔

فرہاد لان میں گھسا تو کتا ایک جست لگا کر اس کے پیچھے لپکا تو فرہاد کی چیخ نکلتے، نکلتے رہ گئی۔ غصیلی شہزادی اس افتاد کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اس کے غصے کا سورج سوا نیزے پر آپہنچا۔ جب فرہاد اس کے آس پاس بھاگتا کتے سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک نازنین کی نگاہ ساتھ والے گھر کے میرس پر کھڑی روبی پر پڑی جو اس سے محض دو سال چھوٹی تھی لیکن جلد شادی ہونے کے باعث کافی اتراتی پھرتی تھی۔ روبی بڑی دلچسپی سے فرہاد اور کتے کی دوڑ دیکھ رہی تھی۔ نازنین کو فرہاد کی بزدلی پر تپ چڑھ گئی۔ وہ کسی سے کیا ڈرتی وہ تو ڈراتی تھی۔ اس نے مالی بابا کا موٹا سا ڈنڈا جو دیوار کے ساتھ ہمہ وقت کھڑا رہتا۔ سرعت سے اٹھایا اور دھاڑ کر کتے سے مخاطب ہوئی جو بدلہ لیے بنا ٹلنے پر آمادہ نہ تھا۔

''تم بھاگتے ہو یا پھینٹی لگاؤں تمہاری.....''

نازنین ڈنڈا لیے اس کی جانب بڑھی تھی۔ کتا ڈنڈے سے زیادہ نازنین کے چہرے پر پھیلے خوفناک تاثرات دیکھ کر ڈر کر واپس دم دبا کر بھاگا تھا۔ فرہاد نے پھولتے تنفس پر بمشکل قابو پا کر دل ہی دل میں اس کی بہادری کو داد دی تھی۔ نازنین کتے کو بھگا کر فرہاد کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ مہمان لڑکا ہے۔

''بہت بزدل ہو تم ایک کتے سے ڈر گئے اور

بونگوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔'' نازنین کا کٹیلا لہجہ طنزیہ اور کھردرا تھا۔ فرہاد کو اچھی خاصی سُبکی اور ندامت ہوئی اس پل۔ اچانک دونوں کی سماعتوں نے قل قل ہنسی کی جھنکار سنی..... دونوں نے چونک کر ہنسی کی جھنکار کا منبع دریافت کرنے کے لیے ایک ساتھ سر اٹھایا تو روبی کو بری طرح کھلکھلاتے پایا۔ نازنین اور فرہاد کے اپنی جانب دیکھنے ..... پر وہ اپنے ٹیرس سے بلند آواز میں سراسر مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔

''واہ نازنین واہ..... تم تو بیچارے Dog سے بھی زیادہ خوفناک ہو۔ بیچارہ دم دبا کر بھاگ نکلا۔ صرف تمہیں دیکھ کر۔'' سراسر آگ لگانے والا لہجہ..... اور نازنین کے من میں بیچ بیچ آگ ہی تو بھڑک اٹھی تھی۔ لڑکی نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا اب ڈنک تو کھانے ہی تھے۔ فرہاد نے دہل کر سوچا جب اس نے نازنین کو ڈنڈا پھینک کر بجلی کی سی تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ فرہاد کی نظر لڑکی کی جانب اٹھی تو وہ موبائل کی مترنم گھنٹی بجنے پر موبائل کو کان سے لگائے بڑی مسکراہٹیں بکھیرتی نظر آئی۔ فرہاد کچھ سوچتا وہیں کھڑا دیکھتا رہا کہ آخر نازنین گئی کہاں ہے۔ یہ عقدہ بھی جلد کھل گیا جب اس نے لڑکی کے عقب سے نازنین کو نمودار ہوتے دیکھا۔ پھر لڑکی کی وہ درگت نازنین نے بنائی کے فرہاد کی اپنی چیخیں نکلتے، نکلتے رہ گئیں۔ وہ صحیح معنوں میں خوفزدہ ہو چکا تھا۔ نازنین اپنی تسلی کر کے لان میں آ کر پھر سے چیئر پر براجمان ہو چکی تھی۔ فرہاد خوف سے تھوک نگلتا لاؤنج میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

☆☆☆

تیمور کے بیٹھنے پر جب وہی چادر پوش نازک وجود حواس باختہ ہو کر اٹھ کر جانے لگا تو تیمور کی آگے کو پھیلی ٹانگوں سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔ عینک اڑ کر دور جا گری۔ تیمور نے جھٹ اٹھ کر اسے اٹھنے میں مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن مہر النسا عرف شرمیلی نے ہاتھ کو نظر انداز کیا اور نزدیکی کرسی پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ تیمور نے دور پڑا چشمہ لا کر اسے دیا۔ جسے اس نے اپنی نظر فرش پر گاڑے ہی وصول کیا۔

''چوٹ تو نہیں آئی آپ کو.....؟'' پہلے دن کی طرح تیمور نے آج بھی وہی سوال نرمی سے کیا تھا۔ مقابل شرمیلی تھی جو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی گویا فوت ہونے والی ہو۔

''آپ کمرے میں ہی ہر وقت کیوں پائی جاتی ہیں؟'' تیمور کی نگاہوں کے سامنے شکیلہ بیگم کا پریشان اور ستا ہوا چہرہ لہرایا تو وہ بے ساختہ استفسار کر بیٹھا۔ شرمیلی نے ان سنی کرتے قدم جانے کے لیے بڑھا دیے۔ تیمور کو وہ بالکل ابنارمل لگی اس پل۔ شکیلہ بیگم کی خاطر وہ ایک بار پھر شرمیلی کے سامنے جا کھڑا ہوا گویا اس کے جانے کے سارے راستے مسدود کیے۔

''آپ کو اپنی ماں پر رحم نہیں آتا۔'' اب کے تیمور کا لہجہ سخت تھا۔ جواباً شرمیلی منمنائی تھی لیکن تیمور کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ وہ بولی ہی اتنا دھیما تھی۔ دونوں آنٹیاں اپنے کمروں میں تھیں۔ اس پل تیمور نے اس شرمیلی کو نارمل انسان بنانے کی ٹھانی تھی۔ وہ کتے کا معاملہ بھول کر اب سنجیدگی سے شرمیلی بیگم کو انسان بنانے پر تل گیا تھا۔

''ذرا اونچا بولیں گی۔'' اس کا لہجہ بدستور سخت تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اس نمونے پر تپ چڑھ رہی تھی۔

''ہمیں جانے دیں۔'' شرمیلی قدرے ہمت کر کے اونچی آواز میں شاید پہلی بار کسی مرد سے بولی تھی۔

''کہاں جانے دوں؟'' تیمور سینے پر ہاتھ باندھ کر فرصت سے اس کے چادر میں چھپے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ اچھی خاصی نروس ہو چکی تھی۔ تیمور کی نگاہیں..... اُف وہ کہاں جائے..... شرمیلی بری پھنسی تھی۔

''مجھے میرے کمرے میں جانے دیں پلیز.....

شرمیلی کسی چٹان کی طرح تیمور کو اپنے سامنے استادہ دیکھ کر ہمت پیدا کر کے قدرے بلند آواز میں بولی تھی۔ اب اس نے اپنے لیے ہم کا صیغہ استعمال نہیں کیا تھا۔

''تو جائیں..... میں نے کب روکا ہے۔'' تیمور

زیرِلب مسکراتا سائڈ پر ہوا، اسے شرمیلی کی بوکھلاہٹ مزہ دے رہی تھی۔ وہ اجازت ملنے پر بندوق سے نکلی گولی کی طرح آگے بڑھی تو نظر کا چشمہ نہ لگانے کے باعث تیمور سے ہی آ ٹکرائی۔ چشمہ اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تیمور نے شرمیلی کو بازوؤں سے تھام کر مزید زمین بوسی سے روکا۔ اس کا دل مارے شرم اور خجالت کے دھڑ، دھڑ کرنے لگا۔ تیمور کو بھی اس پل اپنی کیفیت عجیب محسوس ہوئی تھی۔ کچھ الگ سا..... کچھ انوکھا سا احساس تھا جو اس پل جاگا تھا۔ اسی احساس نے اسی پل اس کے اندر پھر یہ خیال چٹکی سے اجاگر کیا کہ اسے شرمیلی کو نارمل انسانوں کی کیٹگری میں لانا چاہیے۔

''آپ اپنی دنیا میں مگن رہتی ہیں کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ آپ کی والدہ آپ کی وجہ سے کتنی پریشان ہیں۔ وہ افسردہ رہتی ہیں، آپ نے کبھی ان کے اندر جھانکنے کی کوشش کی؟ مائیں اور بیٹیاں تو آپس میں سہیلیاں ہوتی ہیں۔'' تیمور دھیمے پُروقار لہجے میں بول اٹھا تو شرمیلی کے دل پر پہلی بار کسی کے الفاظ نے اثر کیا۔ اس نے کھسکنے کا ارادہ موقوف کر کے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر مقابل کھڑے شاندار بندے کو دیکھا جس کے چہرے پر خلوص اور فکر کی پرچھائیاں تھیں۔ شرمیلی کو گومگو کیفیت میں کھڑا دیکھ کر وہ نرمی سے گویا ہوا۔ جیسے شرمیلی کو آج ہی ٹھیک کر کے دم لے گا۔

''کیا آپ میری ایک درخواست قبول کریں گی۔'' اور شرمیلی کو اس پل خود پر حیرت ہوئی جب اس کا سر آپوں آپ اثبات میں ہل گیا۔

''گڈ! تو پھر آپ کو اپنی امی کی ساری شکایات دور کرنا ہوں گی۔ وہ آپ کی ماں ہیں آپ کی توجہ اور محبت کی سب سے زیادہ حق ہیں۔ شرم و حیا عورت کا زیور ہے۔ مانا یہ ایک اچھی خصوصیت ہے جو آپ میں ہے لیکن جو چیز حد سے تجاوز کر جائے وہ اپنے لیے بھی نقصان دہ ہوتی ہے اور اپنے سے جڑے رشتوں کے لیے بھی تکلیف دہ..... اب آپ کو ناشتا، لنچ، ڈنر اپنی فیملی کے ساتھ کرنا ہے۔'' تیمور نے لمبی چوڑی نصیحت کا پلندا شرمیلی کو تھمایا تھا۔ جسے چار و ناچار اسے تھامنا پڑا کیونکہ تیمور کا سمجھانا اسے اچھا لگا تھا۔ پہلی بار دل کے آس پاس گھنٹیاں سی بجی تھیں جو اسے مسرور کر گئی تھیں۔

وہ خاموشی سے اس کی سائڈ سے ہو کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تیمور اس کی جانب بڑی میٹھی نگاہوں سے تک ہی رہا تھا جب جلا بُھنا فرہاد اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ تیمور نے چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا جو بیک وقت دو مناظر پیش کر رہا تھا۔ ڈرا، ڈرا اور تپا تپا۔

''تجھے کیا ہوا؟'' تیمور نے بھویں اچکا کر استفسار کیا۔ جواباً فرہاد دھیمی آواز میں ہی پھٹ پڑا..... اپنا گھر تو تھا نہیں کہ بھونپو آن کر دیتا۔

''تجھے کس خبیث نے مشورہ دیا تھا کہ تو کتے کو چھیڑ.....''

''میں نے کتے کو نہیں چھیڑا وہ خود ہی سامنے آ گیا تھا۔ اس میں میرا کیا قصور.....'' تیمور نے بے پروائی سے جواب دیتا چونک کر اس کے بدن کو چیک کرتے ہوئے بولا۔ ''کہیں کتے نے کاٹ واٹ تو نہیں لیا؟''

''جو توپ لان میں بیٹھی ہے اس کی موجودگی میں کتا اتنی جرأت نہیں کر سکا۔ بچ گیا میں لیکن وہ لڑکی اُف کیا مار لگائی ہے اس غصیلے جن نے اس کی۔'' جواباً فرہاد جل کر بولتا اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر گیا۔

''اوہ تو یہ کتنی خوفناک لڑکی ہے۔ بھائی ذرا سنبھل کر رہنا۔ کہیں دل نہ لگا لینا ورنہ ہر روز بدن کی ٹکور کرتے نظر آؤ گے۔'' تیمور نے اپنے تئیں مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ فرہاد نے گھور کر اس کی جانب دیکھا لیکن فوراً ہی چہرے کے تاثرات پُراسرار بناتے بولا۔

''یار مجھے یہ سمجھ نہیں آتی نازنین اتنے دھڑلے سے ان کے گھر جا کر اس لڑکی کی پٹائی بھی لگا آئی اور اس کے گھر کے افراد میں سے کسی نے روکا نہیں۔''

''ان کے گھر کے افراد گھر پر نہیں ہوں گے سمپل..... اب چلو کمرے میں۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔'' تیمور بے پروائی سے فرہاد کے کندھے پر بازو پھیلا کر

اسے کمرے کی جانب دھکیلتا بولا۔ ابھی وہ اپنے، اپنے کمروں میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے جب باہر..... یے تحاشا شور بلند ہوا۔ وہ دونوں بجلی کی سی تیزی سے لاؤنج کے دروازے کی طرف لپکے۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ شکیلہ اور زاہدہ بھی اپنے، اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ وہ عشا کے بعد بیٹیوں کے رشتے ہونے کے لیے وظائف میں مشغول تھیں۔ دونوں لاؤنج سے نکل کر لان میں آئیں تو دہل کر ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ فرہاد اور تیمور بھی پریشان کھڑے تھے۔ نازنین کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

''آپ ہمارے گھر کیوں آئی ہیں؟'' زاہدہ بیگم نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر زنانہ پولیس کی تین عدد عورتوں سے پوچھا جو کھوجی نگاہوں سے نازنین کو گھور رہی تھیں۔

''اپنی بیٹی سے پوچھو جو اپنے آپ کو طرم خان سمجھتی ہے۔ آپ کی بیٹی کے خلاف آپ کے ہمسائیوں نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ کی بیٹی نے ان کی بیٹی روبی کو اس کے گھر جا کر پیٹا ہے۔'' ہٹی، کٹی پولیس والی عورت نے اپنی آمد کا مقصد اگلا۔ فرہاد نے سرد آہ بھر کر تیمور کو دیکھا جو خاصا متفکر کھڑا تھا۔

زاہدہ بیگم اور شکیلہ بیگم کا خون خشک ہو گیا۔ اتنی ذلت دیکھنا باقی تھی اس غصیلی کی بدولت، زاہدہ بیگم ملتجی لہجے پولیس والی سے بولیں۔

''میں ہمسائیوں سے معافی مانگ لوں گی۔ آپ معاملہ ختم کر دیں بلکہ آپ یہ لے لیں۔'' زاہدہ بیگم نے گلے سے سونے کی موٹی چین اتار کر اس کے سامنے کی۔ پولیس کی وردی پہنے موٹی عورت کی باچھیں کانوں تک چر گئیں اتنی موٹی چین دیکھ کر مگر اپنی ساتھیوں کے سامنے کچھ زیادہ بے تابی ظاہر نہیں کی۔

''ٹھیک ہے بی بی..... ہم رشوت نہیں لیتے، تم لوگ عزت دار ہو، جا کر صلح صفائی کر لو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں وہ آ کر ہمیں کہہ دیں تو ہم چلے جائیں گے۔'' وہ بولی۔ زاہدہ آگے بڑھیں وہ انسپکٹر خاتون پیچھے آئی۔

''تم نے چین کیوں واپس پہن لی وعدہ بھول نہ جانا مگر چپکے سے یہ کام ہونا چاہیے۔''

زاہدہ بیگم نے کینہ توز نگاہوں سے اپنی سر پھری غصیلی بیٹی کو دیکھا۔ اور چین چپکے سے اسے تھما دی۔ جسے دوسری ساتھی نہ دیکھ پائیں۔ ان کے لیے چائے پانی کا انتظام کرنے کو نفیسہ کو تاکید کر دی تھی۔ اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا ہمسائیوں کے گھر جا کر معافی تلافی کرنا تاکہ وہ رپورٹ واپس لے لیں۔ زاہدہ بیگم بہن کو ساتھ لے کر گیٹ سے نکل گئیں۔ فرہاد اور تیمور نے تاسف بھرے انداز میں نازنین کو دیکھا جس کی اکڑ جوں کی توں تھی۔ فرہاد نے اسی پل اس کے غصے کے بھوت کو اتارنے کا عزم کیا تھا۔ وہ دل دے بیٹھا تھا اس غصیلی پری کو..... اب اسے کیسے نارمل بنانا تھا۔ ابھی اس نے سوچا تو نہ تھا لیکن ارادہ پکا تھا۔ تقریباً گھنٹے بعد دونوں کی واپسی ہوئی ان کے ہمراہ پٹنے والی لڑکی روبی کی ماں اور بہن تھی۔ پولیس والیاں اپنے موبائل میں گم تھیں۔ انہیں سر پر کھڑا دیکھ کر سرعت سے کھڑی ہوئیں۔

''ہم نے ان کی بیٹی کو معاف کیا۔ ہم ایف آئی آر واپس لیتے ہیں۔ اب تم لوگ جاؤ۔'' روبی کی ماں نے لیڈی انسپکٹر کو مخاطب کیا جبکہ نظریں نازنین کے خوب صورت چہرے پر گویا آگ برسا رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اب ہم چلتے ہیں..... ویسے یہ کڑی بڑی اکڑ والی ہے۔ اللہ بچائے اس سے۔'' حوالدارنی کانوں کو ہاتھ لگاتی وہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ نازنین بجائے روبی کی ماں بہن سے معافی مانگتی۔ پاؤں پٹختے وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔ زاہدہ بیگم کو نئے سرے سے روبی کی ماں بہن کی منت سماجت کرنی پڑی۔ شکیلہ بیگم، فرہاد اور تیمور کا اس پل زاہدہ بیگم کے لیے بہت دل دکھا تھا اور نازنین پر تپ چڑھی تھی۔ فرہاد کا ارادہ مزید پختہ ہوا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج گھر کے مکینوں کے لیے معجزہ لیے طلوع ہوا۔ شکیلہ بیگم اور زاہدہ بیگم ٹیبل پر ناشتا لگاتی

نفیسہ کو ہدایت دینے میں مگن تھیں۔ اسی وقت فرہاد اور تیمور ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے آنٹیوں نے محبت بھری نگاہوں سے ان دونوں لڑکوں کو چیئر گھسیٹ کر بیٹھنے کو کہا۔ تیمور کی نگاہیں کچھ بے چین سی لگیں دونوں بہنوں کو جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ نفیسہ نے ناشتے کے تمام لوازمات ٹیبل پر سجا دیے اور خود کچن کی جانب بڑھ گئی لیکن یک لخت اس کے قدموں کو بریک لگی تھی۔ زاہدہ بیگم اور شکیلہ بیگم بھی حیرت میں ڈوب گئیں۔ فرہاد نے سرسری جبکہ تیمور نے بھرپور نگاہ سے آنے والی کا استقبال کیا تھا۔

''السلام علیکم!'' شرمیلی رائل بلیو سوٹ کے ساتھ ہم رنگ دوپٹا سلیقے سے اوڑھے خاصے نروس انداز میں سلام کرتی ماں کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ تیمور کو شرمیلی کا اس کی بات کو اہمیت دینا بے حد اچھا لگا تھا۔ شکیلہ بیگم نے محبت سے اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ والی خالی چیئر پر بٹھایا ان کے دوسری جانب زاہدہ بیگم بیٹھی تھیں انہیں بھی شرمیلی کا پہلی بار سب کے ساتھ ناشتا کرنا بہت اچھا لگا تھا لیکن دل سے ہوک سی اٹھی تھی کاش ان کی نازنین بھی کبھی ان کے ساتھ آ کر بیٹھے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟'' شکیلہ بیگم نے بے چین سے لہجے میں بیٹی سے استفسار کیا جو خود پر مرکوز تیمور کی گہری نگاہوں کے باعث خاصی بوکھلا اٹھی تھی۔ شکیلہ بیگم کی فکر اور بے چینی فطری تھی۔ یہی مہر النسا تھی جو بچپن سے آج تک ایک خول میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ آج اس کا کمرے سے باہر نکل کر سب کو سلام کرنا انہیں ورطۂ حیرت میں غرق کر گیا تھا۔ شرمیلی جو ہمیشہ من، من کر کے بولتی تھی۔ آج کیسی صاف لب و لہجے والی آواز تھی جب اس نے سلام کیا تھا۔

''ہماری طبیعت اب تو ٹھیک ہوئی ہے۔'' شرمیلی کا ذو معنی شرمیلا جواب وہ بھی اتنی مترنم آواز میں..... شکیلہ بیگم جہاں نہال ہوا ٹھیں وہیں تیمور بھی زیرِ لب مسکراتا اس کو دیکھ کر رہ گیا۔

''جیو میری بچی..... خوش رہو..... تم نے تو آج ماں کا دل خوش کر دیا۔'' شکیلہ بیگم نے مہر النسا کے گلابی رخسار چوم ڈالے۔ ماں کی بے پایاں خوشی نے اسے ندامت کے سمندر میں دھکیل ڈالا تھا۔ جانے انجانے میں وہ ماں کے لیے باعثِ اذیت بنی رہی تھی۔ شرمیلی نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر تیمور کو دیکھا۔ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر اس نے نظر کو جھکا دیا۔ دونوں پر محبت پھوار بن کر برسی تھی اور شرمیلی کو سراپا بدل گئی تھی۔

محبت کے خوش کن رنگ دنیا حسین بنا دیتے ہیں۔ لبوں پر مسکراہٹ گویا چپک جاتی ہے۔ ہر سو محبت کے نغموں کی جھنکار بجنے لگتی ہے۔ شرمیلی اور تیمور سرشار سے ناشتا کرنے لگے۔

شرمیلی کو ابھی اب ہم کے بجائے میں کا لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرنی تھی۔ شکیلہ بیگم آج بکروں کا صدقہ کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ زاہدہ بیگم بہن کی خوشی میں خوش تو تھیں لیکن نازنین کا دکھ انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ دونوں بہنوں نے شرمیلی اور تیمور کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے جگمگاتے محبت کے جگنو دیکھ لیے تھے۔ فرہاد نے زاہدہ بیگم کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھ کر نئے سرے سے ارادہ باندھا تھا نازنین کو سیدھا کرنے کا۔ اس سے قبل ہی کچھ ایسا ہو گیا کہ پورا گھر پریشانی کی زد میں آ گیا۔

☆☆☆

''اتنا دل لگا کر تیار ہو کر آفس تو تم نہیں جا رہے..... پھر کہاں جا رہے ہو؟'' ناشتے کے بعد فرہاد، تیمور کے کمرے میں آیا تو اسے قدِ آدم آئینے کے سامنے اِستادہ پایا۔ بال جیل سے اچھی طرح جمائے ریڈ ٹی شرٹ اور بلیو جینز میں ملبوس تیمور ڈھیروں پرفیوم خود پر چھڑکنے میں مگن تھا۔ فرہاد کی آواز پر چونکا۔

''کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' تیمور کا انجان انداز فرہاد کو سلگا گیا۔

''جی، آپ کو ہی مخاطب کیا ہے۔'' اس نے دانت پیسے..... ''وہ مہر النسا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے ناں..... آنٹی شکیلہ بھی ہمراہ ہوں گی۔'' تیمور،

فرہاد کے غصے کو خاطر میں نہ لائے بغیر بولا۔

''اوہ..... آج کل تم مہر النسا کی گردان کچھ زیادہ ہی نہیں کرنے لگے..... خیریت تو ہے؟'' وہ تیمور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''یار تم بھی ناں بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ سنو مجھے مہرو سے محبت ہوگئی ہے۔ زندگی بہت حسین لگنے لگی ہے یار.....'' لہجے میں شوخیاں، گنگناتا لہجہ۔ فرہاد کو رشک آیا لیکن اسے یہ کایا پلٹ ہضم نہیں ہوئی۔

''واہ، واہ کل تک وہ بونگی اور شرمیلی تھی اب مہرو ہوگئی۔''

''ہاں، ہاں محبت تو لمحاتی کرشمہ ہے، محبت ہوئی اور وہ میری مہرو بن گئی۔'' تیمور کا آج انداز ہی نرالا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ گویا چپک گئی تھی۔ فرہاد نے دل ہی دل میں بھائی کی خوشیوں کی دعا کی۔ لیکن اپنا دل بجھ سا گیا تھا۔

''ایک ہم ہیں، دل میں محبت کی کونپل پھوٹی بھی تو کس کے لیے..... گولہ بارود سے بھری توپ کے لیے۔ جس سے محبت کا اظہار تو درکنار بات کرنے کا سوچتے ہی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ اے میرے اللہ میری نیا بھی پار لگا دے۔'' فرہاد کا دل شدت سے کرلایا تھا۔

☆☆☆

رمضان کا بابرکت مہینہ اپنے ساتھ ڈھیروں سکون اور رب کے انعامات لیے آ پہنچا تھا۔ شرمیلی بھی پہلی بار سحر و افطار کی تیاریوں میں پیش، پیش تھی۔ نازنین اپنے موڈ کی پابند تھی۔ دل چاہتا تو کمرے سے نکلتی وگرنہ نفیسہ کمرے میں ہی سب کچھ پہنچا دیتی۔ روزے وہ باقاعدگی سے رکھ رہی تھی۔ شرمیلی اور تیمور کی محبت کا چاند روشنیاں اور مسکراہٹیں بکھیرتا اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ تیمور تو کراچی میں اپنی امی کو شرمیلی سے شادی کا عندیہ بھی دے چکا تھا۔ سلیمہ بس چند روز میں لاہور پہنچنے والی تھیں۔ فرہاد کا دل دن رات دہائیاں دے رہا تھا۔ پھر ایک دن وہ تیمور کے سامنے وہ اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گیا۔

''تیمور یار بتاؤ میں کیا کروں۔ وہ غصیلا جن میرے دل و دماغ پر بری طرح قابض ہو چکا ہے لیکن مجال ہے جو ناک پر مکھی بھی بیٹھنے دے۔ ہر وقت بارود بھرا گولہ بنا رہتا ہے، مجھے محبت ہوگئی ہے اس سے۔ کچھ کرو بھئی خود تو مہر النسا عرف شرمیلی کی زلفوں کے اسیر ہو کر مزے میں ہو۔ امی کو بھی اپنی پسند سے آگاہ کر دیا اِدھر میں ہوں دل تو دے بیٹھا ہوں۔ اظہار کی جرأت کہاں سے لاؤں.....'' تیمور نے فرہاد کے دکھڑے کو سرسری سا سنا لیکن اس کا پورا دھیان سامنے کھلے لیپ ٹاپ پر تھا۔ وہ کسی میل میں الجھا ہوا تھا۔ سو فرہاد کی دہائی پر وہ توجہ نہ دے سکا جس کا وہ بیچارہ متمنی تھا۔ اس کے اس لاتعلق انداز پر فرہاد بھڑک ہی تو اٹھا۔

''تیرا لیپ ٹاپ اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا اگر تو نے میری بات کو توجہ کے قابل نہ گردانا۔'' اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ تیمور نے پُرسکون انداز میں سر اٹھا کر اس کا غصیلا انداز ملاحظہ کیا اور اسی... پُرسکون لہجے میں گویا ہوا۔

''ہو گیا ناں اثر اس غصیلے جن کا تم پر بھی..... تم اس کو کیا سیدھا کرو گے وہ تمہیں اپنے جیسا بنا ڈالے گی۔ سچ پوچھو تو مجھے اس کا سدھرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں تو اپنی محبت پر فاتحہ پڑھ لے اور اپنے پیارے بھائی کی عید الفطر کے بعد ہونے والی شادی انجوائے کر لیں۔'' تیمور کے لہجے میں شوخی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی۔ فرہاد کے تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی۔

''ہاں تیری شادی تو میں جیسے ہونے دوں گا ناں، میری شادی کے بغیر تیری شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لکھ لے میری بات۔'' فرہاد نے بلاوجہ چوہدری بن کر بھڑک مارنے کی بھرپور کوشش کی۔

''اُف میرے خدا..... تجھ پر اس سڑیل لڑکی کا اثر ہو گیا ہے ورنہ میرا بھائی تو بڑا نرم خو اور خوش اخلاق تھا، اس سے پہلے کہ تو مزید بداخلاق ہو جائے تیری مدد کرنا ہی پڑے گی ورنہ تجھ جیسا گھونچو میری شادی میں اپنی لمبی ٹانگیں پھنسا کر بیٹھ جائے گا۔ زرافہ نہ ہو تو۔''

تیمور نے فرہاد کے لمبے قد پر چوٹ کی۔

''تم جو مرضی کہہ لو لیکن تمہیں مدد تو میری کرنی ہی پڑے گی۔'' فرہاد آج اسے بخشنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ اور تیمور تو آج کل گھر بھر کے لیے راجا اندر بنا ہوا تھا۔ اہمیت تو فرہاد کو بھی حاصل تھی لیکن تیمور تو گھر کا داماد بننے جا رہا تھا۔ اس کی اچھی خاصی اہمیت دیکھ کر فرہاد کو جیلسی ہونے لگی تھی۔ لیکن دو مہینوں میں کوشش کے باوجود وہ نازنین کو سیدھا تو کیا کرپاتا اس کے سامنے آنے پر بوکھلا جاتا۔ اس کی حالت دیکھ کر تیمور کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ کچھ پل وہ سوچوں میں مستغرق رہا۔ پھر جوش سے فرہاد کا کان پکڑ کر اپنے منہ کے قریب لایا اور دھیرے، دھیرے کچھ کہنے لگا۔ وہ جیسے، جیسے کہتا گیا۔ فرہاد کے چہرے کے فیوز بلب آنِ واحد میں روشن ہوتے گئے۔ اس کے اندر اس پل امیدوں کا خوب صورت جہان روشن ہوا تھا۔

پندرھویں روزے کی سحری تھی۔ شرمیلی، امی اور خالہ کی سحری بنانے میں مدد کروا رہی تھی جبھی انہوں نے اس سے غصیلی کو بلانے کو کہا۔ مہرالنسا خود بھی چاہتی تھی نازنین اب سب میں گھل مل کر رہے سو جھٹ بولی۔

''خالہ جان ابھی بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ کچن سے نکلی تو لسی بناتی شکیلہ بیگم اور پراٹھے ڈالتی زاہدہ بیگم دونوں کی زبانیں دعا گو ہوگئیں۔

''یا اللہ نازنین، شرمیلی کی بات مان لے۔''

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تو اس نے غصیلی کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا پایا۔ شرمیلی نے دروازے کو ہولے سے ناک کیا لیکن جواب ندارد...... اس نے دروازہ کھول کر دہلیز پار کرنا چاہی تو جھجک آڑے آگئی۔ کزنز ہونے کے باوجود دونوں کبھی ایک دوسرے کے کمرے میں بے دھڑک نہیں جاتی تھیں۔ پھر بھی شرمیلی نے بالآخر دل کڑا کر کے غصیلی کے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ کمرا بے انتہا نفاست اور خوب صورتی سے سجا تھا کسی کونے میں بھی کوئی بے ترتیبی نہ تھی۔

''کیوں آئی ہو...... چلی جاؤ میرے کمرے سے۔'' غصیلی کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔

''تمہیں لینے آئی ہوں اور لے کر ہی جاؤں گی۔ خالہ جان نے تمہیں بلایا ہے سب کے ساتھ مل کر سحری کر لو......'' شرمیلی پر غصیلی کے لب و لہجے کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

''مجھے نہیں آنا...... کہہ دو جا کر سب سے۔'' لہجے میں اب غصے کے ساتھ تنفر بھی گھلا تھا۔

''کیوں نہیں جانا نازنین...... بُھلا کیوں نہیں دیتی ہو تم وہ سب جو کچھ ہوا۔ ایک برا خواب جان کر، میں نے بھی تو بھلا دیا ناں سب......اور کتنی سزا دیں گے ہم اپنی ماؤں کو......اب بس کرو نازنین ایسا نہ ہو کہ ہم زیادتی کرنے میں ان سے بھی آگے نکل جائیں۔ صد شکر مجھے ہدایت مل گئی اب تم بھی بھلا دو سب......'' شرمیلی ملتجی لہجے میں بولتی چند قدم چل کر غصیلی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ جس کا حسن ہر روپ میں دو آتشہ تھا ایسے ہی تو فرہاد دل نہیں ہارا تھا اس پر۔

''نہیں بھلا سکتی ہوں میں...... کچھ نہیں بھلا سکتی۔ وہ اذیت وہ خوف نہیں بھلا سکتی۔'' سرد لہجے میں نمی سی گھلی تھی۔ شرمیلی نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

''ہم نے اپنی الگ، الگ دنیا بسا کر اپنی ماؤں کو جو اذیت دی ہے وہ ان کی خطا سے بہت زیادہ ہے نازنین...... میں نے بے جا شرم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر تنہائی کو اپنا ساتھی بنا ڈالا۔ اور تم نے غصے کے دامن میں ایسی پناہ لی کہ پھر اس پناہ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ اب بس کر دو نازنین...... خوشیوں کو اپنے من آنگن کو مہکانے کی اجازت دے دو......'' شرمیلی کا لہجہ منت بھرا تھا۔ محبت کے حسین جگنوؤں نے شرمیلی کی زندگی کو روشن کر دیا تھا یہی روشنی اس کے لب و لہجے سے اس پل پھوٹ رہی تھی۔

''تم جاتی کیوں نہیں ہو...... جاؤ یہاں سے کیوں میرا دماغ کھا رہی ہو......نہیں آنا مجھے تم لوگوں کے پاس......'' نازنین کے ضبط کی حد بس یہیں تک تھی۔ وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ آج شاید وہ اپنے اندر چھپے غصے کے طوفان سے سب تہس نہس کر دینا چاہتی تھی۔ شرمیلی کا

دل دہل گیا۔ غصیلی ملکہ کے چلّانے پر.....

''دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے۔ نہیں ہے مجھے کسی رشتے کی ضرورت..... تمہیں سمجھ نہیں آتی۔'' وہ پھر چیخی تھی۔

''یا اللہ خیر.....!'' ٹیبل پر سحری کے لوازمات اپنے سامنے سجائے نفوس ان دونوں کے انتظار میں بیٹھے تھے جب زاہدہ بیگم نازنین کے چلّانے پر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوئی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور سیڑھیوں کی طرف لپکیں۔ شکیلہ بیگم، فرہاد اور تیمور بھی اپنی، اپنی جگہوں سے اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگے چاروں اوپر کمرے میں پہنچے تو شرمیلی کو دیوار کے ساتھ لگے تاسف بھری نگاہوں سے نازنین کو دیکھتے پایا جو اپنا غصہ اپنے کمرے کی چیزوں پر بے دردی سے نکال رہی تھی۔ کچھ دیر قبل سجا کمرا اب تلپٹ تھا۔ وہ روتی، چلّاتی چیزوں کو اٹھا، اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ وہ غصے کی انتہا پر تھی۔ زاہدہ بیگم کا دل بند ہونے لگا۔ نازنین کی یہ حالت دیکھ کر پہلے وہ غصہ دکھاتی تھی تو خود پر سختی کا خول چڑھا لیتی تھی، آج تو وہ رو رہی تھی۔ ان کا دل بھلا کیوں نہ تڑپتا۔ اسی وقت زاہدہ بیگم کی نگاہ فرہاد اور تیمور پر پڑی۔ دونوں کی نگاہوں میں نازنین کے لیے غصہ جھلک رہا تھا۔ زاہدہ بیگم وہیں دل پر ہاتھ رکھے کارپٹ پر ڈھیر ہو گئیں۔

''زاہدہ باجی!'' انہیں گرتے دیکھ کر شکیلہ بیگم چلّاتی ہوئیں تیر کی سی تیزی سے آگے بڑھیں اور ان کا سر اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ان کی اشکوں سے لبریز آنکھیں بند تھیں۔ فرہاد، تیمور اور شرمیلی بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کے ہاتھ پیر ملنے لگے۔ نازنین، ماں کو گرتا دیکھ کر اب یوں ساکت تھی گویا جان ہی نہ ہو۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے ماں کا بے ہوش وجود دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے دل میں درد کی ہوک اٹھی تھی، وہ تڑپ کر ماں کی جانب بڑھی اور دیوانہ وار ماں کا چہرہ چومنے لگی۔

''تیمور گاڑی نکالو۔'' فرہاد نے کاٹ دار نگاہوں سے نازنین کو دیکھتے ہوئے تیمور کو مخاطب کیا۔

اس پل فرہاد کو نازنین پر بری طرح تپ چڑھی تھی۔

''اب تڑپنے اور رونے کا کیا فائدہ..... اس حال تک اپنی ماں کو پہنچانے والی صرف آپ ہیں، اب آپ تینوں سائڈ پر ہوں مجھے انہیں اٹھا کر گاڑی میں لٹانا ہے تاکہ جلد از جلد انہیں اسپتال لے جایا جائے۔'' فرہاد کا سرد اور تیکھا لہجہ نازنین کو تاؤ دلا گیا لیکن ماں کی حالت نے گویا غصے کے جن کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ محض فرہاد کو دیکھ کر رہ گئی اور ماں کے پاس سے ہٹ گئی۔ تینوں کے ہٹتے ہی فرہاد نے سرعت سے کمزور سی زاہدہ بیگم کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا۔ کمرے سے نکلتے، نکلتے بھی ایک کٹیلی سرد نگاہ وہ نازنین پر ڈالنا نہ بھولا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب نازنین کے اندر سناٹے اترے تھے۔ بچپن میں باپ کا سایہ اٹھ گیا، اب ماں کی تکلیف پہلی بار دل پر محسوس ہوئی تھی۔ ندامت اور شرمندگی نے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ فرہاد کے کمرے سے نکلتے ہی شکیلہ بیگم اور شرمیلی بھی نکل گئیں۔ نازنین کی خوب صورت آنکھوں سے موتی بہہ نکلے۔

☆☆☆

فرہاد اور تیمور ایمرجنسی میں پہنچے تو زاہدہ بیگم کو فوری ایڈمٹ کر لیا گیا۔ انہیں مائنر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بروقت اسپتال لانے کے باعث اب وہ خطرے سے باہر تھیں۔ انہیں روم میں شفٹ کر دیا گیا تو پھر کہیں جا کر دونوں بھائیوں کی جان میں جان آئی۔ افطاری بھی دونوں نے بھاگ دوڑ میں ہی کی تھی۔ گھر فون کر کے وہ شکیلہ بیگم کو ساری صورت حال سے آگاہ کر چکے تھے۔ اب وہ دونوں روم کے باہر کاریڈور میں کھڑے محوِ گفتگو تھے۔ زاہدہ بیگم دواؤں کے زیرِ اثر غنودگی میں تھیں ان کے پاس نرس تھی۔

''یار تیمور، زاہدہ آنٹی کتنی دکھی ہیں ناں..... ایک ہی اولاد..... وہ بھی غصے والا جن، بدتمیز اور خودسر۔ آخر نازنین ایسی کیوں ہے مجھے اب اس بات کا سراغ لگانا ہے۔'' فرہاد کا انداز پُرسوچ تھا۔

''اونہہ تم سراغ لگاؤ گے، اسے مخاطب کرنے کی جرأت ہے نہیں تم میں۔ جب وہ اپنی ماں کو اس حال تک پہنچا سکتی ہے تو بچو تمہیں تو وہ بھیگی بلی بنا دے گی۔

... اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ عجیب ... لڑکی ہے یار بلکہ نفسیاتی مریضہ......'' تیمور کے لہجے میں نازنین کے لیے غصہ اور بیزاری تھی۔

''تم بھول رہے ہو تیمور کچھ دنوں قبل مہر النسا کو بھی تم اسی کیٹیگری میں شمار کرتے تھے۔ جب اسے تمہاری محبت اور توجہ نارمل انسانوں میں شامل کر سکتی ہے تو پھر نازنین بھی میری محبت ہے اور محبت میں محبوب کی خامیاں کب نظر آتی ہیں۔'' فرہاد بے بس سا ہوا تھا۔

''میں تو تمہارے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ میرے بھائی اور کیا کروں...... تمہاری آنکھوں میں سچے محبت کے سچے رنگ وہ بیوقوف لڑکی نہیں دیکھ سکی۔ وہ تو اپنی الگ ہی دنیا کی باسی ہے۔ اپنی ماں کی حالت کی بھی وہی ذمے دار ہے۔'' تیمور کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''اوکے تم یہیں آنٹی کے پاس رکو...... میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔ کیا ری ایکشن ہے اب اس کا۔ یقیناً وہ بھی جان چکی ہوگی۔'' فرہاد جینز کی پاکٹ میں سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے بولا۔

''اوکے جاؤ تم...... میں خیال رکھوں گا زاہدہ آنٹی کا۔'' تیمور نے محبت سے فرہاد کے کندھے پر تھپکی دی۔ فرہاد لمبے، لمبے ڈگ بھرتا اسپتال کی راہداری میں آگے بڑھتا گیا اسے جلد از جلد اب گھر پہنچنا تھا جبکہ اسی پل تیمور کمرے سے نکلنے والی نرس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔

فرہاد گھر پہنچا تو لاؤنج میں سب کو ستے اور مضمحل چہروں کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ نفیسہ بھی آج گھر نہیں گئی تھی یہیں رک گئی تھی اور سر پر دوپٹا لپیٹے زور و شور سے دعا کر رہی تھی۔ فرہاد کو دیکھا تو تڑپ کر اس کی جانب بڑھی۔

''کیسی ہیں زاہدہ باجی؟'' فرہاد کی نگاہ نفیسہ کو جواب دینے سے قبل صوفوں پر براجمان نفوس پر پڑی۔ شکیلہ بیگم اور مہر النسا کے ساتھ وہ بھی تھی۔ رویا، رویا حسین چہرہ، گلابی عارض وہ خاصی پریشان اور دلگرفتہ لگی فرہاد کو...... سب کی منتظر نگاہیں فرہاد پر ٹکی تھیں کہ نفیسہ نے سب کے دل کی آواز کو زبان دی تھی۔

''ابھی ٹھیک نہیں ہیں وہ...... ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے انہیں ٹینشن نہ دی جائے اور دعا جاری رکھیں۔'' فرہاد کا لہجہ تھکا، تھکا سا تھا۔ نگاہ نے صوفے پر سر جھکا کر بیٹھی اپنی مخروطی انگلیاں بے دردی سے مروڑتی نازنین کا احاطہ کیا تو دل کو ایک دم تپ چڑھ گئی۔

''یہ لڑکی غصہ کرنے سے باز نہیں آئے گی اب اپنی انگلیوں پر ستم ڈھا رہی ہے۔''

''میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' شکیلہ بیگم کی رندھی آواز نے فرہاد کی نگاہوں کے ارتکاز کو توڑا تھا۔ شکیلہ بیگم کے دل کو بے چینی کے پنکھے لگے تھے۔ زاہدہ بیگم ساری زندگی ان کا اور ان کی بیٹی کا سایہ بنی رہی تھیں۔ ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا بہن کی حالت پر...... فرہاد نے پلٹ کر انہیں دیکھا جواب دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

''نہیں آنٹی میں اور تیمور اسپتال میں ہیں ناں...... پھر گھر پر مہر النسا اور نازنین کے پاس کون رہے گا۔'' نازنین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس سجیلے ہینڈسم نوجوان کو دیکھا جو اس کی ماں اور گھر بھر کے لیے فکر مند تھا جسے کو وہ بری طرح ناپسند کرتی تھی۔ وہ ہی کیا وہ تو ہر مرد سے بیزار تھی۔ لیکن ان دونوں نوجوانوں کی آنکھوں میں جو پاکیزگی تھی وہ اسے کبھی کسی اور مرد کی آنکھ میں نظر نہیں آئی تھی جن سے اب تک اس کا پالا پڑا تھا۔

''فرہاد بیٹا مجھے جانا ہے اسپتال۔'' شکیلہ بیگم کا دل کسی پل چین نہ لیتا تھا اس سے قبل کہ فرہاد جواباً کچھ کہتا اس کے موبائل پر تیمور کی کال آنے لگی۔ اس نے جھٹ کال ریسیو کی تھی۔ بوکھلاہٹ میں اسپیکر پر بھی انگلی ٹچ ہوگئی۔

''کیا بات ہے تیمور...... سب خیریت تو ہے ناں......'' فرہاد کے لہجے سے بے تابی عیاں تھی۔

''وہ ڈاکٹرز پُرامید نہیں ہیں۔ انہیں دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ تم سب تو اسپتال لے آؤ۔'' تیمور کے لہجے میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی پھر اس نے کال کاٹ دی۔ تیمور کے الفاظ نہیں گویا بم کا دھماکا تھا جو سب نفوس کے دلوں کے پرخچے اڑا گیا تھا۔ نازنین کے دل پر زور کا دھکا لگا تھا۔ اسے اس پل خود سے شدید نفرت

محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ماں کو معاف نہیں کر پائی تھی لیکن اگر ماں کو کچھ ہوگیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر پائے گی۔ شکیلہ بیگم اور مہرالنسا چادریں لے کر تیار تھیں جانے کو..... وہ گم صم کھڑی ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ گلابی رنگت میں گویا زرد رنگ گھل گیا ہو اس پل فرہاد کو اس پر ترس آیا تھا۔ لیکن پھر بھی جب مخاطب کیا تو لہجے کی کاٹ واضح تھی۔

''آپ کو کہنے کی مجھ میں جرأت تو نہیں ہے۔ آفٹر آل آپ عقلِ کل ہیں..... اگر آنا چاہیں تو آپ بھی آجائیں..... میں پورچ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' فرہاد سرد اور سپاٹ لہجے میں کہتا لمبے، لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج کی دہلیز عبور کر گیا شکیلہ بیگم اور مہرالنسا، نفیسہ کو گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے پورچ میں جا چکی تھیں۔ نازنین کو فرہاد کا ایک لفظ بھی برا نہیں لگا تھا۔ صحیح تو کہا تھا اس نے۔

''نفیسہ میری چادر لا دو.....'' اس کا ٹوٹا بکھرا لہجہ حد سے زیادہ نرم تھا۔ نفیسہ نے پہلی بار عصیلی باجی کا نرم روپ دیکھا تھا۔

''کیا تھا یہ عقل آپ کو پہلے آجاتی۔ ہمیشہ عقل نقصان کے بعد ہی کیوں آتی ہے۔ ٹھوکر کھا کر سنبھلے تو کیا سنبھلے.....'' دلگرفتہ سوچوں میں الجھی نفیسہ نے چادر نازنین کو لا تھمائی۔ چادر اچھی طرح اوڑھ کر وہ پورچ میں گئی تو فرہاد کو اپنا منتظر پایا۔ نفیسہ بھی پیچھے چلی آئی تھی۔ اسے گیٹ بند کرنا تھا۔ نازنین اس وقت جو بھی کام کر رہی تھی وہ پہلی بار ہی کر رہی تھی۔ مہرالنسا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی نازنین یہی سوچ رہی تھی۔ انسان دوسروں کو اذیت دیتے، دیتے خود اذیت میں آجاتا ہے۔ ماں کو اذیت دینا پھر وہ خود اذیت سے کیسے بچ سکتی تھی۔ اسپتال پہنچ کر جس بے تابی سے وہ ماں کی جانب بڑھی تھی۔ سب دکھ سے محض اسے دیکھ کر رہ گئے۔ وہ نالیوں میں جکڑی ماں کو نگاہوں ہی نگاہوں میں چوم رہی تھی، رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ سالوں کا غبار تھا جو چھٹ رہا تھا۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر سارے شکوے دھل گئے تھے۔ شکیلہ بیگم اور مہرالنسا بھی رو پڑی تھیں۔ فرہاد اور تیمور کمرے میں داخل ہونے والے ڈاکٹر سے ان کی حالت ڈسکس کرنے لگے۔ تیمور نے جب انہیں فوراً پہنچنے کا کہا تھا تب طبیعت ان کی واقعی بگڑ گئی تھی لیکن اب وہ خطرے سے باہر تھیں۔ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ تھا ان سب کے دلوں سے نکلی دعائیں مستجاب ٹھہری تھیں۔ اب وہ پُرسکون دواؤں کے زیرِ اثر سو رہی تھیں۔

''آنٹی اب آپ تینوں گھر جائیں..... ہم یہاں آنٹی کے پاس ہیں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں..... ایک دو دن تک ڈسچارج کر دیں گے آنٹی کو۔'' فرہاد نے شکیلہ آنٹی سے مؤدبانہ درخواست کی۔

''میں نہیں جاؤں گی امی کو چھوڑ کر..... خالہ آپ مہرو کو لے جائیں۔ میں امی کے پاس ہی رہوں گی۔'' نازنین اب ایک پل کے لیے بھی ماں سے دور ہونا نہیں چاہتی تھی۔ شکیلہ بیگم گھر نفیسہ کے حوالے کر آئی تھیں۔ رات بھی دھیرے، دھیرے اپنے سیاہ پر پھیلا رہی تھی۔ نفیسہ کون سا اماں تھی۔ بیس، بائیس سال کی لڑکی ہی تھی۔ زاہدہ باجی کے لیے دعا وہ گھر میں بہتر طریقے سے کر سکتی تھیں۔ لیکن نازنین کو وہ یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھیں۔ سو دونوں لڑکیوں کو فرہاد کے سپرد کر کے وہ تیمور کے ساتھ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''جیسے آپ کا حکم آنٹی میں خیال رکھوں گا۔'' فرہاد نے بھرپور تسلی دی تھی۔

''تیمور سحری لے کر آجائے گا اسپتال.....'' شکیلہ بیگم چادر سیٹ کرتے ہوئے بولیں۔

''جیسے آپ کی مرضی..... لیکن میں سحری کے وقت کینٹین سے کھانا لے آؤں گا۔ ہم تینوں روزہ رکھ لیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' فرہاد نے انہیں اطمینان دلایا تھا۔

''ٹھیک ہے فرہاد بیٹا..... چلو آؤ تیمور۔'' شکیلہ بیگم نے بہن کا ہاتھ نم آنکھوں سے لگا کر لبوں سے چوما اور فرہاد کو دوبارہ تاکید کی لڑکیوں کا خاص خیال رکھنے کی۔ دونوں کے جانے کے بعد شرمیلی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''فرہاد بھائی میں عشا کی نماز پڑھ آؤں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شرمیلی دکھ بھری نگاہ ماں کا ہاتھ لبوں سے لگائی نازنین پر ڈال کر کمرے سے نکل

گئی۔ اب کمرے میں فرہاد اور نازنین تھے جبکہ زاہدہ بیگم ہنوز غنودگی میں تھیں۔ کچھ پل در و دیوار نے خاموشی کی زبان سنی..... فرہاد لب بھینچے اس عصیلی حسینہ پر گاہے بہ گاہے نگاہ ڈال لیتا جو اس وقت کہیں سے عصیلی نہیں لگ رہی تھی بلکہ موم کی گڑیا سی لگی جو درد سے لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی ہو۔ نازنین ماں کا ہاتھ تھامے یک ٹک ان کا چہرہ دیکھنے میں مگن تھی جب اس کی سماعتوں نے فرہاد کی گمبھیر دلکش آواز سنی.....

''آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟'' فرہاد کے ذہن میں جو تجسس کا کیڑا کلبلا رہا تھا اس نے بالآخر اسے بولنے پر اکسا ہی دیا تھا۔

''جی کہیے.....'' لب کچلتی نازنین کا لہجہ دھیما اور نرم تھا۔

''آپ اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں کہ سب آپ کو غصیلی ہی کہنے لگے اور آپ سب سے الگ تھلگ اپنی ہی دنیا میں مگن اپنے رشتوں سے اتنی دور ہو گئیں کہ ماں کو بھی اذیت دینے سے باز نہ آئیں۔ مجھے صرف یہی جاننا ہے..... آپ ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں یا.....؟'' فرہاد نے سینے پر بازو باندھے فرصت سے نازنین کے مسلسل گریہ کے باعث سرخ پڑتے چہرے کو نگاہوں میں سمو کر کہا۔ نازنین نے پل بھر کے لیے اس خوبرو نوجوان کو دیکھا جس کا ساتھ کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا لیکن نازنین نے اپنے گرد جو غصے اور نفرت کی بلند و بالا دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ ان کے پار اسے اس نوجوان کی آنکھوں میں لیے محبت کے رنگ کیسے نظر آتے۔ اس وقت فرہاد کی آنکھوں میں بسا محبت کا جہان زندگی میں پہلی بار اس کے دل کو عجیب سی لے کر پر دھڑکا گیا۔ پل بھر کا دیکھنا جب زیادہ طویل ہوا تو فرہاد کے لبوں کی تراش کو دلکش مسکراہٹ نے چھوا تب نازنین نے بے ساختہ نگاہیں جھکائی تھیں۔

''نازنین میرا سوال اب بھی برقرار ہے۔'' دھیما، پُروقار لہجہ..... نازنین کچھ پل لب کچلتی رہی۔ جیسے اندر جنگ چھڑی ہو۔ اسی پل زاہدہ بیگم کسمسائی تھیں لیکن فرہاد کا مکمل دھیان نازنین پر تھا اور نازنین کے دل و دماغ ماضی کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ اس کی زبان ماضی کے اوراق پلٹ، پلٹ کر دُہرانے لگی۔ یہ جانے بنا کہ اس کی ماں کی سماعتیں ہوش میں آ چکی ہیں۔

☆☆☆

''میں اور مہرو بچپن سے ہی اپنے ماں، باپ کی لاڈلی تھیں۔ میں شروع سے ہی غصے کی تیز اور مہرو کم گو اور شرمیلی تھی۔ پاپا اور چچا کی وفات کے بعد زندگی نے ایک دم پلٹا کھایا تھا۔ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہنے والی مائیں اب آفس جانے لگی تھیں۔ ماسی ثریا ہماری پرانی ملازمہ تھی۔ کچن میں خانساماں نذیر انکل سالوں سے کام کر رہے تھے۔ ہمیشہ ہم دونوں کو بٹیا رانی ہی کہتے تھے۔ ہمیں مزے، مزے کی چیزیں بنا کر کھلاتے۔ پاپا اور چچا کے جانے کے بعد جب امی اور خالہ آفس جا کر کاروبار کے معاملات دیکھنے لگیں۔ تب ماسی ثریا کو ہماری ذمے داری سونپ دی گئی۔ سارا دن ہم ان کے رحم و کرم پر ہوتے۔ امی کم پڑھی لکھی لیکن بارعب اور دبنگ خاتون تھیں، خالہ شکیلہ تھوڑی پڑھی لکھی لیکن زیادہ پُراعتماد نہیں تھیں۔ کاروبار غیروں کے ہاتھ میں چلا جاتا سو دونوں بہنیں ایک دوسرے کا سہارا بن کر مردوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن دونوں بزنس اور دکانوں کے معاملات میں اتنی مصروف ہوئیں کہ اپنی بیٹیوں کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ نہ جانے وہ ہماری جانب سے اتنی مطمئن کیوں تھیں..... اولاد اور بیٹی جیسی قیمتی دولت غیروں کے سپرد کر کے وہ مادی دولت کی حفاظت کے لیے سر توڑ کوششوں میں لگ گئیں۔

ہمیں اسکول بھیجنا، ناشتا کرانا سب ماسی ثریا کے ذمے تھا۔ اسکول لانے لے جانے کے لیے ڈرائیور گھر کی رکھوالی کے لیے چوکیدار، کچن میں خانساماں یہ سب ملازم پاپا اور چچا نے رکھے تھے۔ گھر کو بھیڑیوں کے حوالے کر کے وہ بزنس کو بھیڑیوں سے بچانے نکل کھڑی ہوئیں۔ تب میری عصیلی طبیعت نے تینوں بھیڑیوں کی بدلتی نگاہوں کو محسوس کیا تھا۔ تینوں خواہ مخواہ محبت جتانے کے چکر میں ہم دونوں کو ساتھ لپٹا لیتے..... بے بی، بے بی کہہ کر کبھی کمر پر ہاتھ پھیرتے تو کبھی سر پر..... مجھے غصہ آ جاتا، میں ان کے ہاتھ جھٹک دیتی لیکن مہرو مکر، مکر اُن کی شکلیں دیکھنے لگتی۔ ایک دن

خانساماں کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اسکول سے چھٹی تھی میں اور مہرو لاؤنج میں بیٹھے پڑھ رہی تھے۔ امی اور خالہ نے ہماری پڑھائی کے لیے بھی میل ٹیوٹر ہی رکھا تھا جو اُن دونوں کی غیر موجودگی میں ہمیں پڑھانے آتا۔ اسے تو میں نے کسی طرح بھگا دیا۔ امی اور خالہ کو کہہ دیا ہم دونوں خود ہی پڑھ لیں گے۔ ماسی ثریا ہمارے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا سر بار، بار اس کے شانے پر ڈھلک جاتا۔ مجھے تشویش ہوئی' میں نے ماسی کا ماتھا چیک کیا تو وہ بخار میں پھنک رہی تھی، ماسی ثریا کی ہمیں بہت ڈھارس تھی۔ ان کی موجودگی میں سب مرد ملازم دب کر رہتے تھے۔ ان کا بخار میں مبتلا ہونا میرے ہاتھ پاؤں پھلا گیا۔

''جاؤ مہرو کچن سے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ......''

میں بھاگ کر اپنے کمرے سے کپڑا لے آئی۔ میں ماسی ثریا کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرنا چاہتی تھی۔ مہرو کے بجائے خانساماں پانی کا باؤل لیے لاؤنج میں آ گیا۔ مہرو بھی سہمی، سہمی میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ خانساماں نے نہ جانے مہرو کو کس طرح ہراساں کیا تھا۔

''اُف ثریا کو تو بہت تیز بخار ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا'' خانساماں کے لہجے میں کچھ ایسا تھا، میں نے مہرو کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ خانساماں باہر جا کر ڈرائیور کو بلا لایا اور نیم بے ہوش ماسی ثریا کو بازو سے تھام کر اٹھایا اور ڈرائیور کے ساتھ روانہ کیا۔ ڈرائیور کی معنی خیز نگاہیں جو خانساماں کی جانب اٹھی تھیں جواباً خانساماں کے الفاظ...... ''اگلی باری تمہاری ہے۔'' میرے کانوں میں گویا پگھلا سیسہ ڈال دیا ہو۔ تب امی اور خالہ پر مجھے بے حد غصہ آیا تھا۔ خانساماں میدان صاف دیکھ کر ہم دونوں کی جانب بڑھا۔ ہماری ماؤں نے ہمیں چھوٹا جان کر موبائل تک نہیں دیا تھا۔ حالانکہ موبائل جب بھی موجود ہوتے تھے مگر ماسی ثریا ہی کافی تھیں ہمارے لیے ان کے نزدیک...... اب ہم دونوں خانساماں کے اپنی جانب بڑھتے قدموں کو دیکھ رہے تھے۔ مہرو مزید سہم گئی تھی اور میرے اندر غصے کا طوفان سر اٹھا رہا تھا۔ خانساماں نے مجھے اور مہرو کو بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے جانے کے لیے کھینچنے لگا۔

مہرو رونے لگی اور میں نے خانساماں کے بازو پر اتنی شدت سے کاٹا کہ اس کا بازو خون سے بھر گیا۔ اس نے ہم دونوں کا بازو چھوڑا اور اپنا بازو پکڑ کر درد سے بلبلا اٹھا۔ میں تیزی سے مہرو کو لیے سیڑھیاں پھلانگتی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اور دروازہ لاک کر لیا۔ واش روم میں جا کر اپنا منہ صاف کیا۔ پھر دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں اور مہرو ایک دوسرے میں چھپنے لگے پھر دروازے کا لاک کھل گیا۔ کمرے میں اب خانساماں کے علاوہ ڈرائیور اور چوکیدار بھی داخل ہوئے تھے۔ تینوں بھیانک دیو لگ رہے تھے جو ہم دونوں کا خون پینے کے درپے ہوں۔ گھر کی چابیاں ان کے پاس کہاں سے آئیں، میں نہیں جانتی۔

''ماسی ثریا کہاں ہے؟'' میں غصے سے چلائی تھی۔

''اُف اتنا غصہ...... ماسی ثریا لاؤنج میں صوفے پر آرام کر رہی ہیں۔ بیچاری کو بخار جو ہے۔ ڈاکٹر نے ریسٹ کرنے کا کہا ہے۔ اب تم دونوں اچھے بچوں کی طرح ہماری بات ماننا۔'' ڈرائیور خباثت سے مسکراتا ہوا بولا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس پل مجھے امی اور خالہ سے بھی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ میں نے نفرت اور غصے کے طوفان کو اپنے اندر امڈتے دیکھا۔ یہ غصہ میری طاقت بننے والا تھا۔ اور میں نے اسے اپنی طاقت بننے دیا۔ وہ تین تھے اور میں اکیلی...... لیکن اس پل میں نے اپنے اللہ کو بھی پکارا تھا تب میری نظر سائڈ ٹیبل پر پڑے فروٹ باؤل میں رکھی چھری پر پڑی۔ تیز دھار چھری اگر ان تینوں کو کاٹ بھی دیتی تو مجھے پروا نہیں تھی۔ بارہ' تیرہ سالہ لڑکی اس پل شیرنی بن گئی تھی۔ کل ماسی ثریا نے ہم دونوں کو اسی کمرے میں فروٹ کھلایا تھا اور چھری باؤل میں ہی رکھ دی تھی۔ اور چھری اس پل امداد غیبی لگی تھی مجھے۔ میں چھری لے کر ان تینوں کی طرف بڑھی۔ تینوں مجھے بہت بزدل اور کمزور سمجھ رہے تھے۔ وہ ہنسنے لگے، مذاق اڑانے لگے۔ تب میں نے سرعت سے آگے بڑھ کر چھری سے ڈرائیور کے بازو پر حملہ کر دیا۔ وہ جو مجھے محض بچی جان کر مطمئن تھا چھری گوشت میں گھسی تو وہ درد سے چلا اٹھا۔ میں نے خون آلود چھری لہرا کر باقی

pklibrary.com

دونوں کو گرج کر کہا۔

''اگر آگے بڑھے تو کاٹ کر رکھ دوں گی۔ چابیاں پھینکو اور نکلو کمرے سے.....'' میں چھری لے کر تیزی سے خانساماں کی جانب بڑھی وہ اچھا خاصا ڈر چکا تھا۔ میرے ساتھ میرے اللہ کی مدد تھی۔ چوکیدار تو دم دبا کر بھاگ چکا تھا، ڈرائیور بھی کراہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ خانساماں نے چابیاں پھینکیں میری جنونی کیفیت دیکھ کر تینوں ہی ڈر چکے تھے۔ وہ کمرے سے نکلا تو میں نے بھاگ کر دروازہ لاک کیا۔ مہرو خوف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے امی اور خالہ کے آنے کا اتنی بے تابی سے انتظار کیا۔ جب دونوں آئیں تب تک مہرو ہوش میں آ چکی تھی۔ لیکن بہت خوفزدہ تھی تو انہوں نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے بنا تسلی کے دروازہ نہ کھولا۔ جب اطمینان ہو گیا تو دروازہ کھولا۔ لیکن یہ کیا میں جو امی اور خالہ کو خود پر اور مہرو پر ٹوٹنے والی افتاد کے متعلق بتانے کے لیے بے چین تھی دونوں کے غصیلے تاثرات سے اٹے چہرے دیکھ کر میں انہیں دیکھنے لگی۔

''کب بڑی ہو گئی تم..... کیوں تم نے ڈرائیور کو زخمی کیا..... وہ تمہیں بیٹی سمجھتا ہے نازنین..... اور تم فضول واہیات فلمیں دیکھ، دیکھ کر خود کو ہیروئن سمجھنے لگی ہو۔ ہم دونوں باہر سے کھپ کر آئیں تو تمہاری شکایات سننے کو ملتی ہیں، کب سدھرو گی تم؟'' امی تو شروع ہو گئیں، میں سمجھ گئی۔ تینوں درندوں نے سارا الزام مجھی پر ڈال دیا تھا۔ اور میری ماں میرے غصیلے پن کے باعث سب باتوں پر یقین کر بیٹھی تھیں۔

''چھوڑیں باجی..... جانتی تو ہیں بچپن سے ہی غصے کی تیز ہے۔ اِدھر آؤ مہرو..... جاؤ اپنے کمرے میں۔ تم بھی بڑی ہو جاؤ اب ہر وقت نازنین کا پلو تھامے رہتی ہو۔'' شکیلہ خالہ کا لہجہ بیزاری سے اٹا تھا۔

''اِدھر لاؤ چابیاں..... اور ہاں یہ فضول حرکت اب مت کرنا۔ اتنے اچھے ملازم اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔'' امی نے گھر کی چابیاں پکڑ کر تنبیہہ کی تھی۔

''امی وہ بدتمیزی کرنے لگے تھے ہم دونوں کے ساتھ میں نے تو اپنا اور مہرو کا بچاؤ کیا ہے، یقین کریں میرا.....'' میں بالآخر پھٹ پڑی تھی۔

''تم اب باپ کی عمر کے ملازموں پر الزام لگاؤ گی۔ ان کے ہاتھوں پل کر بڑی ہوئی ہو تم تمہارے باپ اور چچا کے وقت کے ملازم ہیں وہ..... کبھی بری نظر نہیں ڈالی تینوں نے..... اور تم اب ان کو گناہ گار ثابت کرنے پر تلی ہو..... ثریا دونوں کو کھانا کھلا کر سلا دو..... اور آج رات تم یہیں رک جاؤ..... تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں.....'' امی بہت تھکی ہوئی تھیں۔ گھر آتے ہی خانساماں، ڈرائیور اور چوکیدار نے ہماری خوب شکایت لگائی تو وہ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکیں۔ بس اس دن کے بعد مجھ پر اور مہرو پر مشکل وقت کا آغاز ہو گیا۔ ہم دونوں اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہو گئیں۔ تب میں نے خود کو اور مہرو کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات نے مجھے کھردرا، بے لچک اور غصیلا بنا دیا۔ مہرو کو میں نے سختی سے کہہ دیا۔ اپنے وجود کو بڑی سی چادر میں لپیٹ کر رکھو..... ہم دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔ میں نے بھی خود کو ڈھانپ کر رکھنا شروع کر دیا۔ تینوں ملازم اب موقع کی تاک میں رہنے لگے تھے۔ میری ماں نے ڈرائیور کے بازو کی مرہم پٹی کے لیے رقم فراہم کی تب میں ماں اور خالہ سے مزید متنفر ہو گئی۔ مہرو کے کمرے سے نکلنے پر میں نے پابندی لگا دی۔

''تم اسکول میں کسی سے دوستی نہیں کرو گی۔'' میں نے سختی سے مہرو کو کہہ دیا۔ وہ بیچاری میری ہدایات پر عمل کرتی کمرا بند کر کے رکھتی۔ میں نے خانساماں، ڈرائیور اور چوکیدار کی وہ مرمت کی کہ تینوں ملازمت چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ماسی ثریا البتہ ہماری خدمت پر مامور رہیں۔ پھر گھر میں کوئی مرد ملازم میں نے رکھنے نہیں دیا۔ میں اسکول سے کالج پہنچی تب تک غصہ اور کھردرا پن میرے مزاج کا حصہ بن چکا تھا اور مہرو نامحرموں سے شدید قسم کا پردہ کرنے لگی تھی۔ بس یوں میں غصیلی

اور وہ شرمیلی مشہور ہوگئی۔ مجھے مردوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں اپنے گھر والوں سے مکمل بیزار اور الگ تھلگ ہوچکی تھی۔ اور ہماری ماؤں کو ابھی تک نہیں علم کہ ان کی بیٹیاں اس طرح کی کیوں ہوگئی ہیں..... بس کوسنے، جھڑکیاں اور لعن طعن ہی کرتی رہیں۔ کبھی اندر جھانکا ہی نہیں کہ بیٹی کتنی اکیلی ہے۔'' نازنین یہ سب بتاتے، بتاتے سسک پڑی۔ فرہاد کی سانسیں گویا تھم سی گئی تھیں۔ وہ بس اسے دیکھے جارہا تھا جو ماضی کی پرتیں کھول کر اب رو رہی تھی۔ دونوں ہی لاعلم تھے کہ زاہدہ بیگم نہ صرف ہوش میں آچکی ہیں بلکہ حرف بہ حرف نازنین کا درد بھی جان چکی ہیں۔ بند آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ بیٹی کا درد جاننے کی کبھی انہوں نے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ان کا گناہ واقعی بہت بڑا تھا۔ نازنین کس کرب سے گزرتی ہوگی اس سوچ نے ان کی روح کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

''آپ جانتے ہیں جب تک امی اور خالہ بزنس اور دکانوں کے معاملات بااعتماد منیجر کے سپرد کرکے گھر بیٹھیں تب تک ہم دونوں ابنارمل ہوچکے تھے۔ مجھے ماں کو اذیت دینا سکون دینے لگا۔ پھر آپ لوگوں کی آمد ہوئی جو رفتہ رفتہ ہمارے گھر کے ماحول کو بدلنے کا باعث ہوئی اور اب مہرو تو تیمور بھائی کی محبت میں بدل گئی۔ میں کیسے بدلوں خود کو..... مجھے کسی پر اعتبار ہی نہیں۔ امی سے مجھے بہت محبت ہے لیکن شکوے بھی بہت ہیں۔'' نازنین کا رندھا ہوا لہجہ فرہاد کا دل تڑپا گیا۔ زاہدہ بیگم کے لبوں سے سسکاری آزاد ہوئی تھی۔

نازنین نے چونک کر ماں کا چہرہ دیکھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔ ماضی کے دریچوں میں جھانکتے فرہاد اور نازنین نے زاہدہ بیگم کو دواؤں کے زیر اثر نیند میں مدہوش سمجھا تھا۔ لیکن وہ سب کچھ سن چکی تھیں۔ اب دونوں کو فکر لاحق ہوگئی کہیں ان کی طبیعت مزید نہ بگڑ جائے۔

''امی آپ روئیں نہیں..... میں اب آپ کی اچھی بیٹی بن کر رہوں گی۔ کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ آپ جو کہیں گی کروں گی بس آپ ٹھیک ہوجائیں۔'' وہ ماں کا ماتھا چومنے لگی۔

''نازنین میری بچی، مجھے معاف کردو..... میں نے تم پر ظلم کیا اور میں کتنی انجان رہی۔ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی میری بیٹی ایسی کیوں ہے۔ تمہارا اعتبار نہ کیا لوگوں کا اعتبار کیا۔ مجھے معاف کردو میری پیاری بیٹی۔'' انہوں نے محبت سے نازنین کا گلابی چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا تھا۔

''امی اب کوئی پرانی بات نہیں ہوگی۔ اب صرف نئی بات ہوگی۔ میں نے سب کہہ دیا ہے ناں ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں میں۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ اب آپ جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔ مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔'' نازنین کا لہجہ نرم اور محبت سے بھرپور تھا۔ فرہاد کی آنکھیں بھی نم تھیں، کتنا درد، کتنا سوز چھپا تھا غصیلی پری کے اندر..... صد شکر اب وہ اپنی محبت کا یقین پاسکتا تھا۔ نازنین نے خود کو بدلنے کا عزم جو کیا تھا۔

''سدا خوش رہو میری بچی..... تمہارا نصیب بلند ہو.....'' زاہدہ بیگم نے دل سے دعا دی۔

''آمین، آنٹی میں بھی کھڑا ہوں، کچھ میری طرف بھی نظر کرم فرمائیں۔'' فرہاد شوخ ہوا۔

''تم تو میرے شہزادے بیٹے ہو۔'' ان کا لہجہ محبت سے چور تھا۔

فرہاد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ نازنین نے بھی مسکرا کر شہزادے حضور کا چہرہ دیکھا تو محبت کے رنگ بکھرے نظر آئے۔ اور وہ محبت کے ان حسین رنگوں سے نظر نہ بچا پائی۔ اور ان خوب صورت رنگوں میں اسی پل رنگ گئی۔ یاقوتی لبوں پر حسین مسکراہٹ سج گئی تھی۔ فرہاد کا دل خوشی سے لوٹیاں لگانے لگا اسے اس کی محبت مل گئی تھی۔ بالکل بدلی ہوئی موہنی سی محبت..... جب مہرو نماز عشا پڑھ کر آئی تب تک کمرے کا ماحول حد سے زیادہ خوشگوار ہوچکا تھا۔

''مہرو گھر چلیں، اب امی بالکل ٹھیک ہیں۔'' نازنین اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر خوشی سے چہکی۔

پہلے تو وہ حیران ہوئی پھر بھاگ کر نازنین کے گلے لگ گئی۔ دونوں نے سرگوشیوں میں اللہ جانے کیا باتیں کیں...... دونوں کے چہرے خوشی سے گلنار تھے۔فرہاد اور زاہدہ بیگم خوش تھے کہ ابنارمل لڑکیاں اب نارمل ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

مجھے تو مہرو اور نازنین ،فرہاد اور تیمور کے لیے بہت پسند آئی ہیں زاہدہ...... اب بتاؤ کب شادی کریں اپنے بچوں کی۔ میں تو اپنے بیٹوں کو بس خوش دیکھنا چاہتی ہوں...... بچپن میں باپ کا سایہ سر پر سے اٹھ گیا۔ بڑی مشقتوں سے ان بیٹوں کو پالا، پڑھایا لکھایا۔ اللہ نے اب ان کو اس قابل کیا ہے۔ شادی ان کی مرضی اور پسند سے ہی ہوگی۔ آخر زندگی ان دونوں نے گزارنی ہے اور مہرو اور نازنین تو ہیں بھی اتنی پیاری اور باادب بچیاں۔'' سلیمہ آج ہی لاہور پہنچی تھیں جب سے وہ گھر آئی تھیں تب سے مہرو اور نازنین کو لپٹائے بیٹھی تھیں۔

''عید میں چھ سات روزے رہ گئے ہیں۔ ان شاء اللہ عید کے بعد ہمارے گھروں میں بھی خوشی کے شادیانے بج اٹھیں گے۔'' زاہدہ بیگم کا لہجہ خوشی کی مہکار سے اٹا تھا۔ یہی حال شکیلہ بیگم کا تھا۔ وہ خوشی سے نہال سلیمہ کے لیے بہترین کھانے تیار کر رہی تھی۔ آج کی افطاری شاندار ہونی تھی۔ دونوں بہنوں کی سمدھن جو آئی تھیں۔ فرہاد اور تیمور ماں کے آنے سے پہلے ڈیفنس میں دوسرے بلاک میں گھر کا ایک پورشن کرایے پر لے چکے تھے۔ سلیمہ نے دونوں لڑکوں کے ساتھ دو دن بعد اپنے گھر شفٹ ہو جانا تھا...... نفیسہ بھی خوب چھمک چھلو بنی کام نبٹا رہی تھی ...... عید الفطر کے بعد دونوں باجیوں کی شادی جو تھی۔ اس کی خوشی دیدنی تھی اسی وقت فرہاد نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا۔ سلیمہ کے چہرے پر مسکان بکھر گئی۔ فرہاد اور تیمور ایک دوسرے کو اشارہ کر کے لاؤنج سے باہر چلے گئے تو انہوں نے ہنستے ہوئے زاہدہ بیگم کو مخاطب کیا۔

''بھئی زاہدہ فرہاد اور تیمور پرسوں جمعے کے دن نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو اس میں کیا مضائقہ ہے اگر بچوں کی خوشی اس میں ہے تو مجھے اور شکیلہ کو کوئی اعتراض نہیں...... کیوں شکیلہ......؟'' زاہدہ نے کچن کے باقی کام نفیسہ کے سپرد کر کے لاؤنج میں سب کے درمیان صوفے پر براجمان ہوئی شکیلہ سے استفسار کیا۔

''باجی جو آپ مناسب سمجھیں گی، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ان کا لہجہ خوشی اور بےفکری میں رنگا تھا۔ ہر طرف مبارک باد... کی صدائیں تھیں۔ جس میں نفیسہ کی بھی باریک آواز شامل تھی۔

''سب کو مبارک ہو......''

''خیر مبارک......'' فرہاد اور تیمور بیک زبان بولتے زاہدہ بیگم کی دائیں جانب جڑ کر بیٹھ گئے اور شوخی بھری شرارت سے سلیمہ کے دائیں بائیں بیٹھی مہرو اور نازنین کو دیکھا۔ دونوں نے شرما کر ایک ساتھ سر جھکایا تھا۔

''شرماتی ہوئی مہرو کتنی اچھی لگ رہی ہے۔'' تیمور، فرہاد کے کان میں گھسا۔

''ارے مہرو کا شرمانا کون سی نئی بات ہے۔ ذرا نازنین کو تو دیکھو...... کتنی کیوٹ لگ رہی ہے۔'' جواباً فرہاد نے بھی اپنا منہ تیمور کے کان میں گھسایا تھا۔ پھر آہ بھر کر رہ گیا۔ کیونکہ تیمور کی کہنی اس کی پسلی سینک چکی تھی۔ دونوں کی سرگوشیوں سے بے نیاز سب خوش گپیوں میں مگن تھے۔

☆☆☆

جمعۃ المبارک کے بابرکت دن جمعہ کی نماز کے بعد فرہاد اور نازنین، تیمور اور مہرو کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد تو وہ شوہر پن کا استحقاق خوب جتانے لگے۔ پھر تو دونوں افطاری کے وقت آدھمکتے اور کھانوں کی فرمائشیں کر، کر کے ناک میں دم کر دیتے۔ سلیمہ بیگم، زاہدہ بیگم اور شکیلہ بیگم شاپنگ کے لیے نکل جاتیں اکثر ان کی افطاری بازار میں ہی ہوتی۔ آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔ دونوں عصر کی نماز پڑھ کر اپنی سسرال چلے آئے۔ تینوں اماں حسبِ معمول شاپنگ پر تھیں۔ وہ دونوں صوفوں پر شان سے براجمان ہو گئے کیونکہ ان کے عین سامنے مہرو اور نازنین باہم گفتگو میں مگن تھیں۔ وہ دونوں ان کی آمد پر

الرٹ ہوگئیں۔ آج نہ جانے دونوں کس کھانے کی فرمائش کردیں۔ وہ دونوں کھانا پکانا بالکل نہیں جانتی تھیں۔ نفیسہ یا دونوں کی امائیں ہی لگی رہتیں۔

''بھئی مہرو آج افطاری میں تمہارے ہاتھ کی بریانی کھاؤں گا۔'' تیمور نے محبت بھری فرمائش کی تو فرہاد کیوں پیچھے رہتا..... جھٹ اپنی فرمائش نازنین کے سامنے گویا داغ دی۔

''بھئی آج تو افطاری میں نازنین کے ہاتھ کا مٹن پلاؤ اور رشین سیلڈ ہو تو مزہ ہی آجائے۔'' دونوں نے مسکرا کر اپنے، اپنے شوہر کو دیکھا۔ اور پھر پھسر پھسر کرنے لگیں۔

''آج تو نفیسہ چھٹی پر ہے۔ کھانا کیسے بنائیں؟'' نازنین، مہرو کے کان میں تقریباً گھس گئی۔

''سوچتے ہیں کچھ.....'' مہرو نے جواباً دھم سرگوشی کی۔

''آپ دونوں اپنے، اپنے مجازی خدا کی خدمت کر کے اجر سمیٹیں۔ ہم دونوں تب تک آرام کر لیں۔'' فرہاد، تیمور کو اشارہ کرتا اپنے مخصوص کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تیمور بھی پیار بھری مسکراہٹ مہرو کی جانب اچھال کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ دونوں نے گویا کھل کر سانس لی۔

''اف مہرو..... فرہاد آیا تو گویا بہار آگئی ہو لیکن جیسے ہی کھانے کی فرمائش کی۔ دل چاہا یہ اٹھ کر چلا جائے۔ یہ دونوں تو اب صرف اب کھانے کی باتیں کرتے ہیں۔'' نازنین روہانسے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک کہا تم نے..... اب کیا کریں..... میرا خیال ہے آرڈر کردیتے ہیں۔'' دونوں کو ان کے شوہروں نے جدید موبائل گفٹ کیے تھے۔ جن سے وہ بھرپور استفادہ حاصل کررہی تھیں۔

اصل زندگی تو دونوں نے اب شروع کی تھی۔ گزرا وقت انہیں اپنی زندگی کا سیاہ دور لگتا تھا۔ جہاں وہ خود تھیں اور ان کی خود ساختہ سوچیں اور بندشیں..... اب زندگی، زندگی لگنے لگی تھی ابھی تو دونوں نے چاند رات کو شاپنگ پر بھی جانا تھا مگر ان دنوں تو وہ محبت بھری باتیں گویا بھول گئے تھے۔ صرف کھانے یاد تھے جو وہ فرمائشیں کر کر کے کھاتے۔

''یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے..... مسئلہ ہی حل ہوگیا مہرو..... جاؤ وہ پمفلٹ لے کر آؤ..... جو کل کوئی نیا ریسٹورنٹ کھولنے پر پھینک گیا ہے۔'' نازنین پُرجوش انداز میں بولی۔ مہرو کچن سے پمفلٹ اٹھالائی جو اس نے گیٹ کے پاس سے اٹھا کر کچن میں رکھ دیا تھا۔ نازنین نے مطلوبہ چیزیں آرڈر کیں..... شکر ہے کہ کافی وقت مل گیا تھا۔ افطار کے وقت جب دونوں نے ٹیبل سجائی تو ٹیبل پر ہر چیز ان کے شوہروں کی پسند کی موجود تھی۔ چھوٹے موٹے کام تو انہیں آگئے تھے۔ بڑے، بڑے کھانے پکانے ابھی مشکل تھے۔ سو اب وہ مطمئن تھیں۔

''آہا..... آج تو مزہ ہی آگیا..... کیا مزے کا مٹن پلاؤ بنایا ہے نازنین نے اور کیا مزے کا رشین سیلڈ ہے۔ امی آپ کی بہو کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔'' فرہاد اور تیمور ہلکی پھلکی افطاری کرنے کے بعد جو نازنین اور مہرو نے پکوڑوں، جام شیریں اور دہی بڑوں پر مشتمل بنائی تھی۔ نماز مغرب ادا کر کے اب کھانے کی ٹیبل کے گرد بذات خود ساتھ بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے۔ فرہاد، نازنین کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ جبھی دونوں بہنوں نے چونک کر نازنین کو دیکھا جس نے فوراً گڑبڑا کر نگاہیں جھکالیں۔ سلیمہ البتہ بہت خوش تھی ان کی بہو سگھڑ جو تھی۔ مہرو کی تعریف میں تیمور کیوں پیچھے رہتا۔ بریانی کا چمچ منہ میں ڈال کر نگلا اور محبت سے گویا ہوا۔

''بریانی تو کمال کی بنائی ہے مہرو نے گویا دیگ کی پکی ہو۔ امی مہرو بھی لاجواب کھانے پکاتی ہے۔ ویسے آپ کی دونوں بہوؤں کو کھانا بنانا آتا نہیں تھا، دونوں نے ہماری خاطر اتنی جلدی بنانا سیکھ لیا ہے۔'' تیمور بریانی کا دوسرا چمچ بھرتے ہوئے بولا۔ سلیمہ خوش تھیں لیکن زاہدہ اور شکیلہ کی نگاہیں اب مہرو پر مرکوز تھیں۔ جس نے گڑبڑا کر اپنا منہ مزید نیچے کرلیا تھا۔

''ماشاءاللہ میری بہویں ایک تو چاند کا ٹکڑا ہیں۔ دوسرے اتنی سگھڑ کہ میرا تو دل ہی خوش ہوگیا۔'' اب

شکیلہ بیگم اور زاہدہ بیگم کو چار و نا چار بولنا پڑا کیونکہ وہ رشتے کی بنیاد جھوٹ پر ہرگز رکھنا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں اپنے محبوب شوہروں کے سامنے نمبر بنانے کے چکروں میں نفیسہ سے کھانا پکواتی تھیں۔ آج وہ چھٹی پر تھی تو یقیناً کھانا آرڈر کیا ہوگا۔ یہ بھی نازنین کا آئیڈیا ہوگا دونوں جانتی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں یہ معصوم مہرو کا آئیڈیا تھا۔ لیکن اب بھلے کچھ بھی ہو جائے انہیں حقیقت بتانی تھی۔ کل کو بیٹیوں کی عزت میں کمی آتی انہیں گوارا نہ تھا۔

''سلیمہ بہن یہ جو کھانا آپ لوگ کھا رہے ہیں ناں، یہ ہماری بیٹیوں نے نہیں بنایا۔ یقیناً آرڈر کیا ہوگا دونوں نے..... اصل میں انہیں ابھی کھانا بنانا نہیں آتا لیکن مجھ سے اور شکیلہ سے سیکھ رہی ہیں۔ ان شاء اللہ جلد سیکھ جائیں گی لیکن شاید اپنے، اپنے شوہر کا مزید دل جیتنے کے چکر میں معدے سے دل تک جانے کے لیے ان کو اس جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ محبت بھی تو بہت کرتی ہیں ناں اپنے، اپنے شوہر سے۔'' زاہدہ بیگم نے مسکرا کر کہتے ہوئے دونوں کے پھوہڑ پن کا بھانڈا عین ان کے سسرال کے سامنے پھوڑا۔ دونوں نے گھبرا کر پہلے ماں اور خالہ کو دیکھا اور پھر تیمور اور فرہاد کو..... اور اپنی ساس سلیمہ خالہ کو..... سب کے چہروں پر مختلف تاثرات رقم تھے۔

''ہم دونوں جانتے تھے آنٹی کہ ہماری بیویوں کو کھانا بنانا نہیں آتا، ہم تو بس ان کے اندر سیکھنے کی لگن پیدا کرنا چاہتے تھے سو فرمائش داغ دیتے تھے، یہ ہمیں اچھا پکا کر کھلانا چاہتی تھیں بدمزہ نہیں، سو انہیں یہ کرنا پڑا..... لیکن سیکھ جائیں گی ابھی جلدی بھی کیا ہے..... ہم دونوں دل و جان سے ان سے راضی ہیں۔'' بھائی کے بھی دل کی ترجمانی فرہاد نے کی تھی۔

''تم دونوں نے میری پیاری، پیاری بہوؤں کو کیوں پریشان کیا بھئی..... میں شادی کے بعد سکھا دوں گی سب..... ابھی تو ان کو اپنی شادی کی تیاریاں انجوائے کرنے دو..... مہرو اور نازنین کو ئی ضرورت نہیں کچن میں سر کھپانے کی۔ شادی کے بعد میں ہوں ناں..... نخرے بھی اٹھاؤں گی اور سکھا بھی دوں گی۔'' سلیمہ واقعی محبت کرنے والی ساس اور بہوؤں کی پکی طرف دار تھیں۔

دونوں لڑکیوں نے ساس کی طرف محبت اور تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔ دونوں کی مائیں سلیمہ کے اتنے والہانہ پن پر مسکرا اٹھیں، دلوں میں اطمینان بھر گیا تھا۔

چاندرات ان کے لیے ڈھیروں مسرتیں لے کر آئی تھی۔ مہرو اور تیمور ٹیرس پر رکھے موتیے کے مہکتے پودے کے پاس کھڑے مستقبل کے سہانے سپنے بن رہے تھے جبکہ نازنین اور فرہاد لان کے ایک گوشے میں سنگی بینچ پر براجمان رات کی رانی کی خوشبو سے محظوظ ہوتے آنے والے وقت کو حسین تر بنانے کے منصوبے بنا رہے تھے جبھی سلیمہ بیگم باہر چلی آئیں اور زور سے بولیں۔

''ارے میری پیاری بہوؤں کیا چوڑیاں، مہندی کی شاپنگ کرنے نہیں جاؤ گی۔'' انہوں نے ذرا زور سے کہا تاکہ اوپر کھڑے تیمور اور مہرو بھی سن لیں..... اور آن کی آن میں تیمور، مہرو کا ہاتھ پکڑے ان کے سامنے تھا جبکہ نازنین اور فرہاد بھی ان کے نزدیک آ چکے تھے۔

شکیلہ اور زاہدہ نے اندر لاؤنج کی کھڑکی سے یہ خوب صورت منظر دیکھا تو دونوں کی نظریں آپس میں ملیں۔

''شکر الحمد للہ.....'' دونوں کے منہ سے شکر کے کلمات ایک ساتھ نکلے۔

''اللہ کا شکر ہے سلیمہ آج ان برخورداروں کی بدولت ہمیں ہماری بچیوں کے مسکراتے چہرے دیکھنے نصیب ہوئے ورنہ یہ تو عصیلی اور شرمیلی ہی بنی رہتیں اور ہم دونوں بہنیں کڑھتی رہتیں۔'' ان کی بات پر تیمور اور فرہاد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''چلیے آیئے شرمیلی بیوی اور عصیلی بھابی چاند رات کی شاپنگ پر چلتے ہیں۔'' تیمور بولا تو سب ہنسنے لگے۔ یہ عید دونوں، تینوں گھرانوں کے لیے بے حد خوشیاں اور مسرتیں لا رہی تھی اور محبتوں کے رنگ میں ڈوبی ان کی زندگی بہت حسین ہونے جا رہی تھی۔

❁❁❁

ایک دن کی دلہن

غزل مستوئی

گرمی زوروں پر تھی چونکہ اب سورج غروب ہونے کو تھا اس لیے گرمی کے بجائے حبس زیادہ تھا۔ تین عورتیں فیکٹری کے گیٹ سے نمودار ہوئیں جس میں ایک رشیداں بھی تھی اور ان کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں جو اس فیکٹری میں کام کیا کرتی تھیں۔

وہ اب فیکٹری سے نکل کر مین روڈ پر آ چکی تھیں۔ جہاں ہوا میں زہریلا دھواں شامل تھا، وہ تو ویسے ہی گرمی اور پسینے سے بدحال تھیں لہٰذا یہ دھویں والی ہوا بھی ان کو کسی نعمت سے کم نہیں لگ رہی تھی جو کہ ان کو فیکٹری کے گھٹے ہوئے ماحول میں کبھی دستیاب نہیں تھی۔ وہ اپنے راستے پر رواں تھیں۔ ہمیشہ کی روٹین گھر سے فیکٹری، فیکٹری سے گھر۔

''اُف آج کتنی گرمی ہے۔'' ان میں سے ایک عورت جو غالباً پینتیس، چھتیس کی تھی پیشانی سے پسینہ

صاف کر کے بولی۔

''صرف آج سلمیٰ بھابی!'' دوسری لڑکی نے فوراً ''آج'' پر زور دے کر کہا۔ یہ دونوں پڑوسنیں تھیں اور اکھٹے فیکٹری آتی جاتی تھیں۔

''موئی گرمی کا تو یہی حال ہے چھوڑو اسے۔'' رشیداں نے چڑ کر کہا جو اس لڑکی کی ماں تھی۔

پتا نہیں وہ کس بات پر چڑ رہی تھی اس ''گرمی'' سے جو اُن کے چڑنے سے بھی نہیں جانے والی تھی یا اس ''روٹین'' سے جو بچپن سے لے کر آج تک نہیں بدلی یا پھر اس ''غربت'' سے جو پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔

اب وہ سڑک پار کر کے بس اسٹاپ پر آ ٹھہریں۔ جہاں پہلے سے کچھ مرد موجود تھے اور ایک ادھیڑ عمر، بھاری بھرکم عورت بینچ پر بیٹھی تھی..... رشیداں بھی اس کے ساتھ وہیں بینچ پر بیٹھ کے بس کا انتظار کرنے لگی۔ بس کو آنے میں ابھی دیر تھی۔ رشیداں نے اپنی سانسیں بحال کیں۔ پاس بیٹھی خاتون نے اسے اپنے بیگ سے جوس کا ڈبا نکال کر دیا۔ پہلے تو اس نے لینے سے منع کیا لیکن ان کے اصرار پر لے لیا۔

اب جہاں خواتین موجود ہوں وہاں بھلا خاموشی ہو ایسا کبھی ہوا ہے۔ اگرچہ مرد بھی بہت باتونی ہوتے ہیں مگر خواتین ہی بدنام ہیں خیر..... گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ اس عورت نے بتایا کہ وہ جوڑوں کی بیماری میں مبتلا ہے دوائی لینے آئی تھی۔ رشیداں نے بھی اسے اپنی بیٹی اور پڑوسن سے ملوایا اور جوڑوں کا درد دور کرنے کے لیے کئی گھریلو نسخے بھی بتائے۔

☆☆☆

وہ ابھی گھر پہنچی ہی تھیں کہ بشیراں خالہ آ گئی۔ رشیداں نے ملتے ہی پوچھ لیا پوچھتی بھی کیوں نہ وہ کب سے جواب کی منتظر تھی۔

''کیا ہوا بات بنی ہے؟'' رشیداں نے جلدی سے پوچھا۔

''کہاں بہن!'' خالہ نے بڑی مایوسی سے کہا۔ یہ سن کر وہ ایک دم ہی مایوس ہو گئی۔

''اچھا اب تم مایوس تو نہ ہو اور رشتہ مل جائے گا موئے لالچی تھے دفع کرو ان کو..... اس میں بھی کوئی بہتری ہو گی تم فکر نہ کرو۔'' خالہ نے رشیداں کی مایوس شکل دیکھ کر جلدی سے دلاسا دیا۔ اس نے صرف ''ہاں'' میں سر ہلایا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔'' خالہ اٹھنے لگی۔

''ارے، ارے کہاں، مجھے بھی دیکھو میں نے تو تم سے پانی تک کا نہ پوچھا۔'' رشیداں نے جلدی سے کہا اسے شرمندگی محسوس ہوئی گھر آئے مہمان سے چائے پانی بھی نہ پوچھا۔

''ارے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم بیٹھو ویسے بھی پرایا گھر تھوڑی ہے، اچھا میں چلتی ہوں گھر پر بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' خالہ چلی گئی۔

رشیداں کو پھر مایوسی نے آ گھیرا۔ وہ کب سے کوشش کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی کا رشتہ کسی اچھی جگہ ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے بشیراں کو بھی کہا وہ کوئی پروفیشنل رشتہ کرانے والی تو نہیں تھی لیکن اپنی جان پہچان میں فوراً بات شروع کر دیتیں۔ رشیداں کے احسان ہی اتنے تھے وہ ہی تو ہر مشکل وقت میں ان کے کام آتی تھی اور سعدیہ تو ان کے سامنے پلی بڑھی، جوان ہوئی تھی بہت پیاری بچی تھی۔ گھر کے ہر کام میں ماہر اور پوری دلجمعی سے کام کرنے والی۔

کچھ لوگ سعدیہ کو دیکھنے آئے لیکن بات نہ بن پائی۔ کچھ لوگوں نے جہیز کی ڈیمانڈ ہی اتنی رکھ دی جو ان کے بس سے باہر تھی۔ اب بھلا جس لڑکی کا باپ ٹھیلے والا ہو، ماں فیکٹری میں کام کرتی ہو وہ کہاں سے جہیز دینے کے قابل ہوں گے اور کچھ کو لڑکی ہی پسند نہ آئی۔ بیچاری غربت کی چکی میں پس کے رہ گئی تھی۔ نین نقوش تو ٹھیک تھے آنکھیں بھی بڑی تھیں لیکن خون کی کمی کی وجہ سے بہت بدصورت لگتی۔ جسم بھی بس ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ غربت کتنی ظالم ہوتی ہے انسان سے قدرت کا دیا حسن اور جوانی بھی

چھین لیتی ہے۔

☆☆☆

کچھ دنوں کے بعد رشیداں کی پھر اس بس اسٹاپ والی عورت سے ملاقات ہوئی۔ اس عورت نے ان کا شکریہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نسخے سے درد میں کافی فرق پڑا۔ اس کے بعد تو یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور پھر گھر کی دہلیز تک آ پہنچیں۔ وہ عورت تھی ہی اتنی خوش اخلاق، ملنسار، انسانیت کا درد رکھنے والی اور ماہر گفتار۔ کبھی ان کے گھر خالی ہاتھ نہ آئی بعض دفع تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی کیونکہ غریب کا گھر تھا وہ کبھی اس کے شایانِ شان کچھ پیش ہی نہ کر پاتی لیکن وہ جو بھی لاتی اپنی خوشی سے لاتی نہ کہ ان کو شرمندہ کرنے۔ وہ ان کے مالی حالات سے اچھی طرح واقف تھی اور ان کو بھی اپنے بارے میں سب بتا دیا تھا کہ ان کے دو بچے جوان ہیں۔ ایک بیٹا جس کی محلے میں اپنی دکان ہے اور ایک بیٹی جو کالج میں پڑھتی ہے بس وہ اور ان کا شوہر ہیں۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں انہوں نے پوچھ لیا۔

''رشیداں بہن تم نے سعدیہ کا رشتہ کہیں طے کیا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں بہن ابھی اِدھر اُدھر بات چل رہی ہے۔'' رشیداں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''اگر میں کہو کہ میں سعدیہ بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں تو؟'' رشیداں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

''اب میں نے تو تم کو پہلے ہی کہا تھا کہ بیٹے کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ بھلا مجھے سعدیہ سے اچھا رشتہ کہیں مل سکتا ہے میرے بیٹے سے تو تم پہلے ہی مل چکی ہو اور گھر بار بھی دیکھ لیا۔ میں اپنے بیٹے کے لیے بالکل سعدیہ جیسی بہو چاہتی ہوں خوب صورت، نیک سیرت اور گھر بسانے والی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بہن لیکن بیٹی کے رشتے کی بات ہے میں تمہیں ایسے تو جواب نہیں دے سکتی سعدیہ کے باپ سے بات کروں گی۔'' بہرحال رشیداں نے ذرا سوچ کر کہا۔

موہم گرما کی ابتدائی نرمیاں
مئی 2021ء کے
شمارے کی انہونی کہانیاں

اولین صفحات

عشق کے ہزار رنگ ہیں..... اپنے قریبی لوگوں سے ہونے والی محبت جب عشق کا روپ دھارتی ہے تو نئی حیرتوں کو جنم دیتی ہے..... محبت اور نفرت کی شدتوں کا اظہار **شبنم شفیق** کے قلم کا افتخار

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان..... **امجد جاوید** کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

آشنا ناآشنائی کے مراحل طے کرتی کہانی کے سنگین حقائق

دوسرا رنگ

دولت کے پیچھے بھاگتے بھاگتے منزل کھو دینے والوں کا امتحان

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

''ہاں، ہاں کرلو بات مجھے کوئی جلدی نہیں۔''

کمرے میں کھڑی سعدیہ یہ سب سن چکی تھی نہ جانے ایسا کیا تھا کہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اسے شرم آرہی تھی۔ ہونٹوں پر اچانک بکھرنے والی مسکراہٹ سمٹ ہی نہیں رہی تھی ورنہ تو اس نے آئینے میں خود کو جب بھی دیکھا نقص ہی نظر آئے ہیں۔ کبھی رنگ سیاہ تو کبھی کیل مہاسے، کبھی پیلی رنگت تو کبھی کیا لیکن آج تو گال گلابی ہوگئے تھے۔

لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں آنکھوں میں خواب کتنی جلدی سجالیتی ہیں اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ان کی تعبیر کیا ہوگی ان کی کوئی منزل ہے بھی یا نہیں۔

ادھر وہ عورت تو چلی گئی لیکن رشیداں کو سوچ کے سمندر میں دھکیل گئی۔ وہ ابھی تک حیران تھی کہ جس وجہ سے اس کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ دن بھر جس فکر میں گھلتی رہتی تھی، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن رشتہ خود چل کر اس کی دہلیز پر آئے گا اُسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی دعائیں یوں بھی قبول ہو جائیں گی۔

اس نے شوہر کو اس بارے میں بتایا پہلے تو اسے بھی یقین نہیں آیا کہ کچھ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ آج کل کے دور میں لوگ ''دوستی'' تو خود سے نیچے کے لوگوں میں کر لیتے ہیں لیکن ''شادی'' تو خود سے اوپر کے لوگوں میں ہی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

تھوڑی سی چھان بین کے بعد رشتہ پکا ہوگیا۔ اب وہ عورت اپنی بیٹی کے ہمراہ آتی، ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کچھ ساتھ لاتی بلکہ اب تو وہ رنگ گورا کرنے والی کریمیں، ڈرائی فروٹ وغیرہ بھی ساتھ لاتی۔

سعدیہ نے جب پہلی بار اپنی نند کو دیکھا تو حیران ہی رہ گئی وہ کتنی گوری تھی، شکل سے لگ رہا تھا کہ فیشل کروا کے آئی ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی کہ شادی کے بعد وہ بھی ویسی ہو جائے گی۔ اب تو کریمیں بھی استعمال کر رہی تھی جس کا چند ہفتوں میں ہی رزلٹ بھی نظر آنے لگا تھا۔

آخر کار وہ دن بھی آگیا جب وہ بیاہ کے سسرال آگئی۔ اس نے اس نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔ آج وہ اس گھر میں تھی جہاں ہر لڑکی نے جانا ہوتا ہے۔ جسے عورت کا حقیقی گھر کہا جاتا ہے جہاں ایک عورت اپنی محبت اور شفقت سے نئے رشتوں کو پروان چڑھاتی ہے اور ایک مکان کو گھر بناتی ہے۔

ابھی وہ کمرے میں میک اپ کر رہی تھی کہ اسے باہر سے زور، زور سے ہنسنے کی آوازیں آئیں اور یہ آوازیں مردانہ تھیں۔ ''یہ کون لوگ ہنس رہے ہیں۔'' سعدیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں صرف اس کا شوہر جو کہ اس کے سامنے بیڈ پر سو رہا تھا اور اس کے سسر تھے باقی جو کچھ رشتے دار آئے تھے وہ تو دوسرے شہر سے آئے تھے شادی کے دن ہی روانہ ہوگئے تھے۔ لیکن ہنسی کی آوازیں ایک سے زیادہ تھیں اور وہ بھی اتنی زور سے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک زنانہ آواز ابھری اور پھر ہنسی کی آوازیں بند ہوگئی۔ لیکن وہ سمجھ نہ سکی کہ کہا کیا گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر ہلکا سا جھانکا۔ چار افراد گھر سے نکل رہے تھے اور اس کی ساس باہر کا دروازہ کھولے اپنی آنکھیں انگلیوں کے پوروں سے صاف کر رہی تھیں کہ اچانک ان کی نظر کمرے کے دروازے پر کھڑی سعدیہ پر پڑی۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''ارے تم جاگ گئیں''۔ وہ دروازہ بند کر کے اس کے پاس آئیں۔

''جی..... امی وہ لوگ.....'' وہ بات مکمل کر ہی رہی تھی کہ اس کی ساس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی تیار نہیں ہوئیں، تمہاری ماں آنے ہی والی ہوں گی جاؤ تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چلی گئیں۔

ماں کے گھر بھی وہ اس بارے میں سوچتی رہی ماں کے کچھ پوچھنے پر اس نے کچھ نہ بتایا پھر شام کو شوہر کے ساتھ وہ واپس آگئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو اس نے نند کو سلام کیا جو بھڑکیلے سوٹ میں ڈارک میک اپ اور

تیز پرفیوم کے ساتھ اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گئی اور باہر کھڑی کار میں جا بیٹھی۔ وہ حیران ہوئی اس نے شوہر کی طرف دیکھا لیکن وہ نظریں چرا کر کمرے داخل ہو گیا تھا۔ گھر میں ساس، سسر تو نظر ہی نہیں آئے۔ پھر جب شوہر سے پوچھنا چاہا تو صرف سرسری سا جواب ملا کہ دوست کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔

اور اگلی صبح تو سارا کھیل ہی فاش ہو گیا۔ جب اس کی نام نہاد نند پیسوں سے بھرے بیگ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔ وہ پوری رات مجرا کر کے لوٹی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سارے جمع ہوئے اور بھکاریوں کی طرح اپنے، اپنے حصے کے لیے لڑنے لگے اور وہ ایک پلر سے لگی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ایک دم بیٹھ گیا۔ کئی دن سے اس کے دل میں پتا نہیں کیا، کیا وسوسے آ رہے تھے اب یہ منظر۔ کسی نے اس کو کچھ بتانے یا چھپانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

''او تم کیا دیکھ رہی ہو کمرے میں جاؤ اور اپنا سامان باندھو۔'' وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کی نند نے اس کی حالت دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اس عورت سے کہا۔

''تو نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا۔'' اب وہ سب ہنسنے لگے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' سعدیہ نے ششدر ہو کر کہا لیکن آدھا جملہ حلق میں پھنس گیا۔ سب اس کی حالت دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ جب سمجھ آیا تو اس نے گڑبڑا کر بھاگنا چاہا لیکن جس کے ساتھ اس کے نکاح کا ناٹک رچایا گیا اس نے پکڑ لیا اور اس پر تھپڑ برسانا شروع کر دیے۔

''چہرے پر تھپڑ نہ مار بڑا خرچا کیا ہے اس پر اگر اس کا چہرہ بگڑ گیا تو کون اس کے پیسے دے گا۔'' اس عورت (جو نام نہاد ساس تھی) نے کہا یہ وہی عورت تھی جو شادی سے پہلے اس پر پیار لٹائے تھکتی ہی نہ تھی اور اب ایسا رویہ..... سچ ہے لوگ مطلب کے لیے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ادھر کام نکلا نہیں کہ اصلی رنگ سامنے آ گیا۔

سعدیہ کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس نے رو، رو کر حالت بری کر لی۔ اس کی کوئی مہذب شادی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ نام کا نکاح تھا جسے تین بولوں سے توڑ دیا جاتا۔ وہ جسم فروشوں کے پاس تھی۔ یہاں کوئی ماں تھی نہ کوئی بیٹا، بیٹی۔ یہ لوگ سیدھے سادے غریب لوگوں کو پھنساتے پھر اُن کی لڑکیوں سے بھی یہ گھناؤنے کام کرواتے۔ ایسے لوگ شکاریوں کی طرح غریب لڑکیوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔ جہاں لڑکی نظر آئی وہاں دانہ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ غربت کے مارے بیچارے لوگ بھی بہت جلدی بھروسا کر لیتے ہیں کہ ان کی بیٹی ایک ایسے گھر جا رہی ہے جہاں وہ خوشی سے رہے گی لیکن ان کو کیا پتا کہ وہ کس نیت سے لے جا رہے ہیں۔ ایسی زندگی دوزخ سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

دروازہ کھلا اور وہ عورت اسے لینے آ گئی۔

''چل ہم جا رہے ہیں۔'' سعدیہ نے بڑی منت سماجت کی۔ اس کے سامنے گڑگڑائی کہ اسے چھوڑ دے، اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس نے خدا رسولؐ کے واسطے دیے لیکن سب بے سود انہوں نے اس کی ایک نہ سنی بلکہ اس کو ڈرایا دھمکایا اس کو مارنے سے لے کر اس کے والدین کو بھی مارنے کی دھمکی دی۔ بہت ڈرا دھمکا مار پیٹ کے بعد وہ اس کو لے کر چلے گئے۔ پہلے وہ اسے پولیس اسٹیشن لے گئے اور وہاں سے دوسرے شہر اور پھر بالآخر بیرون ملک۔

☆☆☆

رشیداں کی اداسی اور پریشانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دو دن سے کال کر رہی تھی لیکن فون بند جا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر اولاد پر کوئی مصیبت آئے تو ماں کو پہلے پتا چل جاتا ہے وہ بھی پریشان تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ہوا کیا ہے پہلے تو اس کی بیٹی خود فون کرتی تھی تو اب کیا ہوا۔ دل میں طرح، طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ رشیداں نے جب شوہر سے کہا تو اس نے کہا۔

"مصروف ہوگی، دعوت وغیرہ میں گئی ہوئی ہوگی۔ نیا، نیا گھر ہے سمجھنے کے لیے تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔" لیکن یہ باتیں ماں کے دل کو تسلی نہیں دے سکیں۔ رشیداں نے اپنے شوہر سے صاف کہہ دیا کہ وہ اسے سعدیہ کے گھر لے چلے۔ جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے گی نہ تب تک اس کے دل کو قرار نہیں آئے گا۔

اگلے دن وہ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ان کے داماد عابد کی دکان بند تھی گھر پر بھی تالا تھا۔ قریبی لوگوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ تو دو دن پہلے گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

"لیکن یہ گھر تو ان کا اپنا تھا اور ہم نے پہلے بھی لوگوں سے پتا کرایا تھا۔" ان کی بات پر پڑوسیوں نے کہا۔

"کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے، یہ لوگ تو دو تین ماہ پہلے کرایے پر یہاں رہنے آئے تھے۔" یہ سنتے ہی رشیداں کی ماں بے ہوش ہوگئی۔

وہ سب جان گئے تھے کہ وہ فراڈیے تھے۔ لیکن ان کی بیٹی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ پولیس میں رپورٹ درج کرانے بھی گئے تھے لیکن وہاں پتا چلا کہ۔ ان کے خلاف ہی پرچہ کاٹا گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے خلاف ہیں اس نے پسند کی شادی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆

اس واقعے کو ایک ماہ گزر گیا تھا۔ سعدیہ کی ماں زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اس دن کو کوستی تھی جب اس نے اپنی اکلوتی بیٹی ان کو سونپی۔ وہ سوچتی کہ کاش وہ اس عورت سے نہ ملی ہوتی یا تھوڑی چھان بین اور کر لیتے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کے چکر میں اپنی بیٹی ہی گنوا دی تھی۔ باپ بھی الگ بیٹی کے غم نڈھال تھا۔

کہتے ہیں پہلے بیٹی کا رشتہ لیتے وقت لوگوں کی جوتیاں گھس جایا کرتی تھی۔ ایسے کاموں میں کئی سال لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن آج کل لڑکے کا صرف گھر ہی دیکھ کر ہاں کہہ دی جاتی ہے۔ رشیداں مستقل پچھتاوے کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ بیچاری رشیداں کہاں تک بیٹی کا پیچھا کرتی، فون کی سمیں بند ہو چکی تھیں، وہ جس در پر جاتی نہیں کوئی شنوائی نہ ہوتی۔ بالآخر دونوں میاں بیوی تھک ہار کر بیٹھ گئے تھے۔ رشیداں اب لوگوں کو سمجھاتی پھرتی لڑکیاں بوجھ نہیں، لڑکیاں ڈھور ڈنگر نہیں، لڑکیاں مفت کا مال نہیں، انہیں بھی تم نے نو مہینے کوکھ کی تکلیف سہہ کر جنا ہے۔ مگر وہ کس، کس کو سمجھاتی دنیا تو بہت وسیع ہے۔ وہ کیسے سب لڑکیوں کو ان شیطانوں سے بچا سکتی تھی۔

☆☆☆

سرکاری اسپتال کے ائر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے پُرسکون ڈاکٹرز اور ان سے یکسر مختلف حالات کا شکار گرمی میں بے بسی سے فرش پر پڑے تکلیف سے بلبلاتے، کراہتے مریض اسپتال کی ہمیشہ کی گہما گہمی میں کچھ لوگ انتظار میں بیٹھے تھے... تو کچھ ڈاکٹرز، نرسز کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے کہ کسی طرح ان کے مریض کو ایک نظر دیکھ لیں۔ انہی میں فرش پر پڑی ماں کا ہاتھ تھامے سترہ، اٹھارہ برس کی وہ نوعمر پیاری سی لڑکی جو ماں کو تکلیف میں دیکھ کر اور اپنی بے بسی پر رو رہی تھی۔ وہ کئی گھنٹوں سے ڈاکٹرز کو بلا رہی تھی لیکن ہر بار نرسز اسے یہ کہہ دیتیں کہ ڈاکٹر ابھی مصروف ہیں، جب فارغ ہوں گے تو آجائیں گے تم شور مت کرو۔ اِدھر اس کی ماں کی حالت لحہ بہ لحہ نازک ہوتی جا رہی تھی اب وہ ماں کے ساتھ بیٹھی دعائیں کر رہی تھی۔

اور ان سے دور بینچ پر بیٹھی ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی اور لڑکی کی بے بسی کی کہانی اسے سمجھ آگئی تھی ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رینگ گئی۔ آنکھوں میں بھی چمک آگئی یقیناً اسے اپنا مطلوبہ شکار مل گیا تھا۔ آج بھی گرمی زوردار تھی۔ اب وہ عورت جوس کا ڈبا ہاتھ میں لیے بینچ سے اٹھ کر اپنے شکار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک اور سعدیہ لٹنے کو تھی۔

❁❁❁

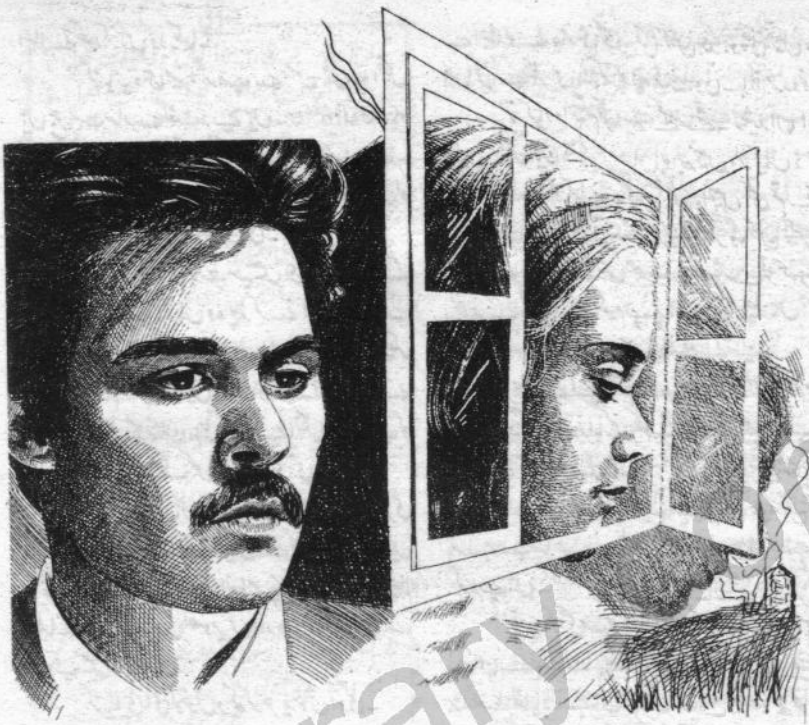

بلاعنوان

فریحہ ماپارا

"گڑیا ذرا یوں گھوموتو سہی۔ ارے ذرا مڑ کر تھوڑا پوز تو دو۔" انیلا نے پانچ سالہ گڑیا کو زبردستی پھولی پھولی گلابی فراک پہنائی تھی اور اب وہ گڑیا کی موبائل کے کیمرے سے تصاویریں لینے میں مصروف تھی۔ لیکن آج تو گڑیا نے بھی ٹھانی ہوئی تھی۔ پھولی ہوئی فراک سے بے تحاشا پیار تو تھا اسے اور آج تو امی نے آنکھوں میں چمکی والی آئی شیڈو بھی لگائی تھی اور وہ روز جو منت کرنے پر بھی گلابی لپ اسٹک اس کے ہاتھ میں کیا اس کے قریب بھی نہیں رکھی جاتی تھی آج وہ اس کے ہونٹ پر سجائی بھی تھی پھر بھی اس کا موڈ ہنسنے مسکرانے کا تھا اور نہ ہی امی جو الفاظ بلوا کر ویڈیو بنانا چاہ رہی تھیں وہ بولنے کا تھا۔

"ارے گڑیا بولو ناں

Our group is the best

So much fun, we are number one

Love you JJ uncle.....

پھر اس کے ساتھ flying kiss بھی دینا۔"

انیلا نے پیار سے پچکارا۔

"نہیں دینی مجھے فلائنگ کس۔" گڑیا کے کہنے پر

انیلا نے غور کر اس کو دیکھا۔

''گڑیا یہ وہی میرا گروپ ہے جس میں وہ انکل ہیں جو بہت سارے گفٹ دیتے ہیں۔ JJuncle یاد آیا۔ پچھلی بار تانیہ آنٹی کی بیٹی کو اتنا بڑا ڈول سیٹ ملا تھا۔ وہ تو اب گروپ کی اسٹار بن چکی ہے۔ تم بھی تھوڑا بول لو ناں۔'' انیلا اب منتوں پر اتر آئی تھی۔

ابھی انیلا کی باتی بات منہ میں ہی تھی کہ گڑیا کے انداز ہی بدل گئے۔ کہاں وہ پوز کرنے اور لائن بولنے سے بیزار تھی اور وہی گڑیا اب بڑے ڈول ہاؤس کے چکر میں گھوم، گھوم کر اپنا ڈریس دکھا رہی تھی۔ اپنے پیارے ہاتھوں سے دل کا نشان بناتی جے جے انکل اور گروپ کو ''آئی لو یو'' اور ''فلائنگ کس'' دے رہی تھی۔

''یہ ہوئی ناں بات میری جان، میری princess۔'' انیلا کئی زاویوں سے گڑیا کی تصاویریں کھینچتی رہی۔ ''اس بار تو انعام پکا ہمارا ہوا۔'' انیلا چہچہاتے ہوئے ساری تصویریں اور ویڈیو اس فیس بک گروپ میں ڈالنے لگی۔

گڑیا اپنی امی کو خوش دیکھ کر مزید خوش ہوگئی۔

☆☆☆

''ہمدان جا کر قاری صاحب کے پاس بیٹھو، گڑیا اکیلے نہیں پڑھے گی۔''

''کیوں امی، میں اکیلے کیوں نہیں پڑھوں؟'' گڑیا نے تجسس سے پوچھا۔

''اس لیے گڑیا کیونکہ وہ اسٹرینجر ہیں اور بالکل بھی اسٹرینجر کے ساتھ فری نہیں ہوتے۔ آپ دور بیٹھ کر پڑھیں گی ابھی اور آپ کو یاد ہے ناں میں نے گڈ ٹچ اور بیڈ ٹچ کے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''جی امی، مجھے بالکل یاد ہے۔'' گڑیا نے انیلا کو فنگر ٹپس پر از بر گڈ ٹچ بیڈ ٹچ کے رولز بتا دیے۔

''جاؤ اب جلدی جاؤ، بھائی بیٹھا ہے قاری صاحب کے پاس۔''

☆☆☆

''آج میٹ اپ ہے، آج میٹ اپ ہے۔'' صبح سے انیلا بولے جا رہی تھی۔ آخر اس کے شوہر جبران نے موبائل سے نظریں ہٹا کر پوچھ ہی لیا۔

''تو کیا ہوا بیگم کل سے کیوں آپ میٹ اپ کے لیے پریشان ہیں؟''

''آپ کو کیا پتا کتنی مشکل سے ٹکٹ ملی ہے؟ آدھے دن میں ٹکٹ ختم۔ میں تو پورا دن بیٹھی رہی جیسے ہی ٹکٹ کے فارم آئے بس جھٹ سے میں نے سب کی ٹکٹ لے لیں۔ آپ گروپ پر ہوں تو پتا چلے ناں آپ کو؟ کیسے سب منت کر رہے تھے ٹکٹ کے لیے۔''

جبران نے اپنے آپ کو سرزنش کی کہ کس حکیم نے اسے اپنی بیگم کا پنڈورا باکس کھولنے کو کہا تھا۔ اب سب ہی لپیٹ میں آنے والے تھے۔

''اور ہاں سنیے آپ ٹھیک سے تیار ہوئیے گا۔ پہلی بار جے جے صاحب سے ملیں گے آپ۔ بڑا نام ہے میرا گروپ میں۔''

''آپ کو بھی جے جے انکل کو اچھے سے سلام کرنا ہے، ان سے ہاتھ ملانا ہے۔ پچھلی بار آپ کی ویڈیو سے کتنا بڑا تحفہ ملا تھا یاد ہے ناں؟ انکل نے خود کمنٹ کیا تھا اس پوسٹ پر۔ بس اچھے سے انکل کو تھینک یو کہنا۔'' اب وہ گڑیا کی طرف مڑی۔ انیلا کے ہدایت نامے ختم ہو کر ہی نہیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

اس نے آج اپنے اور گڑیا کے لیے بہترین کپڑوں کا انتخاب کیا تھا۔ گڑیا کی گلابی رنگت پر وہ نارنجی فراک بے تحاشا خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ اس پر پڑھ کر پھونکا، گڑیا واقعی پیاری سی گڑیا جو تھی۔

میٹ اپ میں بہار کا سماں تھا، جے جے انکل سے ملنے والوں کا رش بھی..... بھی انہیں بھائی، بھائی پکارے جا رہے تھے، اتنے بڑے گروپ کے ایڈمن جو تھے۔ گڑیا کے دماغ میں بھی انیلا کی ساری باتیں چل رہی تھیں۔ جونہی اس نے جے جے انکل کے ساتھ ''ہینڈ شیک'' کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ارے یہ تو بہت پیاری گڑیا ہے۔'' وہ بولے اور

پھر بڑھ کر فوراً اسے گود میں لے لیا۔

اتنے سارے بچوں میں گڑیا کی پزیرائی دیکھ کر انیلا پھولے نہیں سمائی۔

اچانک اسے یوں اٹھا لینا گڑیا کو ناگوار گزرا۔ جے جے انکل کے ہاتھ پہلے اس کی فراک پر تھے اور اب ان کی انگلیوں کا لمس اسے اپنے پیروں پر بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کنفیوز ہو کر اس نے کسمسا کر گود سے اترنا چاہا۔ اتنے لوگوں میں اپنی ماں کو ڈھونڈ کر ان سے تائید چاہی تو انہیں موبائل پکڑ کر اسی کی تصویر کھینچتا پایا۔ اتنے میں راستے بھر کے سارے سبق بھی یاد آنے لگے انیلا کی آواز۔

''اچھے سے ملو گی تو گفٹ ملے گا۔'' اس کے کان میں گونجنے لگی اور گڑیا مسکرا دی۔ انکل کے ساتھ فوٹو بھی کھنچوالی اور ہائے ہیلو بھی کر لی۔ میٹ اپ کے اختتام پر ڈھیر سارے vouchers لے کر اور گڑیا کا اسٹار کا خطاب لے کر انیلا خوشی خوشی، واپس آ گئی۔

☆☆☆

آج انیلا، گڑیا کو لے کر شاپنگ مال آئی تھی۔ میٹ اپ پر بڑے برانڈز کے واؤچر جو ملے تھے۔ شاپ کے اندر کپڑے دیکھتے ہوئے انیلا کو احساس ہوا کہ گڑیا اس کے ساتھ نہیں ہے۔

''گڑیا، گڑیا.....'' وہ ایک ساتھ کئی دفعہ پکار گئی۔ اگلے پچھلے سارے ریک اسٹینڈ دیکھ ڈالے۔ لٹکتے کپڑوں کے نیچے بھی جھانک لیا کہ کہیں گڑیا بیزار ہو کر چھپ تو نہیں گئی۔ ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کے انبار کو وہیں پھینک کر وہ باہر کاؤنٹر پر بھاگی۔

''پلیز، پلیز ہیلپ می۔ مائی چائلڈ از مسنگ۔''

کاؤنٹر پر خواتین نے اسے دلاسا دیتے ہوئے انٹر کام پر گڑیا کے نام کی اناؤنسمنٹ شروع کر دی۔

انیلا جھٹ اپنے موبائل پر گڑیا کی تصویریں اور ساتھ ہی اس کے کپڑوں کی تفصیل بھی بتاتی رہی۔ اتنے میں ایک گارڈ نے مانیٹر پر گڑیا کو کسی اور کی گود میں بیٹھے دیکھ لیا۔ بروقت دروازے کے گارڈز نے شور مچایا تو وہ آدمی گڑیا کو تیزی سے اتار کر فوراً بھاگ لیا۔

کتنی دیر انیلا بچی سے لپٹ کر روتی رہی۔ اور وہ اپنے معصوم ہاتھوں سے ماں کا چہرہ پکڑے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ امی اتنا رو کیوں رہی ہیں۔

''گڑیا، گڑیا آپ ایسے کیسے کسی اسٹرینجر انکل کی گود میں چلی گئی بیٹا؟'' انیلا روتے، روتے بولی۔

''امی وہ بھی تو مجھے گفٹ ہی دے رہے تھے۔'' گڑیا نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا اور بولی۔

☆☆☆

غزل

کہاں آ کے رکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا، اسے بھول جا

وہ تیرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں
دلِ بے خبر میری بات سن، اسے بھول، اسے بھول جا

میں تو گم تھا تیرے ہی دھیان میں، تیری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی میرے کان میں، میرے ساتھ آ، اسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشک غم، تیرے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تو بھی مسکرا، اسے بھول جا

کیوں اٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا تیرے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تیری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی تیرا خواب تھا
دل منتظر تو یہ کس لیے، تیرا جاگنا، اسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے میں پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بلا، اسے بھول جا

شاعر: امجد اسلام امجد، انتخاب
مرسلہ: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
دعا ہماری اس نسل کے لیے
جس راستے پر ہم چلا رہے ہیں انہیں
بس اب خدا ہی بچا لیں انہیں

مکمل ناول

سانجھ بھئی چودیس

عنیزہ سید

شہناز کی صرف دو ہی عادتیں ہاجرہ کو بری لگتی تھیں۔ ایک سگریٹ پینا دوسری پان کھانا۔ آٹھ منزلہ اونچے ٹاور میں بنے ان فلیٹوں میں کام کرنے کے لیے اوپر نیچے جانے کا انتظام یوں تو لفٹ کے ذریعے کیا گیا تھا مگر اس کا کیا، کیا جاتا کہ اس علاقے میں بجلی اکثر جاتی آتی رہتی تھی، صاحب لوگوں کو خود آنا جانا ہوتا تو جنریٹر چلانے کی ذمے داری پر بیٹھے رفیق کو گھرک کر کام نکال لیا جاتا مگر ملازموں، آیاؤں اور ماسیوں کے لیے وہ جنریٹر چلانے میں آنا کانی کر جاتا۔

''چل چل، ٹانگیں ٹوٹی ہیں کیا.....'' کسی ماسی یا آیا کے کہنے پر وہ بے نیازی سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہتا۔

''جانتی ہے روج (روز) کا کتنا تیل جلتا ہے جنریٹر کا۔'' وہ پوچھنے والی کو اپنا راستہ ناپنے کا اشارہ کر دیتا تھا۔

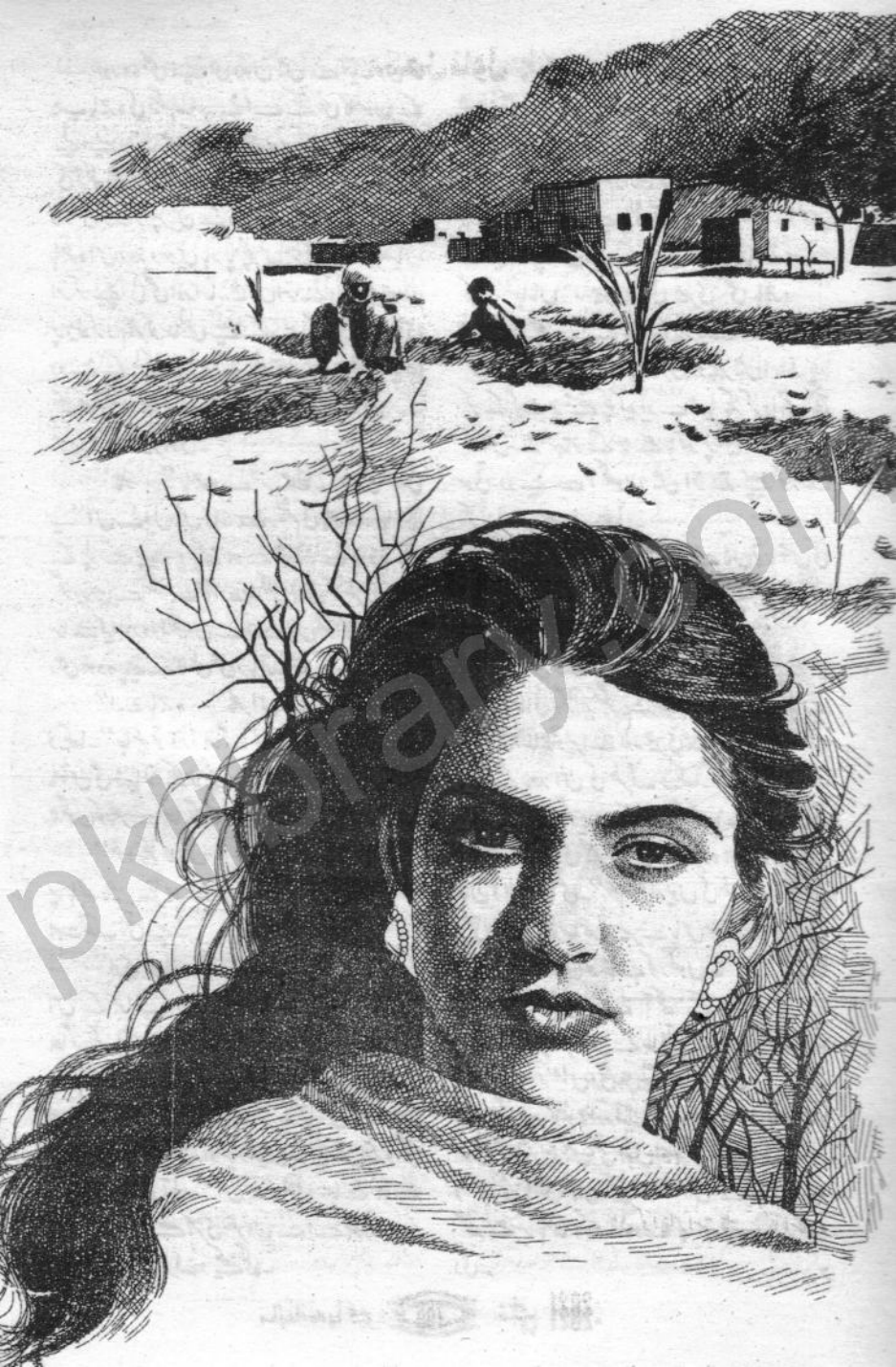

اور وہ بھی ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن تھا جب ہاجرہ کی بیگم صاحبہ نے اسے کتنے ہی کاموں کے لیے ایسے وقت میں کئی بار نیچے اوپر دوڑایا تھا جب بجلی کی آنکھ مچولی تسلسل سے جاری تھی۔ دوڑ کر سامنے والی فارمیسی سے ڈسپرین کے دو پتے پکڑ لانے کے حکم پر ہاجرہ اس روز دسویں بار پانچویں منزل سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی اور احاطے میں اترنے والی سیڑھیوں پر بیٹھ کر دم بھر کو سانس لینے کے لیے رک گئی تھی۔ ابھی دوپٹے کے پلو کو ہوا لینے کے لیے جھلانا شروع ہی کیا تھا کہ بھاری وجود کے ساتھ ہانپتی کانپتی شہناز اس کے قریب آ کر ڈھیر ہوگئی۔

''چلو.....'' ہاجرہ نے سر جھٹکا۔ ''نازل ہوگئی یہ۔'' اس نے دل میں کہا۔ سستے ریشم کی پھولدار ساڑی کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے شہناز نے بلاؤز کے گریبان سے سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا نکال کر نظروں کے سامنے کیا اور دو انگلیوں سے اسے یوں ٹھونکا جیسے جانچ رہی ہو وہ پینے کے قابل بھی رہا تھا یا نہیں۔

''اے ہاجرہ.....'' پھر اس نے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔ ''جائیو تو ذرا بھاگ کر چوکیدار سلطان سے ماچس کی ڈبیا تو پکڑ لائیو.....'' اس نے ہاجرہ کی دکھتی ٹانگوں کو پھر سے بھاگنے کا اذن دیتے ہوئے کہا۔

''خود پکڑ لاناں.....!'' ہاجرہ نے دکھتی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتانے کی کوشش کی کہ وہ خود بہت تھک چکی ہے۔

''اری او ہاجرہ.....بہن.....نہیں۔'' شہناز نے اس کے جواب کو ان سنا کرتے ہوئے کہا۔ ''جاناں بھاگ کر ماچس کی ڈبی پکڑ لا.....میرا تو آج دم پھولے جا رہا تھا۔ اوپر سے دیکھ ناں میں موٹی بھی تو کتنی ہوں اور عمر میں تجھ سے بڑی بھی.....جا شاباش تُو تو جوان جہان ہے، ہرنی جیسی ہوشیار، یوں قلانچ بھر کے تو گئی اور یوں واپس آئی۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ہاجرہ نے غصے بھری نظروں سے اسے گھورا اور سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''چلی بھی جا اب پیروں کو ہاتھ لگوائے گی کیا؟'' شہناز بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی کہاں باز آنے والی تھی۔ ''دیکھ میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے، دو کش لگا لوں گی تو ٹوکری والی باجی کا کام رات گیارہ بجے تک بھی کرنا پڑا تو کر لوں گی۔ پالٹی ہے پالٹی آج اس کے گھر.....'' اس نے جیسے اپنے اس روز کے کام کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا۔ ''جاناں.....میری رانی میری مٹھی ہاجرہ.....'' اس میٹھے لہجے کے آگے ہاجرہ کو ہار مانتے ہوئے نہ چاہ کر بھی اٹھنا پڑا تھا۔ دھوپ بھری دوپہر میں احاطہ پار کر کے گیٹ پر بیٹھے چوکیدار سے ڈبیا پکڑ کر واپس پہنچ کر اس نے شہناز کے بڑھے ہاتھ پر پٹخی اور خود اپنے سوتی دوپٹے سے آنکھوں میں اترتے پسینے کو خشک کرنے میں مصروف ہوئی۔

''اتنا ہی تجھے سگریٹ کا نشہ ہے ناں تو ماچس کی ڈبیا بھی پاس رکھا کر.....'' ذرا دیر بعد اس نے خفگی بھرے انداز میں شہناز کی طرف دیکھا۔

''پاس رکھا کر.....'' ماچس مل جانے پر تیزی سے دیا سلائی رگڑ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے شہناز نے اس کے الفاظ دُہرائے اور تیزی سے اوپر تلے دو کش لینے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ ''پاس کدھر رکھا کروں.....؟'' سگریٹ کے ان دو کشوں نے جیسے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں، اس کے مردہ ہوتے جسم میں جان ڈال دی تھی۔ ''تم شہزادیوں کی طرف بٹوا نہیں رکھتی میں اپنے ساتھ نہ میرے پاس موبیل (موبائل) نہ پیسہ، بٹوا رکھوں تو کاہے کو رکھوں بتا.....'' اس نے تیسرا کش لیتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''اور اِدھر'' اس نے بلاؤز کے گریبان کی طرف اشارہ کیا.....''بس اتنی ہی جگہ ہوتی ہے کہ کرایے کے پیسے، سگریٹ کا ٹوٹا اور ایک آدھا پان بنا کر رکھ لوں۔ موٹی بھی تو دیکھ میں کتنی ہوں اِدھر کسی اور چیز کی گنجائش (گنجائش) ہی نہیں بچتی.....'' اس نے ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''کرایے کے پیسے اور پان کی گلوریاں پلو سے باندھ کر رکھا کرناں تو ماچس کی ڈبی کی جگہ نکل ہی آئے گی تیری اس پاکٹ میں.....'' ہاجرہ نے جل کر کہا۔

''پاکٹ.....'' شہناز ہنسنے لگی اور ہنستے، ہنستے دُہری ہوگئی۔

''تو اس کو پاکٹ بولتی ہاجرہ۔''

''ہاں نہیں تو کیا.....'' ہاجرہ کی نظروں میں غصہ جھلکا۔ ''جہاں بھر کی چیزیں اِدھر گھسائے گی تو پاکٹ نہ بولوں تو کیا بولوں.....ہے۔''

''ہاہا.....ہا.....'' شہناز ہنستے ہوئے دوسری جانب لڑھک گئی..... اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد سیدھی ہوتے ہوئے ہنسی کے مارے آنکھوں میں اترے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بمشکل ہنسی روکی..... ''اور اگر جو کسی پاکٹ مار کو میری اس پاکٹ کی خبر ہو جائے تو.....''

''دھت.....'' ہاجرہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ''گندی بات ہی کرے گی تو ہمیشہ..... بے شرمی والی۔''

''لے اس میں بے سرمی (شرمی) والی کیا بات ہے۔'' شہناز نے تیزی سے سگریٹ کے جلتے ٹکڑے کے آخری دو تین کش لینے کے بعد اسے فرش پر مسل کر بجھاتے ہوئے کہا۔ ''پاکٹ مار پاکٹ پر ہی ہاتھ مارتا ہے نا چری.....'' اس نے اٹھ کر ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چل ہٹ.....'' ہاجرہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور سمٹ کر دور ہوئی۔ ''تجھ سے تو بات ہی نہیں کرنی چاہیے.....'' اس نے دوبارہ داخلی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''اری کدھر چلی..... یہ ڈبیا بھی ساتھ لیتی جاناں..... سلطان کو پکڑا دینا واپس.....'' شہناز نے آواز لگائی۔

''آپ ہی واپس کرآ..... میرے پاس ٹائم نہیں ہے اوپر بیگم صاحبہ انتظار کرتی ہوں گی کب کا انہوں نے مجھے دوا کے دو پتے لینے بھیج رکھا ہے، راستے میں تو پکڑ کر بیٹھ گئی.....'' ہاجرہ نے جاتے ہوئے جواب دیا۔

''اری کچھ نہیں کہتی تیری بیگم صاحبہ..... یہ پکڑا اپنی جا سلطان کو.....'' شہناز نے دہائی دی۔

''کہاں ناں جلدی ہے مجھے، میری بیگم صاحبہ ٹائم کی بڑی پابند ہے، اب بھی بس گھڑی کی سوئیوں پر نظر ٹکائے بیٹھی ہوگی۔ مجھے دو منٹ میں واپس پہنچنا ہے اب تیری طرح بیگموں کو چونا لگا کر اِدھر اُدھر ہر کوئی تو ہو نہیں سکتا۔'' ہاجرہ نے جان بوجھ کر شہناز کو چھیڑا۔

''جا جا، بڑی آئی تو ٹائم کی پابند، تیری بیگم صاحبہ تو جیسے تجھے ٹائم کی پابندی کا جیادہ پیسہ دیوے ناں..... بیگموں کو چونا لگاتی ہے، ہونہہ.....'' شہناز خود پر کیے طنز کی تاب نہ لاتے ہوئے چلائی تھی۔ ''جمعہ، جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں کام پر لگے خود کو اللہ جانے کیا سمجھنے لگتی ہیں یہ چھوریاں۔'' وہ بڑبڑائی..... ''جتنی تیری کل ملا کے عمر ہے ناں اتنے تو سال ہوگئے مجھے فلیٹوں میں کام کرتے ہوئے، مجھے سکھائے وقت کی، کام کی پابندی۔'' وہ یونہی بڑبڑاتے ہوئے ہاجرہ کے پیچھے آرہی تھی۔ اور ہاجرہ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اس سمندر جتنے بڑے شہر کا ایک ایسا علاقہ تھا جہاں زیادہ تر اپر مڈل کلاس لوگ بستے تھے۔ ان میں سے اکثر کئی، کئی منزلہ رہائشی فلیٹوں کے مکین تھے۔ ہاجرہ اس آٹھ منزلہ جدید عمارت کے ایک فلیٹ میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے کام کر رہی تھی۔ فلیٹ میں طاہر صاحب جو ایک ملٹی نیشنل سافٹ ویئر کمپنی میں ملازم تھے اپنی بیوی شاہانہ اور دو بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ طاہر صاحب اسی کمپنی کے لاہور آفس سے اس شہر کے آفس میں ٹرانسفر ہونے پر یہاں آئے تھے۔ ہاجرہ کو کام کے لیے شاہانہ کے پاس فضل احمد جو صاحب کے دفتر میں چپراسی تھا لے کر آیا تھا۔ ہاجرہ، فضل احمد کی ماں کے پاس اسی کے گھر کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔

''بیوہ ہے مسکین، اپنے ہی علاقے کی ہے بیگم صاحبہ پیچھے سے۔'' فضل احمد نے شاہانہ کو بتایا تھا۔

"اپنے چک ہی کا رہنے والا تھا اس کا آدمی، جمال دین میرے ساتھ ہی اِدھر آیا تھا۔ محنت مزدوری کرنے۔ لال بادشاہ کے ورکشاپ میں کام کرتا تھا، اچھا خاصا کمالیتا تھا، اماں کے کوارٹر کے پاس ہی اس نے بھی کوارٹر لے رکھا تھا جب اس مسکینی کو بیاہ کر لایا تھا۔"

"اچھا تو پھر اس کو ہوا کیا.....؟" شاہانہ کو شاید اس تفصیل سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ "بائیس تیئس سال کی یہ لڑکی دیکھنے میں کمزور اور سست نظر آرہی ہے۔ گھر بھر کا کام کیسے سنبھالے گی۔" غالباً کچھ ایسا ہی وہ سوچ رہی تھی۔

"اِدھر ورکشاپ میں دادا گیری اور آپسی فائرنگ میں دو فیر (فائر) جمالے غریب کو بھی جا لگے۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا راستے میں، کھون (خون) ہی بہت بہہ گیا تھا۔" فضل احمد نے بتایا تھا۔

"اوہ....." اب کے شاہانہ کو افسوس ہوا۔ "تو پھر یہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد یہاں کیا کر رہی ہے، واپس اپنے علاقے کیوں نہیں چلی جاتی۔"

اس سوال کا جواب ہاجرہ نے شاہانہ کو خود دیا تھا لیکن اسی وقت نہیں، بہت دنوں بعد جب شاہانہ اسے ایک مہینے کی آزمائشی نوکری پر رکھ چکی تھی۔ اس ایک مہینے میں ہاجرہ کو ثابت کرنا تھا کہ شاہانہ جو بھی ذمّے داری اس پر ڈالے گی وہ اس پر پوری اترے گی، اس نے خود کو ثابت کرنے میں صرف پندرہ دن لیے تھے۔ ان پندرہ دنوں کے اندر ہی شاہانہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ہاجرہ کو ہاتھ سے نکلنے دینا بیوقوفی ہوگی، جس کمال مہارت سے اس نے اس کے سارے کام سنبھال لیے تھے۔ شاہانہ کے دل سے نئے شہر، نئے لوگ اور خصوصاً نئی ملازمہ کے ساتھ سیٹ ہونے کا غم نکل گیا تھا۔

"میاں کی زندگی میں بھی کام کرتی تھیں کیا.....؟" ایک روز کچن میں ہاجرہ کے ساتھ کام نمٹاتے ہوئے شاہانہ نے پوچھا تھا۔

"نہیں بیگم صاحبہ....." ہاجرہ نے سنک میں رکھے برتن دھوتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "وہ گریب تو اپنی زندگی میں مجھے کوارٹر سے باہر بھی نہیں نکلنے دیتا تھا۔ کہتا تھا باہر دنیا بڑی خراب ہے، تیرے والی نہیں ہے۔"

"اچھا تو کیا تمہیں وہیں بند کیے رکھتا تھا تالا لگا کر۔" شاہانہ نے ہنس کر کہا۔

"ایسا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ باہر لے کر جاتا تھا جمعے کے جمعے لازمی۔" ہاجرہ نے دھلے برتن خشک ہونے کے لیے ریک میں لگاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو سیریں کراتا تھا۔" شاہانہ مسکرائی۔

"جی....." وہ اداسی سی مسکرائی..... "بہت گھمایا اس نے مجھے، بہت سیریں کرائیں۔ کپڑا، ٹاکی، جوتا، تیل، کری، خوشبوسب لے کر دیتا تھا۔ کہتا تھا تو گھر میں راج کر، تیرے لیے ہی تو کماتا ہوں میں، میرے ہاتھ کی مہندی اس کے گزرنے کے بعد اتری تھی، اپنی جندگی میں میرے ہاتھ سے مہندی کبھی اترنے نہیں دی تھی اس نے۔" شاہانہ کی نظر بے اختیار ہاجرہ کے ہاتھوں پر جا رکی..... سیاہی مائل جلد والے مضبوط اور سخت ہاتھ جن کی ہتھیلیوں کی رنگت میں پیلاہٹ نمایاں تھی؛

"یہ ہاتھ مہندی میں رنگ کر کیسے لگتے ہوں گے۔" شاہانہ نے تصور کرنے کی کوشش کی۔

"اتنا خیال رکھتا تھا تمہارا....." اگلے ہی لمحے سر جھٹکتے ہوئے اس نے کہا۔

"جی....." وہ سر جھکا کر بولی تھی۔

"جب وہ مرا ہوگا تم پر تو قیامت ہی گزر گئی ہوگی۔"

"قیامت اور کس کو کہتے ہیں بیگم صاحبہ....." اس نے شاہانہ کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"صحیح کہہ رہی ہو....." شاہانہ نے سر ہلایا۔ "اتنی غیر متوقع اور حادثاتی موت..... مارنے والے پکڑے بھی گئے کہ نہیں....."

"اللہ جانے کون تھے کون نہیں....." ہاجرہ نے کچن کاؤنٹر پر رکھی سبزی کی ٹوکری اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب، تم نے پیچھا نہیں کیا ان کا؟" شاہانہ حیران ہوئی۔ "مطلب کوئی تھانہ، کچہری، مقدمہ کچھ بھی نہیں....."

''کون کرتا بیگم صاحبہ.....'' وہ اسٹول پر بیٹھ کر سبزی بنانے میں مصروف ہوئی۔ ''اپنی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی اور اس شہر میں اپنا کون تھا جو پوچھا کرتا۔''

''یہاں تمہارے کوئی رشتے دار، عزیز کوئی تو ہوگا ناں.....''

''نہ.....'' جواب میں اس نے سر ہلایا..... ''ویسے بھی سنا تھا ورکشاپ کے مالک نے صلح صفائی کروا کے دونوں پالٹیوں (پارٹیوں) سے نقد پیسے لے کر معافی نامے پر انگوٹھے لگا دیے تھے۔''

''ورکشاپ کا مالک!'' شاہانہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی لال بادشاہ، وہ بولتا تھا کہ معاملہ اس کی ورکشاپ میں خراب ہوا تھا۔ گولیاں چلنے سے نقصان بھی اسی کا ہوا تھا اس لیے پیسہ بھی وہی لے گا۔''

''وہ.....'' (انگریزی میں گالی دے کر) شاہانہ نے دانت پیسے، ہاجرہ نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں.....'' شاہانہ نے زبان پر آئی مغلظات کا طوفان واپس دھکیل کر سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ شوہر کے مرنے کے بعد تم واپس کیوں نہیں چلی گئیں..... یہاں اس اتنے بڑے شہر میں تنہا تیری میری نوکری کیوں کرتی پھر رہی ہو؟''

''واپس کس کے پاس جاتی؟'' ہاجرہ نے اب ہاتھ دھو کر آٹے والے ڈبے سے خشک آٹا برتن میں نکالتے ہوئے کہا۔

''اپنے علاقے جاتی ناں واپس..... اپنے ماں، باپ کے پاس.....''

''اُدھر میرا رہا کون تھا باقی جس کے پاس چلی جاتی۔'' وہ خشک آٹے میں پانی ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ماں تو ننھی کی پیدائش پر ہی مر گئی تھی۔ ایک بہن تھی، ایک بوڑھا باپ اور ایک بھینس.....''

''بھینس.....!'' شاہانہ جس کی نظریں آٹے پر پڑتے پانی کی لکیریں اِدھر اُدھر بنتے دیکھ رہی تھیں نے چونک کر کہا تھا۔

''ہاں، ایک بھینس تھی ہمارے پاس.....'' اس سارے میں ہاجرہ پہلی بار تھوڑا سا مسکرائی تھی۔ ''ہم اس کا دودھ بیچتے تھے اور اس کے گوبر سے بنائے اپلے بھی..... میرے ابے نے جمال دین کے ابے سے ادھار پر لی تھی وہ بھینس.....''

''اچھا..... یعنی جمال دین تمہارا رشتے دار تھا۔''

''نہیں تو..... وہ میرا کوئی بھی نہیں تھا۔'' ہاجرہ نے سختی سے سر ہلایا۔

''پھر شادی کیسے ہوگئی اس کے ساتھ تمہاری؟'' شاہانہ متجسس ہوئی۔

''اس کے ابے نے میرے ابے سے بھینس کے پیسے مانگے تھے۔ میرے ابے کے پاس تھے نہیں اس نے بھینس کے بدلے میرا رشتہ دے دیا جمال دین کو.....''

''توبہ.....'' شاہانہ نے ہاتھ ماتھے پر مارا..... ''بھینس کے بدلے تمہارے باپ نے رشتہ دے دیا۔''

''مجبوری تھی بیگم صاحبہ..... بھینس واپس نہیں کر سکتا تھا ناں، اسے واپس کر دیتا تو کھاتا کہاں سے۔''

''بھینس بچانے کے لیے وہ کسی کو بھی دے دیتا تمہارا رشتہ.....'' شاہانہ نے حیرت سے دیکھا۔

''ہمارے اُدھر ایسا ہی ہوتا ہے اکثر.....'' ہاجرہ کے ہاتھ تیزی سے آٹا گوندھ رہے تھے۔ ''قرضے کے پیچھے، دشمنی کے پیچھے، مکان، دکان کے پیچھے رشتے لیے دیے جانے کا رواج ہے اُدھر۔''

''اُف.....'' شاہانہ نے تاسف بھرا۔ ''تو پھر جب مر گیا تھا تمہارا جمال دین تو واپس چلی جاتیں ناں باپ کے پاس وہ بھینس کے بدلے کسی نئی جگہ بٹھا دیتا تمہیں۔''

''ابا تو مر گیا تھا میری شادی کے پانچ مہینے پیچھے اور اس کے بعد بھینس بھی۔''

''بھینس بھی مر گئی.....'' شاہانہ نے بے یقینی سے دیکھا۔

''جی..... اسے سنبھالنے والا مر گیا تو وہ کیسے زندہ رہتی۔''

''اور وہ تمہاری چھوٹی بہن.....''

''ابے نے دکان کے بدلے پیسہ لیا تھا چاچے معراج سے، چاچے نے پیسے کے بدلے میری ننھی سے نکاح کرلیا۔''

''چاچے نے ننھی سے نکاح کرلیا؟'' شاہانہ کی آواز بلند ہوئی۔

''سگا چاچا تھوڑی تھا۔'' ہاجرہ نے گندھا ہوا آٹا پلاسٹک کے ڈبے میں منتقل کیا اور ہاتھ اور برتن دھونے لگی۔

''اور اس سارے کو دیکھ کر تم یہیں بس گئیں، اسی شہر میں.....''

''اور کوئی راستہ جو نہیں تھا۔'' ہاجرہ نے شاہانہ کی طرف چہرہ کرتے ہوئے سنک سے کمر ٹکائی..... ''اُدھر جمال دین کے مرنے کے بعد میرا کوارٹر چھوٹ گیا تھا، جب بھی یہ فضل احمد ہی نے مجھے آسرا کرایا تھا اس کی ماں اِدھر قریب غریب بستی میں اپنی کھولی میں رہتی ہے، اس نے ہی مجھے اپنی ماں کے پاس چھوڑا تھا اور کام بھی ڈھونڈھ کر دیا۔''

''پہلے بھی کہیں کام کیا ہے؟'' شاہانہ نے فریج سے اسٹرابیری کی ٹوکری نکالتے ہوئے پوچھا۔

''کئی جگہ.....'' وہ مسکرائی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے زرد ہوتے دانت اور سیاہ مسوڑھے صاف نظر آرہے تھے۔ ''اِدھر ایک اور بلڈنگ میں کیا دو گھروں میں صفائی کا کام اور پھر فضل احمد نے آن لائن والوں کے پاس بھی رجسٹر کروایا تھا مجھے، بکنگ پر جاتی تھی صفائی کا کام کرنے۔''

''اچھا تو وہ کیوں چھوڑا.....؟''

''اس میں بڑا لفڑا تھا.....'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''ٹائم کم بتاتے تھے، کام زیادہ ہوتا تھا، جو نہیں بتایا وہ بھی کرواتے تھے اکثر، ٹائم زیادہ ہونے پر کمپنی والے بھی مسئلہ کرتے اوپر سے اُدھر کے امیر لوگ اتنے کنجوس کہ کیا بتاؤں.....''

''اوپر کا پیسہ نہیں دیتے ہوں گے۔'' شاہانہ نے خیال ظاہر کیا۔

''پیسے کی بات نہیں تھی، رینٹنگ میں کنجوسی کرتے تھے، پانچ اسٹار تو کبھی نہیں دیا کسی نے، اتنا اچھا صاف ستھرا کام کرا کے بھی کبھی ایک، کبھی ڈیڑھ اسٹار بس اس سے اوپر نہیں جاتے۔ بڑی منت کرالو کہ نوکری کا سوال ہے تو دو یا ڈھائی دے دیے بس جیسے اسٹار دینے میں بھی روپیہ لگتا ہو ان کا۔''

''اوہ..... جب ہی تم نے کمپنی چھوڑ دی۔''

''اور کیا..... اُدھر کمپنی والے اسٹار دیکھ کر مرضی کی اجرت ہاتھ میں پکڑاتے تھے، میں نے چھوڑ دی کمپنی.....''

''چلو اچھا ہوا..... اگر کمپنی نہ چھوڑتیں تو میرے پاس کیسے آتیں.....'' شاہانہ مسکرائی۔ ''میں تو بھئی تمہیں فل فائیو اسٹار دوں گی..... ٹرائل کا مہینہ پورا ہونے پر.....'' جواب میں ہاجرہ نے ایک بار پھر اپنے دانتوں اور مسوڑھوں کی نمائش کی تھی۔

☆☆☆

''اور اب ان بیگم صاحب کے گھر پر کام کرتے تقریباً دو سال ہونے کو آئے ہیں.....'' اس روز صبح کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہال نما کمرے کے اس حصے کی دیوار میں جڑی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے سوچ رہی تھی جہاں چھوٹی سی کھانے کی میز کے ساتھ چار کرسیاں جوڑ کر رکھی تھیں۔ اسی کمرے میں ایک طرف صوفہ سیٹ اور اس کے ساتھ کی میزیں سجی تھیں۔ یہ ٹی وی لاؤنج اور ڈرائنگ روم دونوں کا کام دیتا تھا۔ اس روز وہ صبح اپنے وقت سے پہلے ہی کام پر پہنچ گئی تھی۔ بیگم صاحبہ کو بچوں کو اسکول بھیج کر خود صاحب کے ساتھ کہیں جانا تھا اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ جا چکی تھیں۔

ہاجرہ اپنا صبح کا کام ختم کر کے اس کھڑکی کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی..... فرصت کے وقتوں میں پورے فلیٹ کا یہ ہی وہ حصہ تھا جو اسے سب سے اچھا لگتا تھا۔ اس کھڑکی سے نیچے احاطے کا منظر صاف نظر آتا تھا اور باہر سڑک کا بھی..... یہ دونوں ہی جگہیں صبح کے وقت کی مخصوص روٹین کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ مختلف فلیٹوں میں دودھ کے پیکٹ سپلائی کرنے والے

کی موٹر سائیکل احاطے میں کھڑی تھی۔ دن کی روشنی تیز ہو رہی تھی، کئی صاحب لوگ دفتروں کو جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ داخلی گیٹ سے ایک کے بعد دوسری موٹریں ٹکٹی نظر آ رہی تھیں۔ چوکیدار کی نظر بچا کر سبزی کے تھیلے والا ٹھیلا سڑک کے کنارے کھڑا کر کے احاطے میں گھس آیا تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی اوپر نیچے آتی جاتی ماسیوں کو سودا سلف کی پرچی میں لکھی سبزی یاد آ گئی تھی۔ سبزی لینے سڑک پار والی مارکیٹ جانے سے بہتر تھا اسی ٹھیلے والے سے خرید لی جاتی۔ سبزی والے کے پاس گزرے کل کے لکھوائے آرڈر بھی موجود رہتے تھے۔ وہ سبزی کے تھیلے فلیٹ نمبر دیکھ کر دروازے تک پہنچانے کا کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہاجرہ کھڑکی کے قریب کھڑی اِدھر اُدھر چلتے پھرتے، دوڑتے بھاگتے لوگوں کے چہرے دیکھ رہی تھی۔

''سب ہی کو مانو اپنی، اپنی پڑی ہے، ہر کوئی مصروف نظر آتا ہے، ہر کسی کے پاس وقت کم ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور خود میرے پاس۔'' سوچ کا دھارا اپنی طرف مڑ گیا۔ ''وقت ہی وقت ہے۔'' اس نے سوچا..... ایسا ہی تو کہتی تھی فضل احمد کی اماں ماسی سکینہ جس کے پاس اس کی کھولی میں وہ رہتی تھی۔

''صبح کا بھونپو بجنے کے ساتھ ہی یہ شہر اور اس کی گاڑیاں اور گاڑیوں کے ہارن جاگ اٹھتے ہیں..... مار پیں، پیں، پر پیں پیں، ٹرٹر، فرفر.....'' وہ اپنے بنائے دانتوں کے پوپلے منہ سے گاڑیوں اور ان کے شور کی آوازیں نکالتے ہوئے کہتی..... ''مانو شہر میں کدھر حشر کا میدان سج گیا ہے اور سب ہی کو اُدھر جانے کی پڑ گئی ہے۔''

''سچ ہی تو کہتی ہے ماسی صبح شام، صبح شام، اسی چکر میں دوڑے پھرتی ہے اللہ کی مخلوق.....'' اس نے دوبارہ احاطے میں جھانکا۔ کالی زمین پر سفید گول دائروں والے پرنٹ کی ساڑی پہنے پیروں میں سستی پلاسٹک کی چپل اُڑائے شہناز گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

''لو آ گئی یہ۔'' ہاجرہ کو نہ جانے کیوں شہناز کو دیکھ کر اطمینان سا ہوا۔ ''پورے دس بجے آئی ہے۔'' اس نے لاؤنج کی دیوار پر لگی کلاک پر نظر ڈالی۔ ''اور اب بھی کون سا سیدھی کام پر چلی جائے گی پہلے چوکیدار کے پاس بیٹھ کر اس سے ماچس لے کر آدھا سگریٹ پیے گی، اِدھر اُدھر کی باتیں مٹھارے گی اور پھر یہ گھڑی بھر کا دم لے کر کام پر پہنچے گی..... اور پھر اس کی بیگم صاحبہ جب پوچھے گی۔''

''شہناز آج پھر لیٹ ہو گئی۔'' تو سو جھوٹ اور سو بہانے سنا کر اسے ایک دم خاموش کرا دے گی۔'' اس نے سوچا اور مسکرا دی۔ کھڑکی کے پردے برابر کر کے وہ اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ ابھی اسے صاحب اور بیگم صاحبہ کے بیڈ روم کی صفائی کرنی تھی، بچوں کا کمرا انہیں اسکول کے لیے تیار کرنے کے دوران ہی وہ سمیٹ چکی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنا تھا اور دھلائی کے کپڑے مشین میں ڈالنے تھے۔ ان سب کاموں سے فارغ ہوتے ہوئے دوپہر کا ایک بج گیا تھا۔ بچے ڈیڑھ بجے واپس گھر پہنچتے تھے اور صاحب تو شام ڈھلے گھر واپس آتے تھے لیکن اس روز بیگم صاحبہ بھی اس وقت تک گھر واپس نہیں آئی تھیں۔

کچھ دیر یونہی لاؤنج کے فرش پر لیٹے رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر اٹھ کر اس کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی..... پردہ ہٹانے پر اس کا سامنا بھری دوپہر اور سناٹے سے ہوا تھا۔ احاطے میں دھوپ چلچلا رہی تھی فضا پر اکتاہٹ بھرا جمود چھایا ہوا تھا۔ ''تھوڑی دیر میں یہ سناٹا اور اکتاہٹ آپ ہی آپ ختم ہو جائے گی جب مختلف اسکولوں کی بسوں اور ویگنوں سے اسکول گئے بچے اتر، اتر کر اپنے گھروں تک پہنچنے کے لیے احاطے میں داخل ہوں گے، ان کے جوتوں کی ہیڑ تیڑ، لفٹ تک پہلے پہنچنے کی ریس میں آگے پیچھے بھاگنے کی آوازیں، ان کی ہنسی اور کبھی کبھار جھگڑے کا شور اس وقتی خاموشی کو توڑ دے گا۔'' وہ سوچ رہی تھی اسی دم چوکیدار نے گیٹ کھولا تھا اور ایک گاڑی احاطے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی فلیٹوں کے کسی رہائشی کی نہیں تھی،

ہاجرہ واپس مڑتے، مڑتے رک گئی۔

گاڑی سے اترنے والی خاتون چوکیدار سے کچھ پوچھ رہی تھی۔

''شاید کوئی فلیٹ نمبر، کسی رہائشی کے موجود ہونے نہ ہونے کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔'' اس نے سوچا..... اور کچن کی جانب مڑ گئی۔

دو بجنے والے تھے اور بچے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ کچن سے باہر آکر وہ ایک مرتبہ پھر کھڑکی کی طرف بڑھی۔ احاطے میں کچھ دیر پہلے داخل ہوئی کار اب غائب ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ وہ خاتون بھی..... اسکول وین اور بسوں کی آمد البتہ شروع ہو چکی تھی وقفے، وقفے سے بچوں کا ایک مختصر سا ریلا گیٹ سے اندر داخل ہوتا اور شور مچاتا اِدھر اُدھر بکھر جاتا..... بچوں کی آمد کے ساتھ ہی سڑک کنارے کھڑے ٹھیلوں میں بھی صبح کی نسبت اضافہ ہو چکا تھا۔ بچے بسوں، وینوں سے اترتے ہی پہلے ان ٹھیلوں کا رخ کرتے تھے اور رنگ برنگ سوغاتیں خرید کر ہی گھروں کی طرف آتے تھے۔

''لو آگئی اپنے بچوں کی بس.....'' گیٹ کے سامنے زرد لکھائی والی سرخ بس آکر رکی تھی اور اس سے اترنے والے بچوں میں محمد طلحہ اور میرال دور سے نظر آرہے تھے۔

''بھاگ کر نیچے جاتی ہوں خود جا کر اپنے ساتھ بچوں کو اوپر لے کر آتی ہوں۔'' ہاجرہ نے فلیٹ سے باہر نکل کر دروازے کو لاک لگایا اور لفٹ کا بٹن دبایا۔ لفٹ سے باہر نکلنے پر اس نے دونوں بچوں کو سامنے منتظر پایا۔ دونوں کے بیگ پکڑ کر واپس لفٹ کی طرف مڑتے ہوئے اس کی نظر سامان سے لدے لوڈر پر پڑی جس سے اتر کر لیبر کے تین بندے سامان اتارنا شروع ہوئے تھے۔

''ارے یہ لوڈر یہاں کب آیا ہوگا.....؟'' اس نے سوچا..... ''میرے پانچویں منزل سے گراؤنڈ فلور تک پہنچنے کے دوران بس اتنی سی دیر میں.....'' وہ سوچ رہی تھی۔

''اپنے باجو والا فلیٹ خالی ہوا ہے ناں پچھلے ہفتے۔'' دوسری منزل سے لفٹ پر سوار ہونے والی شہناز نے اس کے پوچھنے سے پہلے ہی خبر سنائی تھی۔ ''وہی چڑھا ہے کرایے پر، آٹھویں منزل والی رانی باجی ہے ناں.....'' اس نے کہا۔

''رانی باجی کون.....؟'' ہاجرہ نے لاعلمی سے دیکھا۔

''ارے وہی رانی باجی جو پہلے رہتی تھی، کھانا پکانے کے شو میں آیا کرتی تھی ٹی وی پر۔''

''میں نے نہیں دیکھی۔'' ہاجرہ نے سر ہلایا۔

''اری جا چری تو نے تو کچھ بھی نہیں دیکھ رکھا ہوتا بس۔'' شہناز ہنسنے لگی تھی۔

''اچھا میں چلتی ہوں.....'' اپنا فلور آجانے پر ہاجرہ دونوں بچوں کے بیگ سنبھالتے ہوئے بولی۔

''پوری بات تو سن لے۔'' شہناز اس کے ساتھ اسی کے فلور پر نکل آئی۔ ہاجرہ نے فلیٹ کے دروازے کا لاک کھول کر بچوں کو اندر گھسایا۔

''رانی باجی کا بھائی ہے جس نے یہ فلیٹ کرایے پر لیا ہے۔'' شہناز نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''رانی باجی خود تو یہاں سے چلی گئی ہے مگر اس کی سلام دعا سب سے ہے۔ سجا سجایا عمدہ فلیٹ اتنے کم کرایے پر دلوا دیا بھائی کو۔ بھائی بھی اس کا چھڑا چھانٹ ہے، چھڑے چھانٹوں کو ایسے کیسے دے دیتے فلیٹ کرایے جب تک جان پہچان نہ ہو..... بس سمجھ رانی باجی کی جان پہچان کام آگئی اس کے بھائی کے۔'' شہناز نے آنکھ دبا کر ہاجرہ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی..... لیکن ہاجرہ کو بچوں کو پانی پلانے کی جلدی تھی اسی لیے ان سنی کرتے ہوئے اسے وہیں دروازے سے ہی رخصت کر کے اندر آگئی۔

''بڑا وقت ہے بھئی شہناز کے پاس.....'' اندر آکر بچوں کو ٹھنڈا ٹھار نیبو پانی پلانے کے بعد ان کے کپڑے بدلوا کر ان کے لیے میز پر کھانا سجانے کے دوران وہ سوچ رہی تھی۔ ''آٹھ منزلوں کے ہر فلیٹ کے اندر کی خبر اس کے پاس ہوتی ہے۔ کبھی بھولے سے اس کے پاس بیٹھ جائے کوئی تو ہر کسی کا حال معلوم ہو جائے۔''

☆☆☆

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مئی 2021ء کی جھلکیاں

اس نے وہ تاریخی کارنامہ انجام دیا جسے دنیا کبھی بھلا نہ پائے گی

ناقابلِ تسخیر چوٹیوں کو سر کرتے کرتے وہ پہاڑوں میں کھو گیا

پاکستان کی ان شخصیات کا ذکر جنہوں نے انتھک محنت سے شہرت پائی

ایک ایسی سچ بیانی جسے آپ نم آنکھوں سے پڑھیں گے فخر محسوس کریں گے

بڑھاپے کا عشق

زندگی کو کھیل سمجھنے کا قصہ، لیکن اس کا فیصلہ درست تھا

اس کے علاوہ

بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں، آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے۔

نئے کرایے دار اور اس کے بارے میں سنائی شہناز کی رام کہانی ہاجرہ کے لیے بالکل بھی اہم نہیں ہوتی اگر اسی شام اس کی بیگم صاحبہ اس کو یہ خبر نہ سناتی کہ صاحب کو ان کے دفتر والے کچھ عرصے کے لیے کمپنی کے دبئی والے دفتر میں ٹرانسفر کر رہے تھے اور یہ کہ صاحب کے ساتھ بیگم صاحبہ اور بچے بھی جا رہے تھے۔

''اے لو بیگم صاحبہ...... آپ چلے گئے تو میرا کیا بنے گا......'' ہاجرہ کے کام کرتے ہاتھ یہ خبر سنتے ہی رک گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑی شاہانہ بیگم سے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''ہمیشہ واسطے تھوڑی جا رہے ہیں ہم۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ''لوٹ کر واپس اِدھر ہی آنا ہے۔ پھر تمہیں بلا لیں گے اپنے پاس۔''

''اور جب تک آپ وہاں رہیں گی اِدھر میں کیا کروں گی......؟'' ہاجرہ کا ذہن الجھ گیا تھا۔ ''مطلب روزی روٹی بھی تو کمانی ہے ناں......''

''اکیلی جان ہو تم ہاجرہ......'' وہ ہنس دیں۔ ''جو پیسہ کماتی ہو جوڑ جمع کر کے ہی رکھتی ہو ناں تمہارا ذاتی خرچہ ہی کتنا ہوتا ہے...... دونوں ٹائم کا کھانا بھی یہیں سے مل جاتا ہے تمہیں...... جتنا تم نے جمع کر رکھا ہے، اس میں تمہارا یہ ٹائم تو بغیر کام کیے بھی نکل جائے گا۔''

''ایسا نہیں ہوتا ناں بیگم صاحبہ......'' ہاجرہ اس اچانک پڑ جانے والی افتاد سے جیسے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ ''کام کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔''

''رہائش تمہیں فری ملی ہوئی ہے۔ فضل احمد کی اماں کے پاس، پیسہ تم نے جوڑ رکھا ہے، مسئلہ تو نہیں ہو گا تمہیں ہاجرہ......'' شاہانہ نے نرمی سے سمجھایا۔ ''کیا کرو گی اتنا کما کر اور مزید جمع کر کے...... کس کے لیے جمع کرنا ہے تم نے...... میں تو کہتی ہوں یہ درمیان کا عرصہ آرام کر کے گزار لو......''

''پیسہ کمانا ہے ناں بیگم صاحبہ...... پیسہ جوڑنا بھی ہے......'' ہاجرہ خلا میں نظریں جمائے زیرِ لب بولی تھی۔ ''اُدھر پیچھے ننھی ہے ناں......'' اس نے شاہانہ کی

طرف دیکھا۔

''میری بہن منحی۔''

''ہاں، ہاں.....'' شاہانہ نے سر ہلایا۔

''اس کا آدمی بڈھا ہے اور بیمار بھی..... کیا خبر کب اس کا دم نکل جائے اس کے بعد منحی کا کیا ہوگا۔''

''اچھا ہے بڈھا مر مرا جائے..... تمہاری بہن کی جان چھوٹ جائے گی۔ بڈھے کے گھر بار پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے۔ پھر اس سے کہنا کہیں دوسرا بیاہ کر لے کوئی اچھا سا بندہ دیکھ کر.....'' شاہانہ نے اپنی دانست میں صائب مشورہ دیا۔

''یوں نہیں ہوتا ناں بیگم صاحبہ.....'' ہاجرہ الجھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ ''جینا اتنا آسان ہوتا تو مسئلہ ہی کیا ہوتا.....'' اس کے لہجے میں بے بسی اتری۔

''منحی کا آدمی مر گیا تو اس کی دو سوکنیں اس کو اس گھر میں تھوڑی رہنے دیں گی، اسی گھڑی نکال باہر کریں گی۔''

''اچھا تو پھر.....'' شاہانہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے منحی کے لیے پیچھے کوئی ٹھکانا بنانا ہے بیگم صاحبہ..... ابے کے مکان پر تو منحی کے آدمی نے قبضہ کر لیا۔ پیچھے سر چھپانے کو کوئی جگہ نہیں بچی، میں یہ پیسہ منحی کے لیے ہی تو جمع کر رہی ہوں..... اس بیچاری نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ میرا دل کرتا ہے اس کے لیے جو بن پڑے وہ کروں۔ اب بھی پیچھے جب میں کبھی کسی کی منت ترلے کر کے پیسے بھیجتی ہوں کہ چوری چھپے منحی کو پکڑا آئے۔''

''اوہ اچھا.....'' شاہانہ نے سر ہلایا..... ''مجھے اس صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی کوئی مسئلہ تو نہیں ہے ہاجرہ اتنا اچھا تم کام کرتی ہو تمہیں کسی بھی وقت اچھی جگہ پر عارضی نوکری مل سکتی ہے..... پھر جب ہم واپس آ جائیں گے تو تمہیں پھر سے اپنے پاس بلا لیں گے۔''

☆☆☆

لیکن یہ بھی شاہانہ کا اپنا خیال ہی تھا..... فلیٹوں میں کام کرنے والی ماسیوں نے بھی اپنی ہی طرز کا مافیا بنا رکھا تھا۔ پرانی کام کرنے والی ماسیاں جس کی سرغنہ تھیں، ان ماسیوں کو خوش کیے بغیر اور ان کی مٹھی گرم کیے بغیر کام ملنا مشکل تھا۔ یہ بلڈنگ ہاجرہ کو نزدیک پڑتی تھی اور ویسے بھی اب وہ اِدھر آنے جانے کی عادی ہو چکی تھی۔ شاہانہ کے جانے کے بعد اس نے اسی جگہ کام تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن بقول فضل احمد کے اس کی پی آر کمزور تھی۔ وہ ناک کی سیدھ کام پر آنے اور ناک کی سیدھ پر واپس جانے کی قائل تھی۔ راستے میں رک کر، سیڑھیاں اترتے چڑھتے، لفٹ میں آتے جاتے اکثر نظر آنے والے لوگوں سے بھی وقتی دعا سلام تک ہی واقفیت تھی۔ یوں بھی تقریباً ہر فلیٹ میں ماسیاں لگی ہوئی تھیں، کوئی اس کے لیے اپنی جگہ تو چھوڑ نہیں سکتی تھی..... دو تین مرتبہ کام کی تلاش میں چکر لگاتی ہاجرہ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''آجو باجو کی بلڈنگوں میں بھی پتا کر لے کہ اِدھر ہی چپکی رہ جاوے گی۔'' فضل احمد کی اماں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ لیکن نئی بلڈنگ میں جانے کا فائدہ بھی جب ہی ہوتا جب وہاں کسی کو اس کی ضرورت ہوتی۔ فضل احمد آن لائن ماسی سروس والوں سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہتا رہا لیکن اس کام میں ہر روز نت نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ہاجرہ کو ایک ہی گھر میں ذہنی طور پر یکسو ہو کر کام کرنے کی چاہت تھی۔

''منحی کے آدمی کے مرجانے کے بعد بھی تو اسے اس گھر سے نکلنا ہی ہے ناں.....'' فضل احمد کی اماں نے اسے کہا۔ ''تو ایسا کر یہ جو چار دن فرصت کے ملے ہیں ان کا فائدہ اٹھا کر پیچھے جا اور منحی کو بھی اِدھر ہی لے آ اپنے پاس..... اُدھر وہ شوہر اور سوتنوں کی جوتیاں کھائی اور سیدھی کرتی دن گزار رہی ہے، اِدھر تو اس کے لیے بے چین رہتی ہے۔ منحی کو اُدھر کٹیا کھڑی کر کے دینے کے بجائے وہی پیسہ اِدھر لگا لے، چھوٹا موٹا آسرا تو تیرا ابھی بن جائے گا۔''

''جیسے بھی حالات میں رہ رہی ہے اُدھر اس کے سر پر اس کے آدمی کا سایہ تو ہے ناں ماسی.....'' جواب دیتی ہاجرہ کی آواز یہ بات کرتے ہوئے نہ جانے کیوں

گھٹ سی گئی تھی۔ ''یہاں لا کر اسے بھی اپنی طرح بے آسرا کر کے بٹھالوں.....''

''ارے تو اُدھر کون سا وہ رانی بن کر بیٹھی ہے نہ اس کے پاس تیری طرح اولاد ہے نہ ہی کم بخت کھانے پہننے کو پوری دیتے ہیں۔ دن بھر ان کی چاکری ہی میں تو جتی رہتی ہے۔''

''تو میری بات نہیں سمجھے گی ماسی.....'' ہاجرہ نے اب کے جواب اپنے دل میں دیا۔ ''سر پر سائیں کا سایہ ہونے اور نہ ہونے میں کیا فرق ہے..... اپنی زندگی جینے کی خاطر سڑکوں پر جوتیاں گھسیٹنے اور تیرے میرے کی جوتیاں سیدھی کرنے میں اور اپنے مرد کے گھر رہتے ہوئے اس کے گھر والوں کی جوتیاں سیدھی کرنے میں کیا فرق ہے.....'' ماسی کو خود بیوہ ہوئے کئی سال ہو چکے تھے لیکن بیوگی کی وجہ سے اسے کمانے کے لیے گھر سے باہر نہیں نکلنا پڑا تھا۔ اس کا بیٹا فضل احمد اپنے باپ کے مرنے کے وقت نوکری پر لگ چکا تھا۔ محنتی لڑکا تھا، اتنا کما لیتا تھا کہ چار پیسے گزارے کے لیے ماں کو بھی تھما جاتا اور اپنا گھر بار بھی چلا لیتا تھا۔ خود بیوی بچوں کے ساتھ علیحدہ رہتا تھا۔ ماسی اس دو ننھے، ننھے کمروں کے کوارٹر میں اکیلی رہتی تھی جو اس کے خاوند نے اپنی زندگی میں کبھی اچھے وقتوں میں بنا لیا تھا۔ ہاجرہ کی شکل میں فضل احمد کو اپنی ماں کے لیے اچھا ساتھ مل گیا تھا جو اس کی ماں کی دال روٹی بھی چلا لیتی تھی اور ہر طرح کی سیوا بھی کر لیتی تھی جواب میں ہاجرہ کو رہنے کے لیے مفت کی چھت مل گئی تھی۔ لیکن اب ہاجرہ کے ساتھ مسئلہ بے روزگاری کا ہو رہا تھا۔ ننھی کو ضرورت کی چیزوں کے لیے پیسے بھجوانے اور خود اپنا کام چلانے کے لیے اسے روزگار ہر حال میں چاہیے تھا۔ یوں بھی اسے بیکار بیٹھ رہنے کی عادت نہیں تھی۔ اور کام تھا کہ مل کر نہیں دے رہا تھا۔ ان حالات میں وہ شہناز تھی جو ایک دن پوچھتی پچھاتی اس تک اس کے کوارٹر تک پہنچ گئی تھی۔

''تو، تو ایسی کوری ہے ہاجرہ، کسی کو اپنا فون نمبر بھی دے کر نہیں آئی۔'' ہانپتی کانپتی شہناز کوارٹر کے ایک کمرے میں فرش ہی پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔ ''میں اتنے دن سے سب ماسیوں سے پوچھ رہی، سب کا ایک ہی جواب ہمارے پاس نہیں ہے ہاجرہ کا نمبر۔'' ہاجرہ کا پیش کردہ میٹھے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

''تجھے نمبر مل بھی جاتا تو، تو کیا کرتی، تیرے پاس تو موبائل بھی نہیں ہے۔'' ہاجرہ نے شہناز کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چری ہے تو.....'' وہ ہنسی۔ ''میرے پاس موبیل (موبائل) نہیں تو کیا میرے آس پاس کسی کے پاس بھی نہیں، نمبر ملتا تو کسی کا بھی فون پکڑ لیتی.....'' ہاجرہ نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

''اچھا سب چھوڑ یہ بتا کام کرنا ہے تجھے کہ نہیں.....؟'' شہناز نے میٹھے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا کر خالی کرنے کے بعد منہ پر ساڑی کا پلو پھیرتے ہوئے کہا۔

''کرنا ہے، کیوں نہیں کرنا.....'' ہاجرہ فوراً بولی۔ ''ادھر مہینہ ختم ہونے کو ہے اور تنخواہ کی آس بھی نہیں ہے۔''

''پھر کام تو ہے ایک.....'' شہناز نے حسب معمول گریبان سے سگریٹ کا ٹکڑا نکالتے ہوئے کہا۔

''تیرے پاس کام ہے.....؟'' ہاجرہ کی آنکھوں میں چمک اتری۔ ''رک میں لپک کے چولھے کے پاس سے ماچس کی ڈبی پکڑ لاؤں.....'' وہ شہناز کے کہے بغیر تیزی سے اٹھی اور پل میں ماچس اٹھا لائی۔

''کام ہے بھی ہلکا.....'' شہناز نے سگریٹ سلگایا۔ ''زیادہ لمبا چوڑا کام ہے ہی نہیں.....''

''وہ جو تیری ٹوکری والی باجی کہتی تھی کپڑوں کی دھلائی کے لیے۔'' ہاجرہ نے کہا اور کھسک کر ذرا سا پیچھے ہٹی۔ ''نہ بابا، ٹوکری والی باجی کا مغز ٹھیک نہیں رہتا، اس کا کام نہیں پکڑوں گی میں۔''

''ارے ٹوکری والی باجی کا کام میں چھوڑوں گی تو کوئی اور پکڑے گا ناں.....'' شہناز نے سگریٹ کا کش لگانے کے بعد دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس کا

مغز خراب رہتا ہے تو کیا ہوا، اوپر کے پیسے بھی بہت دے دیتی ہے اس کا کام میں تو کبھی نہ چھوڑوں.....''

''تو پھر کدھر مل رہا ہے کام..... سلیٹی بلڈنگ میں کام کا بھی مجھے مت بتانا، اُدھر میں نہیں جاؤں گی۔'' ہاجرہ نے سر ہلایا۔

''ارے میری بلو رانی.....'' شہناز نے اس کی ٹھوڑی پر انگلی رکھی..... ''تیری تو سرطیں (شرطیں) ہی بہت ہیں کام کے پیچھے..... پر تو فکر نہ کر میں تجھے اپنے والی بلڈنگ میں ہی کام دلواؤں گی۔ تو اِدھر تھی تو چوکیدار سے ماچس تو پکڑ لاتی تھی ناں میرے لیے۔''

''بتا پھر..... کس کی ماسی کام چھوڑ گئی.....؟'' ہاجرہ نے تجسس سے پوچھا۔

''کام چھوڑا نہیں کسی نے..... ایسا کہہ..... کہ اس فلیٹ کا کام ابھی تک کسی نے پکڑا ہی نہیں.....'' شہناز قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''کس کا کام ہے جو کسی نے پکڑا ہی نہیں.....؟'' ہاجرہ حیرت سے بولی۔

''وہی، رانی باجی کے چھڑے چھانٹ بھائی کا.....'' شہناز نے ایک آنکھ دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

رانی باجی کا بھائی ''دانیال حسن'' کسی اشتہاری کمپنی میں ملازم تھا۔ دن بھر گھر پر نہیں رہتا تھا۔ بس صبح کا ناشتا یا پھر کبھی کبھار رات کا کھانا گھر پر کھاتا۔ باقی کا سارا دن باہر ہی گزار دیتا تھا۔ اس کے لیے صبح کا ناشتا تیار کرنا، فلیٹ کی صفائی ستھرائی اور اس کے لیے رات کا کھانا تیار کر کے رکھ جانا بس اتنا سا کام تھا۔ اس کے کپڑے دُھلنے کے لیے لانڈری جاتے تھے جو وہ گھر واپسی پر خود ہی پکڑ لاتا تھا۔ کام پر صبح نو بجے پہنچنا لازمی تھا کیونکہ دانیال حسن کو گیارہ بجے تک دفتر کے لیے نکلنا ہوتا تھا اور اس سے پہلے اس کا ناشتا تیار ہو جانا چاہیے تھا، اس کے چلے جانے کے بعد گھر کی صفائی اور رات کا کھانا بنانے میں جتنا بھی وقت لگ جائے، یہ کام کرنے والی پر منحصر تھا۔ کام ختم کر کے وہ چھٹی کر سکتی تھی۔ فلیٹ کی ایک چابی اس کے پاس رہتی تھی تاکہ صبح جب وہ کام پر آئے تو صاحب کو ڈسٹرب کیے بغیر ہی لاک کھول کر اندر آجائے اور واپسی پر لاک لگا کر چلی جائے۔ یہ ساری تفصیل ہاجرہ کو رانی باجی نے خود بتائی تھی، جو اسے دانیال حسن کے فلیٹ پر اس دن ملی تھیں جب شہناز اسے اپنے ساتھ انٹرویو کے لیے وہاں لے کر آئی تھی۔

''دیکھو بھئی یہ سارا کام ٹرسٹ کا ہے، ایمانداری اور دیانت داری کا ہے۔'' رانی باجی ہاتھ ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ''پورا گھر کسی کے حوالے کر دینا جبکہ کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہو..... مشکل ہے لیکن ڈیٹی کی مجبوری ہے۔ شادی اس کی ہوئی نہیں اور کوئی ساتھ رہنے والا بھی نہیں، پیرنٹس ہمارے پوکے میں رہتے ہیں، میں اپنے گھر میں علیحدہ رہتی ہوں۔ اس لیے مجبوری ہے کسی نہ کسی پر ٹرسٹ کرنا، تم سوچ لو یہ ذمے داری نبھالوگی یا نہیں..... گارنٹی پوری لیں گے ہم..... تمہارا نام، شناختی کارڈ سارا ریکارڈ ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔''

ہاجرہ کچھ دیر کے لیے گھبرا گئی اس نے شہناز کی طرف دیکھتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔ ایک تو وہ کم عمر تھی، کسی چھڑے چھانٹ مرد کے گھر میں کام کرنے کو آج تو وہ بھی نہیں مانتیں جن کے شوہر سر پر ہوتے، خود بھی اچھی عمر کی ہوتیں اور بال بچوں والی ہوتیں، دوسرے جو باتیں اور ذمے داریاں رانی باجی بتا رہی تھیں ان کا بوجھ کون اٹھاتا..... لیکن وہ شہناز تھی جس نے رانی باجی کی نظر بچا کر اسے کہنی سے ٹہوکا دیا تھا۔

''اوں ہوں..... کام کرنا ہے یا نہیں تجھے.....؟'' اس نے دانتوں میں زبان پھنسا کر نیچی آواز میں کہا تھا۔

''کام تو کرنا ہے پر یہ.....'' ہاجرہ نے بھی نیچی آواز میں جواب دیا۔

''پر یہ کیا..... جس نے محنت مزدوری کرنی ہو وہ یہ، وہ نہیں کرتا چری.....'' شہناز نے اسی نیچی آواز میں ڈپٹ کر کہا..... اور پھر سر اٹھا کر رانی باجی کی طرف

دیکھنے لگی۔

”گارنٹی تو میں نے بولا تھا ناں رانی باجی میں دوں گی......“ وہ کہہ رہی تھی...... ”میری گارنٹی بولو آپ کو منجور (منظور) ہے یا نہیں...... اپنی ہاجرہ نیلی گاڑی والے صاحب کے ہاں ڈیڑھ سال کام کرتی رہی، آنکھ بند کر کے اعتبار کرتے تھے۔ صاحب اور میم صاحبہ ہاجرہ پر...... کھلے دل گھر اس پر چھوڑ کر نکل جاتے تھے سیر سپاٹے پر، کبھی تنکا بھی اِدھر کا اُدھر نہیں کیا ان کا...... اور کرے بھی تو کس کے لیے...... بال بچہ ہے نہیں...... آدمی اس کا گزر چکا...... پیچھے ایک بہن ہے......“ شہناز تیسری بار ہاجرہ کی تفصیل سنا رہی تھی...... اس نے خود ہی سارا معاملہ رانی باجی کے ساتھ طے کر لیا تھا۔

”بس تو پیر سے کام پر آنا شروع کر دے ہاجرہ، کام دیکھ کچھ بھی نہیں اور پیسہ نیلی گاڑی والے صاحب کے کام سے بھی زیادہ......“ واپسی پر وہ ہاجرہ کو بتا رہی تھی۔

”یہ جو اتنا پیسہ دے رہے وہ اسی لیے دے رہے ہیں کہ چھڑا آدمی دیکھ کر اور کوئی ماسی اِدھر کام کرنے پر تیار نہیں تھی...... چری ہیں یہ ماسیاں بھی وہ بیچارہ تو سارا دن گھر ہی پر نہیں ہوگا...... تو جو ہوگا ہی نہیں اس سے کیا بھاگنا......“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی اور ہاجرہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس کی بھی عارضی نوکری ہی ہوگی جیسے ہی کسی بہتر جگہ پر کام مل گیا وہ یہ نوکری چھوڑ دے گی۔

☆☆☆

ہاجرہ صبح نو بجے کے بجائے کبھی سوا کبھی ساڑھے آٹھ بجے تک کام پر پہنچ جاتی تھی۔ داخلی دروازے کا لاک کھول کر بے آواز قدموں سے چلتی سیدھی کچن میں چلی جاتی۔ صاحب کیسا ناشتا پسند کرتا تھا، کیسا نہیں، رانی باجی اسے تفصیل سے سمجھا گئی تھیں۔ ایک آدمی کا ناشتا بننے میں وقت ہی کتنا لگتا۔

ہاں اس گھر میں ہاجرہ کو برتنوں کا استعمال بہت احتیاط سے کرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے اب تک جتنے بھی گھروں میں کام کیا تھا اس گھر جیسی نفیس اور نازک کراکری کہیں اور نہیں دیکھی تھی۔ خدا جانے دنیا کے کس، کس کونے سے قیمتی اور خوب صورت برتن اکٹھے کر کے اس گھر میں لا سجائے گئے تھے، کئی برتنوں کے تو استعمال کا طریقہ بھی ہاجرہ کو نہیں آتا تھا۔ اوپر سے عام استعمال میں بھی یہ خاص برتن ہی رہتے تھے، ان برتنوں پر ہی کیا موقوف...... اس گھر میں رکھی ہر چیز ہی قیمتی اور نازک تھی۔ فرنیچر، ڈیکوریشن پیسز، قالین کے ٹکڑے، دیواروں پر لگی پینٹنگز، مجسمے اور خدا جانے کیا، کیا۔ اس گھر کی صفائی دو گھروں کی صفائی جتنا وقت لے لیتی تھی اور رانی باجی کہتی تھی کہ کام ہی کوئی خاص نہیں تھا اوپر سے ذمے داری اور دیانت داری کا بوجھ، ذرا کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہوئی نہیں اور ہاجرہ پر الزام لگا نہیں......

یہ بھی غنیمت تھا کہ شہناز صبح کام پر لگنے سے پہلے ایک بار اس کے پاس چکر ضرور لگا جاتی۔ جتنا وہ پہلے شہناز سے چڑتی تھی اتنی ہی شہناز اب اسے اچھی لگنے لگی تھی۔

”باقی چھوڑ یہ بتا صاحب تو ٹھیک ہے ناں......؟“ وہ داخلی دروازے سے اندر آتی مختصر راہداری میں ہی کھڑی، کھڑی کچن میں جھانکتی۔ ”مطلب کوئی مسئلہ تو نہیں...... چھڑا چھانٹ بندہ ہے اس لیے پوچھتی ہوں۔“

اور ہاجرہ کو اس وقت تک صاحب سے کوئی مسئلہ ہوا ہی نہیں تھا جو بتاتی...... صاحب کے جاگنے کا پتا اس کے کمرے سے اٹھتی موسیقی کی دُھنوں اور نغموں کی آوازیں اسے کچن میں کھڑے ہی دے دیتی تھیں۔ ان آوازوں کے کان میں پڑتے ہی وہ جوسر مشین چلا دیتی۔ پھلوں کا تازہ رس، بھوسی والی ڈبل روٹی کے دو ٹوسٹ اور دو انڈے کبھی ایک چائے کے چمچ زیتون کے تیل میں بنے آملیٹ کی شکل میں اور کبھی ابلے ہوئے۔ اور ہر روز مختلف پھل کے کٹے ٹکڑے، ناشتا بننے میں بھی وقت ہی کتنا لگتا تھا۔ صاحب کے ناشتے کی ٹرے سجا کر اس کے کھانے کی میز تک آمد سے پانچ منٹ پہلے ہی وہ سجا دیتی تھی۔ قہوے کی پیالی وہ ناشتے کے پندرہ منٹ بعد لیتا تھا اور قہوہ ختم کرتے ہی اپنا بیگ اٹھا کر چل دیتا تھا۔ اس دوران ”ہیلو ہاجرہ“ یا ”گڈ مارننگ ہاجرہ، کیسی ہو؟“ اور گھر سے نکلنے سے

pklibrary.com

پہلے..... ''خدا حافظ ہاجرہ، آج کھانے میں فلاں چیز بنا لینا.....'' کے علاوہ دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ صاحب کے گھر میں موجودگی کے دوران البتہ ہاجرہ تھوڑی گھبرائی سی رہتی۔ اس کے چلے جانے کے بعد جیسے اس کی جان میں جان آجاتی..... لیکن ایسا پہلے ایک مہینے میں ہی ہوا، دن گزرنے کے ساتھ وہ صاحب کی نامحسوس اور وقتی موجودگی کی عادی ہونے لگی تھی۔ وہ تھا بھی بے ضرر اور خاموش طبع، نپی تلی بات کرنے والا، کھانے اور اگلے دن کے ناشتے کے علاوہ کوئی خاص ہدایت کرنی ہو تو ہی چند مخصوص جملوں سے زیادہ بات کرتا تھا۔

''پیسے والا آدمی ہم ماسی لوگوں سے زیادہ بات کرے گا بھی کیوں.....؟'' ہاجرہ سے یہ بات سن کر شہناز نے کہا تھا۔ ''ان لوگوں کا اپنا انداز ہوتا ہے زندگی گزارنے کا، ان کی زندگی میں میرے تیرے جیسے لوگ بس اتنے ہی اہم ہوتے ہیں کہ کام اچھا کرتے ہیں یا نہیں..... کام اچھا کیا تو بات چلتی رہے گی ورنہ اُدھر باہر جانے کا دروازہ ہے نکل باہر.....''

ہاجرہ جانتی تھی شہناز ٹھیک کہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس صاحب کے معاملے میں اس کی رائے مختلف تھی۔ اسے ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ صاحب اسے حقیر سمجھتا تھا۔ وہ جتنا بھی تھوڑا بہت اس سے مخاطب ہوتا تھا، اس کے لہجے میں ہاجرہ کو اپنے لیے احترام جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ ایسی نرمی سے تو شاید شاہانہ بھی اس سے مخاطب نہیں ہوتی تھی۔ دن گزرنے کے ساتھ اور صاحب کی نرم گوئی محسوس کر لینے پر ہاجرہ کا اعتماد بھی تھوڑا تھوڑا کر کے بڑھنے لگا تھا۔

اب وہ صاحب کے ناشتا کر لینے کے بعد..... ''ناشتا ٹھیک بنا صاحب؟'' کھانے میں کوئی مسئلہ تو نہیں تھا۔'' قسم کے سوال کبھی کبھار پوچھنے لگی تھی..... اور صاحب بھی۔ ''ہاجرہ میرے کمرے کی صفائی کرتے وقت کاغذات کا اور تاروں کا خاص خیال رکھا کرو، کاغذ ذرا سے اِدھر اُدھر ہو جائیں یا تاریں الجھ جائیں تو میرے لیے مسئلہ ہو جاتا ہے۔'' جیسی ہدایت بھرے جملے بولنے لگا تھا۔ اور صاحب کا کمرا تھا بھی تو ایسا تھا کہ اس کے لیے خصوصی ہدایات کی ضرورت پڑ ہی جاتی تھی۔ کتابوں سے اوپر سے نیچے تک بھری الماری کے ساتھ پڑھنے لکھنے کی میز جڑی ہوئی تھی جس پر کئی قسم کی فائلیں اور خالی کاغذ بکھرے رہتے۔ اس میز کے پیچھے دیوار پر بجلی کے کتنے ہی ساکٹس لگے ہوئے جن سے مختلف قسم کی تاریں نکل کر میز پر اِدھر اُدھر لپٹی ملتیں۔

''اللہ جانے ان تاروں کے ساتھ کرتا کیا ہے۔'' ہاجرہ کو اس میز کی صفائی کرتے ہوئے انتہائی احتیاط برتنی پڑتی تھی..... باقی کمرے میں زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ چار دن کے بعد بیڈ شیٹ اور کمفرٹر کور بدلنا نم تو لیا اور نہانے کے چپل اٹھا کر باتھ روم میں رکھ کر سکھانے کے بعد واپس رکھنا، باتھ روب تبدیل کرنا اور باتھ روم کی تفصیلی صفائی..... ہاجرہ کے دل سے اس کام سے کام کے متعلق ہر طرح کی کھٹک بالکل ہی نکل چکی تھی۔ اب تو کام پر آتے جاتے ماسیوں کے اپنی طرف اشارہ کرتے ہاتھوں اور سرگوشیاں کرتی زبانوں کا خوف بھی ختم ہو گیا تھا۔

''چھڑے چھانٹ مرد کے گھر اکیلی عورت کام کرے ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ ماسیاں اس کے بارے میں کیا، کیا باتیں کرتی ہیں۔

''کرتی رہیں مجھے کیا، ساری دنیا کوئی ایک سی تو نہیں ہوتی ناں.....'' اس نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ اس کے دن اچھے گزر رہے تھے وہ ایک ہی گھر میں کام کر کے پہلے سے زیادہ پیسہ کما رہی تھی۔ ننھی کو پیسے بھیجنے کے بعد بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم بچ رہتی تھی۔

''اب سوچتی ہوں ننھی کے آدمی کے منہ پر اکٹھی رقم مار کر ابے کا مکان ہی اس سے چھڑوا لوں گی۔'' وہ یہی سوچتی۔ ''باپ کی نشانی پر کسی دوسرے کا قبضہ کیسے رہنے دوں.....'' معمول سے زیادہ پیسہ کما لینے پر اس کے منصوبے بھی بدل گئے تھے۔

☆☆☆

وہ دن البتہ معمول سے ذرا ہٹ کر چڑھا تھا۔

جب سے ہاجرہ نے دانیال حسن کا کام پکڑا تھا، رانی باجی کے علاوہ کبھی کوئی مہمان یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ رانی باجی بھی پہلے دن کے بعد صرف ایک مرتبہ یہاں آئی تھی اور ہاجرہ کے کام کو سراہتے ہوئے اسے پانچ سو کا نوٹ بھی پکڑا گئی تھی۔ لیکن وہ دن ہاجرہ کے لیے مختلف تھا جب گھر کا داخلی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو معمول کے سناٹے کے بجائے ٹی وی لاؤنج سے آتی باتوں کی آواز نے اس کا استقبال کیا تھا۔ بے یقینی کے عالم میں اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مردانہ آواز تو یقیناً صاحب ہی کی تھی لیکن دوسری آواز جو نسوانی تھی رانی باجی کی ہرگز نہیں تھی۔

''اس یہ کون آ گئی...... وہ بھی صبح ہی صبح......'' ہاجرہ پہلے ٹھٹکی پھر جھجکی۔ ''لاؤنج میں جھانک کر دیکھوں بھی یا نہیں......؟'' وہ سوچ رہی تھی جب ہی مختصر راہداری میں دیوار کے ساتھ رکھی شیشے والی سطح سے ڈھکی سنہری فریم والی میز پر چابی رکھتے ہوئے بے دھیانی میں چابی کا گچھا شیشے پر رہنے کے بجائے نیچے ماربل کے شفاف چمکتے فرش پر جا گرا۔ چابی اور چھلے کی جھنجناہٹ کی آواز اتنی واضح اور اونچی تھی کہ لاؤنج سے آتی آوازیں لمحہ بھر کو بند ہو گئیں۔

''کون......؟'' صاحب نے بلند آواز میں پوچھا تھا۔ جھجکی اور کھسیائی ہوئی ہاجرہ کا چہرہ لمحہ بھر کے بعد لاؤنج میں جھانکتا نظر آیا تھا۔

''سلام صاحب...... میں ہاجرہ......'' گو وہ صاحب سے مخاطب تھی لیکن اس کی نظریں اس نازک سی لڑکی کے چہرے پر جمی تھیں جو سرخ گھیرے والے سفید انگرکھا فراک کے نیچے چوڑی دار پاجامے میں ملبوس صاحب کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے پھسلتی ہاجرہ کی نظریں پورا سراپا جانچ کر پیروں پر جا رکی تھیں جو بھورے چمڑے کی کولہاپوری چپلوں میں اتنے سفید اور پیارے لگ رہے تھے کہ ہاجرہ کی نظریں ان پر رک کر واپس اٹھی ہی نہیں۔

''اوہ گڈ مارننگ ہاجرہ...... کیسی ہو......؟'' صاحب کی آواز مخصوص الفاظ کے ساتھ اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''میں ٹھیک......'' ہاجرہ نے ان سفید کومل پیروں سے نظریں ہٹاتے ہوئے صاحب کی طرف دیکھا اور دوپٹے کے پلو سے چہرے سے وہ پسینہ پونچھنے میں مصروف ہوئی جو اے سی کی خنکی میں آیا ہی نہیں تھا۔

''آج پہلی بار معلوم ہوا کہ تم صبح اتنی جلدی آ جاتی ہو۔'' صاحب نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''اچھی سی کافی ملے گی ہاجرہ......!''

''جی، جی صاحب......'' ہاجرہ نے اپنی آواز میں اتری لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''شوگر کے ساتھ یا شوگر کے بغیر......؟'' اس نے ایک مرتبہ پھر چہرے پر دوپٹے کا پلو پھیرا۔

''ایک شوگر کے ساتھ اور ایک بالکل پلین بلیک......'' صاحب نے جواب دیا اور مسکراتے ہوئے اپنی مہمان سے انگریزی زبان میں کوئی بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

''جی صاحب......'' ہاجرہ کچن کی طرف مڑی لیکن مڑتے، مڑتے اس غیر متوقع اور اجنبی چہرے پر نظر ڈالنا نہیں بھولی جس کی آمد نے اس فلیٹ کے ایک ڈھب سے چلتے مخصوص ماحول میں خلل کا احساس سا پیدا کر دیا تھا۔

کافی میکر میں پانی اور فلٹر میں فرنچ روسٹڈ کافی کے مطلوبہ چمچ ڈال کر کافی میکر چلانے کے بعد وہ کچن کاؤنٹر سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن بھی لاؤنج میں بیٹھی مہمان میں الجھا ہوا تھا۔

''جنے کون ہے کون نہیں اور کب سے یہاں آئی ہوئی ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ پچھلے روز اسے یاد آیا۔ وہ شام پانچ بجے کام سے فارغ ہو کر گھر واپس گئی تھی۔ رات کا کھانا جو وہ تیار کر کے رکھ جاتی تھی صاحب خود ہی کسی وقت آ کر گرم کر کے کھا لیتا تھا۔ وہ تیزی سے سنک کی طرف بڑھی جہاں روزانہ صاحب کے استعمال شدہ برتن اسے صبح دھونے کے لیے رکھے ملتے تھے۔ اس روز سنک میں کوئی برتن نہیں رکھا تھا۔ اس نے مڑ کر فریج کھولا گزشتہ روز اس نے صاحب کی ہدایت پر جو

pklibrary.com

بدر کا معرکہ 17 رمضان المبارک 02 ہجری کو پیش آیا جس میں حضور اکرم ﷺ کی قیادت میں 313 مجاہدین نے شرکت کی تھی جن میں اکابر صحابہ بھی شامل تھے۔ دوسری جانب دشمنانِ اسلام کے لشکر میں 1000 کی نفری تھی جس کا سپہ سالار ابوجہل تھا۔ اس معرکے کی تفصیلات قرآن حکیم میں بھی مذکور ہیں۔

اس دن حضور ﷺ نے یہ دعا فرمائی تھی:

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنا وعدہ اور اقرار پورا کر۔ یا اللہ! اگر تیری مرضی یہی ہے (کہ کافر غالب ہوں) تو پھر زمین میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔''

نبی پاک ﷺ نہایت خشوع و خضوع سے بارگاہ الٰہی میں دعا فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ قرب و جوار سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے۔ شانہ مبارک سے چادر ڈھلک گئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ آگے بڑھ کر اسے درست کرتے ہوئے فرماتے جا رہے تھے۔ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! بس کیجیے۔ آپ ﷺ نے اپنے رب سے بڑی خوش الحانی سے التجا فرمادی ہے۔''

اسی پس منظر میں رب کائنات نے فرشتوں کو وحی دے کر بھیجا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم اہل ایمان کے قدم جماؤ، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ سنو! تم گردنوں پر مارو (قتل) اور ان کی پور، پور پر مارو۔'' (سورۂ انفال آیت 12)

یہاں ایک لفظ ''بنان'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پیروں کی پوریں۔ جب ان پر تلوار کی چوٹ پڑتی ہے تو وہ پوریں ٹوٹ کر گر پڑتی ہیں جس کے بعد دشمن نہ تو تلوار چلانے کے قابل رہتا ہے اور نہ ہی بھاگ پاتا ہے۔

پیارے نبی ﷺ نے اپنے رب سے دعا فرمائی تھی، بھلا وہ کیسے رد ہو سکتی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی وحی کا نزول ہوا۔ ''میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا، جو آگے پیچھے آئیں گے۔'' (سورۂ انفال آیت 9)

اس موقع پر ابن اسحاق نے ایک روایت بیان کی ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔ ''خوش ہو جاؤ، تمہارے پاس اللہ کی مدد آن پہنچی۔ یہ جبرئیلؑ ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام تھامے آگے چلے آ رہے ہیں اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہیں۔''

کوفتہ اور میکرونی بنایا تھا وہ اسی طرح شیشے کی ڈش میں ڈھکا فریج میں رکھا تھا اور نیوٹیلا سے بنا وہ میٹھا بھی جو صاحب بہت شوق سے کھاتا تھا۔

''اس کا مطلب رات صاحب نے کھانا گھر پر نہیں کھایا۔'' اس نے سنک کے قریب رکھے ریک پر نظر ڈالی، صاحب کے استعمال کی پلیٹیں اور باؤل اسی طرح ترتیب سے دھلے رکھے تھے جیسے وہ دھونے کے بعد لگا کر گئی تھی۔

''ہم..... م.....'' ہاجرہ نے گہری سانس لی اور سر جھٹکتے ہوئے کافی میکر کی طرف بڑھی۔ لاؤنج میں کافی کے کپ سرو کرنے کے بعد اس نے صاحب سے ناشتے کا پوچھا تھا، جس کا اس نے منع کر دیا تھا۔

''ہم آج ناشتا کہیں باہر ہی کریں گے۔ کیوں شیل آج پیور انگلش بریک فاسٹ چلے گا؟'' وہ سفید دودھیا پیروں والی سے پوچھ رہا تھا۔ ہاجرہ بغیر اس کا جواب سنے تیزی سے چلتی کچن میں واپس آ گئی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی کہ صبح، صبح کسی کے گھر یوں کوئی آدھمکے اور پھر ساری روٹین ہی خراب کر دے۔'' اسے نہ جانے کیوں اس خلل پر الجھن ہو رہی تھی اور جھنجلاہٹ بھی۔

''ہاجرہ میری لائٹ بلیو شرٹ نہیں مل رہی، آج یاد سے چیک کر لینا لانڈری سے واپس آئی بھی تھی یا نہیں؟'' کچھ دیر بعد صاحب کی آواز اس کے کانوں میں آئی تھی۔

وہ جیسے ایسی ہی کسی پکار کی منتظر تھی جب ہی تیز قدموں سے لاؤنج کی طرف بھاگی تھی۔ جہاں صاحب اسے نظر نہیں آیا تھا اکیلی وہی لڑکی موجود تھی جو اپنی جگہ سے اٹھ کر مغربی دیوار کے ساتھ رکھے اونچے مجسمے کے قریب کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''ڈیوڈ کا یہ ریپلیکا تم پیرس سے لائے تھے ناں دانی.....'' وہ مجسمے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''دھیان سے..... ذرا سا سخت ہاتھ لگنے پر یہ ڈول جاتا ہے۔'' ہاجرہ بے ساختہ بول پڑی تھی۔

''اوہ ہاں.....'' اس نے فوراً اپنی انگلی ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ ''تھینک یو ہاجرہ.....'' وہ دوستانہ انداز

آپ ﷺ نے جس مقام پر یہ دعا فرمائی تھی، وہ خیمے سے مشابہ تھی۔ پھر آپ ﷺ زرہ پہنے قیام گاہ سے باہر تشریف لائے اور اپنے مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پیش قدمی فرمائی۔ ''عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔'' (سورۂ قمر آیت 45)

اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک مٹھی کنکریاں لیں اور قریش کی جانب رخ مبارک کر کے فرمایا۔ ''شاہت الوجوہ'' (چہرے بگڑ جائیں) اور پھر وہ کنکریاں کفار کی جانب پھینک دیں۔ یہ مشتِ خاک ہر مشرک کی آنکھ، نتھنے یا آنکھوں میں ضرور گئی جس کی بابت اللہ کا فرمان ہے۔ ''جب آپ ﷺ نے پھینکا تو درحقیقت آپ ﷺ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔'' (سورۂ انفال آیت 17)

پھر آپ ﷺ نے جوابی حملے کا حکم دیا اور مجاہدین کو جنگ کی ترغیب دلائی۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''چڑھ دوڑو! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے۔ ان سے جو آدمی بھی ڈٹ کر ثواب سمجھ کر آگے بڑھ کر اور پیچھے نہ ہٹ کر لڑے گا اور پھر مارا جائے گا، اللہ اسے ضرور جنت میں داخل کرے گا۔''

جنت کی اس بشارت پر عمیر بن حمام بولے: ''بہت خوب فرمایا'' پھر دریافت کیا۔ ''کیا میں بھی جنت والوں میں سے ہوں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''تم بھی ان جنت والوں میں سے ہو۔'' اس وقت وہ توشے دان سے کھجور نکال کر کھا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے عقل کو دنگ کر دینے والا ایک جملہ ارشاد فرمایا جو کتاب احادیث میں درج ہے۔ وہ جملہ یہ ہے۔ ''اگر میں اتنی دیر زندہ رہا کہ یہ کھجوریں کھالوں تو یہ لمبی زندگی ہو جائے گی۔''

چنانچہ ان کے پاس جو کھجوریں تھیں، انہیں پھینک دیا اور مشرکین سے لڑنے دوڑے اور لڑتے، لڑتے شہادت پائی۔ ایک اور پروانۂ رسول ﷺ کا نام عوفؓ تھا۔ وہ حارث کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ کا نام عفرا تھا۔ انہوں نے رسول کریم ﷺ سے دریافت کیا۔ ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی کس بات پر (خوش ہو کر) مسکراتا ہے؟''

حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا۔ ''اس بات سے کہ بندہ خالی جسم (بغیر زرہ) اپنا ہاتھ دشمن کے اندر ڈبو دے۔''

یہ سننا تھا کہ عوفؓ نے بدن سے زرہ اتار پھینکی اور تلوار لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں تک کہ شہادت کی زندگی پائی۔

میدانِ کارزار میں دشمن مغلوب تھے۔ ان کے بڑے، بڑے رؤسا اور رستم جہنم واصل ہونے کی بنا پر ان کا جوش و جذبہ سرد پڑ چکا تھا جبکہ شہادت کے متوالوں کا جوشِ جہاد شباب پر تھا کیونکہ نبی ﷺ مجاہدین کو فتح کی بشارت دے چکے تھے۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اسی دم صاحب اپنے کمرے سے باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلا تھا۔

''چلیں.....؟'' اس نے کف کا بٹن بند کرتے ہوئے اپنی مہمان سے پوچھا تھا۔

''شیور پلیز.....!'' جواب میں وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ اور لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی ہاجرہ ہونقوں کی طرح دونوں کو اپنے قریب سے گزر کر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''صاحب.....!'' ذرا دیر بعد جیسے اسے ہوش آیا تھا اور وہ بھاگ کر ان کے پیچھے گئی تھی۔

''آج کھانے میں کیا بنانا ہے.....؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''آج شام گھر پر کچھ گیسٹ انوائٹڈ ہیں ہاجرہ..... میں نے کھانے کے لیے آرڈر کر رکھا ہے۔ وہ ٹھیک سات بجے کھانا ڈیلیور کر دیں گے۔'' صاحب نے مڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''کیا تم آج رات تک اِدھر رک سکتی ہو۔''

''ہاں صاحب رک سکتی ہوں.....'' ہاجرہ نے تیزی سے جواب دیا تھا۔ ''لیکن مجھے ماسی کو فون کر کے بتانا پڑے گا..... ماسی میرا مطلب ہے فضل احمد کی اماں جس کے ساتھ میں رہتی ہوں..... میں وقت پر گھر واپس نہ جاؤں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔'' ہاجرہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ تفصیل صاحب کو کیوں سنا رہی تھی۔ وہ رات دیر تک رک سکتی تھی یا نہیں..... اس کا جواب مختصر ہونا چاہیے تھا۔ اس جواب سے جڑی باقی تفصیل سے صاحب کو کیا سروکار ہو سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر تم فون کر کے بتا دو اپنی ماسی کو.....'' صاحب نے سر ہلا کر کہا۔ ''اور ہاں پلیز..... کراکری کا انتخاب اور ٹیبل سیٹ کرنے کی ذمے داری تمہاری ہوگی۔'' جاتے، جاتے وہ ایک مرتبہ پھر مڑا تھا۔

''ٹھیک ہے صاحب، میں نے یہ سب کام سیکھ رکھا ہے، جانتی ہوں میں سب.....'' ہاجرہ نے ایک بار پھر لمبا جواب دیا تھا۔

''گڈ.....!'' صاحب مسکرایا تھا اور ہاجرہ ان دونوں کے دروازے سے باہر نکل جانے کے بعد بھاگ کر دروازے تک آئی تھی۔ اس نے طویل راہداری سے گزر کر لفٹ کا بٹن دبا کر لفٹ آنے کے انتظار میں ان دونوں کو وہیں کھڑے رہ کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور لفٹ آنے پر ان دونوں کے اس کے اندر غائب ہوجانے تک وہیں کھڑی جھانکتی رہی تھی۔

''صاحب کی شرٹ، شام کے مہمان، کھانے کی ڈیلیوری، برتنوں کا انتخاب، ٹیبل سیٹ کرنا، گھر کی صفائی'' واپس کچن میں آکر اسٹول پر بیٹھے، بیٹھے اس کے ذہن میں کرنے کے سب ہی کام گھوم رہے تھے لیکن اسے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان سب کاموں کے بارے میں سوچنے کے بجائے کچھ اور سوچ رہی تھی، اس کا دل جیسے کسی ایک ہی نقطے پر رک گیا تھا۔

''سب سے پہلے صاحب کے کمرے کی ہی خبر لیتی ہوں.....'' پھر اس کے تجسس نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھایا تھا اور وہ تیزی سے چلتی صاحب کے کمرے کی طرف آئی تھی..... صاحب کے کمرے میں کچھ بھی غیر معمولی نہ پا کر جیسے اس کے سوچ در سوچ بھٹکتے ذہن کو تھوڑی یکسوئی ملی تھی۔ وہی روزانہ کے میز پر بکھرے کاغذ، فائلیں اور تاریں، روزانہ کے معمول کے مطابق اپنی جگہ سے ذرا سی ہلی ہوئی بیڈ شیٹ اور کمفرٹر، نم باتھ روب اور سلیپر کچھ بھی تو غیر معمولی نہیں تھا۔

''مطلب یہ لڑکی آج صبح ہی گھر میں آئی تھی۔'' اس کے بوجھل دماغ پر سے جیسے کوئی وزن دار چیز ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

اس رات کا ڈنر، اس کے مہمان اور گھر کا ماحول سب نیا تھا، ہاجرہ کے لیے تو بالکل ہی نیا..... اس شام ڈنر کے لیے کھانے کے ساتھ جو نئی چیز ڈیلیور ہوئی وہ موسیقی کے کچھ آلات تھے، اطلاعی گھنٹی بجنے پر ہاجرہ کے دروازہ کھولنے پر کسی کمپنی کے ورکر کپڑے میں لپٹے ہوئے یہ آلات لاؤنج میں رکھ گئے تھے۔ ان کے پیچھے، پیچھے شہناز بھی فلیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ ساڑی کے پلو کا کنارہ دانتوں تلے دبائے وہ متجسس انداز میں ہاجرہ کی طرف بڑھی تھی۔

''آج تیرے صاحب کے گھر میں میلاد کیا رہیا (رہا) ہے ہاجرہ.....؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔ ہاجرہ سے تفصیل سن کر وہ بھی لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔

''تیرا صاحب بیاہ رچا رہا ہے..... پکا'' کچھ دیر بعد اس نے اپنی حتمی رائے دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''صبح میں نے تیرے صاحب کو اس چھوری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا، میں اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔''

''تو پھر کسی وقت بیٹھ کر دال میں سے کالا چن کر الگ کرتی رہنا۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔'' ہاجرہ کا ذہن شہناز کی بات سن کر پھر سے جھنجلا گیا تھا۔ وہ شہناز کو وہیں چھوڑ کر لاؤنج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جہاں مختلف رنگوں کے پیکنگ والے کپڑوں میں لپٹے وہ آلات موسیقی رکھے تھے۔

''اب اللہ جانے ان کا کیا کرنا ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر انہیں ایک طرف لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں اپنے کام سے فری ہوچکی۔'' شہناز نے پان کا بیڑا گریبان سے نکال کر کلے میں دباتے ہوئے کہا۔ ''کہے تو میں تیرا ہاتھ بٹا دوں.....''

''ہاں آجا..... لیکن ذرا دھیان سے تیرے ہاتھوں میں تو سوراخ ہیں بھیا..... کہیں کوئی برتن ورتن توڑ دیا تو شامت میری آجائے گی۔'' ہاجرہ معتبر انداز میں بولتی کچن میں جا گھسی۔

لیکن شہناز کی یہ آمد اس کے لیے اچھی خاصی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ الماریوں سے برتن نکال کر صاف کرنے سے لے کر ٹیبل پر لگانے سے لے کر قابوں میں کھانا نکال کر ٹیبل پر اسٹینڈز میں رکھنے اور ان کے نیچے برنر روشن کرنے تک شہناز نے مہارت سے اس کے ساتھ کام کروایا تھا اور پھر صاحب اور

مہمانوں کی آمد کے بعد کھانا کھالیے جانے اور برتن دھو کر سمٹوانے تک شہناز اس کے ساتھ لگی رہی تھی۔

''اب ایسا کر برتن اِدھر کاؤنٹر پر ہی ڈھیر لگا کر چلنے کی کر...... رات بہت ہو چکی۔'' شہناز نے آخری گلاس دھو کر اسٹینڈ میں لگانے کے بعد گیلے ہاتھ کچن ٹاول سے خشک کرتے ہوئے کہا تھا۔

اسی دم لاؤنج سے اٹھتی موسیقی کی کسی دُھن نے دونوں ہی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ دونوں دبے قدموں چلتی راہداری اور لاؤنج کے درمیان بنی محراب تک آئیں اور ذرا، ذرا سا سر نکال کر اندر جھانکنے لگیں۔ صبح والی مہمان لاؤنج کے فرش پر آلتی پالتی مار کر ستار اپنے سامنے سجائے بیٹھی تھی اور اس کے دائیں طرف اسی کی طرح صاحب فرش پر بیٹھا طبلے پر انگلیاں بجا رہا تھا۔ شہناز اور ہاجرہ نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ شہناز نے ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صاحب اور لڑکی کے بارے میں اپنے اندازے کے مزید پکا ہو جانے کا عندیہ دیا تھا۔ اب صاحب طبلہ بجاتے ہوئے مسکرا، مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اور لڑکی جس نے اس وقت سیاہ سوتی گھیر دار فراک کے ساتھ سیاہ ہی چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ستار کی تاروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کیے جذب کے عالم میں کچھ گنگنا رہی تھی اور اس کے کانوں میں پڑے آویزے چھت کی کنسلیڈ لائٹ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔

☆☆☆

اگلا روز اتوار کا تھا اور اتوار کے روز ہاجرہ کی چھٹی ہوتی تھی لیکن اس اتوار کو اسے کام پر اس لیے جانا تھا کہ وہ پچھلی رات دعوت کے برتن دھو کر یونہی بکھرے چھوڑ آئی تھی۔ وہ صبح اپنے وقت پر ہی گھر سے نکل آئی تھی۔

''صاحب کے سوئے، سوئے ہی برتن سمیٹ کر اور لاؤنج کی صفائی کر کے واپس آجاؤں گی۔'' لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

''آج تو ویسے بھی اتوار ہے صاحب جانے کب اٹھے...... چاہے تو دن بھر سوتا رہے۔'' لفٹ سے نکل کر صاحب کے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کا ذہن اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ مگر اس کی توقع کے برعکس صاحب نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ ڈائننگ ٹیبل پر اپنے سامنے لیپ ٹاپ رکھے، کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے کسی کام میں مگن تھا۔

''اوہ...... ہیلو ہاجرہ......'' اسے دیکھ کر صاحب نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''تم بھول گئیں شاید آج تو سنڈے ہے۔''

''جانتی ہوں صاحب......'' ہاجرہ نے آگے بڑھ کر لاؤنج میں بکھری چیزیں سمیٹنا شروع۔ ''رات کام ادھورا چھوڑ کر چلی گئی تھی...... سوچا جلدی، جلدی سمیٹ آؤں۔''

''گڈ جاب بھئی......'' صاحب نے انگوٹھا اٹھا کر داد دیتے ہوئے کہا۔ ''رات ڈنر پر بھی تم نے بہت اچھا کام کیا اور آج اس وقت کام پر آجانا بھی تمہاری فرض شناسی کی اچھی مثال ہے۔''

ہاجرہ جواب دیے بنا اپنے کام میں مگن رہی۔

''چائے، ناشتا، کافی؟'' لاؤنج سمیٹ کر فارغ ہونے کے بعد اس نے پوچھا اور صاحب کے بتانے پر ناشتا تیار کرنے کچن میں چلی گئی۔ وہ پہلا اتوار تھا جب وہ ادھر کام پر آئی تھی عمارت پر جیسے ہو کا عالم طاری تھا۔

''اتنا سناٹا، اتنی خاموشی تو یہاں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔'' جو کے دلیے میں دودھ ڈال کر شہد کا چمچ ملاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ٹرے میں دلیے کے پیالے کے ساتھ ابلا ہوا انڈا اور پھلوں کے تازہ رس کا گلاس رکھ کر وہ لاؤنج کی طرف آگئی۔ جس میں ایک طرف کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی صاحب کے سامنے ٹرے رکھ کر وہ مڑ کر کچن میں جانے لگی تھی جب صاحب کے سوال نے اسے روک لیا۔

''اور ہاجرہ سناؤ کیا چل رہا ہے تمہاری لائف میں......؟'' ہاجرہ نے ٹھٹک کر بے یقینی سے صاحب کی طرف دیکھا جو سوال کرنے کے بعد بے نیازی سے انڈے کا ٹکڑا کاٹنے میں پھنسا رہا تھا۔

''رانی باجی نے بتایا تھا کہ تم کوئی مکان وکان

pklibrary.com

بنانا چاہتی ہو...... اسی لیے کام کرتی ہو۔ ایسا ہی ہے ناں......؟'' اس نے ہاجرہ کی طرف دیکھا تھا۔

''جی صاحب......'' ہاجرہ نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

''کتنے سال ہو گئے تمہیں بیوہ ہوئے......'' صاحب کو شاید اب اس سے سوال کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ ''میں کوئی غلطی تو نہیں کر رہا ناں...... تمہارے ہزبینڈ کا انتقال ہو چکا ہے، رائٹ......؟''

''جی صاحب، تین ساڑھے تین سال پہلے......'' ہاجرہ کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

''اوہ سیڈ...... تمہاری عمر تو اب بھی بہت کم لگتی ہے۔ بچپن میں ہی شادی کر لی تھی کیا؟''

ہاجرہ کو اس سوال کا فوری جواب اس لیے بھی نہیں سوجھا کہ وہ سوال کرنے والے کے بے تکلفانہ انداز پر حیرت زدہ تھی۔

''اچھا چلو یہ بتاؤ کہ کچھ یاد ہے...... تم کب پیدا ہوئی تھیں...... اپنی عمر کا اندازہ ہے تمہیں......؟''

''پتا نہیں صاحب، ابا بتاتا تھا کہ کوئی بڑا آدمی شہید ہوا تھا جس روز میں پیدا ہوئی تھی۔'' ہاجرہ نے کہا۔

''چلو جی......'' صاحب کانٹا چھری چھوڑ کر کرسی پیچھے جھلاتے ہوئے ہنس دیا۔ ''اتنے وحشت ناک دن پیدا ہو گی تو ایسا ہی مقدر پاؤ گی ناں......''

ہاجرہ نے نظریں میز کی سطح پر جما لیں۔

''سوری، سوری، سوری......'' ہاجرہ کی شکل دیکھ کر اس نے اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

"I did not mean that"

اچانک ہنسی رکنے پر اسے گلے میں خراش محسوس ہونے لگی تھی اور اب وہ کھانس رہا تھا۔ ''میرا وہ مطلب نہیں تھا......'' یہ خیال آنے پر کہ ہاجرہ اس کی بات سمجھی نہیں ہو گی اس نے یہ ہی الفاظ اردو میں دُہرائے۔ ''میں بس یونہی...... اچھا خیر چھوڑو......'' اس کی نظر ہاجرہ کے ہاتھ پر رک گئی جس سے اس نے بے دھیانی میں میز کا کنارا پکڑ رکھا تھا...... سیاہی مائل زرد رنگت والا ہاتھ جس کی انگلیوں کے ناخن بد سلیقگی سے کٹے ہوئے تھے اور مسلسل کام کرنے کی وجہ سے جن کے کونوں میں میل پھنسی نظر آرہی تھی۔

''تم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں ہاجرہ......'' وہ دلچسپی سے مسکرایا۔ ''تم لوگوں کے دیہاتوں گاؤں وغیرہ میں تو بیوہ عورتیں چوڑیاں، مہندی، ہار سنگار کرنا چھوڑ دیتی ہیں شاید......'' ہاجرہ نے اس سوال پر چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے اپنا میز پر دھرا ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں......'' وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''یہ چوڑیاں......'' ہاجرہ نے جھینپ کر اپنے بازو میں پڑی میٹل کی چار رنگ اڑی میلی، بے ڈھنگی چوڑیوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے آدمی نے مجھے لے کر دی تھیں لعل شہباز کے مزار سے...... تب سے کبھی اتاری ہی نہیں......''

''اوہ......'' صاحب نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ ''میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔ its your right Hajra میرا مطلب ہے کہ یہ تمہارا حق ہے تمہاری مرضی ہے تم چوڑیاں پہنو نہ پہنو......''

ہاجرہ اس کے اس سوال پر یوں شرمندہ سی کھڑی تھی جیسے چوڑیاں پہننا واقعی اس کی غلطی تھی۔

''کم آن ہاجرہ...... ایزی ہو جاؤ بھئی......'' صاحب کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کی اس کیفیت کو کیسے ختم کرے۔ ''یو نو یہ سب rituals اور taboos جو بیوہ عورتوں کے بارے میں ہمارے ہاں روایت بلکہ کسٹم بن چکے ہیں میں ان سے بالکل بھی اتفاق نہیں کرتا...... عورت کو ہر حال میں اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔''

''جی صاحب......'' ہاجرہ نے اس کی بات آدھی ادھوری سمجھتے ہوئے کچھ نا سمجھ پاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''برتن اٹھا لوں صاحب......؟''

''ہاں، ہاں پلیز......'' وہ جیسے اسے نارمل ہوتے

ہوئے دیکھ کر کھل اٹھا۔ ''تم نے کل بہت اچھا کام کیا اور وہ جو تمہارے ساتھ تھی ماسی..... کیا نام اس کا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''شہناز.....'' ہاجرہ نے کہا۔

''شہناز ہاں شہناز، اس نے بھی بہت اچھا کام کیا..... تم ایسا کرو.....'' اس نے ٹراؤزر کی جیب سے والٹ نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیسے تم رکھ لو اور یہ اس کو دے دینا شہناز کو.....'' اس نے والٹ سے چند نوٹ نکال کر ہاجرہ کی طرف بڑھائے۔

''اس کی کیا ضرورت ہے صاحب.....؟'' ہاجرہ کا ہاتھ غیر ارادی طور پر بند مٹھی کی شکل اختیار کر گیا۔

''یہ تو میری جاب ہے، جس کی سیلری آپ مجھے ویسے ہی دے دیتے ہیں۔''

''یہ آؤٹ آف روٹین تھا ہاجرہ اور تم یہ پیسے ڈیزرو کرتی ہو..... یہ تمہارا انعام ہے۔'' صاحب نے اصرار کرتے ہوئے پیسے دوبارہ اس کی طرف بڑھائے۔

''لے لو شاباش.....'' ہاجرہ نے کن انکھیوں سے صاحب کی طرف دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے پیسے پکڑ لیے..... تیزی سے برتن اٹھا کر وہ کچن کی طرف چل دی۔

''تم کچن سمیٹ کر گھر چلی جانا..... کھانا بنانے کی ضرورت نہیں..... رائٹ.....'' پیچھے سے صاحب کی آواز آئی تھی۔

☆☆☆

اور وہ اس سے اگلی شام ہی کی بات تھی جب اپنی ایجنسی کے دفتر میں بیٹھے اپنے کلائنٹ سے اگلے سیزن کے لیے لان کے کپڑوں کے اشتہار کی ڈسکشن کرتے ہوئے اچانک دانیال حسن کے چشم تصور میں ایک منظر لمحہ بھر کے لیے حاضر ہوا اور پھر غائب ہو گیا۔

''پرفیکٹ.....'' اس کے منہ سے بے اختیار لفظ نکلا..... اس کے کلائنٹ اور اس کی مارکیٹنگ اینڈ ڈیزائن ٹیم کے ممبران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا پرفیکٹ.....؟'' کسی نے پوچھا تھا۔ دانیال نے جواب نہیں دیا، وہ تصور میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے خیال سے ہی لطف اندوز ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''ڈینی.....'' کسی نے اسے خیال کے اثر سے باہر لانے کے لیے اس کا کندھا جھنجوڑا تھا۔

''ڈن ہو گیا صدیقی صاحب.....'' اس نے اس منظر میں واپس آتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا قلم ٹیبل پر پھینکتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ ''اس کمپین میں اس بار ہم کسی ٹاپ ماڈل کے بجائے نیا تجربہ کریں گے۔''

''کیسا نیا تجربہ.....؟'' صدیقی صاحب نے چونک کر دیکھا تھا..... اور ان سب کو اپنا خیال سناتے ہوئے دانیال حسن پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے چشم تصور میں سیاہی مائل زرد جلد والا وہ ہاتھ رہ، رہ کر ابھر رہا تھا جو اس کے سامنے میز پر رکھا تھا، اس ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن بدسلیقگی سے کٹے تھے اور ان کے کناروں میں میل کی ہلکی سی لکیر بھی پھنسی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

''ہاجرہ.....!'' شنیلہ عرف شیل جو اس کی یونیورسٹی فیلو رہ چکی تھی اور جس کے ساتھ مل کر اس نے کئی پروجیکٹس پر کام بھی کر رکھا تھا شنیلہ ان دنوں ایمسٹرڈم فلم اسکول میں کوئی کورس کر رہی تھی اور چھٹیوں پر پاکستان آئی ہوئی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے ہاجرہ.....؟'' شنیلہ نے اس سے دوبارہ پوچھا جیسے کنفرم کرنا چاہ رہی ہو کہ جو اس نے سنا وہ ٹھیک تھا۔ جواب میں دانیال نے سر ہلانے ہی پر اکتفا کیا۔

''تمہارا ٹارگٹ کسٹمر اس اچانک اور بڑی تبدیلی کو ہضم کر لے گا..... یہ سوچ لو.....'' وہ کہہ رہی تھی۔

''سب سوچ لیا..... تم ذرا تصور کرو.....'' دانیال نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب جا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کسی بھی ٹاپ ماڈل کو لے کر اسے ہاجرہ جیسا لک دینا مشکل نہیں لیکن اس میں وہ بات کہاں ہو سکتی ہے جو خود ہاجرہ میں ہو گی..... ایک دم پیور، ایک دم نیچرل.....''

شنیلہ نے تصور میں ہاجرہ کا سراپا دیکھا..... سیاہی

مائل گندمی رنگت والی ہاجرہ جس کے اونچے دانت چہرہ دبلا ہونے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہوجاتے تھے۔ جس کے ہلکا سا مسکرانے پر اس کے دانت اور سیاہ مسوڑھے صاف نظر آنے لگتے تھے۔ جو ہلکے رنگ کے پرانے اور بار، بار دھوئے جانے کی وجہ سے رنگ سے بدرنگ ہوئے شلوار قمیص پر سفید چادر اوڑھے رکھتی تھی۔ جس کے بال جن کو وہ گول جوڑے کی شکل میں لپیٹے رکھتی تھی میں لگے کسی دیسی نباتاتی تیل کی بو کئی فٹ دور کھڑے بھی صاف سونگھی جاسکتی تھی۔ جس کی آنکھیں بڑی، بڑی تھیں اور جن میں ایک ابدی اداسی اور مظلومیت جھلکتی تھی۔ گو شنیلہ نے ہاجرہ کو ایک ہی دن میں صرف دو بار ہی دیکھ رکھا تھا لیکن اس کے اندر موجود کانٹینٹ رائٹر کا مشاہدہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ ہاجرہ کی شخصیت کی ساری جزئیات بیان کرسکتی تھی۔

''ڈونٹ ٹیک ہر لائٹ بے بی.....'' شنیلہ کو یوں تصور میں گم دیکھ کر دانیال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بظاہر وہ بہت معمولی اور عام سی لڑکی لگتی ہے لیکن اس کے اندر کوئی چیز اتنی طاقتور ہے کہ وہ آپ کو متوجہ کرلینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ شاید یہ ہی اس کا charisma ہے۔''

''کچھ نہیں.....'' شنیلہ نے اس کے خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ تمہارے گھر میں کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا اور صرف ہاجرہ کا آنا جانا رہتا ہے اس لیے قدرتی طور پر تمہیں اس نے اپنی طرف متوجہ کرلیا اور تم اسے کیریزمیٹک پرسنیلٹی قرار دینے پر بھی تل گئے ہو..... خیر یہ نیچرل سی بات ہے.....'' اس نے ہونٹ بچکائے۔

''تم ہاجرہ کے ساتھ، ساتھ مجھے بھی لائٹ لے رہی ہو شیل.....'' دانیال برا مان گیا۔

''جو میں محسوس کررہا ہوں اور جو میں ہوتے دیکھ رہا ہوں اگر وہ حقیقت میں ہوگیا تو تم ہی ہوگی جو میری تعریف میں رطب اللسان نظر آؤ گی۔''

جواب میں شنیلہ نے کندھے اچکائے تھے جیسے وہ دانیال سے مزید بحث نہ کرنا چاہتی ہو۔

''چلو فرض کیا جو تم سوچ رہے ہو سب اس پر ایگری کر بھی جائیں تو تمہیں کیسے یقین ہے کہ ہاجرہ یہ کرنے پر تیار بھی ہوجائے گی۔ تم جانتے ہو وہ کس کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔''

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ ہاجرہ پیسہ کمانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے، اس نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے ایڈریس پر سیٹ کررکھا ہے۔ اسے ایک نادیدہ گھر بنانا ہے جہاں اس کی چھوٹی بہن آرام سے زندگی گزار سکے اور وہ گھر بنانے کے لیے اسے پیسہ کمانا اور جمع کرنا ہے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہوسکتا ہے لیکن سوچ کا زاویہ کچھ اتنا درست نہیں.....'' شنیلہ نے سر ہلایا۔ ''ہاجرہ کو یقیناً پیسہ کمانا ہے اور اسی لیے وہ گھر سے نکلتی ہے لیکن یہ پیسہ کمانے کے لیے اس نے اپنے کچھ ''ڈوز، اور ڈونٹس (حدود و قیود) بھی سیٹ کررکھے ہوں گے اور کسی بھی اشتہار میں کام کرکے پیسہ کمانا مجھے یقین ہے اس کے ڈونٹس میں سے ایک ثابت ہوگا۔''

☆☆☆

لیکن شنیلہ کے لیے ہاجرہ کی طرف سے ایک غیر متوقع ردِعمل منتظر تھا..... ہاجرہ کچن میں کھڑی ایگ سوفلے کے لیے باؤل میں انڈے پھینٹ رہی تھی جب دانیال نے اس کے سامنے اپنی تجویز رکھی تھی۔

''دیکھو ہاجرہ میں تمہاری ''بے تاثر شخصیت'' اور ''زندگی میں کسی مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں روح'' سے زیادہ تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا.....'' وہ اپنے سامنے ششدر کھڑی ہاجرہ سے کہہ رہا تھا۔ ''لیکن تم جانتی ہو کہ ہماری زندگیوں میں کچھ موڑ اور چند مواقع بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر آتے ہیں اور ضرور آتے ہیں۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم آگے بڑھ کر ان موقعوں کو ویلکم کرتے ہیں، نئے موڑ مڑ جاتے ہیں یا پھر انہیں ہمیشہ کے لیے ریجیکٹ کرکے اسی ڈھب پر زندگی گزارے چلے جاتے ہیں..... جس پر ہمیشہ سے گزارتے

چلے آئے ہیں۔‘‘

’’تم مگر میں، لل...... لیکن میں......‘‘ ششدر کھڑی ہاجرہ نے کچھ بدبدانا چاہا تھا۔

’’تم ایسا کرو میرے ساتھ آؤ......‘‘ وہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں چلا گیا اور اپنے لیپ ٹاپ کو لاؤنج کی دیوار سے جڑے بڑے سائز کے ٹی وی سے متصل کرنے لگا۔

’’یہ دیکھو......‘‘ اس نے کہیں کوئی بٹن دبایا اور ہاجرہ کی طرف گھوما...... ہاجرہ نے نظر اٹھا کر دیکھا ٹی وی اسکرین پر پھولدار نئے کپڑے پہنے ایک عورت کا اسکیچ نظر آرہا تھا۔ دانیال نے اس عورت کا چہرہ زوم ان کیا وہ ہاجرہ کا چہرہ تھا ہو بہو وہی، بلا کم و کاست، ہاجرہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی اس چہرے کو دیکھتی رہی جو اس کا اپنا عکس تھا...... ایک کے بعد ایک دانیال ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے اسکرین کو آگے پیچھے کرتا گیا۔ کلک، کلک کی آواز کے ساتھ ہاجرہ خود کو مختلف روپ دھارے دیکھتی رہی۔ نت نئے نمونوں کے کپڑے اور چہرہ وہی اس کا اپنا......

’’یہ صرف visuals ہیں ہاجرہ جو میں نے خود اسکیچ کیے ہیں...... یہ آگمینٹڈ ریئلیٹی کی ایک مثال ہے صرف اور اسے حقیقت کا روپ تم نے دینا ہے، بولو دو گی......؟‘‘ ہاجرہ کے پلے صاحب کی ایک بھی بات نہیں پڑی تھی، وہ جیسے کسی طلسماتی دنیا میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں جادو کی چھڑی کے زور پر وہ کوئی بھی، کچھ بھی بن سکتی تھی۔ شہزادی بھی ملکہ بھی اور سنڈریلا بھی۔

’’دیکھو ہاجرہ...... میں نے اتنے مہینوں میں تمہارے اندر ایک مضبوط، باہمت عورت کو دریافت کیا ہے۔ تم باقی عورتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور محنتی ہو، تمہارے اندر بہت سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن ہر کوئی ان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا، تمہارے پاس یہ موقع خود چل کر آرہا ہے۔ اس ایک کام کے ذریعے تم نہ صرف خود کو بلکہ اس دنیا کی بہت سی جہتوں کو کھوج سکو گی......‘‘ دانیال کسی بھی حال میں اسے قائل کر لینا چاہتا تھا۔

’’لل لیکن...... م م میں صاحب میں......‘‘ ہاجرہ کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی اور بے یقینی بھی۔

’’دیکھو ہاجرہ میں جانتا ہوں تمہارا ایک خواب ہے۔‘‘ اب دانیال نے ہاجرہ کو وہاں ضرب لگانا شروع کی جہاں اس کی زمین نرم تھی۔ ’’ایک گھر کی تعمیر جس میں تمہاری بہن جو شوہر اور دوسرے لوگوں کے ظلم و ستم سہہ رہی ہے...... سہولت سے رہ سکے، ایسا ہی ہے ناں؟‘‘ اس نے ہاجرہ سے تائید چاہی جو اس نے تیزی سے سر ہلا کر فوراً دے بھی دی۔

’’بس تو پھر دوسری سوچ سوچو ہی مت......‘‘ دانیال نے سر جھٹکا۔ ’’ایک اشتہار میں کام کرنے کے تمہیں اتنے پیسے مل جائیں گے جتنے تم نے کبھی اکٹھے دیکھے بھی نہیں ہوں گے۔‘‘

ہاجرہ نے ایک بار پھر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

’’میرا یقین کرو ہاجرہ......‘‘ دانیال نے کہا۔ ’’اچھا

خوب صورت کون!

☆ خوب صورت ہے وہ دل جو کسی کے درد کو سمجھے۔

☆ خوب صورت ہے وہ احساس جو کسی کے دکھ کا مداوا ہے۔

☆ خوب صورت ہیں وہ ہاتھ جو کسی کو مشکل وقت میں تھام لیں۔

☆ خوب صورت ہے وہ سوچ جو کسی کے لیے اچھا سوچے...... اور......

☆ خوب صورت ہے وہ انسان جسے اللہ نے یہ تمام خوب صورتیاں عطا کی ہیں۔

از: مہرین ضیا بنگش، کیماڑی

دعا

ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا کرو ہو سکتا ہے کسی کا بہت بڑا کام تمہاری چھوٹی سی دعا کا محتاج ہو۔

از: صائمہ سجاد، کوہاٹ

pklibrary.com

...... چلے آئے ہیں۔''

''مم مگر میں، لل...... لیکن میں......'' ششدر کھڑی ہاجرہ نے کچھ بڑبڑانا چاہا تھا۔

''تم ایسا کرو میرے ساتھ آؤ......'' وہ کچن سے نکل کر لاؤنج میں چلا گیا اور اپنے لیپ ٹاپ کو لاؤنج کی دیوار سے جڑے بڑے سائز کے ٹی وی سے متصل کرنے لگا۔

''یہ دیکھو......'' اس نے کہیں کوئی بٹن دبایا اور ہاجرہ کی طرف گھوما...... ہاجرہ نے نظر اٹھا کر دیکھا ٹی وی اسکرین پر پھولدار نئے کپڑے پہنے ایک عورت کا اسکیچ نظر آ رہا تھا۔ دانیال نے اس عورت کا چہرہ زوم ان کیا وہ ہاجرہ کا چہرہ تھا ہو بہو وہی، بلاکم و کاست، ہاجرہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی اس چہرے کو دیکھتی رہی جو اس کا اپنا عکس تھا...... ایک کے بعد ایک دانیال ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے اسکرین کو آگے پیچھے کرتا گیا۔ کلک، کلک کی آواز کے ساتھ ہاجرہ خود کو مختلف روپ دھارے دیکھتی رہی۔ نت نئے نمونوں کے کپڑے اور چہرہ وہی اس کا اپنا......

''یہ صرف visuals ہیں ہاجرہ جو میں نے خود اسکیچ کیے ہیں...... یہ آگمینٹڈ ریئلٹی کی ایک مثال ہے صرف اور اسے حقیقت کا روپ تم نے دینا ہے، بولو دو گی......؟'' ہاجرہ کے پلے صاحب کی ایک بھی بات نہیں پڑی تھی، وہ جیسے کسی طلسماتی دنیا میں داخل ہو گئی تھی۔ جہاں جادو کی چھڑی کے زور پر وہ کوئی بھی، کچھ بھی بن سکتی تھی۔ شہزادی بھی ملکہ بھی اور سنڈریلا بھی۔

''دیکھو ہاجرہ...... میں نے اتنے مہینوں میں تمہارے اندر ایک مضبوط، باہمت عورت کو دریافت کیا ہے۔ تم باقی عورتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور محنتی ہو، تمہارے اندر بہت سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن ہر کوئی ان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا، تمہارے پاس یہ موقع خود چل کر آ رہا ہے۔ اس ایک کام کے ذریعے تم نہ صرف خود کو بلکہ اس دنیا کی بہت سی جہتوں کو کھوج سکو گی......'' دانیال کسی بھی حال میں اسے قائل کر لینا چاہتا تھا۔

''لل لیکن...م...م میں صاحب میں......'' ہاجرہ کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی اور بے یقینی بھی۔

''دیکھو ہاجرہ میں جانتا ہوں تمہارا ایک خواب ہے۔'' اب دانیال نے ہاجرہ کو وہاں ضرب لگانا شروع کی جہاں اس کی زمین نرم تھی۔ ''ایک گھر کی تعمیر جس میں تمہاری بہن جو شوہر اور دوسرے لوگوں کے ظلم و ستم سہہ رہی ہے...... سہولت سے رہ سکے، ایسا ہی ہے ناں؟'' اس نے ہاجرہ سے تائید چاہی جو اس نے تیزی سے سر ہلا کر فوراً دے بھی دی۔

''بس تو پھر دوسری سوچ سوچو ہی مت......'' دانیال نے سر جھٹکا۔ ''ایک اشتہار میں کام کرنے کے تمہیں اتنے پیسے مل جائیں گے جتنے تم نے کبھی اکٹھے دیکھے بھی نہیں ہوں گے۔''

ہاجرہ نے ایک بار پھر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا یقین کرو ہاجرہ......'' دانیال نے کہا۔ ''اچھا

خوب صورت کون!

☆ خوب صورت ہے وہ دل جو کسی کے درد کو سمجھے۔

☆ خوب صورت ہے وہ احساس جو کسی کے دکھ کا مداوا ہے۔

☆ خوب صورت ہیں وہ ہاتھ جو کسی کو مشکل وقت میں تھام لیں۔

☆ خوب صورت ہے وہ سوچ جو کسی کے لیے اچھا سوچے......اور......

☆ خوب صورت ہے وہ انسان جسے اللہ نے یہ تمام خوب صورتیاں عطا کی ہیں۔

از: مہرین ضیا بنگش، کیماڑی

دعا

ایک دوسرے کو دعاؤں میں یاد رکھا کرو ہو سکتا ہے کسی کا بہت بڑا کام تمہاری چھوٹی سی دعا کا محتاج ہو۔

از: صائمہ سجاد، کوہاٹ

pklibrary.com

چلو یہ بتاؤ اتنے عرصے میں تمہیں میرے بارے میں کیا پتا چلا..... میں کیسا انسان ہوں، کیا ایسا جو تمہارا برا چاہ سکتا ہے یا ایسا جو تمہارے لیے پازیٹو سوچتا ہے۔''

''پازیٹو مطلب.....؟'' ہاجرہ نے ناسمجھی سے دیکھا۔

''پازیٹو مطلب اچھا.....'' دانیال نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور ہاجرہ نے ایک بار پھر سر ہلایا۔

''بس پھر مجھ پر یقین رکھو..... میں تمہارے لیے پازیٹو یعنی اچھا ہی سوچتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو ایکسپوز کرو..... اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ..... میں ایک ڈفرنٹ مطلب مختلف ہاجرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اور ہاجرہ، دانیال کی ان ساری باتوں میں شاید کچھ اور نہیں سن رہی تھی سوائے..... ''میں چاہتا ہوں، میرا یقین کرو، میں جانتا ہوں، میں نے تمہارے اندر دریافت کیا ہے..... میں، میں، میں.....'' دانیال سمجھ رہا تھا کہ اس نے ہاجرہ کی کمزوری یعنی انھی کے مستقبل پر ضرب لگائی تھی اور ہاجرہ مان گئی تھی..... اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے ہاجرہ کے اندر سوئی ہوئی ایک ناآسودہ عورت کے دل پر وہ ضرب لگائی تھی جو کوئی مرد ہی لگا سکتا تھا۔

ہاجرہ کے اندر سوئی ہوئی وہ عورت جو بیوگی کی سفید چادر اوڑھے، خود کو زندگی کے ہر اچھے اور خوش کُن احساس سے عاق کر چکی تھی' دانیال کی میں، میں سے بھرپور تقریر کے نتیجے میں جاگ گئی تھی۔ اس شام کے بعد ہاجرہ نے اپنے اندر ایک نئی توانائی پھوٹتی محسوس کی تھی۔ اپنے دل کے نہاں خانوں میں سوئے وہ خواب جو اس کی آنکھوں نے دیکھنے سے پہلے ہی جھٹک رکھے تھے، نئے سرے سے آنکھوں میں آبسے تھے۔

اشتہار بنانا..... اشتہار میں کام کرنا، اشتہار بن جانا..... یہ سب کیا تھا ہاجرہ کو اس پورے عمل کے دوران کچھ بھی پتا نہیں چلا تھا۔ وہ تو بس آنکھوں میں بسے کسی نئے سپنے میں جینے لگی تھی۔ جہاں اس کا صاحب تھا اور وہ تھی۔ صاحب جو صبح اس کے کام پر پہنچنے سے پہلے جاگا ملتا تھا، وہ کچن میں کھڑی کام میں مصروف ہوتی تو کتنی دیر اس کے سامنے کچن اسٹول پر بیٹھا اسے کام کی جزئیات سمجھاتا رہتا تھا۔ اسے کرنا کیا تھا، پہننا، اوڑھنا کیا تھا، اٹھنا بیٹھنا کیسے تھا۔ صاحب کے ساتھ کام کرنے والے عملے سے کیسا برتاؤ رکھنا تھا۔ وہ اس کام کے لیے کہاں، کہاں جانے والے تھے۔ صاحب بولتا جاتا تھا اور ہاجرہ صرف سنتی تھی۔ اس کی تمام حسیات صاحب کی طرف متوجہ ہوتی تھیں، اس کی اپنے پاس موجودگی کو محسوس کرتی تھیں، احساس تھا تو صرف ایک..... ''وہ تھا اور اس کے ساتھ وہ خود تھی۔'' اور معجزہ تھا تو صرف ایک کہ ہاجرہ سب ویسے ہی سمجھ رہی تھی جیسے صاحب اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

"how intelligent you see"

کبھی، کبھی تو اپنی ہدایات پر ہاجرہ کا ردِعمل صاحب کو بھی حیران کر جاتا تھا اور وہ اپنے ساتھ کام پر آئی شنیلہ کو جتانے کے انداز میں کہتا تھا۔

''تم نے دیکھا یہ کتنی ذہین ہے، اتنی ہی جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔''

صاحب نے ہاجرہ کو وہ اشتہار کروایا اور جیسا اس نے چاہا ہاجرہ نے ویسا ہی کمال مہارت سے کیا تھا۔ صاحب کے خیال کو حقیقت میں ڈھلے دیکھ لینے کے بعد اس کی اجنبی کے اپنے ناقد بھی خاموش تھے۔ صاحب کا کام ان سب کی توقع سے بڑھ کر کامیاب ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

اور پھر تو ہاجرہ کو خود اپنا آپ اس گھر میں اجنبی کبھی لگا ہی نہیں..... صاحب کے ساتھ بے تکلفی تو اشتہار بننے کے دنوں ہی میں بڑھ گئی تھی۔ شوٹ کے لیے صاحب اسے خود رہائشی فلیٹوں والی بلڈنگ کی طرف آنے والی ذیلی سڑک سے پک کرتا تھا۔ بلڈنگ سے اکٹھے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیے جانے پر طرح، طرح کی باتوں کی زد میں آنا صاحب کو پسند تھا نہ ہی ہاجرہ کو گوارا تھا۔ اس جگہ سے اٹھا کر صاحب کبھی اسے اپنے دفتر، کبھی اسٹوڈیو اور کبھی شوٹ لوکیشنز پر لے جاتا۔ ہاجرہ کے ماپ کے کئی لباس بن گئے تھے.....

اس اشتہار کے لیے ہاجرہ کو کوئی خاص گیٹ اپ نہیں دیا گیا تھا وہ جیسی تھی انہیں اسے ویسی ہی دکھانا تھا، ہاں ذرا سا نو میک اپ لک، ہاتھ پیروں کی صفائی، ناخنوں کی رگڑائی، بالوں کا انداز۔۔ وغیرہ..... ہاجرہ پر سب گزرتا رہا اور وہ جیسے کسی ٹرانس میں گم اپنے لیے توجہ اور خیال کی اس پھوار میں بھیگ، بھیگ جاتی رہی۔

''یوں نہیں، کولھے پر یوں ہاتھ رکھنا ہے۔'' کبھی کبھار صاحب بے تکلفی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہونے، چلنے یا بیٹھنے کے انداز کی تصحیح کرتا، کبھی کندھے سے پکڑ کر مخصوص زاویے سے جھکاؤ دیتا، کبھی ذرا سے اِدھر اُدھر ہوتے بالوں کو سنوارنے کا فرض بھی ادا کر دیتا..... اور ہاجرہ کا دل اس لمس پر اس توجہ پر کوئی نیا خواب بُننے لگتا۔

اسی دوران گھر میں اور کبھی باہر باتوں، باتوں میں ہاجرہ بھی صاحب کے ساتھ اپنا دل کھول لیتی۔ اماں کے مرنے سے لے کر ابا کے مصائب، غربت، جمال دین سے بیاہ، جمال دین کے گزر جانے سے لے کر ابے کے انتقال اور بھینس کی موت، ننھی کا بیاہ، واپس چک جانے کا سبب..... اس کی کہانی طویل ہی کتنی تھی، اس میں گھماؤ پھراؤ ہی کتنے تھے۔ سیدھی، سیدھی چلتی کہانی اس کے آج پر ختم ہو جاتی مگر وہ صاحب کا تحمل اور دلچسپی سے سننے کے دوران ''واہ زبردست..... افوہ..... سیڈ، کمال، شاباش۔'' جیسے مختصر تبصرے اس کی کہانی کے مرکزی نقاط بن جاتے۔

وہ بھول جاتی کہ وہ خود کون تھی اور صاحب کون تھا۔ اس نے صاحب سے متعلق باتوں اور چیزوں سے محبت کرنے کا فن سیکھ لیا تھا اور کسی کو بھی اس قصے کا ہمراز نہیں بنایا تھا۔ وہ شہناز تھی جو اس کے بدلے معمول پر چونکتی تھی یا پھر فضل احمد کی اماں ماسی سکینہ جو کبھی، کبھی اسے دیکھ کر اپنے ہمہ وقت ہلتے پوپلے منہ سے دہائی دے ڈالتی تھی۔

''آئے ہائے حاضرہ (ہاجرہ) تیرے اوپر کسی کے تاویج (تعویذ) کا اثر تو نہ ہو گیا ہے، کملی پیر رکھتی کدھر اور ہے پڑے کہیں اور ہے۔'' اب ہاجرہ کسی کو کیا بتاتی کہ اس کے ساتھ کیا واردات ہو گئی ہے۔ وہ کس کے خیالوں میں گم رہتی ہے اور کس کا خیال ہمہ وقت اس کے سینے میں انی کی طرح گڑا رہتا ہے۔

''شیل میری بہت پرانی دوست ہے۔'' کبھی باتوں، باتوں میں صاحب اسے بتاتا۔ ''اور مجھے بہت عزیز بھی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہتا۔ ''ہم دونوں کی آپس میں انڈر اسٹینڈنگ اور بونڈنگ بہت اسٹرانگ ہے۔ کبھی، کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم جنم، جنم کے ساتھی ہوں.....'' اور یہ ہی ایک تصور تھا جو ہاجرہ کے سینے میں انی کی طرح گڑا رہتا تھا۔ شیل یعنی شنیلہ جس کو پہلے دن دیکھتے ہی اس کا دل اور سے اور ہو گیا تھا۔ رفتہ، رفتہ وہ رقیب روسیاہ بن گئی تھی۔ اس کے اور صاحب کے درمیان فصیل کی طرح کھڑی شنیلہ ستار..... ہاجرہ کا بس نہیں چلتا تھا کوئی منتر، کوئی شبد ایسا اس کے ہاتھ لگے جس کا ورد کر کے پھونکنے سے شنیلہ ستار جیسی ہستی ہمیشہ کے لیے صاحب کی زندگی سے نکل جائے۔ وہ ان دونوں کو ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے، پیتے کام کرتے دیکھتی اور بظاہر بے نیاز اور پُرسکون نظر آتے ہوئے اپنا کام نمٹائے جاتی جبکہ اس کے اندر عجیب سی آگ لگی ہوتی جو پل، پل اس کے دل کو سلگاتی اور اس کا حلق دھویں سے بھر جاتا تھا۔ ہفتہ واری تعطیل کی شام تو شنیلہ ضرور ہی صاحب کے گھر پر موجود ہوتی کبھی کبھار وہ دونوں اور کبھی چند اور دوست اکٹھے ہوتے۔ کھانا کبھی ہاجرہ سے بنوا کر اور کبھی باہر سے منگوا کر کھایا جاتا..... چائے، کافی کے کئی، کئی دور چلتے اور پھر شنیلہ اور صاحب مل کر ستار اور طبلے پر ہم نوائی کرتے ہوئے محفل جما دیتے۔ ایسے وقتوں میں کبھی کبھار زبردستی اور کبھی ہاجرہ کے بلانے پر شہناز بھی کام کے بہانے آ بیٹھتی۔

''لے کے پہلا، پہلا پیار، بھر کے آنکھوں میں خمار
جادو نگری سے آیا ہے کوئی جادوگر''

کچن میں کام کرتے ہوئے شہناز مٹک، مٹک کر

لاؤنج سے آتی آوازوں کی لے پر گنگناتی پھرتی۔

''اپنی میم صاب سے جا کے بول نور جی ہاں (جہاں) کا گیت گائے کوئی۔'' وہ کہتی اور خود ہی گنگنانے لگتی۔

''جواں ہے محبت حسین ہے جمانہ (زمانہ)
لوٹایا ہے دل نے خوشی کا خزانہ (خزانہ)
وہ مہکتے ہوئے گاتی پھرتی.....

''دیکھ کر کسی چیز کو ٹکر مار کر گراتی ابھی۔'' ہاجرہ اپنے سلگتے دل کو سنبھالتی جھنجلا کر کہتی۔

''تو سڑی رہ چری.....'' شہناز قہقہہ لگا کر ہنستی۔

''میرا صاحب اور میم صاب اتنے پیارے، جوان اور مہربان ہوتے تو میں تو گاتی ناچتی پھرتی۔''

''نہیں ہے وہ میم صاب.....'' ہاجرہ چڑ کر کہتی۔

''دوست ہے صرف صاحب کی، ساتھ کام کرتے ہیں دونوں.....''

''اچھا.....'' شہناز اور بھی زور سے ہنستی.....

''جو کوئی بھی ہے..... تجھے کیوں آگ لگے رہی ری۔''

''مجھے کیوں آگ لگے گی، میں تو تیری حرکتوں سے گھبرا رہی ہوں، صاحب لوگ ایسی مستیاں پسند نہیں کرتے.....'' ہاجرہ سر جھٹک کر کہتی۔

''لے تیرا صاحب تو دل کا اتنا اچھا ہے..... مہربان ہے، قدر دان ہے، تیرے ساتھ، ساتھ مجھے بھی خرچہ پانی دے دیتا ہے۔'' شہناز اسے کہنی سے ٹہوکا مار کر کہتی اور ہاجرہ سے اس بات کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ صاحب کے مہربان اور دل کے اچھا ہونے میں تو کوئی شک باقی نہیں تھا۔ جیسے اس نے ہاجرہ کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھایا تھا اس کا حال تو صرف وہی جانتی تھی۔ ہاجرہ پر شوٹ کیا ہوا اشتہار ابھی منظرِ عام پر تو نہیں آیا تھا لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی صاحب نے خود ہاجرہ کا بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں رکھوانے کے بعد اسے بینک کی کاپی چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ پکڑایا تھا۔

''اسے سنبھال کر رکھو ہاجرہ اور اپنی بچت کے پیسے اسی اکاؤنٹ میں ڈال لو..... ابھی تمہارا ایڈ چلنے کا انتظار ہے مجھے اس کے بعد خدا نے چاہا تو.....؟'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر رک گیا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن ہوئی تھی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''خدا نے چاہا تو.....؟'' ہاجرہ نے چونک کر پوچھا تھا۔

''ہم..... م.....'' وہ اسکرین کی طرف متوجہ بے دھیانی سے بولا تھا۔ ''ایک کپ چائے مل سکتی ہے ہاجرہ.....'' اس نے شاید ہاجرہ کو وہاں سے ٹلنے کا اشارہ کیا تھا اور ہاجرہ ٹل بھی گئی تھی اگرچہ اس کے دل میں ''خدا نے چاہا تو.....'' سے شروع ہونے والے جملے کے مکمل ہونے کا ارمان ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ لیکن صاحب اس پر مہربان تھا، اس کے لیے نرم دل رکھتا تھا اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا..... اب تو وہ صاحب کی کچرے میں پھینکی کچھ پرانی، استعمال شدہ، ٹوٹی پھوٹی چیزیں چن کر صاف کر کے بڑی عقیدت کے ساتھ جمع کر کے کچن کیبنٹ میں سنبھال دیا کرتی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ کچن کے فرش پر بیٹھ کر ان چیزوں کو نکال کر کتنی دیر دیکھتی رہتی۔ وہ چیزیں جن میں پرفیوم کی خالی شیشی، کسی مہنگی گاڑی کا چھوٹا سا ٹوٹا ہوا ماڈل، ایک پرانا ماؤتھ آرگن اور موبائل فون کا خراب ہو چکا چارجر شامل تھا، اسے بہت عزیز تھیں۔ وہ صاحب کی ذاتی چیزیں تھیں اس کے استعمال میں رہ چکی تھیں اس کے ہاتھوں نے انہیں نہ جانے کتنی بار چھوا ہوگا۔ وہ انہیں اپنے سامنے پھیلائے کتنے ہی پل انہیں دیکھتی رہتی تھی۔ اور ابھی تو وہ صاحب کی محبت اور اس سے عقیدت میں اتنا ہی کر سکتی تھی اگر ''خدا نے چاہا تو'' والا جملہ مکمل ہو جاتا تو خدا جانے کتنے چراغ اس کے اردگرد ... جگمگا اٹھے ہوتے وہ اس جملے کے مکمل ہونے والے پل کے انتظار میں تھی۔

☆☆☆

لیکن وہ اتنے دنوں کے خواب آگیں دنوں کے بعد چڑھا ایک مختلف دن تھا۔ اس روز ہاجرہ اپنے کام

پر پہنچ کر صاحب کے لیے صبح کا ناشتا بنانے میں مصروف تھی اور صاحب غالباً غسل کے بعد دفتر کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اطلاعی گھنٹی چیخ اٹھی تھی۔ ہاجرہ کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی صاحب نے خود آ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر داخل ہونے والی رانی باجی تھیں جس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

''یہ کیا ہے ڈینی.....؟'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ میں پکڑا کوئی انگریزی رسالہ صاحب کے سامنے جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''اندر تو آئیں، لاؤنج میں چل کر بات کرتے ہیں.....'' صاحب یقیناً رانی باجی کے غصے کا سبب جان گیا تھا جب ہی سوال کرنے کے بجائے نرمی سے بولا تھا۔

''اندر چل کے کیا بات کروں..... بات تو ایک ہی ہے اور بہت واضح بھی ہے۔'' رانی باجی نے کچن کے دروازے میں کھڑی ہاجرہ پر ایک زہر آلود نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''ڈونٹ کری ایٹ اے سین ہیئر پلیز..... اندر چلیں.....'' صاحب نے بھی ایک نظر ہاجرہ پر ڈالی تھی اور رانی باجی کو ساتھ لیے لاؤنج میں چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد رانی باجی کے چیخنے کی آواز آنا شروع ہوئی۔

''گھر میں کام کرنے والی ایک معمولی ماسی..... ڈینی مجھے یقین نہیں ہو رہا تمہارے اسٹینڈرڈز اتنے گر جائیں گے..... تم نے ایک کالی، بدشکل، بھدی ماسی کو اٹھا کر اپنی ماڈل بنالیا۔ pity on you'' وہ اونچی آواز میں چلا رہی تھی۔ کچن کے دروازے میں کھڑی ہاجرہ کی سمجھ میں اب ماجرا آ گیا تھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور چھوٹی کچن ٹیبل سے جا ٹکرائی تھی۔ ٹیبل پر رکھے گلاس اس کی ٹکر کھا کر لڑھکے ہاجرہ نے ہاتھ مار کر دونوں گلاسوں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''don,t you utter a single nasty word about her please!''

''میں تو کہوں گی، کیوں نہ کہوں..... غریب بستی کی رہنے والی ایک اجڈ، گنوار، بدصورت، جاہل ماسی..... اس سے تو میں پوچھتی ہوں، اس نے تمہیں شیشے میں اتار کیسے لیا..... چلتر، گھٹیا عورت، اسے میں اس دن کے لیے یہاں رکھوا کر گئی تھی کیا.....؟'' رانی باجی نے کچن کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے تھے اور ہاجرہ کے ہاتھ سے دونوں گلاس نکل کر فرش پر ڈھیر ہو گئے تھے۔

''توڑ دیا..... کچھ توڑ دیا اس نے۔'' رانی باجی، دانیال کی گرفت سے بازو چھڑاتی کچن کی طرف لپکی تھی۔ اتنے قیمتی گلاس توڑ دیے..... ڈینی یہ ہے تمہاری چھوٹ اور گھٹیا لوگوں کو سر پر چڑھا لینے کا نتیجہ..... اللہ جانے اور کتنے نقصان کر چکی ہوگی اب تک..... یہ نقصان اور باقی بھی میں چیک کر لیتی ہوں تمہیں ہی بھرنے ہوں گے۔ تنخواہ میں سے کٹیں گے تمہاری یہ سارے پیسے۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اسٹاپ اٹ رانی باجی..... پلیز اسٹاپ اٹ ناؤ.....'' صاحب نے ایک مرتبہ پھر رانی باجی کا بازو پکڑ لیا تھا۔

''میں رکوں گی نہ ہی خاموش رہوں گی۔'' انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنا بازو چھڑایا تھا۔ ''اس کو ابھی کے ابھی نوکری سے نکالتی ہوں میں۔''

''آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔'' صاحب نے سختی سے کہا۔

''ارے واہ، کیسے نہیں کروں گی۔'' رانی باجی نے ہاجرہ کو کندھے سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے رکھا تھا ناں..... میں ہی اسے نکالوں گی، چلو نکلو میڈم..... ابھی کے ابھی یہاں سے چھٹی کرو..... اللہ جانے اور کتنے نقصان کیے بیٹھی ہوگی..... کیا کچھ چرا کے گئی ہوگی..... غضب خدا کا نالی کا کیڑا ماڈل بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ ابھی نکالو اسے ڈینی ابھی.....''

''میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا رانی باجی، ہاجرہ نے آج تک اس گھر سے نہ تو کچھ چرایا ہے نہ ہی اس سے پہلے اس کے ہاتھوں کوئی نقصان ہوا ہے۔ I am perfectly ok with her'' اب کے

صاحب نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی رہی ماڈلنگ کی بات تو وہ میرا آئیڈیا تھا ہاجرہ کا نہیں...... پھر الزام اس کے سر پر کیوں ڈال رہی ہیں۔''

''اسی بات کا تو رونا ہے۔ اس گھٹیا عورت کے ساتھ رہتے، رہتے! تمہارا اسٹینڈرڈ اتنا گر چکا ہے کہ تم اسے اپنی ماڈل بنا بیٹھے۔'' رانی باجی صاحب کے دوٹوک انداز پر کچھ نرم پڑی۔

''وہ میرے کام کا حصہ ہے اور کام میں کچھ بھی کمپرومائز .... کرنا پڑے آپ جانتی ہیں میں کرسکتا ہوں......'' صاحب نے رانی باجی کو کچن سے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

''ہاجرہ تم پلیز اس ٹریش کو صاف کرلو...... اور ہاں ایزی ہوجاؤ۔ ڈونٹ پینک، میں ہوں ناں یہیں...... میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی یہاں سے نکال نہیں سکتا۔'' صاحب نے کچن سے باہر نکلتے، نکلتے رک کر ہاجرہ کو تسلی دی تھی۔ اور ہاجرہ نے اس دن بھی گھر میں ہونے والی باقی ہر بات کو بھلا کر ''میں ہوں ناں یہیں، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی یہاں سے نکال نہیں سکتا۔'' والے الفاظ سنے تھے۔ اور اسے لگا اس روز ''اگر خدا نے چاہا'' والا جملہ بھی ان الفاظ نے مکمل کردیا تھا۔ وہ صاحب کی امان میں محفوظ تھی۔ اللہ نے صاحب کو اس کا رکھوالا بنادیا تھا۔ اس کا دل جھوم، جھوم جانے لگا تھا۔

اس کے بعد صاحب اور رانی باجی کے درمیان مزید کیا گفتگو ہوئی ہاجرہ نہیں جانتی تھی۔ صاحب کے ناشتا کرلینے کے بعد وہ دونوں اکٹھے گھر سے نکلے تھے اور ہاجرہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس نے ناشتے کے برتن اٹھانے کے لیے لاؤنج کا رخ کیا تو اسے سینٹر ٹیبل پر پھینکا وہ انگریزی پرچہ بھی نظر آگیا جو رانی باجی اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس نے جھپٹ کر وہ پرچہ اٹھایا جس کے سرورق پر خود اس کی تصویر جگمگا رہی تھی یہ اسی برینڈ کی بک لیٹ تھی جس کے گرمیوں اور بہار کے والیم ون کے لیے دانیال نے ہاجرہ سے ماڈلنگ کرائی تھی۔ ہاجرہ اس پرچے کے صفحے پلٹتی گئی ایک کے بعد دوسرے ڈیزائن کا لباس پہنے ہاجرہ دیواروں، پتھروں، درختوں، پرانی عمارتوں کے آس پاس کھڑی...... بیٹھی، لیٹی نظر آرہی تھی...... اسی دم اسے اپنا فون بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر کچن میں واپس آئی۔ وہ شاہانہ باجی کی کال تھی۔

''پتا ہے کیا ہاجرہ...... ابھی، ابھی میں نے ٹی وی پر لان کی ایک برینڈ کا اشتہار دیکھا ہے۔ اس میں جو لڑکی ہے ناں قسم سے اس کی شکل تم سے اتنی ملتی ہے کہ کیا بتاؤں...... یوں جانو جیسے تمہیں چھپاؤ، اسے ڈھونڈ لو......'' شاہانہ کھنکھناتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''سچی بیگم صاحبہ......'' ہاجرہ نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''قسم سے ہاجرہ...... اور یقین جانو اسے دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ ہم نے کبھی غور نہیں کیا...... تمہارا چہرہ تو اتنا فوٹو جینک ہے، پرفیکٹ ماڈل میٹریل ہو تم...... ذرا سی محنت تم پر ہوجائے تو بس سمجھو اس والی ماڈل کو بھی پیچھے چھوڑ جاؤ۔''

''ارے نہ بابا نہ بیگم صاحبہ...... کہاں میں اور کہاں یہ اشتہاروں میں کام کرنے والی لڑکیاں...... مجھ غریب نے تو کبھی ڈھنگ سے بالوں میں کنگھا بھی نہیں پھیرا......'' ہاجرہ صاف انجان بن گئی۔

''جانتی ہوں، جانتی ہوں......'' شاہانہ نے ہنس کر کہا۔ ''اور سناؤ کہاں ہو، کیا کررہی ہو پتا ہے دو مہینے کے بعد ہماری واپسی ہے ان شاء اللہ...... واپس آکر میں تمہیں بلاؤں گی تو منع تو نہیں کروں گی ناں......؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''دو مہینے کے بعد......'' ہاجرہ کی فون پر گرفت ڈھیلی پڑی۔ ''اگر خدا نے چاہا تو......'' ایک جملہ اس کے کان سے ٹکرایا۔ ''دو مہینے بعد کون جانے بیگم صاحبہ کون کہاں ہوگا'' وہ دل سے ہنسی تھی۔ ''پھر بھی دیکھتے ہیں۔'' اس نے کہا تھا اور شاہانہ کی کال بند ہونے کے بعد ننھی کی سوتن کے بیٹے کا نمبر ملالیا تھا۔ جو کبھی کبھار اس کی کال جانے پر ننھی سے اس کی بات کرادیا کرتا تھا۔

''ہاں ننھی...... کیسی ہے تو......؟'' ننھی کی آواز

سننے پراس نے کھنکتی آواز میں کہا تھا۔

"فضل احمد، پیراں دتے کی شادی دیکھنے پیچھے چک جارہا ہے۔ اگلے ہفتے، اس کے ہاتھ میں تجھے پہننے کے جوڑے اور عطر کریم کی شیشیاں بھیجوں گی۔" وہ کہہ رہی تھی اور اس کی نظروں کے سامنے اشتہار کے سلسلے میں ملنے والے کپڑوں کا ڈھیر اور بناؤ سنگار کی چیزیں ناچ رہی تھیں جو اس نے اپنے بکس میں چھپا رکھی تھیں۔ "خیر سے تیرا اور میرا ناپ ایک سا ہی ہے ناں تو عمر میں مجھ سے چھوٹی ہے لیکن قد بت تیرا میرے جیسا ہی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں بس تو سمجھ اب ہمارے دن پھرنے ہی والے ہیں اور جیسے ہی اِدھر میرے دن پھرے، میں آکر تجھے چاچے معراج کی قید سے پکا چھڑ والوں گی...... اور اس کے بعد ہم اِدھر ہی آکر رہیں گے اپنے گھر میں...... ہاں، ہاں اِدھر اپنا ٹھکانا بھی بن جائے گا تو دیکھتی جا...... نہ بابا ناں میں چک واپس آنے والی نہیں اب...... میرا اُدھر کیا رکھا ہے تیرے سوا...... نہ ابا، ہا نہ اماں...... اور تو اور ابے کا مکان بھی گیا۔ میں کس کے لیے پیچھے واپس جاؤں گی۔ یوں بھی مجھے اِدھر بڑے شہر اور روشنیوں میں رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ چک کی تو بھول کر بھی یاد نہ آئے ہے مجھے...... بس تو تیاری رکھ تیری غلامی کے دن بھی تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ چاچے معراج کے مرنے کا انتظار نہیں کریں گے اب ہم اس سے پہلے ہی اس سے تیری جان چھڑالوں گی میں......" ہاجرہ کی آنکھوں میں بسے سپنے اس سے نہ جانے، کیا، کیا کہلوائے چلے جارہے تھے۔

☆☆☆

"آئی ایم رئیلی سوری ہاجرہ......" اس شام صاحب اس کی واپسی سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا تھا...... "آج صبح جو ہوا وہ سب جو رانی باجی نے بولا اس کے لیے میں تم سے معذرت کرتا ہوں......" وہ کہہ رہا تھا۔ "رانی باجی نے برا کیا بہت برا کیا...... خدا جانے ہمارے لوگوں کے دلوں میں ابھی تک ایک دوسرے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

پتا

ادارے کو 1500 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
750 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے لیے اتنا تعصب کیوں بھرا ہوا ہے۔ کسی کو بھی لیٹ ڈاؤن کرتے ہوئے ذرا سا بھی نہیں سوچتے کہ انسان تو سب برابر ہیں تو جب انسان برابر ہیں تو ان کے لیے آگے بڑھنے کے مواقع بھی تو برابر ہونے چاہئیں ناں.....'' ہاجرہ بڑی، بڑی آنکھیں کھولے صاحب کو سن رہی تھی۔

''اب دیکھو ناں میں نے تمہیں ایڈ میں چانس دیا تو کیا برا کیا..... مجھے تمہارے اندر وہ ٹیلنٹ نظر آیا تھا، تمہاری شخصیت میں وہ کیرزما، وہ ساری کوالٹیز تھیں جن کو میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں روایتی ٹرینڈ بدل دینا چاہتا تھا اور دیکھ لو کل شام ایڈ اسکرین پر آیا اور راتوں رات میڈیا انڈسٹری نے اس ایڈ کو کیچ کر لیا۔ جانتی ہو شہر کے سب سے بڑے اور مرکزی بل بورڈ پر جس کا ماہانہ کرایہ ہی تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ ہے۔ تمہارا ایڈ چل رہا ہے۔ وہ ہی کیا ٹریفک سگنلز کے نیچے لگی چھوٹی اسکرینز پر بھی تم ہی نظر آ رہی ہو ہاجرہ..... میں ابھی راستے میں دیکھتا آیا ہوں۔ بھئی تم تو راتوں رات سلیبریٹی بن گئی ہو..... ٹرینڈ سیٹر، فیوچر کی ایک کامیاب ماڈل.....'' وہ نہ جانے کیا، کیا سنا رہا تھا ہاجرہ کے پلے کم ہی کچھ پڑ رہا تھا۔

''دیکھو اس خوشی میں، میں تمہارے لیے اپنے پسندیدہ فلیور کی آئس کریم لایا ہوں..... کھاؤ گی.....؟'' اس نے فریز کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور اس شام صاحب نے خود ہاجرہ کے ساتھ کچن ٹیبل پر بیٹھ کر خود بھی آئس کریم کھائی تھی اور ہاجرہ کو بھی کھلائی تھی۔ ہاجرہ کے لیے صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی ایک خواب تھا جو اس دن تعبیر میں ڈھل گیا تھا۔ وہ قسمت کی کن، کن مہربانیوں کے صدقے جاتی۔

لیکن اسی شام واپسی کے لیے لفٹ سے نکل کر احاطے میں اترتے ہوئے اس نے سیڑھیوں پر بیٹھی شہناز کو دیکھا تھا۔

''تو ابھی تک اِدھر بیٹھی ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''تیری ٹوکری والی باجی تو آج کل مری نہیں گئی ہوئی پھر تو اِدھر کیا کر رہی ہے ابھی تک؟''

''آ ادھر بیٹھ ہاجرہ.....'' خلافِ توقع شہناز نے سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تیرا ہی انتجار (انتظار) کر رہی تھی۔''

''ہاں بول.....؟'' ہاجرہ اس کے قریب سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''کب سے چکر چلائے رہی تو اپنے صاحب سے۔'' شہناز نے اس کے کان کے قریب منہ کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ سچ، سچ بتانے کی ہو رہی ورنہ آج میں اڈی والی جتی پہن کر آئی ہوں قسم اللہ پاک کی لاج نہیں کروں گی تیرا۔''

''کیا کہہ رہی ہے تو.....؟'' ہاجرہ کو جھٹکا سا لگا وہ سرک کر پیچھے ہوئی۔

''سب بتائے گئی مجھے رانی باجی، ہاجرہ.....'' شہناز نے پُریقین انداز میں کہا۔ ''میں تو پہلے ہی سیاہ کالی تھی ہاجرہ تو نے میرے منہ پر اور بھی کالک مل دی ری۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''گارنٹی دی تھی میں نے تیری..... قسم سے بڑھ کر اعتبار تھا مجھے تجھ پر..... ارے یہ قسم کیا ہووے ہے میں تو وجو (وضو) کر کے نام لیوے تھی تیرا..... تو نے میرے ہی منہ پر کالک مل دی ری ستیاناس جائے تیرا.....'' ہاجرہ بے یقینی سے شہناز کو بولتے ہوئے سن رہی تھی۔ اسی دم لفٹ بوائے شہباز دانت نکوستے ہوئے اس کے سامنے سے گزرا تھا۔

''ایسے ہی تو اکیلم اکیلے آدمی کے گھر پر کام کرنے کو تیار نہیں ہوگئی تھی ہاجرہ ماسی شہناز.....'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''دیکھا.....!'' شہناز نے دونوں ہاتھوں سے ہاجرہ کی کمر پیٹ ڈالی۔

''ایک، ایک کو بتا کر گئی ہے رانی باجی..... سب کو رسالے کا ایک، ایک کاگج (کاغذ) بانٹا ہے اس نے۔ تیری فوٹو والے کاگج ساری بلڈنگ میں اِدھر سے اُدھر پھرتے پھر رہے ہیں ناس پیٹی اتنے سالوں کی

کمائی عجت کا ہے واسطے داؤ پر لگادی تو نے۔''
ہاجرہ گم صم بیٹھی شہناز کو سن رہی تھی اور دائیں بائیں، آگے پیچھے اِدھر اُدھر جاتے سب چہرے اسے خود پر ہنستے نظر آرہے تھے یوں جیسے وہ بیچ بازار میں ننگے سر بیٹھی ہو اور جس کے ہاتھ میں جس بھی حجم کا پتھر آیا اس نے اسے کھینچ مارا ہو۔

☆☆☆

''یہ ٹھیک ہے ہاجرہ......'' اگلے روز کام کے لیے پہنچنے پر اس کا سامنا صاحب کے بجائے شمیلہ سے ہوا تھا۔''رانی باجی تمہارے اور دانی کے بارے میں سب کو بہت غلط باتیں سنا کر گئی ہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''دانی کے لیے یہ بہت بڑا لاس ہے ہاجرہ...... وہ کیسا لڑکا ہے تم تو جانتی ہی ہو...... اس کا ٹیسٹ، اس کی چوائسز اس کے اسٹینڈرڈز...... اور اس کی اپنی ہی بہن نے اسے اسکینڈلائز کر دیا۔ وہ بھی تمہارے ساتھ سوچو ذرا...... یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس کے ساتھ۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''He is in total shock اس کے دل اور دماغ پر بہت اثر ہوا ہے۔ اس نے تو اپنی طرف سے اپنے کام کی کری ایٹی ویٹی کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش میں تمہیں ایڈ میں لے لیا تھا اور یقین جانو اس سلسلے میں وہ تمہارے ساتھ بھی اتنا ہی مخلص تھا۔ اسے تمہاری محنت اور اپنی بہن کے لیے پیسہ کمانے کے جنون کا علم تھا، اسی لیے اس نے تمہیں بھی موقع دیا تا کہ تم آگے بڑھ کر اپنے لیے کچھ کر سکو...... بتاؤ بھلا اس نے کیا برا کیا......'' شمیلہ کا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔''رانی باجی کو ذرا سا تو سوچنا چاہیے تھا...... وہ اپنے بھائی کو جانتی نہیں تھیں کیا، اسے گھر پر کام کرنے والی ماسی کے ساتھ ہی اسکینڈلائز کر دیا۔ کچھ تو سوچتیں وہ...... جانتی بھی تھیں کہ میں اور دانی ان دونوں اپنی destination wedding پلان کر رہے ہیں اور اسی سلسلے میں ہمیں ترکی جانا تھا لیکن انہوں نے دانی کو اتنا شاک پہنچایا ہے کہ سب پلان ٹھپ کر کے رکھ دیے ہیں۔''

ہاجرہ نے ہمیشہ کی طرح شمیلہ کی بھی پوری بات نہیں سنی تھی۔ نہ ہی سمجھی تھی۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے صرف ایک ہی جملہ سنائی دیا تھا...... ''اسے گھر پر کام کرنے والی ماسی کے ساتھ ہی اسکینڈلائز کر دیا۔ اس کا ٹیسٹ، اس کی چوائسز اس کے اسٹینڈرڈز اور اس کی اپنی ہی بہن نے اسے اسکینڈلائز کر دیا اور وہ بھی تمہارے ساتھ...... ذرا سوچو یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس کے ساتھ......''

''چھن، چھن، چھن......'' ایک، ایک کر کے ہاجرہ کو کانچ میں تراشے اپنے سپنے ٹوٹتے سنائی دے رہے تھے۔ وہ کون تھی...... گھر پر کام کرنے والی ایک ماسی اور صاحب کون تھا دور آسمان پر سجا ایک ستارہ، اس کے اور صاحب کے درمیان تو کروڑہا کروڑ میلوں کا فاصلہ تھا اور وہ صاحب کی نرم گوئی اور نرم دلی کے چکر میں اس فاصلے کو ہی بھلا بیٹھی تھی۔

''آئی ایم سوری ہاجرہ......'' شمیلہ نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا تھا۔''میں جانتی ہوں کہ ان سب باتوں کی وجہ سے تم بھی کتنی ہرٹ ہوئی ہوگی کتنی اپ سیٹ ہوگی...... لیکن دنیا کے لوگ بہت ظالم ہیں بھئی...... کچھ بھی بول جاتے ہیں۔'' ہاجرہ نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے تھے۔

''اور صاحب......'' اس نے وحشت ناک نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔

''اپنے کمرے میں بند ہے۔ میں نے بتایا ناں اسے بہت سخت شاک لگا ہے۔ شمیلہ نے نظر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھا تھا جو ستے ہوئے چہرے کے ساتھ لٹے پٹے انداز میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''ڈونٹ وری ہاجرہ......'' وہ ہاجرہ کا یہ انداز دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔''لوگوں کو جب اس پوری بات میں کوئی سچائی نظر نہیں آئے گی تو وہ بھول جائیں گے۔ ایسے گوسپس چند روزہ ہوتے ہیں بس...... ہاں لیکن تمہارے لیے ذرا مشکل ہو جائے گی۔ ایک دفعہ جب

ایسی باتیں نکل جائیں تو تمہارے طبقے کے لوگوں کو کام ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہے لیکن یو ڈونٹ وری..... اللہ ہے ناں.....'' وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''صاحب سے..... صاحب سے ملنا ہے مجھے۔'' ہاجرہ نے بمشکل حلق سے الفاظ نکالے تھے۔

''ہاں مل لینا..... لیکن ابھی شاید وہ تم سے بات نہ کر پائے..... ایسا کرو تم کل یا پرسوں آ جانا.....'' شفیلہ نے اسے اس روز یوں ہی واپس چلے جانے کا اذن دیا تھا۔ اور ہاجرہ کا دل چاہ رہا تھا کہے۔ ''تم کون ہوتی ہو مجھے یوں چلے جانے کا کہنے والی..... جب تک صاحب خود نہیں کہے گا میں جانے والی نہیں.....'' لیکن اس وقت شفیلہ اس گھر میں سب کچھ تھی۔ وہ اس کا کہا ٹال نہیں سکتی تھی اسی لیے دبے قدموں واپس چلی آئی۔ بلڈنگ میں موجود لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی، چھپتی چھپاتی.....

☆☆☆

دو دن بعد اسے اپنے فون پر صاحب کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے فلیٹ پر بلا رہا تھا۔

''دیکھا..... میں نے کہا تھا ناں صاحب میرے ساتھ ایسا کر ہی نہیں سکتا کہ بنا بات کیے مجھے گھر سے چلے جانے کا بول دے..... یہ تو وہ شفیلہ چڑیل.....'' وہ دانت پیستی اٹھی تھی۔

''میں یہ فلیٹ چھوڑ رہا ہوں ہاجرہ.....'' لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا صاحب اس سے مخاطب تھا۔ ''تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہارا حساب چکا دوں.....''

''مگر کیوں صاحب.....؟'' ہاجرہ نے کہنا چاہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کہنے سننے کا وقت نکل چکا تھا۔ کمرے میں جا بجا ڈبوں میں پیک کیا سامان رکھا تھا۔ بسا بسایا گھر پیک ہو کر ڈبوں میں سمٹ چکا تھا۔

''ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی غلط نہیں تھا..... لیکن یہ دنیا۔'' اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری تھی۔ ''اسے دوسروں کو غلط ثابت کرنے میں دوسروں کو گندا کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ یہ جہاں ایک مرد اور ایک عورت کو بنا کسی رشتے میں بندھے اکٹھے اٹھتا بیٹھتا دیکھ لے، اس کے منہ سے غلاظت ابلنے لگتی ہے۔ خدا گواہ ہے ہاجرہ میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے۔ اتنے عرصے میں لمحہ بھر کے لیے تمہارے بارے میں میرے دل میں کوئی غلط خیال نہیں آیا۔ اس لیے کہ خود تم بھی صاف دل، صاف نیت ہو..... کام سے کام رکھنے والی..... بے ضرر، بے نیاز عورت..... میں واقعی تمہارا بہت احترام کرتا ہوں ہاجرہ.....''

''جب ہم جانتے ہیں کہ کچھ بھی غلط نہیں تھا صاحب تو آپ یہاں سے جا کیوں رہے ہیں؟'' ہاجرہ نے پہلی مکمل بات کی تھی۔

''کیونکہ میں ان رویوں کو اور اس گفتگو کو اسٹینڈ نہیں کر سکتا ہاجرہ..... مجھے صاف لوگوں، خالص اور صاف باتوں اور ستھرے ماحول سے پیار ہے۔ جب سے یہ سب سنا ہے خود سے گھن آنے لگی ہے۔ اسی لیے یہاں سے جا رہا ہوں.....'' ہاجرہ کے دل نے ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بند کر دیا تھا۔

''یہ تمہارا حساب جو میرے خیال میں بنتا ہے، سکیورٹی کی رقم اور ایڈوانس کے باقی واجبات ہیں.....'' اس نے میز پر دھرے ایک لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اچھی طرح گن لو اور اگر کوئی کمی بیشی ہو تو کھلے دل سے بتانا۔''

ہاجرہ نے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھا لیا اور بغیر اسے کھولے، بغیر کچھ گنے واپس مڑ گئی۔

''میں..... اور شیل کل رات کی فلائٹ سے استنبول جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر ہم شادی کر لیں گے، میرا واپس یہاں آنے کا کوئی ارادہ پہلے بھی نہیں تھا اور اب تو بالکل بھی نہیں ہے۔'' اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

''ہاں تمہارے لیے اس سارے میس کے بعد ایک بہت اچھی خبر ہے۔ تمہارا ایڈ دیکھنے کے بعد کچھ اشتہاری کمپنیوں نے میرے ساتھ رابطہ کیا ہے۔ وہ تمہیں اپنے ایڈز میں بطور ماڈل لینا چاہتے ہیں.....

اتفاق سے یہ سب ہی ساؤنڈ اور اسٹیبلشڈ کمپنیاں ہیں۔ میں تمہارا نمبر انہیں دے دوں گا۔ وہ تم سے رابطہ کریں تو کام پکڑ لینا تمہیں صرف تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت ہے۔ تم بہت جلد جگہ بنالوگی۔ اس کام میں بہت پیسہ ہے، شہرت ہے نام ہے، ننھی کے لیے جو خواب تم نے دیکھ رکھا ہے اسے پورا کرنے میں یہ سب تمہارے کام آئے گا۔ میں نے کہا تھا ناں کہ..... خدا نے چاہا تو وقت تم پر مہربان ہوجائے گا۔ دیکھ لو وقت تم پر مہربان ہورہا ہے۔''

''نہیں۔'' ہاجرہ نے بے ساختہ سر ہلایا تھا۔ ''نہیں صاحب آپ کسی کو میرا نمبر نہیں دیجیے گا۔'' اس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے وقت کی یہ مہربانی نہیں چاہیے۔''

''لیکن کیوں ہاجرہ..... ننھی کے لیے گھر.....''

اب نہیں صاحب، نہیں بنانا مجھے کوئی گھر گھروندا.....'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''جہاں آپ نہیں، وہاں کام بھی نہیں کرنا۔'' اس نے بمشکل جملہ مکمل کیا..... اور تیز قدموں سے چلتی کچن کی طرف آگئی۔ اور صاحب حیرت سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''ہاں ننھی.....'' لفٹ میں اتفاق سے اس وقت وہ اکیلی تھی اسی لیے ننھی کا نمبر ملالیا..... ''سن..... میں ٹرین کا ٹکٹ کٹا کر تیرے پاس آرہی ہوں..... میرا انتظار رکھیو..... نہیں، نہیں تجھے لینے واسطے نہیں خود بھی اُدھر ہی جابسنے واسطے آرہی میں..... ریلوے اسٹیشن پہنچ کر تجھے بتاتی ہوں میں کس گاڑی سے پہنچ رہی ہوں.....'' فون بند کر کے وہ لفٹ سے باہر نکلی تھی۔ جانتی تھی کہ دو دن پہلے کی طرح سب کی نظریں اسی پر ہوں گی..... سیڑھیوں پر شہناز بیٹھی ملی تھی۔ ہاجرہ نے تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر آگے نکلنا چاہا۔

''چوروں کی طرح کیوں نکل رہی ری ہاجرہ.....'' شہناز کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ ''اور یہ گٹھڑی میں کیا اٹھا رکھا ہے۔ اُدھر صاحب کے گھر سے کچھ اٹھا کر تو نہیں بھاگ رہی..... میری شکل پر اور بھی کالک ملوانے کا ارادہ ہے کیا.....؟'' وہ پوچھ رہی تھی اور ہاجرہ نے بے بسی سے سفید ململ کے ٹکڑے میں لپٹی وہ چیزیں جنہیں سینے سے لگائے صاحب کے گھر سے نکلی تھی۔ کھول کر اپنی نظروں کے سامنے کیں۔

کسی مہکتے پرفیوم کی خالی شیشی، کسی مہنگی گاڑی کا چھوٹا سا ٹوٹا ہوا ماڈل، ایک پرانا خراب ماؤتھ آرگن اور موبائل فون کا خراب ہوا چارجر..... یہ سب چیزیں ہاجرہ کے اجڑے خوابوں کی خاک تھے جسے چوم کر وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی اور اپنے سپنوں کے مزار پر جنہیں بڑی عقیدت سے اسے چڑھاوے کے طور پر اسے عمر بھر چڑھاتے رہنا تھا۔

''بول ری.....'' شہناز نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا..... ''کیا ہے یہ سب.....؟''

''چھوڑ مجھے.....'' اس نے اپنا کندھا شہناز کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔ جانے دے مجھے۔''

''گاڑی پکڑنی ہے۔'' شہناز نے اس کے الفاظ دُہرائے تھے۔ ''کدھر جارہی تو.....؟''

''جس شہر سے ساجن رخصت ہوگیا، اس شہر میں کیا رہنا..... میں اپنے دیس واپس چلی.....'' ہاجرہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ساجن، رخصت، دیس.....'' شہناز ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''بولائے گئی کیا بے''

''ہاں.....'' ہاجرہ نے سر ہلایا..... ''اپنی پاکٹ میں سینے سجا کر میٹھی نیند سوگئی تھی۔ دنیا پاکٹ مار بن کر ہاتھ مارگئی میری پاکٹ پر..... بولا نا تو بنتا ہے ناں شہناز.....'' وہ ہنس کر آگے چل دی تھی اور شہناز وہیں کھڑی حیرت زدہ نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

❁❁❁

بن اپنا چراغ تو آپ

روبینہ شاہین

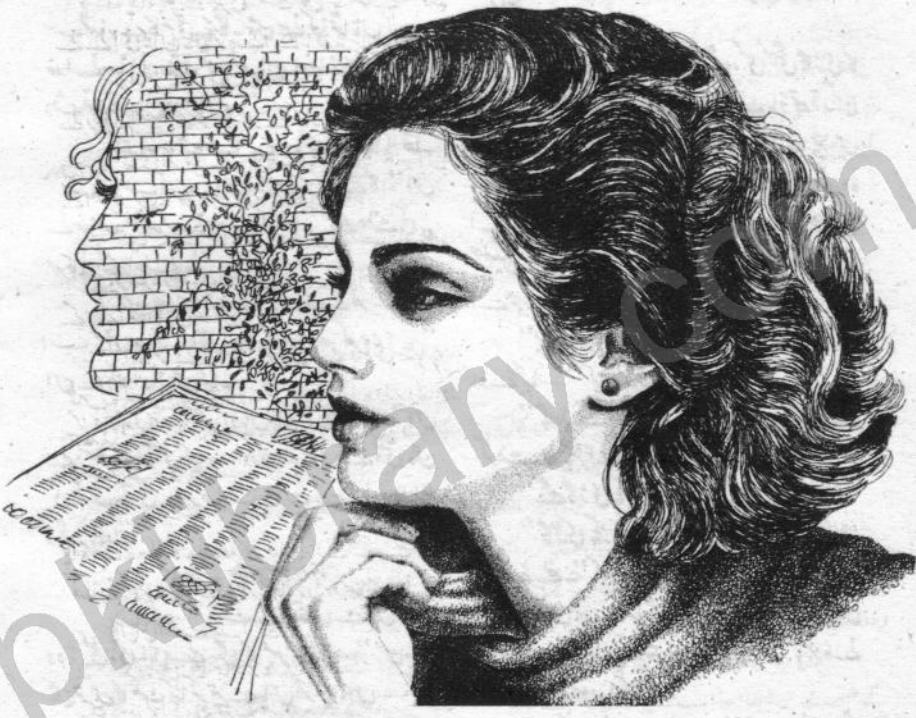

ٹھنڈی ہوا کا سرد جھونکا ردا کو اندر تک ٹھنڈا کر گیا۔ موسم بدل رہا تھا..... سردیوں کی آمد، آمد تھی۔ موسموں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مگر انسان کبھی، کبھی اس وقت کے شکنجے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اگر اسے یقین نہ ہو کہ یہ موسم بھی گزر جائے گا تو وہ ٹھنڈ سے جم جائے یا گرمی سے پگھل جائے۔ تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ قانون جتنا اس کائنات میں لاگو ہے۔ اس سے کہیں زیادہ انسان کو اس پر یقین ہونا ضروری ہے۔ ردا کے اندر کا

موسم روز بروز بے یقینی سے بھرتا جا رہا تھا۔ بے یقینی جو موت کا دوسرا نام ہے۔ ردا نے اپنی شال اپنے گرد لپیٹی اور کمرے کی طرف چل دی۔ اور بستر پر بیٹھ کر کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا۔ آج ماضی کی یاد نے انگڑائی لی اور اس کے ذہن و دل پر چپکے سے دستک دے ڈالی۔

☆☆☆

''اچھا، چلو بتاؤ میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟'' ردا نے اپنی کلاس فیلو مائرہ کے آگے ہاتھ پھیلایا۔

''ردا پلیز میں یہ سب خرافات چھوڑ چکی ہوں۔'' مائرہ نے ردا کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''نہ جی آج تو تمہیں دیکھنا ہی پڑے گا.....'' اس کے اصرار پر مائرہ کو ہار ماننی ہی پڑی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا مائرہ یونو کہ میری سب تیاریاں مکمل ہیں۔ کالج سے فری ہوتے ہی میں ہائر اسٹڈی کے لیے امریکا چلی جاؤں گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو میں نے تو وہی بتایا جو لکیریں کہہ رہیں۔'' مائرہ نے محسوس کیا کہ ردا پریشان ہو گئی تھی اس کی بات سن کر..... اسی لیے اللہ نے انسان کی تقدیر چھپا رکھی تاکہ وہ پہلے سے پریشان نہ ہو۔

''اب منہ لٹکا کر مت بیٹھو اور جلدی سے کچھ کھلاؤ پلاؤ مجھے۔'' مائرہ نے ردا کا دھیان بانٹنے کے لیے اسے کھانے کی فرمائش کر دی اور ناچار ردا کو اٹھنا ہی پڑا۔

اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔

''کتنا سچ کہا تھا مائرہ نے.....'' اس نے اپنی ہتھیلی پھیلا کر اپنی لکیروں کو حسرت سے دیکھا۔

ردا اپنے ماں، باپ کی پہلی اولاد تھی۔ جو سب کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین بھائی تھے۔ باپ کا فرنیچر کا بزنس تھا اور ماما ایک این جی او کی چیئر پرسن تھیں... گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ والد قدرے سخت اور اصولوں کے پابند تھے۔ جبکہ ماما آزاد خیال اور بولڈ خاتون تھیں۔ ردا نے شکل صورت کے ساتھ، ساتھ عادات اور مزاج میں بھی دونوں سے رنگ چرائے تھے۔ ماں کی طرح ذہین اور بولڈ تو تھی ہی ساتھ میں باپ کی طرح اخلاقی روایات پر بھی یقین رکھتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ صوم وصلوٰۃ کی پابند بھی۔ کچھ بھی ہو نماز کبھی نہیں چھوڑتی تھی۔ یہ عادت بچپن سے تھی اسے۔ وہ برملا کہا کرتی تھی کہ تین چیزوں کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ نماز، پھول اور کتاب.....

وہ بچپن سے ہی اپنے چچازاد ہمایوں سے منسوب تھی۔ چچا کی فیملی پچھلی دو دہائیوں سے امریکا میں مقیم تھی۔ ردا اور ہمایوں کا رشتہ اگرچہ بڑوں کی مرضی سے طے ہوا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ ان کی محبت بھی بڑھتی چلی گئی۔ اور اب وہ تناور درخت بن چکی تھی۔ فاصلوں کی دوری کے باوجود بھی دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ تھے۔

''ہمایوں تمہیں پتا ہے میری ایک فرینڈ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کیا کہا؟ کہہ رہی تھی کہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتا رہیں کہ تمہاری زندگی میں کوئی بڑا سانحہ رونما ہوگا اور یہ بھی کہ تم باہر نہیں جا سکو گی۔''

''اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ ہاتھ دکھاؤ۔ پتا ہے ناں کہ جو شخص نجومی کے پاس جائے اور اس کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کرے اس کی چالیس دن نماز قبول نہیں ہوتی.....''

''ہاں پتا ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے سے کہا۔

''پھر بھی۔''

''اچھا سوری ہمایوں آئندہ نہیں دکھاؤں گی..... پکا وعدہ.....'' ردا نے ہمایوں کو یقین دہانی کروائی۔

''مجھ سے نہیں اللہ سے ایکسکیوز کروں۔'' ہمایوں نے نروٹھے پن سے کہا۔ وہ وڈیو کال پر بات کر رہے تھے۔

''اچھا بابا کر لوں گی..... اللہ جی میری پکی توبہ آج کے بعد اس طرح کا جاہلانہ کام نہیں کروں گی.....'' اس نے خلوصِ نیت سے دعا مانگی تھی۔

جس دن ردا نے ہاتھ دکھایا وہ ان کا کالج میں آخری دن تھا اور اگلے تین دن بعد اس کی زندگی نے ایک نیا ٹرن لیا تھا..... سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ جس نے اس کی زندگی کو

یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ سارے خواب ساری امیدیں اس ایک لمحے کی نظر ہوگئیں۔ زندگی خاک نہ تھی مگر خاک اڑا رہی تھی۔ اور یہ خاک اس کی آنکھوں کے آگے دھند بن کر ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ اور دھند چاہے موسموں میں ہو یا آنکھوں میں انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔

آج ردا سو کر اٹھی تو اس کی فرینڈ مائرہ اپنے دو گول مٹول بچوں کے ساتھ اس کے گھر موجود تھی۔

''مائرہ تم.....؟'' اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ وہ واقعتاً خوش تھی..... آج لمبے عرصے بعد اسے دیکھا تھا..... تو خوشی سے بے ساختہ تھی..... اس نے سارا دن مائرہ کے بچوں سے کھیل کر گزارہ۔ اس کی مایوسی کچھ دیر کے لیے ہی سہی تھم گئی تھی..... ان کے جانے کے بعد پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی ادھوری ہے۔ آج اگر یہ سب نہ ہوتا تو میرے آنگن میں بھی بچوں کی کلکاریاں ہوتیں..... میرے اور ہمایوں کے بچے۔ پھر اس نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا..... اسے چوبیس گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا۔ ہوش آنے کے بعد یادوں نے پھر دستک دے ڈالی تھی۔

وہ دنیا جو اس کی اپنی تھی، اس کی دسترس میں تھی۔ چاہت اور امید سے بھرپور دنیا، ایک ایسی دنیا جہاں خواب، پھول اور رنگ تھے۔ چاہت کا نشہ تھا۔ یہ نشہ اس کی آنکھوں سے چھلکتا تھا۔ وہ پور، پور محبت میں ڈوبی ہوئی داسی لگتی۔ جس کا کام ہی محبت کرنا ہو۔ محبت تو تھی ہی اسے ساتھ میں یقین بھی تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ یقین کی دولت ہی تو تھی کہ وہ روز بروز خوب صورت ہوتی چلی گئی۔

لائبریری میں اپنی مطلوبہ کتاب نہ ملنے پر اسے جھنجلاہٹ ہو رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا کہ پہلے کیوں نہ ایشو کروائی۔ پتا بھی تھا کہ فرسٹ ٹرم شروع ہونے میں کچھ ہی دن باقی تھے اور اب تمام اسٹوڈنٹس بکس ایشو کروا چکے تھے۔ اسی سوچ میں گم ردا ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل سے گھونٹ پر گھونٹ چڑھائے جا رہی تھی۔

گھر واپسی پر اس نے سوچا کیوں نہ کتاب خرید لی جائے۔ اسی مقصد کے لیے اس نے گاڑی اردو بازار کی طرف موڑ لی۔ دو تین دکانوں کی چھان پھٹک کے بعد مطلوبہ کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔

فرسٹ ٹرم کے ایگزام اسٹارٹ ہو چکے تھے اور ردا پوری طرح ان میں محو تھی۔ ایگزام کے دوران وہ ایسے ہی پاگل ہو جایا کرتی۔ تمام ایکٹویٹیز اسٹاپ۔ یہاں تک کہ ہمایوں سے گفتگو بھی۔ میسج ٹائپ کیا اور سینڈ کر دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگی..... آج ایگزام سے فارغ ہوئی تو پہلا خیال ہمایوں کا آیا۔ تین دن سے بات نہیں کی تھی..... انتظار کرتے، کرتے نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ اٹھی تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔

''شکر ہے تم دکھائی تو دیے، میں تو سمجھی بھول بھال ہی گئے ہو؟'' ردا نے الٹا شکوہ بھگارا۔

''اب تم خود ہی غور کرو کہ بھولا کون تھا؟'' ہمایوں نے منہ پھلاتے ہو کہا۔ کھانے کے ساتھ، ساتھ ویڈیو اسکائپ کال بھی جاری تھی۔

''چلو چھوڑو ناراضی۔ پتا تو تھا میرے ایگزامز ہو رہے ہیں''۔

''مجھے زہر لگتی ہے تمہاری یہ عادت۔ ہمیشہ ایگزامز نہ ہوئے پتا نہیں کیا ہو گئے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی دن تم مجھے بھی بھول جاؤ گی۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یقین رکھو۔'' ردا نے پُرعزم لہجے میں کہا اس کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔ ہمایوں کی ناراضی دور ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

بہت خوب صورت باغ تھا۔ رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکا ہوا..... چار سو ہریالی اور سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ باغ میں وہ اکیلی فراک اٹھائے خراماں، خراماں چل رہی تھی۔ ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔ کبھی وہ فراک سنبھالتی اور کبھی بال پیچھے کرتی۔ چلتے، چلتے وہ اک جھیل کنارے جا پہنچی۔ جہاں نہایت سفید پانی رواں

دواں تھا۔ جھیل کے کنارے لگے پودوں کی پگڈنڈیوں کے ساتھ، ساتھ چراغ جل رہے تھے ٹمٹما رہے تھے۔ اور ان پھولوں پر جگنو..... شام کا اندھیرا روشنی کو اپنی لپیٹ میں لے کر چل دیا۔ تو ننھے، منے جگنو بھی اپنا فرض نبھانے چلے آئے۔ روشنی بکھیرنا۔ یہی تو فرض تھا اس چھوٹی سی مخلوق پر۔ صرف اندھیرے کو شکست دینا کام نہیں تھا ان کا بلکہ اس کائنات پر سب سے افضل مخلوق انسان کو جگانا بھی ان کا ایک مقصد تھا۔ وہ پہچانتے تھے کہ ہمارا کام روشنی بکھیرنا ہے اور انسان بھول چکا تھا۔ جگنو جو محبت اور روشنی کا استعارہ ہے۔ فراک سنبھالتی بچی کی نظر یکا یک اس پر پڑتی ہے تو وہ فراک چھوڑ کر جگنو کے پیچھے لپکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جگنو پکڑ پاتی..... جگنو اپنی اڑان بھر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ردا کی آنکھ کھل گئی۔

یہ خواب آج تیسری بار وہ دیکھ رہی تھی۔ اور... پُرسوچ انداز میں خود کلامی کی کہ آخر اس خواب کا اس کی زندگی سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہے۔ خواب کی جزئیات پر غور کرتے اس کی نظر گھڑی پر پڑی جو نو بجا رہی تھی۔ آج تو اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ جلدی سے چپل پہنے وہ واش روم میں چل دی۔

ردا کا ماسٹر مکمل ہونے کو تھا اور اس کا ارادہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا تھا۔ سارے معاملات طے پا چکے تھے۔ آج اس کا یونیورسٹی میں آخری دن تھا۔

وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے۔ جی سی یونیورسٹی کی سیڑھیوں پر بیٹھی ردا سوچ رہی تھی۔ ابھی کل ہی تو اس کا ایڈمشن ہوا تھا اور اب اینڈ ہونے کو ہے۔ کتنی یادیں وابستہ تھیں یہاں سے..... کتنے اچھے پل تھے جو اس کی زندگی میں آئے۔ وہ لوگ، وہ ٹیچرز وہ جگہیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ موسم نے آناً فاناً انگڑائی لی اور بادل برسنے لگے۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا اور پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف چل دی۔

بارش زور پکڑ چکی تھیں اور ردا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ یونیورسٹی میں ہی رک جاتی۔ مگر کچھ پل اوپر طے ہوتے ہیں ان کو ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ آج کا دن یہ بارش اور یہ حادثہ بھی طے تھا۔ اس کا زبردست ایکسی ڈینٹ ہو گیا تھا۔

اس نے تین دن بعد آنکھ کھولی اور خود کو پٹیوں میں جکڑے دیکھ کر ہوش اڑ گئے۔ کچھ سجھائی نہ دیا کہ وہ کہاں ہے، کدھر ہے؟ دماغ کی اسکرین تاریک تھی۔ کچھ دیر لیٹنے کے بعد اس کو یاد آیا بارش میں گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی کہ سامنے سے آنے والا ٹرک..... اور پھر اسے کچھ یاد نہ تھا۔

اب وہ مکمل طور پر ہوش میں آ چکی تھی جب اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک ٹانگ سے محروم ہو چکی ہے۔ ٹریک کا مرمتی کام جاری تھا۔ فیروز روڈ جو کافی مصروف روڈ ہے۔ وہاں ایم اے او کالج کے پاس یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ جو اس کے سارے خواب لے گیا اور زندگی بھی۔ ہمایوں زندگی ہی تو تھا۔ جس کے بغیر جینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ چکا تھا۔ ٹانگ کٹنے سے زیادہ اذیت ناک تھا ہمایوں کا چھوڑ دینا۔

''ہمایوں پلیز کچھ بولو تمہاری چپ مجھے مار ڈالے گی، کچھ تو بولو۔ تمہیں تو اس وقت میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ تم کیوں نہیں آئے چچا، چچی کے ساتھ مجھے دیکھنے۔''

''میں بزی ہوں ردا..... تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر آؤں گا.....'' خدا خدا کر کے بولا بھی تو بس اتنا۔ اور میلوں دور بیٹھی ردا کے دل نے گھنٹی بجائی تھی کہ یہ آواز ہمایوں کی نہیں تھی۔ وہ تو اس کے فلو ہونے پر بھی پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ بار، بار کال کر کے اس کو مختلف قہوے پینے کو کہتا کبھی سوپ پینے کو اور اب تو اس کی ٹانگ کٹ گئی تو اس کی کال تک نہ آئی..... ہوش آنے کے تین دن بعد اس نے خود کال کی تھی۔

زندگی کا سفر رواں دواں رہتا ہے۔ چاہے مسافر چلے یا رک جائے۔ ردا کی زندگی رک چکی تھی۔ مگر سفر جاری و ساری تھا..... وہ ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی دل گھبراتا تو وہیل چیئر پر باہر نکل آتی مگر ملازموں کی ترحم آمیز نگاہیں اس کا دل چھلنی کر

دیتیں۔ ماما، بابا اور بھائیوں کی اب بھی اس میں جان تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھتے۔ پھول اور کتابیں اسے پسند تھیں۔ دنیا جہاں کے ان ڈور اور آوٹ ڈور پلانٹس اس کے گھر میں موجود تھے۔ اور رہیں کتابیں تو اس کی لائبریری میں دنیا جہاں کی کتابیں موجود تھیں۔ سب کی محبتیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ کئی لوگ تھے جو اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار تھے مگر روداحیات کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ وہ اب بھی بہت سوں کے لیے متاثر کن تھی۔ بڑی، بڑی آنکھیں جہاں کبھی شوخیاں اور رنگ چھلکتے تھے۔ وہاں اداسیاں ہلکورے لیتی تھیں۔ وہ اب بھی سحر زدہ کردیتی تھی۔ مگر وہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ کسی کو قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس کی اپنی محبت اسے چھوڑ گئی تھی۔ تو پھر کسی اور کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

آج رودا پھر سے اداس تھی۔ اور جب بھی اس پر اداسی کا دورہ پڑتا وہ اتنا شدید ہوتا کہ یوں محسوس ہونے لگتا کہ تنہائی کوئی دیوہیکل بلا ہے جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے قبضے میں کرلیا ہے۔ تنہائی بلا ہی تو ہوتی ہے جو بڑے، بڑے لحیم شحیم جثوں کو کھا جاتی ہے۔ تین سال، چھ ماہ اور چودہ دن بیت چکے تھے ہمایوں سے بچھڑے ہوئے۔ پر اسے آج بھی اتنی ہی شدید محبت تھی۔ وہ آج بھی اس کی سالگرہ کا دن اہتمام سے مناتی تھی۔ اچھا کھانا کھاتی، تیار ہوتی۔ اس کے فیورٹ کلر کا سوٹ پہنتی۔ اس کی فیورٹ ڈشز بنواتیں۔ رات گئے تک مصروف رہتی۔ اس کے نام کا کیک کاٹتی اور صدقہ وخیرات بھی کرتی.....

☆☆☆

رات کا آخری پہر بیت رہا تھا.....اس نے سوچوں سے چھٹکارا پانے کے لیے لیپ ٹاپ آن کرلیا۔ یوٹیوب کے آئی کان پر کلک کرتے ہی سوچیں ہوا ہوگئیں۔ آج کل وہ یوٹیوب پر ایک مشہور ومعروف سیلف ہیلپ اسپیکر کو سن رہی تھی۔ جسے سن کر اسے لگتا کہ اس کا ڈپریشن کم ہونے لگا ہے۔ اس کی باتوں میں ایک عجیب سا سحر تھا۔ جو اپنے حصار میں لے لیتا۔ شاید جو باعمل لوگ ہوتے ہیں ان کی باتیں یوں ہی دل پر اثر کرتی ہیں۔

مختلف موضوعات کو چیک کرتے ہوئے بالآخر اس نے convert your weaknesses into strength پر کلک کیا۔

وہ سن رہی تھی کہ مقرر نے ٹون بدلی۔

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ جتنے ڈپریسڈ ہیں وہ اتنے ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ان میں کامیاب ہونے کا مارجن اتنا ہی زیادہ ہے۔'' وہ دلچسپی سے سننے لگی۔

''ڈپریسڈ ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے اندر فیول ہے جو جل رہا ہے۔ یعنی اندر توانائی ہے۔ بس کرنا یہ ہے کہ اس توانائی کو استعمال کرنے کا فن سیکھنا ہے۔ آئن اسٹائن کہتا ہے کہ انرجی کو میٹر (matter) میں کنورٹ کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ لوگ جن کا دل ٹوٹ چکا ہے جو محبت میں ناکام ہوچکے ہیں۔ ان سے بطور خاص عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنی چاہت کو ضائع مت کریں۔ اس جذبے کو کام میں لائیں۔ دکھی انسانیت تڑپ رہی ہے۔ سسک رہی ہے، ان کے لیے کام کریں۔ یقین کریں نہ صرف آپ کا ڈپریشن دور ہوگا بلکہ آپ سکون محسوس کریں گے۔ وہ جوں، جوں سنتی جا رہی تھی۔ مسحور ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا لفظ اس کے دل میں اتر رہے ہیں۔ شاید یہ لفظ قدرت نے بلوائے ہی اس کے لیے تھے۔ لفظ اگر رزق تھے تو وہ اسی کے حصے کا رزق تھے۔ مقرر اب سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں وہ گویا ہوا۔

''درد تو سویٹ ڈش کی طرح ہے۔ اس درد کو محسوس کیجیے۔ اس کو کام میں لائیں۔ ہمیں اللہ درد دیتا ہے۔ مگر ہم اس نعمت کو ناشکری کر کے ضائع کردیتے ہیں۔ اس کو ضائع نہ کیجیے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کب کیا کرنا ہے؟ اس کو پرایا مت سمجھیں۔ کیونکہ وہ ہمیں پرایا نہیں سمجھتا۔ جب وہ ہمیں پرایا نہیں سمجھتا تو پھر ہمیں بھی اس کی دی ہوئی خوشی اور غم کو دل سے قبول کرنا چاہیے۔ اور جب دل سے قبول کرلیں گے

تو بڑے سے بڑا غم بھی راحت میں بدل جائے گا۔" ردا کی آنکھیں ساون بن چکی تھیں۔ جو بن بادل برس رہی تھیں۔ تین سالوں کا قہر تھا جو پگھل رہا تھا۔ وہ پگھل رہی تھی۔ یہ مشکل کی آخری رات تھی انرجی میٹر میں کنورٹ ہو رہی تھی۔ اب اس کنورٹ انرجی کو کام میں لانا تھا۔

☆☆☆

آج ردا کی برتھ ڈے تھی سبھی نے اسے پھولوں کے بوکے اور دیدہ زیب ٹائٹل والی اس کے فیورٹ رائٹرز کی کتابیں گفٹ کی تھیں مگر وہ بھول گئی تھی کہ کتابیں دینا اور لینا اس کو بہت پسند ہوا کرتا تھا اور پھول وہ تو کبھی مرجھا گئے تھے جب سے ہمایوں اس کی زندگی سے رخصت ہوا تھا۔ اگر ہمایوں اس کی لاٹھی بنتا تو یہ معذوری اس کو کبھی ہرا نہ پاتی۔ دکھ تو اسی بات کا تھا کہ ہمایوں نہیں رہا تھا.... سوچوں سے بچنے کے لیے وہ اسٹڈی روم میں چلی آئی جہاں سیکڑوں کتابیں ریپر میں لپٹی اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ردا کتابیں اوپن کرنے لگی کہ اسے ایک ٹائٹل پر بنی تصویر نے اپنی طرف کھینچا۔ دونوں ہاتھوں اور پیروں سے معذور انسان۔ نک وائے چچ۔ ردا نے کتاب اٹھائی اور اسے اپنے روم میں لا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ life without limits ٹائٹل سے زیادہ اس کتاب کا عنوان متاثر کن تھا۔ یہ ایک جرمن نژاد باشندے کی آٹو بائیوگرافی تھی۔ اس نے پڑھنا شروع کیا اور پڑھتی چلی گئی...... انتہائی متاثر کن بائیوگرافی تھی۔ ایک ایک لفظ حیرتوں میں گم، ایک، ایک فقرہ درد میں چھپی کامیابی کی داستان سنا رہا تھا۔ نک کا کہنا تھا کہ "لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ نک اتنے زیادہ چیلنجز کے ساتھ تم اتنے خوش کیوں ہو؟ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں نک ہوں، خدا کی قدرت کا سرچشمہ، میں خدا کی تخلیق ہوں۔ جس نے مجھے بہترین پلان کے مطابق تخلیق کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کی کوئی حد نہیں، ہاتھ نہیں پیر نہیں حد نہیں۔ میرے پاس جوتوں کا ایک جوڑا ہے جو مجھے امید سے جوڑے رکھتا ہے کہ ایک دن اللہ مجھے پاؤں دے گا اور میں ضرور

ادارہ پاکیزہ کے اراکین کے نام

سالگرہ پر خصوصی تحفہ

☆ خدا آپ کے سارے غم ریت پر لکھ دے تاکہ ہوا سے مٹ جائیں اور...... خوشیاں پتھروں پر لکھ دے تاکہ ہوا تو کیا بارش بھی مٹا نہ سکے۔

☆ اللہ کرے ہر روز نکلتا ہوا نیا سورج آپ سب کے لیے نئی خوشیاں اور کامرانیاں لیے طلوع ہو۔

دعا کیا ہے؟

☆ دعا نظر نہیں آتی مگر اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ انسان کو فرش سے عرش تک لے جاتی ہے۔

☆ دعا مانگنے سے گریز نہ کرو کہ یہ بندگی کا اعلیٰ درجہ ہے کہ جب بندہ اس رب العالمین کے سامنے گڑگڑاتا ہے تو وہ مولائے کل فوری فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس عاجز بندے کی دعا اس کے ہاتھ گرانے سے پہلے قبول کرو...... (بشرطیکہ دعا شرعی اور اس کے حق میں بہتر ہو)

مرسلہ: بشریٰ رضوی، کراچی

چلوں گا۔ پاؤں ملیں نہ ملیں مگر حوصلہ موجود ہے۔" یہ حوصلہ ہی تھا کہ وہ آج دنیا کا بہترین موٹیویشنل اسپیکر تھا۔ پوری دنیا گھوم چکا تھا۔ اس کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ معذور لوگوں کے لیے این جی او چلا رہا تھا۔ ایک بے حد خوب صورت بیوی اور دو نارمل بچوں کا باپ ایک بہترین زندگی گزار رہا تھا۔

کتاب پڑھتے، پڑھتے وہ رونے لگی پھر نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو آنسوؤں کے نشان ابھی تک اس کی گالوں پر موجود تھے۔ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے بعد اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ مطالعہ بھی جس کا اسے نشے کی حد تک شوق تھا۔ آج بہت عرصے بعد اس نے کتاب کھولی تھی۔ جس نے اس کے اندر نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ نک اس کے لیے ایک ایسی تحریک

ثابت ہوا کہ وہ بغیر ٹانگوں کے بھی دوڑنے لگی تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد ردا حیات نے ایک فلاحی فاؤنڈیشن کا افتتاح کیا۔ جس کے ذمے تھا معذور اور میٹھلی ریٹائرڈ بچوں کے لیے فری اسکول کھولنا اور ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تربیت دینا تاکہ وہ معاشرے کا ایک کارآمد شہری بن سکیں۔ ردا کی ان تھک محنت کا نتیجہ تھا کہ وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں اس کی چار برانچز کام کر رہی تھیں۔ اس کا ارادہ اسے پورے ملک میں پھیلانے کا تھا۔ اندر کی انرجی کام کر رہی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی شکر گزاری کا احساس بڑھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ اب اس کی زندگی میں سکون ہی سکون ہے۔ ادھورے وجود کے ساتھ وہ کتنے ادھورے لوگوں کو مکمل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ یہی اصل زندگی ہے۔ باقی سب فریب تھا۔ جب وہ معذور بچوں کو پڑھتے دیکھتی تو محسوس کرتی کہ اس کی ٹانگ جڑنے لگی ہے۔ یہ بچے اس کی بیساکھی تھے، زندگی تھے، جگنو تھے۔ جنہوں نے اسے سچ میں محبت کرنا سکھایا تھا۔ ان جگنوؤں کی روشنی تھی کہ اندھیرے چھٹنے لگے تھے۔

ممی اور پاپا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا وہ ہواؤں میں رقص کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اور پھر ایک ماں نے اپنی بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھا۔ بند آنکھوں سے نہیں جیتی جاگتی آنکھوں سے اور جاگتی آنکھوں والے خواب پورے ہو کر رہتے ہیں۔

وہ کافی دنوں سے ردا سے بات کرنا چاہ رہی تھیں مگر ردا اپنی این جی او میں اتنی گم تھی کہ بات کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ انہیں یقین ہی نہ آتا کہ ان کی بیٹی اتنا کام بھی کر سکتی ہے۔ اتنا تو اس نے ساری زندگی میں نہیں کیا جتنا ان چھ مہینوں میں..... وہ شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ آج کل ان کی دعائیں زیادہ ہی لمبی ہونے لگ گئی تھیں۔ وہ اللہ سے ایک چیز کی درخواست کر رہی تھی۔ اور ماں کی دعا ہو اور وہ بھی اولاد کے حق میں۔ تو درد کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔

بالآخر آج شام کی چائے پر ردا ان کو میسر آ ہی گئی..... ممانے اپنا مدعا بیان کیا جو بڑی خوب صورتی سے رد کر دیا گیا۔ کرب سے نہیں قہقہوں کے طوفان میں۔

''مما آپ بھی ناں.....'' اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نا لے رہی تھی..... ''بابا آپ سمجھاتے نہیں مما کو میں اور شادی۔ امپاسبل۔'' بابا بس اسے دیکھ کر رہ گئے..... ہنستے ہوئے کتنی خوش لگ رہی تھی ان کی بیٹی..... وہ اسے دیکھنے میں محو تھے جب ان کے کانوں میں ایک دکھی ماں کی شکوے بھری آواز پڑی۔

''یہ خاک سمجھائیں گے، ان کو تو اپنے بزنس ٹور سے فرصت نہیں، مل بھی جائے تو اخبار پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' ان کا ارتکاز ٹوٹا اور ان کی لبوں پر آنے والی مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ بیگم آپ کیا جانیں۔ دعاؤں کی درخواستیں دھڑا دھڑ جمع ہو رہی تھیں۔ فائلیں اپنے رتبے کے اعتبار سے ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں سب سے اوپر تہجد میں کی جانے والی دعاؤں کی فائل پڑی تھی۔ ایک باپ کی پندرہ سالہ دعاؤں کا ریکارڈ۔ جو ردی میں پھینکا جانے والا نہ تھا بلکہ اس کو بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کی سند لگوانے کے لیے بھیجا جانے والا تھا۔

آج بھی کتاب پڑھتے، پڑھتے وہ رونے لگی پھر نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ جب آنکھ کھلی تو آنسوؤں کے نشان اس کے گالوں پر موجود تھے۔ محبت سے محرومی کے بعد اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ مطالعہ بھی جس کا اسے نشے کی حد تک شوق تھا۔ مما کا مطالبہ ضد پکڑے جا رہا تھا۔ مگر وہ ہمایوں کی جگہ کسی اور کو کیسے دے دے۔ مشکل تھا بہت ہی مشکل..... مگر اب اس کے اندر سے آواز آئی۔

''مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں..... ہمت کرو۔''

جس نے اس کے اندر نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ تب اس کے لیے ایک ایسی تحریک ثابت ہوا کہ وہ بغیر ٹانگوں کے بھی دوڑنے لگی تھی اور آج نتیجہ سامنے تھا۔

''آپ نے سنا ردا مان گئی ہے شادی کے لیے.....'' ایک ماں نے ایک باپ کو وہ خبر سنا ڈالی جس کی دعائیں وہ پندرہ سالوں سے کر رہے تھے..... ان کی دعاؤں کی فائل پر سندِ قبولیت لگ چکی تھی۔

❁❁❁

بخل...... مذمت الٰہی

تمام تر حمد وثنا اللہ رب العزت کے لیے ہے جو تمام کائنات کا رب حقیقی، خالق و مالک اور پیدا کرنے والا ہے۔ عدم سے وجود میں لانے والا کل اختیار رکھنے والا اور ہر شے پر مکمل غلبہ رکھنے والی صرف اس کی ہی ذات ہے۔ وہی ہمارا خالق ہے، مالک ہے، آقا ہے، دوست ہے، محبوب ہے، بادشاہ عظیم ہے اور ناصح حکیم ہے۔ وہ ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے دوست اور عزیزوں سے بڑھ کر نوازشیں کرنے والا ہے۔

اللہ رب العزت کتنا رؤف و رحیم ہے کہ ہم کو بن مانگے ہی سب کچھ عطا کر رہا ہے۔ وہ عیسائی، یہودی، کافر، مشرک، مسلمان غرضیکہ کسی کو بھی اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا...... حتیٰ کہ علی الاعلان بغاوت کرنے والوں کو بھی توبہ کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

مگر بہت افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم صرف اپنے رب سے دنیاوی فائدہ مانگتے ہیں کتنے کم عقل ہیں کہ سمندر سے موتیوں کی جگہ کنکر پتھر مانگ رہے ہیں۔ چند روزہ زندگی کا فائدہ حاصل کر کے اس ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی کو کانٹوں کی سیج بنا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو وہ ہستی ہے جو دینے والی ہے اس سے ہم جو مانگیں گے وہ دے گا...... دنیا مانگیں گے تو دنیا ہی بخش دے گا اور اگر آخرت مانگیں گے تو آخرت عطا کرے گا، یہ کام تو ہمارا ہے کہ داتا سے موتی مانگتے ہیں یا پتھر...... اللہ رب العزت کا سب سے بڑا احسان عظیم ہے کہ آقائے دو جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہترین نمونہ بنا کر ہمیں دکھا دیا کہ دیکھو اس طرح میری اطاعت کی جاتی ہے۔ اگر آپؐ کے طریقے پر چلیں تو ہماری دنیا و عاقبت دونوں سنور جائیں...... کروڑوں درود و سلام ہوں اس پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؑ پر اور ان کے اصحاب پر......

آج ہمارا موضوع ''بخل'' ہے۔ بخل کے لغوی معنی ہیں...... لالچ، حرص، کنجوسی، تنگ دستی۔

اللہ تعالیٰ ہر شخص کو مال اور وسائل عطا فرماتا ہے اس کی عطا کا انداز بڑا نرالا ہے جسے چاہے کم دے اور جسے چاہے زیادہ دے اور یہ حکمت صرف وہی جانتا ہے کہ وہ کسی کو کم یا زیادہ کیوں دیتا ہے۔ بہر کیف تقاضائے شریعت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ضرورت سے زیادہ مال و دولت عطا کر رکھا ہے انہیں چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کریں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق سے ضرورت کے مطابق خرچ نہ کرنا بخل ہے اور بخل کرنے والے کو بخیل کہتے ہیں خسیس کہتے ہیں۔ بخیل مال کو جمع تو کرتا ہے لیکن خرچ نہیں کرتا...... بخل نہایت ہی قابل مذمت اخلاقی برائی ہے۔ کیونکہ اس سے اور بہت سی دوسری برائیاں جنم لیتی ہیں۔ بغض و عناد، بددیانتی، ذخیرہ اندوزی اور تنگ نظری جیسے برے اخلاق اسی سے جنم لیتے ہیں۔ حرص، طمع، لالچ وغیرہ بخل کی ہی شاخیں ہیں۔ اس لیے اسلام میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے تاکہ اس برائی کا قلع قمع ہوتا رہے۔

بخل کے بظاہر تو فائدے نظر آتے ہیں لیکن... درحقیقت یہ فائدے نہیں بلکہ نقصان ہیں۔ انسان سوچتا ہے کہ دولت اکٹھی کر کے امیر ہو جائے گا اور عیش و عشرت

کی زندگی بسر کرے گا مگر بخیل مال تو اکٹھا کرتا رہتا ہے لیکن اس کا بخل اس کے لیے دکھوں اور مصیبتوں کا سبب بنتا ہے اس لیے کہ حرام و حلال کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کی کوشش میں وہ پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور یہ کثرتِ دولت سوائے ذہنی پریشانیوں کے اور کچھ نہیں..... اس کے برعکس اللہ کی راہ میں جو دولت خرچ کی جائے وہ بڑھتی ہے۔ تو اللہ کا بندہ اور دوست بننے کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کی محبت اور چاہت کو چھوڑ کر اپنے رب کی محبت کو اپنایا جائے..... بخیل چونکہ دولت سے محبت رکھتا ہے اور کم ہو جانے کے ڈر سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں رکھ سکتا کیونکہ محبت کی انتہا کا تقاضا تو یہ ہے کہ یا اللہ کی طرف قائم کر لو یا دنیا سے دل لگا لو..... بخیل کا دل تو مال و دولت کی محبت میں لگا ہوتا ہے تو اللہ کی محبت اس کے دل میں نہیں پہنچ سکتی۔ دنیا حُبِ الٰہی کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ لہٰذا دل کو بخل سے جو نہایت ہی مہلک مرض ہے۔ پاکیزہ کیا جائے تب اللہ کی معرفت جلد حاصل ہوگی۔

قرآن کریم میں بخل کے بارے میں مختلف جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں اپنی کنجوسی (بخل) کو اپنے لیے بہتر خیال نہ کریں بلکہ وہ ان کے لیے نہایت بدتر ہے۔ عنقریب قیامت والے دن ان پر اپنی کنجوسی (بخل) ... کے طوق ڈالے جائیں گے۔ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے۔'' (سورۂ آل عمران:180)

''خبردار! تم وہ لوگ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو۔ تو تم میں سے بعض بخیلی کرنے لگتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے وہ تو دراصل اپنی جان سے بخیلی کرتا ہے..... اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تم فقیر اور محتاج ہو اور اگر تم روگردان ہو جاؤ تو وہ تمہارے بدلے تمہارے سوا اور لوگوں کو لائے گا جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔'' (سورۂ محمدؐ 38)

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

''جو (خود بھی) بخل کریں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔ سنو! جو بھی منہ پھیرے اللہ بے نیاز اور سزاوار حمد و ثنا ہے۔'' (سورۂ حدید:24)

مزید ارشاد الٰہی ہے کہ..... ''اور جب راحت ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔'' (سورۂ معارج:21)

اللہ تعالیٰ کو بخیل پسند نہیں بلکہ سخی پسند فرماتا ہے.....

بخل کا انجام عذابِ الٰہی ہے۔ سونا، چاندی اور مال و دولت جو بھی انسان بخل کی بنا پر جمع کر کے رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا۔ قیامت کے روز اسی دولت سے اسے ایسا دردناک عذاب دیا جائے گا کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا اس لیے اللہ کا خاص بندہ بننے کے لیے بخل کی عادت کو ترک کر کے سخاوت کی عادت ڈالنی چاہیے۔

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''میں تمہیں لوگوں میں سے بدتر آدمی کا پتا نہ دوں؟ لوگوں نے عرض کیا بتائیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس سے اللہ کے نام پر کچھ مانگا جائے اور وہ اس کو نہ دے۔''

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! اپنی راہ میں خرچ کرنے والے کو اس کا اجر عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ! بخیل کے مال کو تلف فرما دے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اس امت کے اگلے لوگ یقین اور زہد کی وجہ سے نجات پا جائیں گے اور اس امت کے پچھلے لوگ بخل اور حرص کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... ''دو خصلتیں ایک مردِ مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور بدخلقی.....'' ایک اور حدیث مبارکہ میں ہے جس کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''تین چیزیں ہلاکت خیز ہیں۔ ان میں سرفہرست تو بخل ہے کہ جس کی مخالفت چھوڑ کر اس کی غلامی اختیار کر لی جائے اور دوسری وہ جھوٹی خواہش جس کے پیچھے تو پڑ جائے اور

تیسری نخوت وغرور......"

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ "تم کہتے ہو کہ بخیل ظالم کی نسبت معذور تر ہوتا ہے۔ (یعنی قابلِ معافی) لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑھ کر (یعنی بخل سے بڑھ کر) کون سا ظلم ہوسکتا ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عزت وعظمت کی قسم کھا کر کہا ہے کہ کسی بخیل کو بہشت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "سخی شخص اللہ تعالیٰ سے قریب، لوگوں کے قریب اور دوزخ سے دور ہے جبکہ بخیل اللہ سے دور...... جنت سے دور اور بندگانِ خدا سے دور اور دوزخ سے قریب ہے۔ سخی جاہل اللہ کو عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ "سخاوت جنت کا ایک درخت ہے سخی اس کی شاخیں پکڑتا ہے اور شاخیں اس کو جنت میں داخل کیے بغیر نہیں چھوڑیں گی۔ اسی طرح بخل بھی دوزخ کا ایک درخت ہے پس جو بخیل ہوتا ہے وہ ان شاخوں کو پکڑتا ہے اور وہ شاخیں اس کو دوزخ میں داخل کیے بغیر نہ چھوڑیں گی۔"

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بخل سے پناہ مانگی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ "تین آدمیوں کو اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے بوڑھا زناکار، بخیل، متکبر......"

☆☆☆

ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کا طواف کررہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ کعبہ شریف کا حلقہ تھامے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا کہ "اے پروردگار......! اس گھر کی حرمت وعزت کے صدقے میرے گناہ بخش دے......" آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا...... "اے شخص......! تیرا گناہ کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ میں اسے اپنے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔" فرمایا...... "تیرا گناہ بڑا ہے یا زمین؟ اس نے کہا "میرا گناہ......" فرمایا...... "تیرا گناہ بڑا ہے یا آسمان......؟" اس نے کہا "میرا گناہ......" فرمایا۔ "تیرا گناہ بڑا ہے یا عرش؟" اس نے کہا "میرا گناہ......" فرمایا۔ "تیرا گناہ بڑا ہے یا حق تعالیٰ......" اس نے کہا۔ "حق تعالیٰ بہت بڑا ہے......" فرمایا۔ "بس کہو کہ تمہارا گناہ کیا ہے؟" اس نے کہا کہ "میرے پاس مال و دولت بہت زیادہ ہے۔ لیکن جوں ہی کوئی سائل دور سے دکھائی دیتا ہے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بس آگ (چلی آرہی ہے) جو مجھے جلا کر راکھ کردے گی۔" آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھ سے دور رہو کہ تیری آگ کہیں مجھے بھی نہ پھونک ڈالے۔ قسم ہے مجھے اس پاک پروردگار کی جس نے مجھے سیدھی راہ دکھانے کے لیے اس دنیا میں بھیجا کہ اگر تو رکن اور مقام کے درمیان ہزار سال تک نماز پڑھتا ہے اور اس قدر گریہ و زاری کرے کہ تیرے آنسوؤں سے ندیاں بہنے لگیں ان کی وجہ سے درخت پیدا ہوجائیں لیکن تیری موت اسی حالتِ بخیلی میں ہو تو تیرا ٹھکانا پھر بھی جہنم دوزخ اور صرف دوزخ ہی رہے گا۔ تو نے یہ بھی نہ سوچا کہ بخل کفر میں ہے اور کفر کا مادہ آتش ہے تو نے یہ بھی نہ سنا کہ حق تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے۔ جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے اور تو نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی نہ سنا کہ جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جاوے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

☆☆☆

بنی اسرائیل میں تین شخص تھے۔ ایک کوڑھی، دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا...... اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لینا چاہا اور ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتہ سب سے پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور پوچھا کہ تم کو سب سے زیادہ کون سی چیز پسند ہے۔ اس نے کہا اچھا رنگ...... خوب صورت جسم اور اس چیز کا دور ہونا جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں...... فرشتہ نے یہ سن کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو اس کا کوڑھ جاتا رہا۔ اس کے بعد فرشتے نے کہا کہ تجھ کو کس قسم کا مال پسند ہے اس نے کہا اونٹ...... اس کی خواہش کے مطابق اس کو حاملہ اونٹنیاں دے دی گئیں پھر فرشتے نے اس کو یہ دعا دی کہ خدا تیرے لیے ان میں برکت فرمائے...... اس کے بعد فرشتہ گنجے کے پاس گیا اور اس سے دریافت کیا کہ تجھ کو کون سی چیز زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا خوب صورت بال اور اس چیز کا دور

pklibrary.com

ہوجانا جس کے سبب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ یعنی گنج۔ پھر فرشتہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کا سر ٹھیک ہوگیا خوب صورت بال عطا ہوگئے۔ پھر فرشتے نے اس سے سوال کیا کہ تجھ کو کون سا مال پسند ہے؟ اس نے کہا گائیں چنانچہ اس کو حاملہ گائیں عطا کردی گئیں..... پھر فرشتے نے اس کو یہ دعا دی کہ اللہ تیرے مال میں برکت دے..... پھر فرشتہ اندھے کے پاس آیا۔ اس سے پوچھا کہ تجھے سب سے زیادہ کون چیز پسند ہے؟ اس نے کہا صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ میری بینائی مجھ کو واپس دے۔ فرشتے نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی اس کو واپس کردی..... پھر فرشتے نے اس سے کہا کہ تجھ کو کس قسم کا مال پسند ہے؟ اس نے کہا بکریاں..... چنانچہ اس کو زیادہ بچے دینے والی بکریاں دے دی گئیں۔ پس ان تینوں کے مال میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور کوڑھی و گنجے کے اونٹوں اور گائیوں سے جنگل بھر گئے اور اندھے کی بکریوں کے ریوڑ وادیوں میں نظر آنے لگے اس کے بعد فرشتہ اپنی اسی شکل صورت میں جس میں پہلے آیا تھا۔ کوڑھی کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں ایک مسکین آدمی ہوں میرے سامان کا سفر جاتا رہا ہے بس اب منزلِ مقصود تک پہنچنا خدا کی مہربانی سے ہوسکتا ہے یا تیرے سبب سے۔ پس اس ذات کا واسطہ جس نے تجھ کو اچھا رنگ اچھی جلد اور مال عطا فرمایا ہے۔ ایک اونٹ مانگتا ہوں تاکہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں..... کوڑھی نے کہا کہ میں تجھ کو پہچانتا ہوں میرے اوپر بہت سے حقوق ہیں۔ ان کی موجودگی میں تجھ کو کوئی حق نہیں پہنچتا..... تب فرشتے نے کہا کہ میں تجھ کو پہچانتا ہوں تو وہی کوڑھی نہیں ہے جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں تو فقیر تھا اللہ نے تجھ کو مال دیا..... تب کوڑھی بولا۔ یہ مال مجھ کو نسلاً بعد نسلاً اپنے خاندان سے ملا ہے۔ فرشتے نے کہا اگر تو نے جھوٹ بولا ہے تو خدا تجھ کو ویسا ہی کردے جیسے کہ تو پہلے تھا..... اس کے بعد فرشتہ گنجے کے پاس آیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا تب فرشتے نے کہا تو جھوٹا ہے خدا تجھ کو ویسا کردے جیسا تو پہلے تھا..... اس کے بعد فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک مرد مسکین ہوں مسافر ہوں میرا سامانِ سفر جاتا رہا ہے تجھے اس ذات کا واسطہ کہ جس نے تجھے دوبارہ بینائی بخشی ہے میں ایک بکری مانگتا ہوں..... اندھے شخص نے یہ سن کر کہا..... میں اندھا تھا خدا نے مجھ کو میری بینائی واپس کردی..... پس تجھ کو جس قدر مال چاہیے لے جا اور جس قدر تیرا جی چاہے چھوڑ جا..... قسم ہے خدا کی..... میں تجھ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ اس چیز کو واپس کرنے کی جو تو لے گا..... فرشتے نے یہ سن کر کہا..... تم اپنا مال اپنے پاس رکھو..... تم لوگوں کا امتحان لیا گیا تھا..... اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی اور خوش ہوا اور تیرے ساتھیوں سے خدا ناراض ہوا۔

☆☆☆

متعدد علما سے سوال کیا گیا کہ دانش مند، دولت مند، بخیل، دانا، درویش کا مفہوم کیا ہے؟ سب نے یہی جواب دیا کہ دانش ور وہ ہے جو قضا و قدر پر مطمئن رہے۔ دانا وہ ہے جو فریبِ دنیا میں مبتلا نہ ہوسکے۔ درویش وہ ہے جو زیادہ طلب نہ کرے اور بخیل وہ ہے جو دولت کو مخلوق سے زیادہ عزیز تصور کرتے ہوئے کسی کو ایک جبہ نہ دے۔

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ”بخیل دنیا میں مفلسوں اور قلاشوں جیسی زندگی بسر کرے گا مگر آخرت میں امیروں جیسا حساب و کتاب دے گا.....“ آپ ہی کا ایک اور فرمان ہے کہ ”صاحبِ مال اکثر بخیل ہوتے ہیں۔“

حضرت امام حسینؓ کا ارشاد ہے کہ ”بخیل ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ دنیا میں اس لیے ذلیل ہوتا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت خرچ نہیں کرتا اور آخرت میں اس لیے ذلیل ہوگا کہ اسے ذلت آمیز عذاب ملے گا۔“

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے اور جنت سے دور ہوجاتا ہے مگر دوزخ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے۔“

حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا کہ ”شیطان کو سب سے پیارا بخیل مسلمان ہے اور ناپسندیدہ گناہ گار سخی ہے۔“

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے سنا کہ روم کے نواح میں ایک خدا رسیدہ بزرگ ہے جو نہایت پاک طینت اور عبادت گزار ہے، مجھے اس کی زیارت کا شوق ہوا کچھ دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ ان بزرگ کی

زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ طویل اور پُرصعوبت سفر کے بعد منزل پر پہنچے اس وقت تھکن سے ان سب کی حالت بری تھی اور بھوک شدت کی لگی ہوئی تھی۔ ان بزرگ نے نہایت گرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کیا ہر ایک کے ہاتھوں کو اور سر کو چوما اور نہایت وقار اور عزت سے بٹھایا اور ان کے جاہ و چشم کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سونے چاندی کی ریل پیل ہر طرف خدام دوڑتے پھر رہے تھے اور حدِ نظر تک اس کے کھیت اور باغ پھیلے ہوئے تھے مگر اس کا چولھا ٹھنڈا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو کھانا کھلانا تو درکنار اس کے بارے میں ذکر تک نہ کیا البتہ خندہ جبینی اور شیریں زبانی کا یہ عالم تھا کہ بات، بات پر بچھا جاتا تھا اور اہلاً و سہلاً مرحبا کہتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ بھلا اس کی خالی، خولی باتوں سے ان لوگوں کے پیٹ کی آگ کیسے بجھ سکتی تھی۔ یہ لوگ دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ بزرگ تو بے پھل کے درخت کی طرح بے فیض ہے رات ہوئی تو اس نام نہاد بزرگ نے مصلیٰ پکڑ لیا اور تسبیح اور تہلیل میں مشغول ہو گیا۔ اس نے ساری رات اللہ، اللہ کرتے گزار دی اور پلک تک نہ جھپکائی اِدھر یہ مہمان ساری رات بھوک کے مارے انگاروں پر لوٹتے رہے۔ صبح ہوئی تو پھر ان بزرگ نے میٹھی، میٹھی باتیں شروع کر دیں۔ لیکن کیا مجال کہ اپنی گفتگو میں کھانے کا ذکر تک آنے دیں۔ شیخ سعدیؒ کے ساتھیوں میں ایک جوان نہایت خوش طبع تھا وہ نہ رہ سکا اور ان بزرگ سے کہا۔ ''حضرت ہمیں آپ کا بوسہ نہیں توشہ چاہیے آپ کی شیریں کلامی اور محبت ہمارے کس کام کی؟ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے سر پر جوتے ماریں مگر کھانے کو کچھ دے دیں۔''

☆☆☆

لوگوں کو ایثار کی بدولت بڑی سبقت حاصل ہوئی ہے۔ شب زندہ داروں کا دل مردہ نہیں ہوتا..... شرافت، سخاوت روٹی دینا ہے۔ بے ہودہ اور لایعنی باتیں محض خالی ڈھول ہیں۔

حضرت حسنؓ سے بخل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا۔ ''بخل یہ ہے کہ انسان راہِ اللہ مال خرچ کرنے کو ضائع ہونا اور مال جمع کرنے کو خوب قرار دے۔''

بخل کی بنیاد اولاد، مال کی محبت، فقر و فاقہ کا خوف اور طویل امید ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''بدترین بخیل وہ شخص ہے جو باوجود مقدور کے قربانی نہ کرے۔''

قربانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک جاندار کا خون ہو بلکہ غرض اس کی یہ ہے کہ بخل کی نجاست تیرے دل سے دور ہو اور جانوروں سے شفقت کرنا تیری طبیعت کا مقتضی نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ان پر شفقت کرنا ہے۔ جب جانور کے ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا تو ایسا مت کہہ کہ اس بیچارے نے کیا کیا ہے میں اسے کیوں ذبح کروں..... اپنا اختیار چھوڑ خدا کے حکم کے تابع ہو۔

☆☆☆

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ابلیس سے ملاقات ہوئی آپ نے اس سے دریافت کیا تجھے کون سا آدمی پسند ہے اور کون سا ناپسند.....؟ ابلیس نے کہا مجھے مومن بخیل پسند ہے مگر گناہ گار سخی پسند نہیں آپ نے پوچھا کیوں.....؟ ابلیس نے کہا اس لیے کہ بخیل کو تو اس کا بخل ہی لے ڈوبے گا مگر گناہ گار سخی کے بارے میں مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ذات کی بدولت اسے معاف نہ کر دے اور اسے توبہ کی توفیق بھی عطا کر دے..... یہ بات کہہ کر وہ آگے روانہ ہو گیا۔

مکہ معظمہ میں ایک شخص امیہ بڑا سخت کافر تھا بہت کچھ مال و متاع اس کے پاس تھا مکہ کے رئیسوں میں سے تھا دیگر جائداد کے علاوہ اس کے پاس نہایت قوی ہیکل غلام بھی تھے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود امیہ راہِ خدا میں کبھی کچھ دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کبھی کوئی غلام کسی فقیر کو کچھ دے دیتا تو وہ سخت ناراض ہوتا تھا۔ جب کوئی اسے سمجھاتا اور نصیحت کرتا کہ اے امیہ! اتنا کثرت سے مال و دولت ہونے کے باوجود تم مسکینوں اور محتاجوں کی راہِ خدا میں کیوں نہیں مدد کرتے؟ کیوں نہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کر کے آخرت کی تیاری نہیں کرتے تو وہ بدنصیب کہتا تھا کہ اول تو آخرت ہے کہاں.....؟ اور اگر ہوتی بھی تو میں نے مال و اسباب اور اولاد یہ سب کچھ اتنا جمع کر لیا

ہے کہ مجھے آخرت کا خوف اور اس کے انعامات کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ اسی بدبخت کے غلام تھے۔ وہ خفیہ طور پر مسلمان ہوگئے تھے ایمان ان کے دل میں جوش مارتا تھا مگر ظالم کی غلامی اور اس کی قید سے مجبور تھے۔ اسلام لانے کی خبر امیہ کو ہوگئی چنانچہ انتہائی غصے میں اس نے حضرت بلالؓ کو بلایا اور سوال کیا کہ ”اے بلال.....! میں نے سنا ہے کہ تو مسلمان ہوگیا ہے کیا یہ بات ٹھیک ہے؟“ حضرت بلالؓ نے سکوت اختیار کیا اور کچھ جواب نہیں دیا بلکہ خاموش کھڑے رہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ بے شک مسلمان ہو چکا ہے اس نے حضرت بلالؓ سے تمام کنجیاں چھین لیں۔ پھر اس نے دریافت کیا ”اے بلالؓ سچ بتا کہ تو کس کی پرستش کرنے لگا ہے اور کس کو پوجتا ہے؟“ حضرت بلالؓ نے جواب دیا کہ ”حضرت محمدؐ کے خدا کو پوجتا ہوں اور اسی کی پرستش کرتا ہوں وہی ایک وحدہ لاشریک ہے.....“ تب امیہ نے کہا ”اے بلال.....! اس دین کو چھوڑ دے نہیں تو میں تجھ پر بہت عذاب کروں گا بلکہ تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔“ بلالؓ نے کہا..... ”اے امیہ..... میں اس دین سے پھر نہیں سکتا تیرا جو جی چاہے کر میں تیرا زر خرید غلام ہوں۔“ یہ سن کر اس سخت شقی القلب شخص نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ بلال کے بدن میں ببول کے کانٹے چبھو دو اور جب دھوپ بہت تیز ہو جائے تو اس غلام کو گرم پتھروں پر لٹاؤ اور سر سے پیر تک اس پر گرم پتھر رکھو اور اس کے اردگرد آگ بھی روشن کر دو اور اس کو اسلام لانے کا مزہ چکھا دو۔ اور جب شام ہو جائے تو اسے اندھیری کوٹھری میں بند کر دو اور تمام رات اس کے جسم پر کوڑے لگاؤ اور روزانہ ایسا ہی کرتے رہو۔

اور پھر حضرت بلال نے یہ سختیاں جھیلیں انہیں گرم پتھروں پر لٹایا گیا تمام جسم میں ببول کے کانٹے چبھوئے گئے نہایت تپتی ہوئی سلیں ان کے سینے پر رکھی گئیں..... اللہ اکبر..... تکلیف سی تکلیف..... لیکن حضرت بلالؓ کی زبان پر فوراً ہی کی طرح اللہ احد، اللہ احد برابر جاری رہا..... اس عذاب و تکلیف میں عرصہ دراز گزر گیا.....

ایک روز جبکہ عذاب ہو رہا تھا کہ حضرت بلال حبشیؓ پکار اٹھے اور انہیں کچھ مایوسی سی ہوگئی کہ اب میں سید المرسلینؐ سے نہیں مل سکوں گا اور یونہی میری روح تڑپتی ہوئی بدن سے جدا ہو جائے گی تب انہوں نے روتے ہوئے اپنے رب سے فریاد شروع کر دی..... حضرت بلالؓ کی فریاد پروردگار کو پسند آئی اور قبولیت کا دروازہ کھل گیا۔

اسی روز حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی دیوار کے نیچے سے گزرے یکایک آپ کے کانوں میں نہایت درد بھری ہائے، ہائے کی آواز آئی..... حضرت صدیق اکبرؓ..... بے چین ہو کر وہیں کھڑے ہو گئے اور دریافت کیا کہ لوگو! یہ کس مصیبت زدہ کی آواز ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک شخص امیہ کے غلام کی آواز ہے جس کا نام بلال حبشیؓ ہے وہ اللہ احد کی توحید پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آیا ہے اور اس کے ایمان کی اس کے مالک کو خبر ہوگئی ہے اس لیے وہ رات دن بلال پر عذاب کرتا ہے اور اس وقت بھی وہ کوٹھری میں بندھا ہوا کوڑوں سے پٹ رہا ہے۔ اے صدیق اکبرؓ! بلال کی دردآمیز صداؤں سے ہمسائے کے لوگ..... بے چین ہیں مگر ہمارا کچھ بس نہیں چلتا کیونکہ امیہ امیر کبیر ہے ہم اس کے غلام کو کیسے چھڑا سکتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ..... یہ سنتے ہی لرز گئے۔ وہ تمام رات وہیں روتے ہوئے انہوں نے گزاری صبح ہوئی تو آپؓ اس مکان میں داخل ہوئے اور امیہ کے پاس پہنچے۔ آپ نے فرمایا..... ”او ظالم شقی.....! بلال پر اتنا ظلم؟ اس نے خدائے واحد کو پکارا تو تیرا کیا بگاڑا..... تو نے اس قدر عذاب دیے اگر تو اس پر رحم کرتا تو تیری عاقبت سنور جاتی اور قیامت کے عذاب سے بچ جاتا.....“ اس پر امیہ نے کہا..... ”قیامت ہے کہاں؟ اے ابوبکرؓ تمہیں کیسے معلوم کہ تمہارا دین سچا ہے اور یہ کہ قیامت ضرور آئے گی مجھے اس عذاب و ثواب سے کوئی غرض نہیں میرے پاس کسی شے کی کمی نہیں پھر میں کیوں ان نعمتوں پر فریفتہ ہوں جو محض وہمی اور خیالی باتیں میرے پاس دنیا کی بہشت موجود ہے۔“ یہ باتیں سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ ناراض ہوئے، تم جیسے شقی القلب ایسی باتیں کرتے ہیں

یہ بتاؤ بلال پر کیوں اتنا ظلم کر رہے ہو؟" امیہ نے کہا "میں اسے اسی طرح عذاب میں رکھوں گا اے ابو بکر.....! تمہیں اگر اس پر ترس آتا ہے تو تم بھی مالدار ہو اور اپنی آخرت پر بڑے نازاں ہو یہ ثواب تم ہی کماؤ اور بلال کو مجھ سے خرید لو....." حضرت ابو بکرؓ کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ حضرت بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے پوچھا....."بلال کا معاوضہ کیا مانگتے ہو؟"

وہ ہنسا اور کہا۔"اس کی قیمت بہت زیادہ ہے تم اسے خرید نہ سکو گے۔ اور اگر تم اسے خریدنا چاہتے ہو تو ایک مثقال سونا (ایک سو چالیس تولے) اور فسطاس رومی غلام تمہارے پاس جو نہایت اعلیٰ درجے کا کارندہ ہے کئی ہزار اشرفیاں اس کی ملک ہیں اسے مع ان اشرفیوں کے مجھ کو دے دو اور بلال کو مجھ سے لے لو....." حضرت ابو بکر صدیقؓ نے نہایت خوشی سے منظور کر لیا..... آپؓ نے تمام مال و اسباب اور فسطاس رومی غلام جو کافر تھا اسی وقت آپؓ نے سب کچھ امیہ کے حوالے کیا اور اس طرح حضرت بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا پھر آپ اللہ کی حمد کرتے ہوئے بلالؓ کو لیے ساتھ باہر آئے۔ امیہ "حضرت ابو بکرؓ! پر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ "میں ان کو بہت عقلمند سمجھتا تھا مگر آج بلال کے معاملے میں انہوں نے دھوکا کھایا اتنا مال خرچ کر کے ایک نکما و مفلس غلام لے لیا۔" جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا....."میں تجھ کو نہایت عقلمند جانتا تھا مگر تو نے آج دھوکا کھایا۔ تجھے تو خبر ہی نہیں کہ بلالؓ کیا چیز ہے؟ اس کا مرتبہ کیا ہے قسم ہے اللہ کی تو اگر بلال کے بدلے میں یمن کی ساری سلطنت بھی مانگتا تو وہ بھی تھوڑی تھی میں تو اپنا سب مال دے دیتا مگر تو نے بلال کی قیمت کچھ نہ مانگی....." پھر آپؓ حضرت بلالؓ کو لے کر آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لائے۔

کیونکہ صدیق اکبرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ میں نے دنیا کمانے کے لیے نہیں اس غلام کو خریدا بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے لیے خریدا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "بچا لیں گے ہم جہنم کی آگ سے اس شخص کو دیتا ہے مال اپنا واسطے پاک کرنے نفس کے۔"

تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں بخل کرتے ہیں اسے وہ اپنے لیے بہتر نہ سمجھیں یہ ان کے لیے مصیبت ہے دنیا سے جاتے ہوئے بخل کوئی فائدہ نہیں دے گا تو دنیا سخی کو دوست رکھتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا بھی پسندیدہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس بری عادت سے محفوظ رکھے اور اپنی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائے..... کہ سخی اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ (آمین الٰہی آمین.....)

حرف آخر:

اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں شرمندہ دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی، کوئی کوتاہی کوئی کمی یا آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات میں غلطی ہو گئی ہو تو اے میرے مہربان رب مجھے اس کے لیے معاف فرما دے کہ بے شک تو اپنے بندوں کی خطاؤں کو معاف کرنے والا ہے.....

جن احترام کے لائق ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے ہیں اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائے اور اہم سب کے لیے توشۂ آخرت بنا دے..... اور ہمیں علم کا مسافر بنا دے۔

الٰہی آمین

۱۔ احیا العلوم حصہ سوئم ..... حضرت امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۲۔ مکاشفۃ القلوب..... حضرت امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

۳۔ شبستان اولیا حصہ اول دوئم..... مولانا حافظ محمد اسحاق دہلویؒ

۴۔ تزکیہ القلوب..... علامہ عالم فقری

۵۔ گناہوں سے بچیے..... علامہ عالم فقری

۶۔ حسن احوال..... ڈاکٹر محمد طاہر القادری

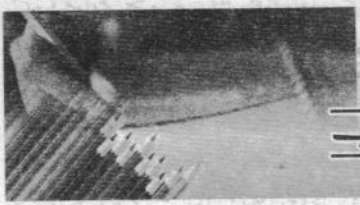

انداز نو

بنتِ زیب

خوش اطوار، خوش گلو صداکارہ،
اسکرپٹ رائٹر، ناظمہ، شاعرہ اور لیکچرار

عروج فاطمہ زہرا زیدی

عروج فاطمہ ریڈیو پاکستان کراچی مرکز کی ایک ایسی منجھی ہوئی آواز جس کے لہجے کی کھنک اور تہذیب سامعین کو مسخر کر لیتی ہے۔

اللہ کی عطا کردہ تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عروج بچپن ہی سے مختلف شعبوں میں فعال رہی ہیں اور اللہ کے کرم سے بے شمار کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ ہر دم کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ کمسنی ہی سے عروج کے ہم رکاب رہا۔ آپ کی خوش

بختی کہ مواقع ملتے رہے، راہیں ہموار ہوتی گئیں اور عروج جانب منزل پرواز کرتی رہیں۔ بیت بازی کے دوران فی البدیہہ شعر پڑھنا معمول رہا۔ تقریری مقابلوں میں فطری ذہانت اور حاضر دماغی بہت کام آئی۔ کھیلوں کے میدان میں بھی ہمیشہ پلڑا بھاری رہا، بزم طلبا سے ریڈیو سے جو وابستگی ہوئی تو وہاں بھی اپنی خداداد صلاحیتوں سے خوب کمالات دکھائے۔ اردو ادب میں ایم اے کی سند حاصل کر کے اردو ادب کی لیکچرار مقرر ہوئیں۔ بچپن ہی سے کچھ نہ کچھ کرنے کی آرزومند عروج فاطمہ زہرا نے زندگی کے محاذ پر بہت کچھ کر دکھایا۔ اس کامیابی میں جہاں اللہ کا کرم شامل ہے وہیں عروج کی امی اور بڑے بھائی کا کردار بھی بہت اہم ہے کہ ان کی محبت اور عروج پر کیے جانے والے اعتماد نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ مزید جاننے کے لیے پڑھتے ہیں ہمارے سوالوں کے جواب میں عروج کے اثبات و انکار اور ان کے جواز.....

❁ میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے دن!

☾ جی! بچپن؟ وہ تو گیا ہی نہیں اتنے پیارے دن تھے کہ آج بھی میرے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ بقول اماں کے ''یہ بڑی نہیں ہو سکتی۔''

❁ بچپن میں چیلنجز کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی!

☾ بالکل نہیں۔ بچپن سے خبطی ہوں۔ اپنی اس فطرت سے بہت نقصان بھی اٹھایا۔

❁ بچپن میں کبھی لڑکیوں والے کھیل نہیں کھیلے!

☾ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ ہم تو گڑیوں کے جنازے تک اٹھاتے اور اٹھواتے رہے ہیں۔ (قہقہہ)

❁ بچپن میں دل پسند مشغلہ بچوں کی کہانیاں پڑھنا اور سننا تھا!

☾ بالکل صحیح..... اماں کی سختی کے سبب میٹرک تک گھر میں ٹیلی ویژن نہیں تھا تو یہی تفریح تھی۔

❁ بچپن میں بھیا سے ایک پل نہیں بنتی تھی!

☾ جی۔ میرا اور بھیا کا ٹام اینڈ جیری والا معاملہ تھا بلکہ اب تک ہے۔ اماں کہتی ہیں شادی ہو گئی تو کیا کرو گی؟ کیسے گزارہ ہو گا شوہر کے گھر.....

❁ بچپن ہی سے بھیا نے میرا بڑا ساتھ دیا!

ڈرامے کی ریکارڈنگ کے دوران..... ریڈیو پاکستان میں ساتھی صداکاروں کے ساتھ

جی! میں بندا، جو بھی اور جیسی بھی ہوں اس میں میرے بھیا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کا دیا اعتبار ہی مجھے اتنی تقویت دیتا ہے کہ میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔

میری ساری زندگی میں ایک کمی ہے تو.....!

جب چھوٹی تھی تو بہت محسوس کرتی تھی کہ بہن نہیں ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا سوپر مین بھیا وقت پڑنے پر ونڈر وومن بن جاتا ہے۔

بچی تھی تب امی کھانے کی پلیٹ لیے میرے تعاقب میں رہتی تھیں!

جی! ہاہاہا..... ارے نہ پوچھیں۔ کھانے کے معاملے میں اماں کو خون کے آنسو لایا ہے۔ توبہ.....

میری امی میری کل کائنات ہیں!

بالکل! بلکہ کائنات سے بہت بڑھ کر..... اماں ہی سہیلی ہیں، رازدار ہیں اور سب کچھ بس وہی ہیں۔

کمسنی میں ابو کی دائمی جدائی میری بہت بڑی محرومی بن گئی تھی!

جی! بقول شاعر

''تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کیوں کرتی''

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم!

ابو کے بہت سے خواب تھے، ان کی بہت خواہش تھی کہ ان کا نام ہو۔ اب جب کہیں کسی مرکزی محفل میں پڑھنا ہو، کوئی انعام ملنا ہو، پزیرائی ہو تو ابو بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے ہر کامیابی پر رونا آتا ہے سوچتی ہوں کاش وہ ہوتے تو اپنے خوابوں کو پورا ہوتے دیکھتے۔ دیکھتے کہ ان کی رو تو بیٹی کتنی مضبوط ہوگئی ہے۔

اسکول میں کھیلوں کے مقابلوں میں پیش، پیش رہتی تھی!

جی! پارا بھرا تھا پارا۔ چین سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ ہر کھیل کھیلا۔

کوشش کے باوجود بیت بازی کے مقابلوں میں ہار جاتی تھی!

ارے نہیں۔ موزوں طبیعت تھی شروع سے۔ فی البدیہہ بھی شعر سنا دیتی تھی۔ ابھی دو سال پہلے ایف ایم ۱۰۷ پر ''نعتیہ بیت بازی'' کا مقابلہ ہوا۔ مابدولت اول آئی تھی۔

اسکول سے جامعہ کی سطح تک اسٹیج ڈراما ہو یا ٹیبلو میری شمولیت لازمی ہوتی تھی!

جی! اللہ کے فضل و کرم سے، ڈرامے باز شروع سے ہیں۔ (قہقہہ)

ملی نغموں کے مقابلوں میں ہمیشہ اول انعام لیا۔

نہیں بھئی..... بہت برا گاتی ہوں۔

مباحثہ ہوتا اور قائد حزب اختلاف میں ہوتی، حاضرین کو ہلا کر رکھ دیتی تھی!

جی! اسے ہماری زبان میں پینترا بدلنا کہتے ہیں۔ تقریر بس اسکول تک ساتھ رہی اور وہاں ہر مقابلے کی فاتح رہی۔ میری اسکول پرنسپل مس زہرا نے ایک بار تقریری مقابلے کا انعام دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''عروج کے کانسپٹ کلیئر ہیں، اس لیے یہ حاضر جواب ہے اور مقابلے جیت جاتی ہے۔ اپنے کانسپٹ کلیئر رکھیں اور یہ حرف بہ حرف سچ ہے۔''

مباحثہ اور تقریری مقابلے میں کوئی خاص فرق نہیں!

نہیں! مباحثہ انگریزی میں.... panel discussion کہلاتا ہے اور تقریر speech بمعنی بولنا۔ آج کل لوگ ان دونوں کا فرق ہی ملحوظ نہیں رکھتے۔

اخبار کا مطالعہ میرے روزمرہ کے معمولات کا اہم جز ہے!

نہیں! اخبار پڑھنا مشکل لگتا ہے۔

گوگل میری سکھی ہے!

جی! گوگل باجی بہت مددگار ہیں۔ ماننا

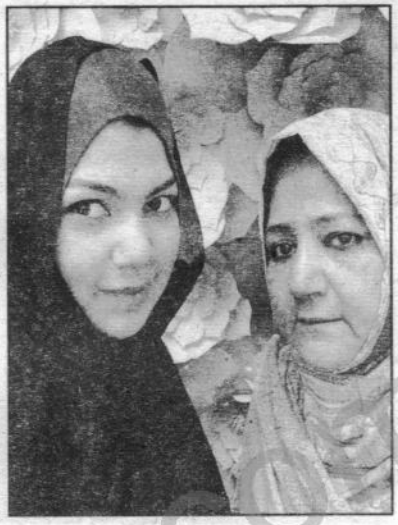

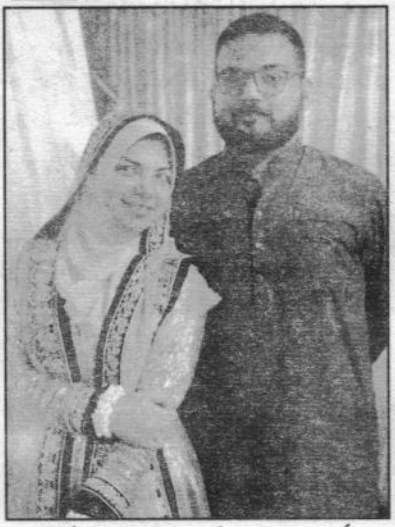

عروج زہرا اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ..... بڑے بھائی محمد رضا کے ساتھ، کزن کے دعوت ولیمہ کی تصویر

پڑے گا۔

❁ سوشل میڈیا کی آزادی کی قائل ہوں!

☽ جی! (مسکراہٹ) آزاد اور مادر پدر آزاد ہونے میں فرق ہے۔ میں پہلے کی قائل ہوں ہر معاملے میں۔

❁ سوشل میڈیا کے بنا زندگی بے رنگ سی لگتی ہے!

☽ واقعی؟ ارے میں تو سنتی رہی کہ ''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

❁ شکر کی میں عادی ہوں صبر آتے، آتے ہی آتا ہے!

☽ ذات کی سید ہوں ناں، امام زین العابدینؒ کی اولاد سے..... شکر اور صبر خون میں ہے۔ (چہ خوب)

❁ غصے میں سب تہس نہس کر دیتی ہوں!

☽ نہیں! بہت کم آتا ہے۔ اور آئے بھی تو بس بھیا اور امی کے سامنے ہی نکالتی ہوں۔ باقی دنیا کے لیے چپ ہو جاتی ہوں۔ کچھ نہیں کہتی۔

❁ ماسک ضرورت کے تحت لیکن فیشن کے مطابق استعمال کرتی ہوں!

☽ جی! بقول ہماری مس زینب کے "this is new normal"

❁ گرمی کا موسم اور گہرے رنگ میری کمزوری ہیں!

☽ ہرگز نہیں! موسم تو دل کا ہوتا ہے۔ رنگ مجھے ہلکے پسند ہیں۔ پیسٹل کلرز بقول نانی مرحومہ ''بڈھی روح ہے اس لڑکی میں۔''

❁ میرا غیر ضروری حساس ہونا میرے احباب کو بہت کھلتا ہے!

عروج ❁ جی! بہت زیادہ۔ کبھی بڑی، بڑی باتیں نظر انداز کر دیتی ہوں اور کبھی بہت چھوٹی سی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔

❁ سجنے سنورنے کا شوق ہمیشہ سے ہے!

☽ نہیں! مجھے اتنا نہیں۔ اماں کو شوق ہے بہت مجھے سجانے سنوارنے کا۔ میرے سب ملبوسات وہی سیتی ہیں۔

❁ مجھے الھڑ لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں!

☾ بالکل! لڑکیوں کو الھڑ ہی ہونا چاہیے۔ ایک بار شادی ہو جائے پھر کہاں وہ شوخیاں رہتی ہیں؟ ذمے داریاں ایک دم بڑا کر دیتی ہیں۔

❁ سیر و تفریح میرا پسندیدہ مشغلہ ہے!

☾ ہاں! مگر کون لے کر جائے؟ کراچی میں رہتے ہوئے ساحل جانے کو ترستی ہوں۔ بقول بھیا کے اپنے میاں کے ساتھ جانا۔ سو انتظار ہے ان کی آمد کا وہ آئیں اور.....

❁ جس کا اخلاق اچھا وہی سب سے اچھا!

☾ بے شک۔ یہ تو حدیث میں بھی ہے۔

❁ مشرقی ملبوسات مجھے دل و جان سے عزیز ہیں!

☾ جی! مغرب کے ملبوسات بھی کوئی ملبوسات ہیں بھلا۔

❁ وقت پر کھانا نہ کھانے پر امی کی ڈانٹ معمول کا حصہ ہے!

☾ جی! یہ تو بچپن سے عادت ہے۔ کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا اس کے بغیر۔

❁ چٹوری میں غضب کی ہوں!

☾ جی بہت! اماں کے آگے شور کرتی ہوں بھوک لگی ہے۔ وہ کہتی ہیں کھانا کھالو، بنا ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں ''نہیں بھئی، گول گپوں یا چاٹ یا پاپڑ کی بھوک لگی ہے۔''

❁ صبح سویرے چائے نہ پیوں تو دن بھر تھکن سوار رہتی ہے!

☾ جی! چائے زندگی ہے بھئی۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں اگر یہ ہم سے پہلے جنت میں چلی گئی تو یہ دودھ کی نہر کو پتی ڈال کر چائے کی نہر بنا دے گی۔

❁ سب سے اچھا نقشہ میں روٹی پکاتے ہوئے بناتی ہوں!

☾ نہیں جناب! روٹی بہت اچھی بناتی ہوں۔ گول، گول اور پھولی، پھولی..... آٹے کے اشتہار جیسی۔

❁ گھریلو امور میں میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے!

☾ نہیں، نہیں! خوب دلچسپی لیتی ہوں۔ اماں نے اب تک کھانے پکانے میں ہاتھ نہیں ڈلوایا لیکن ویسے گھر کی تزئین و آرائش، صفائی ستھرائی سب میرے ذمے ہے۔

❁ غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کی مالک ہوں!

☾ جی! بالکل۔ اور یہ کام بہت چھوٹی عمر سے کر رہی ہوں۔ یوں کہہ لیں کہ mind maping میں ماہر ہو گئی ہوں اب۔

❁ موسم بہار میں دنیا میں آئی تو میرا مزاج بھی بہار رنگوں سے مزین ہے!

☾ جی! میرا برج دلو ہے۔ ہم دل والے ہوتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور، ٹوٹ کر چاہنے والے۔

❁ پھول کھلنے کے موسم میں دل میں گلاب کھلتے ہیں اور بے حساب کھلتے ہیں!

☾ آپ کے سوال پر دو اشعار یاد آ گئے، ان کے خالق کا نام نہیں معلوم.....

رنگوں کا ہر موسم میرے جیسا ہے
جیسا بھی میں سوچوں سب کچھ ویسا ہے
لیکن پھر بھی اکتا جاتی ہوں کیسے
میں کیا جانوں میرا دل ہی ایسا ہے

❁ بلا کی داستان گو ہوں میں!

☾ جی! حقیقت میں افسانے نہیں ملاتی ہاں افسانوں میں حقیقت ملا دیتی ہوں۔

❁ وعدہ کر تو لیتی ہوں لیکن تکمیل اکثر نہیں کر پاتی!

☾ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ اپنوں سے کیے وعدے بھلا دیتی ہوں مگر دوسروں سے کیے وعدے نبھاتی ہوں۔ یوں کہہ لیں میں اپنوں کے لیے بہت... لاابالی ہوں۔

پروگرام......گزشتہ سے پیوستہ......میں مایہ ناز شاعرہ ڈاکٹر زہرا اور محققہ نصرت زہرا کے ساتھ۔ تصویر میں شگفتہ آفتاب اور انیس زہرا بھی موجود ہیں

❁ کہتی ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!

☾ جی! میں جھوٹ نہیں بولتی مگر سچ بولنے کا بھی وقت اور انداز ہوتا ہے۔ بے وقت کا سچ بھی جواں سال موت کی طرح بے حد اذیت ناک ہوسکتا ہے۔

❁ جب سے خود کو نظام الاوقات کے مطابق ڈھالا ہے تنگیِ وقت کا گلہ جاتا رہا!

☾ جی! سو تو ہے۔ وقت کا صحیح استعمال آجائے تو زندگی بہت سہل ہو جاتی ہے۔

❁ آج بھی یاد ہے وہ پل جب میں نے جیتی بازی ہاری تھی!

☾ جی! مقابل کوئی اپنا ہو تو میں جیت سے زیادہ ہار کو ترجیح دیتی ہوں۔ یہ شعر عرصہ پہلے کہا تھا۔

اپنی ہر اِک خواہش خود ہی مار گئی
رب سے بولی یا ربا! میں ہار گئی

❁ میں وہ دریا ہوں کہ ہر بوند بھنور ہو جس کی!

☾ یہ تو عزیز رشتے دار بہتر بتا سکیں گے۔ ویسے ہماری ریڈیو والی سیما باجی (سیما رضا ردا) کے مطابق تو آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔

❁ ذرا سی کامیابی کیا مل جائے خوشی سے میرے پاؤں زمین پر ہی نہیں ٹکتے!

☾ جی! بچوں کی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتی ہوں۔

❁ جو چیز سب سے زیادہ سنبھال کر رکھتی ہوں اکثر وہی رکھ کر بھول جاتی ہوں!

☾ نہیں! اپنے سوا سب کچھ جہاں رکھوں یاد رکھتی ہوں۔ بس، اکثر نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو بھول جاتی ہوں۔

❁ کیا ہی اچھا ہو کہ لوگ آزاد خیالی اور روشن خیالی کا فرق جان لیں!

☾ جی! روشن خیالی یا آزادی آپ کو بے راہ روی، روایات سے انحراف یا اخلاقی اقدار سے دوری نہیں سکھاتی بلکہ ان کی بہتر پاسداری کا درس دیتی ہے جبکہ مادر پدر آزادی آزاد خیالی اس کا الٹ ہے۔

❁ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

☾ جی! غالب نے کہا: دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور....

❁ بہت ہی بزدل ہوں میں!

◯ نہیں! بہت بہادر ہوں۔ اپنے خوف سے لڑنے والے بزدل کیسے ہوسکتے ہیں؟

❁ وزن متناسب رکھنے کے لیے اپنے غذائی معمولات کا خاص خیال رکھتی ہوں!

◯ بالکل نہیں۔ جب، جو، جیسا اور جتنا اچھا لگا کھالیا۔

❁ جذبات میں آکر بنتی بات بگاڑ دیتی ہوں!

◯ نہیں! ایسی جذباتی نہیں۔ بات بنانے والی، رشتے نبھانے والی ہوں۔

❁ غضب کی قوت مدافعت ہے مجھ میں!

◯ جی بالکل! حال ہی میں کورونا سے جیت کر بیٹھی ہوں..... مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔

❁ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں!

◯ جی! بے شک۔ عزت اور محبت میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو میں بے خوف ہوکر، لمحہ ضائع کیے بغیر عزت چنوں گی۔

❁ فی زمانہ استاد کے منصب پر فائز ہونا آسان بات نہیں!

◯ جی! بات تو سچ ہے مگر۔ استاد صرف استاد نہیں ہوتا ایک مکمل نسل کی تربیت کا ذمے دار ہوتا ہے۔ نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، آرائش لباس، وقت کی تقسیم غرض ہر چیز میں استاد حصے دار بن جاتا ہے۔

❁ استاد و شاگرد کے مابین دوستانہ و محبانہ رویہ ہی باہمی شفقت و احترام کا باعث بنتا ہے!

◯ جی! یہ درست ہے۔ جب تک باہمی احترام و محبت نہ ہو سیکھنے سکھانے کا عمل کیسے آگے بڑھے گا۔

❁ تعلیمی نصاب میں تبدیلی معیارِ تعلیم میں بہتری کی ضمانت ہے!

◯ جی! کوئی شک نہیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہم سالہا سال سے وہی پڑھ رہے ہیں۔ نصاب میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

❁ امتحان میں نقل کے بڑھتے ہوئے رجحان کے ذمے دار کسی حد تک اساتذہ اور والدین بھی ہیں!

◯ جی! اصل مسئلہ یہی ہے کہ دونوں طرف کوئی بھی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہے۔ اس چپقلش سے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

❁ امتحان کے روایتی طریقے میں تبدیلی سے آن لائن امتحان بھی نقل کے بغیر کامیابی سے لیے جا سکتے ہیں!

◯ جی! بے شک آن لائن میں ہمیں کئی ٹیکنیکل اور تدریسی مسائل کا سامنا ہے مگر جہاں ہم اتنی غیر مؤثر چیزیں مغرب سے لیتے ہیں ان کا طریقۂ جانچ بھی ہمیں لے لینا چاہیے۔ کثیر الانتخاب سوالات آن لائن جانچ کے لیے بہترین طریقہ ہیں۔ اسے اپنانا چاہیے۔

❁ اسکول سے جامعہ کی سطح تک اردو کے نصاب سے کل مطمئن تھی نہ ہی آج ہوں!

◯ جی! بچوں کی ذہنی سطح اب بہت تبدیل ہو چکی ہے، اشد ضرورت ہے کہ ہم اس سطح کے مطابق بچوں کو تعلیم دیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے کہ ''اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت ان کے زمانے کے مطابق کرو۔ وہ تم سے مختلف زمانے کے لیے خلق ہوئے ہیں۔'' اور ہم ہیں کہ وہی لکیر کے فقیر بنے ہیں اور بنائے جا رہے ہیں۔

❁ اردو کے استاد کو زبان و بیان پر دسترس ہونی چاہیے!

◯ جی! ایک استاد کو زبان کے اسرار و رموز سے آشنا ہونا چاہیے۔ اس حد تک تو ضرور کہ بچوں کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرسکیں۔

❁ مزاح کی تخلیق بہت بڑی آزمائش ہے!

◯ جی! مزاح نگار، دوسروں کے ساتھ مل کر اپنا مضحکہ اڑاتا ہے۔ یوں کہیے اپنی ذات کی نفی کرنا اور اس نفی کا مذاق اڑانا..... آسان تو کسی طور نہیں ہوسکتا۔

❁

شعر در اصل وہی ہیں حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

جی! میرے استاد رؤف پاریکھ صاحب کہتے تھے "اچھے شعر کی نشانی یہ ہے کہ اسے یاد نہیں رکھنا پڑتا، وہ یاد رہ جاتا ہے۔"

❁ کچھ شاعری بھی ذریعۂ عزت نہیں مجھے!

نہیں بھئی، بہت نیک نامی ہے۔ خوشی تب ہوتی ہے جب وہ شعرا جنہیں پڑھا کرتی تھی میرے سامنے ہوتے ہیں ان سے اپنے لیے یہ سننا کہ "اچھے شعر کہتی ہو" کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔

❁ کمسنی میں پہلا شعر تخلیق کیا وہ بھی مزاح سے بھرپور!

صندل سی وہ رنگت ہے عقابوں سی ہیں آنکھیں
یعنی کوئی انسانوں سی خوبی بھی نہیں ہے

❁ حوا کی بیٹی کے دکھ سکھ میری شعری تخلیق کا حصہ کبھی نہیں بنے!

نہیں! میں نہیں سمجھتی کہ بنتِ حوا ہمیشہ ہی مظلوم ہوتی ہے۔ مگر ظاہر ہے، لڑکی ہوں تو اپنے احساسات ہی کہتی ہوں۔

❁ ادب زندگی کا نقیب ہے اور میری شاعری اس خیال کی ترجمان!

جی! یہ تو میرے قارئین بتا سکتے ہیں۔ اپنے طور سے تو میں اس سے متفق ہوں۔

❁ سچا شعر اپنے آپ کو منوا لیتا ہے!

جی! جو چیز بہتر ہوگی وہ جلد یا بدیر اپنا مقام بنا لے گی۔

❁ کسی سے عشق ضروری ہے شاعری کے لیے!

جی! عشق بغیر شاعری ممکن ہی نہیں۔ اب عشق کس سے ہے، یہ ایک الگ بحث ہے۔

❁ ادب کی ٹرین میں زنانہ مردانہ ڈبوں کی کوئی تخصیص ضروری ہے!

نہیں! ادب انسان کو انسان سمجھتا ہے۔ جب تک آپ جنس کو ثانوی حیثیت نہیں دیں گے۔ ادب آپ پر نہیں کھلے گا۔

❁ ناول کے پلاٹ میں افسانہ لکھنا سہل ہے!

یہ دو مختلف دائرے ہیں جو کہیں، کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں مگر اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے۔ اس لیے انہیں خلط ملط کرنا میرے خیال سے ناانصافی ہوگی۔

❁ افسانے کی کامیابی میں سماجی حقیقت نگاری کا کردار بہت اہم ہے۔

بالکل! افسانہ کامیاب ہی اس صورت میں ہوگا۔ جب اس میں معاشرے کا عکس ہو، ورنہ وقتی پزیرائی تو ہو جائے گی مگر وہ افسانہ ادب کا حصہ نہیں بن پائے گا۔

❁ ادیب و شاعر جمال پرست نہ ہو تو اس کی تخلیق بے کیف ہوتی ہے!

بالکل! کیا کوئی ایسا بھی شاعر یا ادیب ہو سکتا ہے جو جمال پرست نہ ہو؟ ممکن نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا ذوقِ جمال الگ ہو۔

❁ ادب لفظوں کا فن ہے اور لفظی صنعت گری ہر ایک کے بس کی بات نہیں!

جی! لوگ بولنا نہیں جانتے آپ لکھنے کی بات کر رہی ہیں۔

❁ قلم کا وار تلوار سے بڑھ کر کاری ہوتا ہے!

جی! قلم کا وار اس لیے کاری ہے کہ یہ کسی طور بھرتا نہیں، تلوار کا بھر جاتا ہے۔

❁ کتاب اور قاری کے غیر مستحکم تعلق کا بنیادی سبب کتاب کی قیمت ہے جو قاری کی قوتِ خرید سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے!

ارے نہیں۔! ہم سے دیوانے کمیٹیاں ڈال، ڈال کر کتابیں لیتے ہیں مگر اب سب کچھ اس فون میں سما گیا ہے۔ سعود عثمانی کہتے ہیں ناں۔

کاغذ کی یہ مہک یہ نشہ روٹھنے کو ہے
یہ آخری صدی ہے کتابوں سے عشق کی

❁ مشاعروں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار کسی

حد تک نظامت پر بھی ہوتا ہے!

◯ جی! کسی حد تک؟ ارے مشاعرہ اٹھے گا یا بیٹھے گا اس کا تعین نظامت ہی کرتی ہے۔

❁ مشاعرے تربیت گاہ سے بڑھ کر تفریح گاہ بن گئے!

◯ جی! تربیت گاہیں رہی کہاں ہیں اب، بقول غالب: حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں.....

❁ میرے شوق نے مجھے بزم طلبا کی راہ دکھائی!

◯ شوق تو تھا۔ نصیر ترابی مرحوم (اللہ مغفرت فرمائے) کچھ وقت کے لیے شاعری کے استاد رہے خود ریڈیو پاکستان لے کر گئے۔ میڈم ربیعہ اکرم سے ملوایا، انہوں نے سیما باجی کے حوالے کیا اور جب سے اب تک سیما باجی کی رہنمائی حاصل ہے۔

❁ بزم طلبا نے میری خداداد صلاحیتوں کو خوب خوب نکھارا!

◯ بالکل.....اس میں کوئی دو رائے نہیں۔

❁ معلوماتِ عامہ کے مقابلے منعقد کروا کر طلبا کی جانب سے مایوسی ہوتی ہے!

◯ جی! طلبہ ایک انجانی ریس میں لگے ہیں، انہیں غیر نصابی سرگرمیوں کی فرصت ہی نہیں۔ مگر اب بھی مکمل اندھیرا نہیں ہے کچھ طلبہ کے سبب امید قائم ہے۔

❁ صدا کاری ایسا ہنر ہے جو آتے، آتے ہی آتا ہے!

◯ جی! یہ تو ہے۔ سیکھنے کا سفر جاری رہتا ہے۔ اگر آپ اس عمل کو روک دیں گے تو آپ کے اندر موجود صدا کار کی موت یقینی ہے۔

❁ ریڈیو پاکستان میں مجھے اپنی انتظامی صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع ملا!

◯ جی جناب! بھرپور۔ آخری منٹ تک لائحہ عمل بدل کر کامیاب پروگرام کیے اور کروائے ہیں۔ لیکن یہ فقط میری نہیں بلکہ پوری بزم طلبہ ٹیم کی محنت ہوتی تھی۔

❁ ریڈیو پاکستان میرا فخر اور پہچان ہے!

◯ جی! بالکل۔ کیونکہ آج جو کچھ ہوں اس میں ریڈیائی تربیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

❁ ریڈیو کی میزبانی بہت احتیاط کی متقاضی ہے!

◯ جی! بلاشبہ۔ ریڈیو میں ہر جذبے کا اظہار اپنی آواز سے کرنا ہوتا ہے اور زبان و بیان کا خیال بھی۔ اس لیے بہت ہوم ورک اور بہت حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔

❁ ریڈیو کے لیے تحریر کردہ میرے ڈراموں کے مکالمے حقیقی زندگی میں میرے بہت کام آتے ہیں!

◯ یہ تو نہیں! ہاں بقول ندا فاضلی: جن باتوں کو خود نہ سمجھا اوروں کو سمجھایا ہے۔ کبھی کبھی کرداروں سے کوئی بات کہلوا کر اسے اپنی حقیقی زندگی میں لاگو ضرور کیا ہے۔

❁ ریڈیو کے لیے اسکرپٹ لکھنا نسبتاً مشکل کام ہے!

◯ جی، ریڈیائی ڈرامے میں مکالمے کے ساتھ ساؤنڈ ایفیکٹس بھی لکھنے پڑتے ہیں اور مجھ سہل پسند کے لیے جو فی البدیہہ کی ماہر ہے ایسا باریک کام بہت صبر آزما ثابت ہوتا ہے۔

❁ اپنے سامعین سے یہی کہوں گی ریڈیو تربیت گاہ ہے سنیے ضرور لیکن ساتھ ہی زبان و بیان کی تربیت بھی حاصل کیجیے!

◯ جی بالکل! جو بات ہے۔ زبان پڑھنے سے زیادہ سننے سے آتی ہے۔ اس لیے زبان سیکھیں۔

❁ پاکیزہ بہنوں سے یہی کہوں گی کہ.....

◯

سو باتوں کی بات ہے پیارے وہ جو ذات میں ہوتی ہے
ہر انسان کی عزت اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے

یہ میرا کہا ہوا شعر ہے، میری پسند کا مطلع ہے اور میرا خیال ہے یہی زندگی کا اصول بھی ہے عزت کریں اور عزت کروائیں۔

☆☆☆

pklibrary.com

اظہارِ تعزیت

سیمار ضا ردا

وہ لوگ بھی کھوئے ہیں
جو کھونے کے نہیں تھے

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے، یعنی آگے چلیں گے دم لے کر......

زندگی اور موت کے درمیان ایک لکیر کا فاصلہ ہے اور اس کی مسافت کے تعین کا فیصلہ انسانوں کی دسترس سے ماورا ہے، کسی قریبی عزیز کی دنیا سے رخصتی ہمارے رشتوں کی کمزوری اور دنیا کی ناپائداری کا پتا دیتی ہے لیکن کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ ہر ایک کا قلبی تعلق ہوتا ہے اور ان سے محبت اور پیار کا سچا جذبہ دل کی گہرائیوں میں بس جاتا ہے......حال ہی میں فنونِ لطیفہ کی دو عظیم شخصیات کا جدا ہو جانا کسی سانحے سے کم نہیں۔ ایک دلکش آواز خموش ہوگئی اور ایک بلبل ہزار داستان سنانے والی بھی زمیں کا رزق ہوگئی۔

حسینہ معین کے حصے میں اگر تحریر کی شہنشاہیت آئی تھی تو کنول نصیر کے حصے میں آواز کا حسن۔

حسینہ معین اور کنول نصیر دونوں ہی فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتی تھیں اور دونوں کو اپنے میدانِ ہنر میں کامل دسترس حاصل تھی حسینہ معین اور کنول نصیر میں ایک قدر مشترک تھی اگر حسینہ معین کی تحریروں میں تہذیبی شعور نمایاں تھا تو کنول نصیر کی آواز اور لہجے میں بھی تہذیب کا رچاؤ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

کنول نصیر کا شخصی خاکہ......

اس کے لہجے کی نغمگی مت پوچھ
چلتے، چلتے ٹھہر گئے ہیں لوگ

کنول نصیر معروف براڈ کاسٹر موہنی حمید کی بیٹی تھیں مٹھاس بھری........اور اپنے لہجے سے دلوں میں اتر جانے والی آواز کی مالک کنول نصیر ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن کی پہچان تھیں۔ ریڈیو کے مائک سے ان کا تعلق اس وقت سے ہے جب وہ صرف ساڑھے تین ماہ کی تھیں وہ بھی اس لیے کہ موہنی حمید کو ایک شو میں روتے ہوئے بچے کی آواز درکار تھی تو وہ کنول کو اپنے ساتھ لے گئیں جنہیں باقاعدہ چٹکی کاٹ کر رُلایا گیا۔ یوں وقت کے ساتھ، ان کا رشتہ ریڈیو کے مائک کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ ریڈیو پاکستان، لاہور میں بچوں کے پروگرام میں شرکت کرتی

pklibrary.com

یعنی سات برس کی عمر سے ہی ریڈیو پر باقاعدہ پروگرام بھی کرنے لگیں۔ ان کی فکری تربیت میں ان ادیب و شعرا اور سینئر فنکاروں کا بہت اہم کردار ہے جو اُن کے گھر آتے تھے اور ان نشستوں سے کنول نے بہت کم عمری میں اندازِ گفتگو کا فن حاصل کرلیا۔

''میرا نام کنول نصیر ہے اور آج پاکستان میں ٹیلی ویژن آگیا ہے آپ کو مبارک ہو۔'' کنول نصیر نے 26 نومبر 1964ء کو پی ٹی وی کے قیام کے وقت ٹی وی اسکرین پر پہلی بار یہ الفاظ ادا کیے تھے یوں انہیں ٹی وی کی پہلی خاتون اناؤنسر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے خبریں بھی پڑھیں۔ 1965ء میں کنول حمید نے کرنل نصیر سے شادی کی تھی۔ وہ ٹی وی پر کنول نصیر کے نام سے جلوہ گر ہوتی رہیں۔ ٹی وی پروگراموں کی میزبانی کے ساتھ، ساتھ کنول نے کئی ڈراما سیریلز میں بھی کام کیا اور مختلف ملکی اور غیر ملکی سربراہانِ مملکت کے اعزاز میں دی جانے والی تقریبات میں میزبانی کا شرف بھی حاصل کیا۔ انہیں پانچ دہائیوں تک پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے بطور براڈکاسٹر کام کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں انہیں پرائڈ آف پرفارمنس (صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی) سے نوازا۔ 25 مارچ کی شام کنول نصیر تہتر برس کی عمر میں اسلام آباد میں قلیل علالت کے بعد وفات پا گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اپنائیت کے احساس سے گندھی اور پُراثر لہجے والی کنول نصیر ہم سے بچھڑ تو گئی ہیں لیکن پاکستان میں ٹی وی اور ریڈیو کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی کنول نصیر کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔

حسینہ معین

مقبول و معروف ڈراما رائٹر

روشنائی کی ایک گنگناتی ندی خاموش ہوگئی۔

25 مارچ 2021ء کی شام کو جب کنول نصیر کے انتقال کی خبر ملی تو ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ اور اسی رات محترمہ حسینہ معین نے بھی اپنے فیس بک پیج پر کنول نصیر کے انتقال کی خبر بہت دکھ سے شیئر کی۔ مگر قدرت کے فیصلے بہت عجیب ہوتے ہیں ..... بے شک زندگی اور موت کا اختیار اسی کو حاصل ہے اور صرف 9 گھنٹے کے

بعد یہ تکلیف دہ خبر بھی ہر خاص و عام نے سنی کہ معروف مصنفہ حسینہ معین دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حسینہ معین کی وفات اردو ڈراموں کے ایک روشن ترین عہد کا خاتمہ ہے، بھارت کے شہر کان پور میں نومبر 1941ء میں پیدا ہونے والی حسینہ قیام پاکستان کے بعد جب اپنے عزیز وطن آئیں تو پہلے راول پنڈی اور پھر کراچی میں مستقل رہائش اختیار کی بہت کم عمری میں ہی بچوں کے ماہانہ میگزین بھائی جان کے لیے کالم لکھنا شروع کیے۔ بیس سال کی عمر میں ریڈیو پروگرام اسٹوڈیو نمبر 9 کے لیے طنز و مزاح کے چٹکلے لکھے ڈراما نگاری میں قومی ڈراما عید مبارک سے ڈیبیو کیا۔

ان کے لکھے گئے مشہور و مقبول ڈراموں میں انکل عرفی، شہزوری، تنہائیاں ان کہی، زیر زبر پیش، دھوپ کنارے، آہٹ، پرچھائیاں شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے اسکرپٹس کی بنا پر ہمیشہ اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ حسینہ معین نے واہگہ بارڈر کے مسائل پر بھی ڈرامے اور سیریلز لکھے جنہوں نے شائقین سے داد بھی حاصل کی اور شاندار ڈرامے اور اچھوتے کردار تخلیق کرنے پر انہیں متعدد ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ حسینہ معین کو نہ صرف ان کے لکھے ہوئے ڈراموں بلکہ ان کی لکھی ہوئی چند فلموں کی وجہ سے بھی کافی شہرت حاصل رہی۔ ان کے لکھے گئے ڈرامے پڑوسی ملک میں بھی بہت مقبول تھے۔ انہوں نے کئی برس کینسر جیسے موذی مرض سے لڑتے ہوئے گزارے اور بالآخر انہوں نے کینسر کو شکست دی لیکن لکھنے کا سلسلہ پہلے کی طرح اس طرح سے نہ جڑ سکا۔ ان کا لکھا ہوا ناول ہر ہفتے ایک کثیر الاشاعتی رسالے میں تواتر سے شائع ہوتا رہا اور پھر ''پل صراط کا سفر'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آیا۔

میری اور حسینہ آپا کی ملاقاتیں بہت ہوئیں۔ کبھی لائیو شو میں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پروگرام کیا تو کبھی زمانہ طالب علمی میں کسی سروے کے لیے پاکستان ٹیلی ویژن جا پہنچے۔ وہ اپنے اسکرپٹس اور سیریل کی تیاریوں میں مصروف رہتی تھیں۔ مگر ہمیں دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی اور ہمارے سوالوں کے جواب بہت پیار، پیار سے دیتیں۔ اور کبھی پلٹ کر یہ نہ کہتیں کہ تم نے یہ جملہ کیوں لکھ دیا تھا میگزین میں..... (ہائے اب ایسی ہستیاں کہاں)

سماجی تقریبات اور ادب سے متعلق فیسٹیول میں وہ ہمیشہ اپنے سنجیدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دکھائی دیتی تھیں۔ اپنی زندگی کا ایک ملال یہ بھی ہے کہ جن دنوں میں اپنے ناول اول عشق ابن السبیل کی طباعت کے مراحل میں مصروف تھی میری خواہش رہی کہ حسینہ آپا میرے ناول پر اپنا مضمون قلم بند کریں۔ انہوں نے میری بات مان لی، میں اپنے ناول کا مسودہ لے کر ان کے گھر گئی۔ وہ ناول کی ضخامت دیکھ کر تھوڑا گھبرائیں پھر مسکرا کر بولیں۔ ''کوئی بات نہیں تمہاری پہلی کاوش ہے۔ میں ضرور لکھوں گی۔'' انہوں نے بالکل منع نہیں کیا حالانکہ وہ ان دنوں بہت بیمار تھیں۔ مگر ایک ماہ کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا اور کہا۔ ''سیما میں نے مضمون لکھ لیا ہے، اپنی سی کوشش کی ہے دیکھ لینا۔'' ان کے کہے یہ جملے میرے لیے کیا معنی رکھتے ہیں، میں یہ احساس تحریر نہیں کر سکتی۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ ان کا لکھا ہوا مضمون میرے ناول میں شامل ہے۔ ناول کی تقریب رونمائی بائیس مارچ 2020ء کو ہونا تھی مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ کووڈ 19 نے ہر راستہ بند کر دیا۔

اب جب اس تقریب اجرا کا سوچتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ حسینہ آپا کو تو اس تقریب میں مضمون پڑھنا تھا۔ افسوس پل کا بھروسا نہیں۔

حسینہ معین 26 مارچ 2021ء کی صبح 79 سال کی عمر میں اپنے مداحوں سے بچھڑ گئیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈراموں کو آج بھی دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہے ان کے جانے سے پاکستان ٹیلی ویژن کا سنہری دور اختتام کو پہنچا ہے۔

ستاروں سے باتیں کرنے والی ایک دم گم ہو گئیں۔ محبت اور مسکراہٹ کے قصے سنانے والی بلبلِ ہزار داستاں ہم سے رخصت ہو گئی..... ہم سب اداس ہیں.....

ناقابلِ فراموش سالگرہ اور سالگرہ کے پیغامات

شائستہ زریں

عید ہمارا وہ مذہبی تہوار ہے جو ہم نہایت جوش و خروش اور خاص اہتمام سے مناتے ہیں۔ گزشتہ برس عید کا تہوار کورونا وبا کے دنوں میں آیا تو سب ہی مختلف تجربات سے گزرے۔ زندگی یادوں سے عبارت ہے اور یادیں تلخ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی۔ یہ یاد کسی خاص دن، موقع یا ہستی سے منسوب ہو تو لطف دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہماری زندگی میں آنے والے چند یوم ہمارے لیے بہت خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں بالخصوص سالگرہ سے وابستہ یاد خواہ یہ ہماری ہو، ہماری کسی عزیز ہستی کی ہو یا اپنے قائم کردہ ادارے کی..... اس کی خوشی دل اور ذہن کے افق پر ہمیشہ جگمگاتی رہتی ہے سو، اس بار ہم نے ایسی ہی یادوں سے اپنی بزم سجائی ہے، چونکہ ہمارا زیرِ نظر شمارہ ماہ شوال کی مناسبت سے عید نمبر اور ماہ مئی کے حوالے سے سالگرہ نمبر ۲ بھی ہے تو عید اور سالگرہ کی یادوں کے ساتھ، ساتھ ماہنامہ پاکیزہ کے لیے سالگرہ کے پیغامات بھی ہیں۔ یاد رہے گزشتہ برس کے لاک ڈاؤن کی عید یادیں ہماری بہنوں نے شیئر کی ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے نہایت محبت اور محنت سے پاکیزہ کے قلمکاروں کی صف میں شامل ہونے والی ہماری پیاری ''مصنفات'' آج شریکِ بزم ہیں جن سے ہم نے معلوم کیا کہ.....

سوال ۱: کورونا وبا اور لاک ڈاؤن میں عید منانے کا تجربہ کیسا رہا؟

سوال ۲: وہ سالگرہ (خواہ کسی کی بھی ہو) جو بھلائے نہیں بھولتی؟ بھلا کیوں؟

سوال ۳: محض دو جملوں یا ایک شعر پر مشتمل پاکیزہ کی سالگرہ کے لیے پیغام.....

رفعت شبانہ
استاد، لکھاری

۱: کورونا کی عید بہت مختلف گزری۔ میرے اخراجات کم ہوئے کہ عید کی بڑی شاپنگ نہیں ہوئی۔ بیوٹی پارلر اور درزی بھی بند تھے۔ ہاں اگر خریداری کی تو ماسک اور سینی ٹائزر کی۔ ہمارے گھر رشتے دار بہت کم آئے بھائی وغیرہ آئے تو فاصلے سے ہی عید کی مبارک باد دی اور عیدی بھی ہم نے فاصلے سے ہی وصول کی۔ پڑوسیوں میں سویوں اور دوسرے کھانوں کے آئٹمز کے تبادلے بھی نہیں ہوئے۔ میں نے واٹس ایپ کے ذریعے سب کو عید کی مبارک باد دی۔

۲: ہم اپنے ہر دلعزیز بھتیجے عمیر قریشی کی سالگرہ دس سال تک بڑی دھوم دھام اور ہر مرتبہ نئے طریقے سے مناتے رہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے سوچا کہ فائر ورکس کا انتظام کریں گے۔ بازار سے ان گنت پھلجھڑیاں خرید لائے اور سالگرہ والے دن ہم نے کافی سمجھدار بڑے بچوں کے ہاتھوں میں دے دیں۔ جب تمام مہمان جمع ہو گئے تو گھر کی تمام بتیاں بجھا کر سب نے وہ پھلجھڑیاں جلائیں۔ سارا گھر چنگاریوں سے دودھیا رنگ کا ہو گیا۔ سب کی آنکھیں سفید روشنی سے چکاچوند ہو گئیں۔ جب ساری

پھلجڑیاں جل گئیں تو لائٹیں بھی کھول دیں۔ پورا ہال دھوئیں سے بھر گیا۔ سب کو کھانسی شروع ہو گئی۔ پھر سارے پنکھے کھول دیے گئے۔ جب دھواں کم ہوا تو پھر کیک کاٹا گیا۔ تالیوں اور کھانسنے کی آوازیں ساتھ چل رہی تھیں۔

۳: ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہما علی

ٹیچر، مصنفہ، شاعرہ

۱: کورونا کی وبا نے تو عید کو روایتی عید کی طرح منانے ہی نہیں دیا تھا۔ ایک طرف یہ خوف کہ باہر جانے والے لوگوں سے ملنے سے کہیں ہمیں کورونا نہ ہو جائے تو دوسری طرف یہ ڈر کہ کہیں ہم سے ہمارے پیارے بزرگواروں کو یہ وبا نہ لپٹ جائے۔ شوق سے خریدے گئے نئے سوٹ یہ سوچ کر سلوائے ہی نہیں کہ کون سا کہیں جانا ہے یا کسی نے ملنے آنا ہے بقول شاعر...... ع

اب کے ہم نے منائی عید سوٹ نیا سلوائے بغیر

۲: میری بڑی بہن شہلا نہ صرف ہم بہن بھائی کو بلکہ ہماری اولادوں کو بھی اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہیں۔ یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے میری چھوٹی بہن فرح دبئی سے آئی ہوئی تھی۔ سات جولائی کو شہلا آپا کی سالگرہ تھی۔ سب بچوں اور بڑوں نے شہلا آپا کو سرپرائز دینے کا پروگرام بنایا۔ تمام انتظامات فرح کو سونپے گئے۔ ریسٹورنٹ میں فرح کی بیٹی عائشہ کے نام سے برتھ ڈے پارٹی کی بکنگ کروائی گئی۔ عائشہ کی سالگرہ دسمبر میں ہوتی ہے اس لیے شہلا آپا سے فرح نے یہی کہا کہ عائشہ سب کے ساتھ اپنی برتھ ڈے منانا چاہتی ہے۔ وہ ہمارے سمر اسکول کا آخری دن تھا۔ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلی شکر پڑیاں کا چوک کراس کیا تو میری گاڑی میرے قابو میں نہ تھی۔ آخر گاڑی گرین ڈیوائڈر سے ٹکرائی اور میں قلابازی کھاتے ہوئے گاڑی سے نکل کراس پر گر گئی۔ گاڑی کا اگلا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہاں سے گزرتی ایک ایمبولنس بھی رک گئی۔ سب کا خیال تھا کہ میری ڈیڈ باڈی

ہی نکلے گی لیکن یقین کریں مجھے ایک خراش تک نہ آئی تھی۔ بہرحال گھر پہنچ کر رونا شروع کیا میری بچی چھوٹی تھی، وہ بھی میرے ساتھ رونے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ میرے اپنے میرے پاس ہوں پھر خیال آیا شہلا آپا کی سرپرائز برتھ ڈے کینسل ہو جائے گی۔ بہرحال دن کے ۱۲ بجے اپنی بیٹی علینہ سے فرح کو فون ملوایا اور اسے بتایا کہ میرا ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں بس میرا دل چاہ رہا ہے تم میرے پاس آجاؤ۔ فرح گھر آئی جب اس نے باہر کھڑی... میری گاڑی کی حالت دیکھی تو رونے لگی۔ اندر آ کر مجھے دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ بہرحال ہم نے فیصلہ کیا جب تک سالگرہ نہیں ہو جاتی کسی کو نہیں بتائیں گے۔ دونوں بیٹیوں علینہ اور ماریہ نے بھی جانے سے انکار کر دیا کہ امی کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ فرح جاتے وقت میرے چھوٹے بیٹے جنید کو ساتھ لے گئی۔ سب حیران تھے کہ ہما اور بچیاں کیوں نہیں آئیں۔ فرح نے مطمئن کر دیا کہ اچانک مہمان آ گئے جنید میرے گھر آیا ہوا تھا تو میں اسے لے آئی۔ سالگرہ میں خوب ہلا گلا ہوا۔ سب نے خوب انجوائے کیا، پارٹی ختم ہونے کے بعد فرح نے انکشاف کیا کہ ہما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سب پریشان ہو گئے اور وہاں سے سیدھا میرے گھر آئے۔ یہ تھی کبھی نہ بھلائے جانے والی سالگرہ۔ اور اس کی روداد۔

۳: مجھ کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام تیرا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

افشین نعیم

رائٹر

۱: الحمدللہ بہترین رہا۔ چونکہ عید کی کوئی شاپنگ نہ ہو پائی تھی (شکریہ کورونا) تو پہلے سے موجود کپڑوں،

pklibrary.com

جوتوں سے کام چلایا۔ نہ ہم کہیں گئے نہ کوئی ہمارے گھر آیا۔ صبح صبح تیار شیار، کش پش ہو کر کچن کی راہ لی، پورا دن مزے، مزے کے پکوان تیار کرتے، خود کھاتے، گھر والوں کو کھلاتے عید کا دن گزارہ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

۲: ہمارے گھر میں سالگرہ منانے کا رواج نہیں تھا۔ بس یوں ہوتا کہ سالگرہ والے دن رات کے کھانے کے بعد کیک کاٹ لیا جاتا اور بس..... اختتام کو پہنچی سالگرہ۔ یہ ہماری چھٹی سالگرہ کا قصہ ہے کہ والد صاحب صبح ہی صبح کیک لے آئے۔ جس کو رات کے کھانے کے بعد کاٹا جانا تھا۔ اب والد صاحب تو آفس چلے گئے۔ والدہ بیچاری ہم چار بہن بھائیوں اور گھر کے کام کاج میں گھن چکر بنی رہیں۔ اور رہ گئے ہم بہن بھائی تو ہم باری، باری جاتے۔ پانی پینے کے بہانے فریج کھولتے مزے سے کیک کا ڈبا سائڈ سے کھول کر تھوڑا سا کیک نکال کر کھاتے۔ چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے اور واپس آجاتے۔ شام تک ہم یہ کارروائی دُہراتے رہے۔ قصہ مختصر رات کو جب کیک کاٹنے کے لیے کیک کا ڈبہ کھولا گیا تو خالی ڈبہ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ والد صاحب حیرانی سے والدہ صاحبہ کو اور وہ ہمیں دیکھتی رہیں۔ خیر سالگرہ کا دن ہونے کی وجہ سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی گئی۔ والد صاحب اسی وقت بازار جا کر آئس کریم لے کر آئے۔ یوں کیک کی جگہ آئس کریم کھا کر ہم نے سالگرہ منائی۔

۳: مثبت سوچ وہ سیڑھی ہے جو شکر گزاری کی منازل طے کرواتی بالآخر اپنے رب سے ملوا دیتی ہے۔ زندگی میں خوش رہنے کا یہ فارمولا یعنی مثبت اندازِ فکر ماہنامہ پاکیزہ اپنے قارئین کو دے رہا ہے۔

فصیحہ آصف خان
لکھاری، شاعرہ

۱: اس عید کا تو کوئی لطف نہیں آیا۔ کوئی ملنے آیا نہ... روبرو بات ہوئی۔ گلے ملنا تو دور کی بات ہے ہاتھ تک نہیں ملا سکے۔ ہاں فون پر گپ شپ ہوتی رہی۔ دن تو کسی طور گزرنا تھا سو گزر گیا۔ احتیاط نے ہی بچائے رکھا۔ اللہ کا کرم ہے۔

۲: یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ہماری ایک بہت پیاری سہیلی نے اپنی سالگرہ کا بہت تھوڑا سا اہتمام کیا تھا۔ سو ہم نے اسے سرپرائز دیا اس کی بہنوں اور ہم سب سہیلیوں نے اس کے کمرے کو پھول، غباروں جھنڈیوں، رنگ برنگے آرائشی سامان اور موم بتیوں سے دلہن کی طرح خوب سجایا۔ جب وہ اسکول سے پڑھا کر واپس آئی تو اس پر پھول نچھاور کیے۔ وہ حیران رہ گئی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بعد ازاں تحائف کی برسات ہوئی۔ ان مسحور کن لمحوں میں وہ فرطِ مسرت سے مجھ سے لپٹ گئی۔

۳: ماہنامہ پاکیزہ کے لیے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پھر بھی میرے دلی جذبات پیش ہیں۔

کس قدر محبت ہے تجھ سے
اے پاکیزہ! ہم صدقے تمہارے

مریم شہزاد
قلم کار

۱: یوں تو کورونا اور لاک ڈاؤں بہت پریشان کُن تھے اور ہیں بھی مگر کچھ اچھی باتیں بھی ہوئیں۔ جیسے بیٹے نے تراویح گھر پر پڑھائی تو رمضان المبارک کا مزہ دوبالا ہو گیا اور پھر جب رمضان پُرنور ہو تو اللہ پاک نے عید بھی اچھی کروا دی۔ کورونا کو تو الحمدللہ ہم نے لفٹ ہی نہیں کروائی۔ بے شک دل تو پریشان تھا، سب کے حالات سن، سن کر لیکن ایک در بند ہوتا ہے تو اللہ کتنے ہی دروازے کھول دیتا ہے سو اس نے عید پر بھی کرم کر دیا۔

۲: ویسے تو میں سالگرہ نہیں مناتی۔ لیکن ایک

سالگرہ مجھ کو یاد رہتی ہے۔ جب میں دس سال کی تھی۔ ہم دہلی گئے ہوئے تھے۔ وہاں کوئی شادی تھی۔ ۱۱ اپریل کا دن تھا میرے چاچا کو جب معلوم ہوا کہ میری سالگرہ ہے۔ تو وہ سب بچوں کو آئس کریم کھلانے لے گئے۔ جب ہم آئس کریم کھا کر واپس شادی والے گھر میں آئے تو وہاں ابٹن کھیلا جا رہا تھا۔ کسی نے چہرے پر ابٹن لگاتے لگاتے منہ میں ڈال دیا پھر جو الٹیاں ہوئیں تو آئس کریم کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔

۳: تیری سالگرہ کی آمد پر۔ دعاؤں سمیت اپنا من، اپنی جان۔ اپنی خوشیاں، اپنی شوخیاں اے پاکیزہ تیرے نام کر دیں۔

تسلیم فاطمہ شیخ

قلم کار

۱: رمضان اور عید کا رتی بھر مزہ نہیں آیا۔ ہر کوئی اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا، یہی ڈر کہ کہیں کورونا کسی کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اکثر رشتے داروں نے تو صاف لفظوں میں اسٹینس لگا دیا تھا کہ بھئی عید ہے تو کیا ہم سے نہ کوئی ملنے آئے، احتیاط کریں، فاصلہ رکھیں۔ اور ہم نے بھی فاصلہ رکھا اور اتنا فاصلہ رکھنے کے باوجود بھی بخار نے ہم سے فاصلہ نہ رکھا اور تمام گھر والے بخار کی لپیٹ میں آ گئے۔ اللہ ایسی عید کسی کی زندگی میں نہ لائے۔ جب بھی عید آئے خوشیوں بھری چہچہاتی ہوئی آئے، آمین۔

۲: ویسے تو ہر سالگرہ میں کچھ، کچھ ڈراما ہو ہی جاتا ہے میرے ساتھ۔ جب میں آٹھویں کلاس میں تھی تو ہم چار سہیلیاں تھیں۔ دو کی سالگرہ اگست میں، ایک کی مئی میں اور میری جون میں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ چاروں کی سالگرہ ایک ہی دن منائیں گے۔ کھانے کی چیزیں بنا کر ہم سب اسکول لے گئے۔ مگر جب بریک ہوئی تو آدھے گھنٹے کی بریک میں بس جگہ ہی ڈھونڈتے رہے کہ کہاں سالگرہ منانی ہے اور پورا اسکول گھومتے، گھومتے وقت گزر گیا مگر ہمیں جگہ نہ ملی کہ سالگرہ منائیں کہاں؟ بریک کے بعد مطالعہ پاکستان کا لیکچر شروع ہوا تو ہم نے چھپ، چھپ کر چوری چوری کھایا۔ اس واقعے کو کتنے سال گزر گئے لیکن آج بھی یاد آئے تو ہنسی آتی ہے کہ ہم کلاس کا انتخاب ہی نہ کر سکے۔

۳: پاکیزہ آسمانِ ادب کا چمکتا تارہ' اللہ اسے یونہی فرزاں رکھیں اور احباب سے کہوں گی کہ اپنے اندر کی صلاحیتوں کو پہچان اور سنوار کر اپنا نام اور مقام خود بنایئے ماہنامہ پاکیزہ کی طرح۔

شمائلہ دلعباد

قلم کار

۱: پردیس میں عید پہلے ہی کچھ خاص پُررونق نہیں ہوتی، وہ جو پاکستان میں عید ملنے ملانے کا سلسلہ ہوتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ لیکن کورونا وبا اور لاک ڈاؤن کی عید اس لحاظ سے مزید روکھی پھیکی رہی کہ بچوں کے ساتھ گھر سے باہر جھانک بھی نہیں سکے۔ پر جناب کھانے قسم، قسم کے بنا، بنا کر اور خود بھی کھا، کھا کر بھولو پہلوان کو مات دینے تک پہنچ گئے تھے۔ میٹھی عید کو مزید میٹھا کرنے کے لیے میں نے اس بار گلاب جامن گھر پر بنائی تھی۔ گھر کے افراد کے ساتھ وقت بتاتے ہوئے باؤنڈنگ بھی مزید مضبوط ہو گئی۔

۲: اپنی سالگرہ پر میں اور میاں صاحب زیادہ اہتمام نہیں کرتے لیکن بچوں کی سالگرہ ہم پردیس میں ذرا اہتمام سے ہی مناتے ہیں۔ تو جناب بڑے بیٹے کی پہلی سالگرہ کبھی نہیں بھولتی کیونکہ اس روز پہلی بار اس نے زمین پر پاؤں جما کر چلنا سیکھا تھا۔ وہ سالگرہ ہم سب نے اکٹھی منائی تھی۔

۳: پیارے پاکیزہ میری دعاؤں کے سارے جگنو تمہارے نام، خدا کرے یہ دن بار، بار آتا رہے، تمہارے لیے خوشیوں کے لمحات لاتا رہے (آمین)

کشف بلوچ

رائٹر

۱: مجھے لگتا ہے عید پھیکی ہونے کے بجائے بہت خاص بن گئی کیونکہ اس بار گھر والوں نے بازاروں اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے بجائے گھر میں سب کے ساتھ عید منائی۔

ویسے عید کے پہلے دو دن میرے کچن میں ہی

گزرتے ہیں لیکن چونکہ کورونا اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے رشتے دار کم ہی گھر آئے تو اس بار کچن میں کم وقت گزرا۔ عید پر ہم سب نے مکمل احتیاط کی اور شاپنگ کے لیے کہیں نہیں گئے۔ گھر میں پڑے ان سلے کپڑوں کی قسمت جاگ اٹھی اور ہم نے وہی سلوا کر پہنے۔ البتہ باقی چھوٹی موٹی چیزیں خرید لیں مگر بعد میں افسوس ہوتا رہا کہ کہیں گئے ہی نہیں اور وہ چیزیں گھر میں پہن کر واپس الماری میں رکھ دی گئیں۔

۲: مجھے ۲۰۱۲ء کی اپنی وہ سالگرہ بھولی ہے اور نہ کبھی بھولے گی، جس کے اختتام پر کیمرے کی کلک کی آواز آئی تو تصویر میں میری ماں کا ہنستا ہوا چہرہ بھی موجود تھا۔ اس شام مجھے معلوم نہیں تھا کہ اگلے سال ٹھیک اسی روز یہ چہرہ مجھے نظر نہیں آئے گا۔ یہ محبت بھری آواز اور ہنسی اب کبھی میری سماعتوں میں رس نہیں گھولے گی۔ اگلے سال ۱۲ اپریل ۲۰۱۳ء کی صبح کسی نے میری پیشانی چوم کر میری جھولی میں ان گنت دعاؤں کے پھول نہیں ڈالے۔ اس شام نہ تو میں نے موم بتی بجھا کر کیک کاٹا اور نہ ہی گھر میں میری سالگرہ منائی گئی۔ اس روز میری ماں کا چالیسواں تھا۔ اب ماں کہیں نہیں ہے صرف تصویر مسکراتی ہے۔ (کشف! مائیں چلی بھی جائیں تو اولاد اُن کی دعاؤں کے حصار میں رہتی ہے۔)

۳: ماہنامہ پاکیزہ کے نام جو روح کی ویرانی میں لفظوں کی موم بتیاں جلا کر دلوں میں نور کے ہالے تخلیق کر رہا ہے۔ تاریکیوں میں روشنی کے جگنو تقسیم کرنے والے اس ادارے کے ہر فرد کو سالگرہ مبارک۔

ضادیہ احمد
لکھاری

۱: یہ عید مختلف رہی۔ کورونا کی وجہ سے اس عید میں نہ تو روایتی ملنا جلنا رہا نہ وہ رونق رہی۔ نہ خاندان والوں کی دعوت ہوئی۔ نہ وہ دوستوں اور کزنز سے ملاقات، نہ وہ ہنسی مذاق، نہ ہی وہ عید کی تیاریوں کے لیے وہ بازاروں کے چکر اور رونقیں بہت کچھ نامکمل تھا لیکن ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ جس نے ہمیں اس وبا کے ماحول میں بھی اپنے حفظ و امان میں رکھا۔

۲: دو سال قبل ہم ٹرین میں کراچی سے لاہور جا رہے تھے تو ہماری ساتھ والی برتھ پر ایک کیوٹو سے بچے کی سالگرہ کا اہتمام اس کے گھر والے کر رہے تھے۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ غبارے پھلائے اور اس قدر انجوائے کیا جیسے کسی اپنے کی سالگرہ ہو اور تحفے کے طور پر ہم نے ان کو اپنے ساتھ لائی ہوئی کچھ چیزیں دیں۔ اس سفر سے جو دوستی کا رشتہ قائم ہوا وہ دوستی اب تک قائم ہے۔

۳: دل پر ہو ہزاروں کی دستک
دستک وہی کھلے جو پاکیزہ ہو

فرح بھٹو
قلم کار

۱: عید کی روایتی افراتفری اور جوش و خروش مفقود تھا۔ ہم نے اس عید پر بالکل بھی شاپنگ نہیں کی۔ آن لائن بھی کچھ نہیں خریدا کہ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا۔ یہ عید بہت سادہ مگر منفرد گزری۔ افرادِ خانہ ایک دوسرے کے ساتھ صرف ایک دوسرے کو اپنا وقت دیتے ہوئے اچھا محسوس کر رہے تھے۔ کسی کو کہیں جا کر عید ملنے کی عجلت نہیں تھی۔ سیل فون البتہ فون کالز اور عید کے پیغامات سے بھر گیا تھا۔ فون پر بھی اپنوں کی سلامتی کی دعائیں لبوں پر تھیں۔ ہر کوئی عید مبارک کہنے کے بعد اس وبا کے ٹلنے کی دعا کرتا اور ہم دل سے آمین کہتے۔

۲: دسمبر یوں تو ہوتا ہی سرد ہے پر میری نازک طبیعت پر بچپن میں بہت گراں گزرتا تھا۔ نزلہ، زکام، کھانسی بے تکلفی سے مجھ پر حملہ آور ہو جاتے۔ ۳ دسمبر کو میری سالگرہ آتی پانچ برس کی تھی۔ حسبِ سابق دھوم دھام سے میری سالگرہ منانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے کہ میرا ہلکا پھلکا ٹمپریچر شدت اختیار کر گیا۔ سب سے چھوٹی بیٹی ہونے کی وجہ سے امی کی مجھ سے قربت بھی زیادہ ہے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ امی نے مجھے میڈیسن دے کے لٹا دیا اور کمرا بند کر کے اعلان کر دیا کہ میری بچی بیمار ہے سو اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ بیڈ روم سے باہر ہلچل، ہنسی مذاق اور باتوں کی آوازیں مجھے بے چین کرنے لگیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ دوڑ لگا کے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ اپنی سالگرہ

انجوائے کروں۔ مگر ہائے رے مجبوری دل مسوس کر پڑی رہی کہ امی کی پہرہ داری کڑی تھی۔ محفل عروج پر تھی کیک کاٹنے کے لیے برتھ ڈے گرل کی تلاش ہوئی لیکن وہ تو کمفرٹر میں چھپی ہوئی تھی۔ میرے بابا شہر کی مشہور بمبئی بیکری سے ہمیشہ کی طرح پانچ پاؤنڈ کا تین منزلہ کیک لائے تھے۔ کچھ آنٹیوں نے بیڈروم میں آکر امی سے کہا کہ صرف کیک کاٹنے کے لیے فرح کو باہر لے آؤ لیکن امی نے صاف انکار کر دیا کہ باہر ہوا لگ گئی تو میری بچی مزید بیمار ہو جائے گی۔

بہر حال کیک کاٹنے کے لیے میری دس سالہ بہن کا انتخاب کیا گیا۔ وہ شرمندہ ہو رہی تھی کہ کیک پر پانچ کا ہندسہ اور میرا نام پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ بچے الگ فرح، فرح کا شور مچا رہے تھے۔ خیر بہن نے اسی خجالت سے کیک کے گلے پر چھری پھیر دی۔ تالیاں بھی بجیں، ہوٹنگ بھی ہوئی اور تصویریں بھی کھینچی گئیں جو بطور یادگار اب تک میرے پاس ہیں۔ اپنی نوعیت کی یہ انوکھی سالگرہ جس میں برتھ ڈے گرل کے سوا سب نے انجوائے کیا۔ کیسے بھلائی جا سکتی ہے؟

۳: ادب کے افق پر سدا تو تابندہ رہے پاکیزہ
خدا کرے کہ منائیں ہر برس سالگرہ تیری

ریما نور رضوان

مصنفہ

ا: کورونا وبا نے تو دل و دماغ پر خوف کی دبیز تہ جما دی تھی اس پر مستزاد لاک ڈاؤن۔ کیسی عید؟ کیسی خوشی؟ بس گھروں میں محصور رہے۔ لاک ڈاؤن کھلنے کے بعد جولائی میں مما کے گھر گئی تو سب کے ساتھ مل کر دلی مسرت ہوئی اور اس دن عید محسوس ہوئی۔

۲: ہم ایک دفعہ سند باد گئے ہوئے تھے جہاں

میرے بہت پسندیدہ فنکاروں فضیلہ قاضی اور قیصر خان نے اپنے بیٹے کی سالگرہ کا اہتمام کیا تھا۔ میں حیرت سے فضیلہ کو دیکھ رہی تھی جو ٹی وی میں جتنی حسین نظر آتی ہیں حقیقت میں اس سے بڑھ کر حسین تھیں۔ اور اس وقت تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب کیک کاٹتے وقت فضیلہ قاضی نے ہاتھ ہلا کر ہم سب کو بھی بلا لیا۔ فضیلہ قاضی کے بیٹے کی سالگرہ میں شرکت اور اتنے قریب سے ان کو دیکھنے کی میری دیرینہ خواہش کی تکمیل دونوں ہی نہیں بھلائے جا سکتے۔

۳: پاکیزہ کو اللہ پاک دن دگنی رات چوگنی ترقی و کامیابی عطا فرمائے اور اس سے منسلک ہر فرد کو اپنی امان میں رکھے، آمین

☆☆☆

معزز قارئین!

ماشاء اللہ گزشتہ کئی برسوں سے پاکیزہ خواتین کے دلوں میں حکمرانی کر رہا ہے۔ اور کیوں نہ کرے کہ پاکیزہ محض ایک ماہنامہ ہی نہیں دبستان بھی ہے اور تربیت گاہ بھی۔ ان شاء اللہ اسی خلوص اور لگن سے پاکیزہ کا یہ سفر جاری رہے گا، نئی امنگوں، جوش اور ولولے سے۔ پاکیزہ کی سالگرہ اور عید الفطر کے... پُرمسرت موقع پر ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے تمام مصنفات اور پاکیزہ بہنوں کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتی ہوں کہ یہ سب باہمی بے لوث محبت اور کاوشوں کا کمال ہی تو ہے جس نے اس رسالے پاکیزہ کو یہ مقبولیت اور شہرت بخشی۔ پاکیزہ کے لیے ہمارا پیغام یہی ہے کہ

خدا کرے کہ چمکو مثالِ انجم تم
جو ہر سو کر دے اجالا وہ آفتاب رہو
پڑھے جو تم کو وہ تم کو نہ بھولنے پائے
محبتوں سے جو مہکے وہ تم گلاب رہو

☆☆☆

pklibrary.com

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں..... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

عطا الحق قاسمی..... اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے۔ اس ماہ اپنے باذوق پڑھنے والوں کے لیے ہم نے انہی نامور مزاح نگار کی تصنیف ہنسنا رونا منع ہے سے اقتباس منتخب کیا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

ایک لانگ ڈسٹینس کال

''السلام علیکم بھائی جان، میں لاہور سے انوار بول رہا ہوں۔''

''شکر ہے یار تمہاری آواز سنائی دی۔ مگر آواز بہت کم آرہی ہے۔ ذرا اونچا بولو۔''

''بھائی جان شکر کریں فون مل گیا ہے، میں تو دو گھنٹے سے ٹرائی کررہا تھا، بھابی بچوں کا کیا حال ہے؟''

''سب ٹھیک ہیں، تم سناؤ گھر میں سب خیریت سے ہیں؟''

''جی اللہ کا شکر ہے، پشاور کا موسم کیسا ہے؟''

''سخت سردی پڑ رہی ہے، لاہور کیسا جارہا ہے؟''

''لاہور میں بھی یہی حال ہے، سنا ہے عذرا باجی سخت بیمار ہیں، ایک تو اُن کے ہاں فون نہیں ہے اور مجھے خط لکھنے کا وقت نہیں ملتا، آپ ان کی طرف جائیں تو میری طرف سے بھی پوچھ لیں۔''

''میں تو خود ایک مہینے سے ان کی طرف نہیں جاسکا، وقت ہی نہیں ملتا، ویسے شہباز آیا تھا، وہ بتا رہا تھا۔ پہلے سے بہتر ہے۔ بڑا ترس آتا ہے ان پر، ہماری اس بہن نے ساری عمر دکھ اور پریشانی میں ہی گزار دی۔''

''سنا ہے وہ مالی طور پر بھی پریشان ہیں۔''

''ہاں میں نے بھی سنا ہے، جی چاہتا ہے ان کی مدد کرنے کو لیکن میں ان دونوں مکان بنا رہا ہوں، ابھی تک اسی لاکھ لگ گئے ہیں مگر یہ مکمل ہونے میں ہی نہیں آرہا۔ ویسے میں نے شہباز کو کہا تھا کہ دوائیوں وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ اسپتال میں ڈاکٹر رانا سے مل لے، وہ میرے بچپن کا دوست ہے، میں نے شہباز کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا تھا۔''

''چلیں یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا..... وہ اپنا کٹو ہے ناں؟''

''کون کٹو؟''

''تاجی اعجاز کا نواسہ.....؟''

''ہاں، ہاں کیا ہوا اسے؟''

''پولیس اسے جوئے کے الزام میں پکڑ کر لے گئی؟''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، وہ تو بہت اچھا بچہ ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں، رضیہ آپی بھی روتی آئی تھیں، تایا ابو بھی آئے تھے کہ اس کے لیے کچھ کر، وہ بالکل بے گناہ ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''بھائی جان میں کیا کرسکتا ہوں..... اس پر الزام ہی ایسا ہے کہ کسی کو کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور پھر ویسے بھی آج کے زمانے میں کسی کی نیک چلنی کی گواہی کیسے دی جاتی سکتی ہے کل کو میں جو سب کے سامنے شرمندہ ہوں تو کیا یہ بہتر نہیں ... کہ اس معاملے میں آیا ہی نہ جائے چنانچہ میں نے رضیہ آپی اور تایا ابو کو ٹرخا دیا تھا۔''

''اچھا کیا.....! کبھی سلمان سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟''

''کون سلمان؟''

''بھئی وہ جو میرا بچپن کا دوست ہے، کیا اس نے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ دیا ہے؟''

''اچھا سلمان، بھائی جان اس بیچارے کو تو فوت ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔''

''اوہو، بہت افسوس ہوا، تم جنازے میں گئے تھے؟''

''جانا تھا مگر جب میں گھر سے نکل رہا تھا، کچھ کاروباری دوست آگئے، بہت اچھا آدمی تھا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے جب بھی آتا ہمیشہ آپ کی باتیں کرتا۔ آپ سے وہ محبت کرتا تھا۔''

''مجھے خود اس سے بہت محبت تھی، کبھی اس کے گھر جانا ہو تو میری طرف سے بھابی سے تعزیت ضرور کرنا۔ اور سیاست کا کیا حال ہے؟''

''آپ کے سامنے ہی ہے، ملک میں تو قدرے سکون ہے لیکن عالم اسلام پر بہت برا وقت آیا ہے، بھائی، بھائی سے لڑ رہا ہے اور دشمنوں کو چوہدری بننے کا موقع مل رہا ہے۔''

''بس یار دعا کرو، اللہ حالات بہتر کرے، اس سے کاروبار پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔''

''جی ہاں، پہلے سے آدھا رہ گیا ہے، یہ آپ کی آواز بہت کم آرہی ہے؟''

''میں تو خاصا اونچا بول رہا ہوں، ویسے آواز تمہاری بھی بہت مدھم ہے۔''

''ہیلو.....''

''ہیلو، ہیلو.....''

''ہیلو..... ہاں اب کچھ بہتر ہے۔ آپ لاہور آرہے ہیں؟''

''میں پچھلے ہفتے چند گھنٹوں کے لیے آیا تھا کچھ ضروری کام تھے مگر تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک تو تم نے گھر بہت دور بنایا ہے، اوپر سے تمہارا فون خراب رہتا ہے، بہت فون کیے سوچا تھا کہ چلو فون پر ہی بات کرلوں مگر تمہارے فون سے ٹوں، ٹوں کی آواز آتی رہی، ہیلو یہ پھر گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔''

''بھائی جان لانگ ڈسٹینس کال میں یہی تو خرابی ہے کہ.....''

''بھائی کو بھائی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مگر یہ خرابی لانگ ڈسٹینس کال میں نہیں، اس لانگ ڈسٹینس میں ہے جو مادہ پرستی نے رشتوں کے درمیان پیدا کردیا ہے! کیونکہ تمہیں تو ایک شہر میں رہنے والے قریبی عزیزوں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔''

''یہ کون گدھا درمیان میں آگیا ہے؟''

''چلو دفع کرو اسے، تم اپنے بچوں کی تازہ تصویریں تو مجھے بھیجو، بہت یاد آتے ہیں۔''

''وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

''تم دونوں جھوٹ بولتے ہو، تم لوگوں کو اپنے علاوہ کچھ یاد نہیں۔''

''یہ کوئی بہت ہی لعنتی شخص ہے، اچھا بھائی جان پھر بات ہوگی۔''

''خدا حافظ.....''

''خدا حافظ.....''

☆☆☆

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، وہ تو بہت اچھا بچہ ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں، رضیہ آپی بھی روتی آئی تھیں، تایا ابو بھی آئے تھے کہ اس کے لیے کچھ کر، وہ بالکل بے گناہ ہے۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''بھائی جان میں کیا کرسکتا ہوں..... اس پر الزام ہی ایسا ہے کہ کسی کو کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور پھر ویسے بھی آج کے زمانے میں کسی کی نیک چلنی کی گواہی کیسے دی جاتی سکتی ہے کل کو میں جو سب کے سامنے شرمندہ ہوں تو کیا یہ بہتر نہیں ... کہ اس معاملے میں آیا ہی نہ جائے چنانچہ میں نے رضیہ آپی اور تایا ابو کو ٹرخا دیا تھا۔''

''اچھا کیا.....! کبھی سلمان سے تو ملاقات نہیں ہوئی؟''

''کون سلمان؟''

''بھئی وہ جو میرا بچپن کا دوست ہے، کیا اس نے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ دیا ہے؟''

''اچھا سلمان، بھائی جان اس بیچارے کو تو فوت ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔''

''اوہو، بہت افسوس ہوا، تم جنازے میں گئے تھے؟''

''جانا تھا مگر جب میں گھر سے نکل رہا تھا، کچھ کاروباری دوست آگئے، بہت اچھا آدمی تھا، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے جب بھی آتا ہمیشہ آپ کی باتیں کرتا۔ آپ سے وہ محبت کرتا تھا۔''

''مجھے خود اس سے بہت محبت تھی، کبھی اس کے گھر جانا ہو تو میری طرف سے بھابی سے تعزیت ضرور کرنا۔ اور سیاست کا کیا حال ہے؟''

''آپ کے سامنے ہی ہے، ملک میں تو قدرے سکون ہے لیکن عالم اسلام پر بہت برا وقت آیا ہے، بھائی، بھائی سے لڑ رہا ہے اور دشمنوں کو چوہدری بننے کا موقع مل رہا ہے۔''

''بس یار دعا کرو، اللہ حالات بہتر کرے، اس سے کاروبار پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔''

''جی ہاں، پہلے سے آدھا رہ گیا ہے، یہ آپ کی آواز بہت کم آرہی ہے؟''

''میں تو خاصا اونچا بول رہا ہوں، ویسے آواز تمہاری بھی بہت مدھم ہے۔''

''ہیلو.....''

''ہیلو، ہیلو.....''

''ہیلو..... ہاں اب کچھ بہتر ہے۔ آپ لاہور آرہے ہیں؟''

''میں پچھلے ہفتے چند گھنٹوں کے لیے آیا تھا کچھ ضروری کام تھے مگر تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک تو تم نے گھر بہت دور بنایا ہے، اوپر سے تمہارا فون خراب رہتا ہے، بہت فون کیے سوچا تھا کہ چلو فون پر ہی بات کرلوں مگر تمہارے فون سے ٹوں، ٹوں کی آواز آتی رہی، ہیلو یہ پھر گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔''

''بھائی جان لانگ ڈسٹینس کال میں یہی تو خرابی ہے کہ.....''

''بھائی کو بھائی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ مگر یہ خرابی لانگ ڈسٹینس کال میں نہیں، اس لانگ ڈسٹینس میں ہے جو مادہ پرستی نے رشتوں کے درمیان پیدا کردیا ہے! کیونکہ تمہیں تو ایک شہر میں رہنے والے قریبی عزیزوں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔''

''یہ کون گدھا درمیان میں آگیا ہے؟''

''چلو دفع کرو اسے، تم اپنے بچوں کی تازہ تصویریں تو مجھے بھیجو، بہت یاد آتے ہیں۔''

''وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

''تم دونوں جھوٹ بولتے ہو، تم لوگوں کو اپنے علاوہ کچھ یاد نہیں۔''

''یہ کوئی بہت ہی لعنتی شخص ہے، اچھا بھائی جان پھر بات ہوگی۔''

''خدا حافظ.....''

''خدا حافظ.....''

☆☆☆